دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۷۶ ویں جلد

جولائی ۱۹۵۵ء تا دسمبر ۱۹۵۵ء

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۷۶

جولائی ۱۹۵۵ء تا دسمبر ۱۹۵۵ عیسوی

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسماے گرامی	صفحہ	شمار	اسماے گرامی	صفحہ
۱	جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے، پی، ایچ ڈی، ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی	۳۷۵	۸	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اعظمی	۲۷، ۳۴۴
۲	جناب اختر مسعود صاحب ایم اے لکچرار اردو، لکھنؤ یونیورسٹی	۲۰۹	۹	جناب عابد رضا صاحب بیدار رامپوری	۲۹۵
۳	جناب افتخار احمد صاحب اعظمی	۴۳	۱۰	جناب شیخ فرید احمد صاحب ایم اے لکچرار رابرٹسن کالج جبل پور	۴۵۶
۴	جناب سید امین الحسینی صاحب حیدرآباد دکن	۳۶۷	۱۱	جناب کلب علی خاں صاحب فائق رامپوری	۲۸۵
۵	جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب لدھیانوی	۵۳	۱۲	جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی	۱۲۸
۶	حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۲۳۱-۳۰۳، ۳۸۵	۱۳	جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی	۴۲۴
۷	جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے	۵۸-۱۰۸، ۱۵۳، ۱۵۷، ۱۹۵، ۲۶۹، ۳۲۹، ۴۶۵	۱۴	جناب محمد اشرف صاحب ایم اے لکچرار اسلامیہ کالج پشاور	۱۸۵، ۳۴۵، ۳۲۵، ۴۰۵
			۱۵	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲، ۷۷، ۸۲، ۱۶۲، ۲۳۶، ۲۴۲، ۳۱۵، ۳۲۲، ۳۹۷، ۴۰۰، ۴۷۰

فہرست مضامین معارف

جلد ۷۶

جولائی ۱۹۵۵ء تا دسمبر ۱۹۵۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۷۶

جولائی ۱۹۵۵ء تا دسمبر ۱۹۵۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰ — 20 JUL 1955 — جولائی سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

مجلس ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی	صدر
(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی،	رکن
(۳) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی،	"
(۴) جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	"
(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی	مرتب
(۶) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے	شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ کی پرفریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: عہ

حکمای اسلام جلد اول

دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکما کے حالات پر مشتمل ہو، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکما نے فلسفہ سے مذہب کی تخریب و بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)

قیمت: معہ

جلد ۷۶ ماہ ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۵ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اسپشل میرج ایکٹ جس زمانہ میں پاس ہوا ہے، اسی زمانہ میں ہم نے لکھا تھا کہ یہ ایکٹ اسلامی قانون نکاح کے خلاف ہے، اس لیے مسلمانوں پر اس کا اطلاق نہ ہونا چاہئے، مگر بغیر کسی استثناء کے اس کا نفاذ ہو گیا، اس قانون کے رو سے مختلف مذہب رکھنے والے مرد اور عورتیں آپس میں شادی کر سکتے ہیں، یہ شادی قانوناً جائز ہوگی، اور اس کے لیے کسی مجسٹریٹ کے سامنے شادی کا اقرار کر لینا کافی ہوگا۔

اسلامی قانون میں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان شادی جائز نہیں ہے، البتہ مسلمان مردوں کو کتابیہ عورت سے شادی کی اجازت ہے، اس کے خلاف جو عورت ہوگی وہ شرعاً جائز نہ ہوگی، اور شادی کرنے والے کو اپنے بعض اسلامی حقوق سے دست بردار ہونا پڑے گا، مگر اسپشل میرج ایکٹ کے رو سے اس قسم کی شادی قانوناً جائز ہوگی، اور شادی کرنے والا کسی حق سے محروم بھی نہ ہوگا، اس لیے دینی حیثیت سے اس قانون کی مضرت ظاہر ہے، دنیاوی حیثیت سے بھی وہ مسلمانوں کے لیے برابر نقصان کا باعث ہے، آجکل اگر کوئی ہندو کسی مسلمان عورت سے شادی کر لیتا ہے، تو اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی، بلکہ اسکو متحدہ قومیت کی نشانی قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر بدقسمتی سے کوئی مسلمان مرد، خواہ نام ہی کا مسلمان ہو، کسی ہندو عورت سے شادی کر لیتا ہے تو اس کے خلاف ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں کوئی مسلمان ہندو عورت سے شادی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا، مگر ہندو مرد آزادی سے مسلمان خواتون سے شادیاں کریں گے، اور عورت کسی حق سے محروم بھی نہ ہوگی، اور اس کی اولاد ہندو مانی جائے گی، اس لیے دنیاوی حیثیت سے بھی یہ قانون مسلمانوں کے لیے سخت مضر ہے۔

انگریزی حکومت نے بھی کبھی کوئی ایسا قانون نہیں بنایا تھا جس سے کسی مذہبی قانون کی مخالفت ہوتی ہو، مختلف المذاہب عورتوں اور مردوں کے درمیان شادی کے جواز کے لیے سول میرج ایکٹ ضرور تھا مگر اس میں فریقین کو اس کا اقرار کرنا پڑتا تھا کہ ان کا کسی مذہب سے تعلق نہیں ہے، اور اپنے حقوق سے بھی دستبردار ہونا پڑتا تھا، اس لیے اس کا اثر کسی مذہبی قانون پر نہیں پڑتا تھا، مگر موجودہ قانون اسلامی قانونِ نکاح کے صریح خلاف ہے، اس لیے مسلمانوں پر اس کا نفاذ کسی طرح روا نہیں ہے، ہم کو امید ہے کہ ہماری سیکولر حکومت اس سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دے گی،

اردو کی عالمگیری کا یہ تازہ ثبوت بہت دلچسپ ہے کہ تاشقند کے مسلمانوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اردو میں ایڈریس پیش کیا، انھوں نے اردو ہی میں اس کا جواب دیا، اور مزید ستم یہ کیا کہ مجمع کو السلام علیکم سے خطاب کیا، جس کا جواب وعلیکم السلام سے ملا، معلوم نہیں اس خبر سے اردو زبان اور اسلامی کلچر کے مخالفین کے دلوں پر کیا گذری ہوگی، تعجب ہے کہ ہندوستانی پریس نے بغیر کسی ترمیم کے اس خبر کو شائع کس طرح کر دیا،

درحقیقت ان تمام اسلامی ملکوں میں جن کا ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ سابقہ رہتا ہے، اردو پوری طرح روشناس ہے، بلکہ ان میں عربی اور فارسی کے بعد اردو ہی کا درجہ ہے، عرب، عراق، ایران اور مصر و شام وغیرہ میں ہزاروں ہندوستانی مسلمان حج و زیارت اور حصول تعلیم کے لیے جاتے ہیں، بہت سے ہندوستانی تاجر تجارت کے سلسلہ میں رہتے ہیں، وسط ایشیا کے سیکڑوں طالب علم ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں حصول تعلیم کے لیے آتے ہیں، جو اردو کا تحفہ اپنے ساتھ لیجاتے ہیں، اس لیے اردو ان ملکوں میں اجنبی نہیں ہے، بلکہ وہاں اردو کی تعلیم بھی ہوتی ہے، اس لیے اردو اسلامی دنیا سے ربط و تعلق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، مگر جو لوگ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق اردو کو مٹانے کے درپے ہیں، ان کے لیے سارے دلائل بے کار ہیں،

اس صوبہ کی حکومت نے بعد از خرابی بسیار اردو کو جو تعلیمی حقوق دیے ہیں، وہ بھی شعبۂ تعلیم

کی اردو دشمنی کی بنا پر پورے نہیں ہونے پاتے۔ اس سے فائدہ اٹھانے کی صرف یہ صورت ہے کہ خود اردو کے حامی اس کے لیے عملی جد و جہد کریں، اس لیے صوبائی انجمن ترقی اردو نے اسکولوں میں اردو تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے داخلہ کی مہم شروع کی ہے، اگر اس کے لیے پوری کوشش کی جائے تو کسی نہ کسی حد تک اردو کو اس کا حق ضرور مل جائے گا، اس لیے اردو علاقائی زبان کی تحریک کی طرح اس مہم کو بھی کامیاب بنانا اردو کے حامیوں کا فرض ہے، اس مہینہ سے نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا ہے، اس لیے اصل کوشش کا یہی وقت ہے، ورنہ پھر ایک سال کے لیے موقع جاتا رہے گا،

اس سے پہلے معارف میں اس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کی تجارتی سہولت کی فراہمی کے لیے لاہور اور کراچی گئے تھے، ناظرین کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ حکومت پاکستان نے اس کے لیے پچاس ہزار کا لائسنس دینا منظور کیا ہے، اس خصوصی رعایت کے لیے دار المصنفین گورنر جنرل پاکستان کا خاص طور سے شکر گذار ہے، اور اس سلسلہ میں ان کے پرائیوٹ سکریٹری قدرت اللہ شہاب صاحب، فنانس سکریٹری ممتاز حسن صاحب، حکومت سندھ کے ہوم سکریٹری نیاز احمد صاحب اور ہندوستان کے ہائی کمشنر مقیم کراچی مسٹر سی، سی ڈیسائی کا بھی ممنون ہے، جنھوں نے اس کام میں بڑی دلچسپی لی، حسن اتفاق سے اس زمانہ میں دار المصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کراچی میں گورنر جنرل کے مہمان تھے، اس لیے ان سے اس کام میں بڑی مدد ملی، اگر یہ لائسنس مستقل ہو گیا تو انشاء اللہ بڑی حد تک دار المصنفین کی مالی دشواریاں دور ہو جائینگی۔

مولانا حاجی مسعود علی صاحب ایک مرتبہ فریضۂ حج سے سبکدوش ہو چکے ہیں، اس سال حکومت ہند کی جانب سے حجاج کے وفد کے رکن کی حیثیت سے حج بیت اللہ کیلیے تشریف لیگئے ہیں، اللہ تعالیٰ حج مبرور عطا فرمائے اور مع الخیر واپس لائے۔

مقالات

مینا بازار

از ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

(۲)

(سلسلہ کے لیے دیکھیے معارف اپریل ۱۹۵۵ء)

محاکمہ | مصنف مینا بازار کے متعلق جو اختلاف تھے، ان کو میں نے تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اب وہ دلائل بیان کیے جائیں گے جن کی بنا پر کسی ایک مصنف کے موافق فیصلہ کیا جا سکے میرے خیال میں حسب ذیل قرائن ایسے ہیں جن کی بنا پر مینا بازار وغیرہ کو ظہوری کی تصنیف ماننے میں سخت تامل ہے۔

(۱) ظہوری شمالی ہندوستان کبھی نہیں آیا تھا فیضی نے اس کے بلانے کی بڑی کوشش کی؛ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ فیضی کے ہمراہ لاہور آنا بھی چاہتا تھا[۱]، مگر برہان نظام شاہ نے آنے نہیں دیا، فیضی کو ظہوری سے جو قلبی تعلق تھا، اور اس کو شمالی ہندوستان بلانے میں جو دلی مسرت اسے تھی، اس کا اندازہ فیضی کے ایک خط سے ہوگا، جس کے چند جملے درج[۲] ذیل ہیں؛

حضرت مولوی در اشتیاق شما سوختم، چوں یاد شما می کنم دود از نہاد بر می آید۔ یارب

[۱] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۶۹ [۲] رقعات فیضی ص ۸۵

امکانِ ملاقات نیست ، دعنی یکبار نوشتید کہ می خواہم جوگی شدہ بیایم ، خاطر گل گل شگفت !
کاش کہ بیائید ۔ بہ آمدن شما می ارزیم ۔ دل ما را مجروح فراق خود پسندید ، چہ شرح دہم کہ
بہ یاد شما چوں گزارم ، حضرت بادشاہ شمارا یاد می کند ۔ الخ

وہ ۱۰۰۳ھ تک احمد نگر میں رہا ۔ ۱۰۰۴ھ میں بیجاپور چلا گیا ، اور مسلسل ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کی مدح کرتا رہا ۔ ایسے حالات میں یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اکبر یا جہانگیر کے قلعے کے زنانہ بازار سے ایسی دلچسپی رہی ہو کہ اس نے بغیر دیکھے اس بازار کی تفریحات پر ایک دلچسپ کتابچہ لکھ دیا ۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ایسے قرائن موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اکبری عہد کے بعد لکھی گئی ۔ ظہوری ، اکبر سے زیادہ وابستہ تھا ، چنانچہ اس کا ایک قصیدہ بادشاہ کی مدح میں بھی پایا جاتا ہے ، اور اس کے دربار کے متعدد امرا کی مدح میں اس کی نظمیں موجود ہیں ، لیکن جہانگیر سے اس کے تعلقات کم معلوم ہوتے ہیں ، اس کی مدح میں کوئی قصیدہ نہ لکھنا اس قیاس کی تائید کرتا ہے ، ایسے حالات میں عہد جہانگیری کے زنانہ بازار سے ظہوری کی وابستگی قرین قیاس نہیں ۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مصنف نے زنانہ بازار کا بیان اس طرح کیا ہے کہ گویا اس نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ ذیل کے جملے ملاحظہ ہوں ،

زنانہ بازارے ...... ترتیب یافتہ (ص ۲) عزم سیر ایں نو آئیں ...... بادب می آیند (ایضاً)
خوبی ایں بازار سراپا نگار دیدہ (ص۳) دریں بازار بے نظیر (ایضاً) ثنا پردازی ایں شہر
لطافت بہر (ص ۲۴) نفوس اوصاف ایں عشرہ کاملہ بر صحیفۂ قدر وجلال ستم (ص ۳۴)

جب تک کوئی مضبوط قرینہ ایسا نہ ہوگا جس سے ظہوری کی دلچسپی شمالی ہندوستان کے قلعے وغیرہ سے ثابت ہو سکے ، اس وقت تک خواہ مخواہ کسی کنی شاعر کے سر اس بازار کی تصنیف کا

سہرا نہیں باندھا جا سکتا،

(۲) کلیات ظہوری کے کسی مخطوطے میں مینا بازار اور پنج رقعہ شامل نہیں، اس کلیات کے سات مخطوطے معلوم ہیں، جن میں نسخہ رامپور ۱۰۴۲ھ کا مخطوطہ ہے، اس میں ظہوری کی نثری تصنیف میں تینوں دیباچے یعنی سہ نثر اور رقعہ بنام فیضی منقول ہیں (ملاحظہ ہو ظہوری ص ۳۱۰) بانکی پور کے دو نسخوں میں سے ایک میں پنج رقعہ اور مینا بازار شامل ہیں لیکن اس میں ورق ۴۲۱-۴۲۴ (جو صرف اتنے حصوں کو حاوی ہے) اصل کاتب کے بجائے ایک شخص مسمی ولی محمد نے ۱۲۰۹ھ میں شامل کر دیا ہے (ص ۳۱۳ بعد) جبکہ اصل نسخہ اس کے قبل کا ترقیمہ ہے۔ امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ کا نسخہ عہد آصفی کے مشہور خطاط حافظ نور اللہ کے قلم کا ہے، اس میں تینوں دیباچے موجود ہیں، مگر اور کسی نثری تصنیف کا ذکر نہیں، اسی طرح علی گڈھ کی لٹن لائبریری میں کلیات کا جو نسخہ ہے، اس میں مینا بازار وغیرہ نہیں ہیں، بوڈلین میں دو مخطوطے[۱] پائے جاتے ہیں، ان میں پہلے کی کتابت ۱۰۶۲ھ کی ہے، اس کا کاتب ابن محمد عبد القادر ہے اور اس کے اجزا حسب ذیل ہیں:-

دیباچۂ نورس، دیباچۂ گلزار ابراہیم، دیباچۂ خوان خلیل، ترجیع بند، قصائد، ساقی نامہ اور رباعیات، دوسرا مخطوطہ ۱۲۳۹ھ کا لکھا ہوا ہے، جو حسب ذیل اجزا پر حاوی ہے،

دیباچۂ گلزار ابراہیم و خوان خلیل۔ رقعہ بنام فیضی۔ ساقی نامہ، مثنوی، غزلیات و رباعیات۔

کلیاتِ ظہوری کے ان نسخوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سہ نثر سب میں پائی جاتی ہے، اور رقعہ بنام فیضی بھی بعض میں موجود ہے، جس میں ظہوری کا تخلص صراحۃً موجود ہے، اور مآثر رحیمی[۲] وغیرہ میں اس رقعہ کی تفصیل بھی درج ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کوئی شبہہ نہیں ہو سکتا، لیکن مینا بازار وغیرہ نہ ان نسخوں میں موجود ہیں، نہ ان میں ظہوری کا تخلص آیا ہے،

---

[۱] فہرست بادلے ج ۱ ص ۷۶۲ بعد [۲] ج ۳ ص ۳۹۶

نہ دکن سے متعلق ہے اور نہ کسی تاریخ سے اس کی شہادت بہم پہنچتی ہے۔ اس لیے ان کا شمار ظہوری کے مصنفات میں نہیں ہو سکتا۔

(۳) ملک قمی ظہوری کا خسر تھا، دونوں ۱۵[1] سال تک احمد نگر میں ساتھ ساتھ رہے، پھر بیجاپور میں آخر حیات تک ہمدم و ہمراز رہے۔ دونوں نے مشترک کتابیں لکھیں، اس کے علاوہ متعدد چیزیں ایک ہی نام سے لکھیں، ظہوری نے جب ابراہیم عادل شاہ کی کتاب نورس کا دیباچہ لکھا تو ملک نے بھی اس کے مقابلے میں ایک نثر لکھی، چنانچہ خود لکھتا ہے[2]:

از ہم کرد نکتہ پرور نہیاز و آتش طعنہ در زبانہ کہ ملک چون ظہوری مبنی بر خطبۂ کتاب نورس

. . . . نوشتہ متین نتوانست کہ سست باوجود نسبت یگانگی ..... خجلت کردنی بہ کجی برمی داشت

و غیرت بر دل رسید ...... لاجرم سطرے نثر و نقشے نظم ..... از گریبان دل بر داد۔

یہ دیباچہ ملک کے کلیات کے دونوں نسخوں یعنی نسخۂ رام پور اور نسخۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں پایا جاتا ہے۔ جب یہ کام ختم ہو چکا تو دونوں شاعروں نے گلزار ابراہیم[3] ایک بیاض تیار کی، اور پھر اس کا الگ الگ دیباچہ لکھا، ظہوری کا دیباچہ سہ نثر میں نثر دوم ہے اور ملک کا اس کے کلیات کے دونوں نسخوں میں محفوظ ہے، پھر دونوں نے خوان خلیل[4] ایک دوسری بیاض لکھی اور اس پر الگ الگ دیباچے لکھے، ظہوری کا سہ نثر میں نثر سوم اور ملک کا اس کے کلیات کے نسخۂ رام پور میں جزو اول ہے۔

جب ملک نے ظہوری کی سہ نثر کا جواب لکھا تو اس کی اور نثروں کا بھی جواب لکھنا قرین قیاس ہے، خصوصاً مینا بازار تو ایسی تھی کہ اس کے مقابلہ میں ملک ضرور کوئی نثر لکھتا، لیکن اسکے کلیات

---

۱ سنہ ۱۰۰۸ تا ۱۰۲۴ھ ۲ کلیات ملک (نسخۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی) ورق ۳۲۵ الف۔

۳، ۴ ملاحظہ ہو تحقیقی مطالعے ص ۸۹ بعد

میں اس طرح کی کوئی چیز نہیں، اس لیے اس سے اس قیاس کو بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مینا بازار وغیرہ ظہوری کی تصنیفات میں شامل نہیں تھیں،

(۳) ظہوری کی سہ نثر کے طرز میں مختلف لوگوں نے نثریں لکھیں۔ بعضوں نے تو اسی نام سے لکھیں۔ مثلاً زمحری نے سہ نثر زمحری اور ملکاپوری[1] نے سہ نثر آصفی[2] لکھی اور نام کسی نے ظہوری سے لیا، شمس نے بہار عظیم[3] صرف نثر دوم یعنی دیباچہ گلزار ابراہیم کے جواب میں لکھا، اور جس طرح ظہوری نے اپنے ممدوح کی توصیفیں کی ہیں اسی طرح بہار عظیم میں بھی مولف نے اپنے ممدوح کی خوبیاں بیان کی ہیں، نثر خیالی[4] بھی نثر دوم کی نقل ہے۔

ان کے علاوہ بعض لوگوں نے ہو بہو سہ نثر کے طرز کا چربہ اتارنے کی کوشش کی۔ ان میں محمد علی ماہر خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس نے گل اورنگ نام کی ایک نثر اورنگ زیب کی مدح میں لکھی اور اس میں ظہوری کا طرز پیش نظر تھا، سرخوش کلمات الشعرا[5] میں لکھتا ہے:

نثر مثل ظہوری با پُر مضامین تازہ نوشتہ اند

محمد علی ماہر سرخوش کے استاد تھے، چونکہ سرخوش نے ظہوری کی نثری تصنیف میں صرف سہ نثر کا ذکر کیا ہے، اس لیے "مثل ظہوری" سے صرف سہ نثر کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

ابو طیب ولا نے طرز ظہوری کا چربہ اتارا ہے، اور چونکہ اس کے راوی عبد الجبار صاحب محبوب الزمن[6] ہیں جنھوں نے مینا بازار وغیرہ کو ظہوری کی تصنیف نہیں بتایا ہے، اس لیے طرز

---

[1] و [2] یہ دونوں طبع ہو چکی ہیں [3] اس کا ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے کل ۱۳ ورق پر مشتمل ہے، خاتمہ میں لکھتا ہے: "چہ عجب اگر ظہوری اہل بہار عظیم بیند ... بہار الفت گلزار ابراہیم از دل برکندہ ثمر زمینہ میوہ کہنہ انگاشتہ، دست از مائدۂ خوان خلیل شستہ۔" اس مولف کے نزدیک بھی ظہوری کے نثری کلام سے مینا بازار وغیرہ خارج تھی [4] یہ کتاب ۱۲۵۸ھ میں لکھی گئی [5] مصنف فخر الحسن نے نواب صدیق حسن کی مدح میں لکھا ہے [6] ص ۱۲ ص ۱۸

وری سے مراد صرف طرز سہ نثر ہے، ولا کی نثر بجواب ظہوری جس کا نام "نثر ولا" ہے، مدراس یونیورسٹی

میں موجود ہے۔

ملا طغرا مشہدی ظہوری کے طرز سے بہت متاثر تھا۔ ابراہیم خلیل نے صحف ابراہیم[1] میں لکھا ہے،

در بعضے رسائل قدم بہ قدم ملا ظہوری راہ می رود، اما سخن شناسان آگاہ می دانند

کہ نزہت بیان و شیرینی ادا خلعتے ست کہ بر قامت ملا ظہوری دوختہ اند۔

چونکہ ابراہیم خلیل نے مینا بازار کو بھی ظہوری کی طرف منسوب کیا ہے، اس لیے صاف طور پر پتہ نہیں چلتا کہ ملا طغرا نے کس کتاب کی پیروی کی ہے۔ مگر ذیل کی مثال سے واضح ہوگا کہ جس طرح ظہوری نے دیباچۂ نورس میں موسیقی کے لوازم کا ذکر کرکے صنعت براعت استہلال پیدا کی ہے، اسی طرح طغرا نے طنبور وغیرہ کے استعمال سے دیباچۂ نورس[2] کی تقلید کی ہے۔

طنبور سے بہ رنگ نشۂ طنبور رہ کاسہ شماری شراب سرور و قانونے بہ جوے تار قانون

دو آبیاری باغ نغمہ داؤد موسیقار سے بہ سرپنجۂ موسیقار در پاپالش رنگ گل ترانۂ تازہ، کمانچہ

بہ تاب کیسوے کمانچہ در آرایش پیچ مرغولہ مانند آوازہ۔ الخ

ترجمان نے ظہوری کے دیباچوں کے طرز کی اتباع کی ہے، مؤلف جام جہاں نما

نگار ہے[5]

"تصویر خطبۂ شاہ جہاں را بہ طرز دیباچہ ہاے ملا ظہوری بسیار رنگین و باآب و تاب نوشتہ"

ملا سے شیدا بھی ظہوری کے طرز سے بہت متاثر تھا، اس نے ساقی نامۂ ظہوری کا دیباچہ لکھا تھا جو میں نے پڑھا تھا اس میں دیباچۂ نورس کی شان پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔[6]

---

[1] صحف ابراہیم ورق ۷۵ [2] فردوسیۂ طغرا ص ۹ – ۱۰ [3] ورق ۱ (ج ۲) [4] قلمی بیاض

رانکی پور ورق ۱۰۱ – ۱۰۳

پیمانہ کشان مصطبۂ عرفان از جوش خم کدۂ حمد نشاے بخشی سرخوش اند کہ ذوق کیفیت رسائی شوقش زبان صراحی را از دہان جام بہ کام رسانیدہ و بہ تلقین لطف از لیش از جاشنی بلند ذکر خفی و جلی نے بہ نوا دمے بہ نشاء دو بالا رسیدہ ہشور افزاے کہ از بیخودی بادۂ ہوش ربا ے عشقش مست و مستور و سرخوش و مخمور ہاے و ہوے مستانہ می زنند و بہ ہواے صفوت کدۂ خلوت قربش صافی نوشان خم خانۂ افلاک باد ردے کشان عالم آب خاک پیمانہ می زنند۔ الخ

ان تفصیلات سے یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ظہوری کے مقلدین نے صرف سہ نثر کا چربہ اتارنے کی کوشش کی جس سے یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک مینا بازار کا طرز ظہوری کے انداز سے متفاوت تھا، مجھے تلاش و جستجو کے باوجود کسی ایسی کتاب کا پتہ چل نہ سکا جو مینا بازار کے جواب میں لکھی گئی ہو۔

(۴) مینا بازار کے مطبوعہ نسخے ارادت خان کی طرف منسوب ہیں، کم از کم چار مطبعے محمدی، مصطفائی، خدائی اور نول کشوری کے نسخے میرے پیش نظر ہیں، جن میں داغنح کو مصنف بتایا گیا ہے، اسی طرح بیشتر مخطوطات داغنح ہی کے نام سے ملتے ہیں۔

(۵) کیا یہ عجیب بات نہیں کہ گیارہویں صدی کا لکھا ہوا کوئی نسخہ دنیا کے کسی کتاب خانے میں نہیں پایا جاتا، ظہوری کی وفات ۱۰۲۵ھ میں ہوئی ہے، اس اعتبار سے اگر مینا بازار ظہوری کی ہوتی تو اس سنہ کے بہت قبل کی تصنیف ہوتی، ایسی حالت میں گیارہویں صدی کے آخر تک اس کے کسی نسخے کا نہ پایا جانا، اس کا ظہوری کی تصنیف ہونا بالکل مشکوک کر دیتا ہے۔

(۶) مینا بازار کو ظہوری کی طرف منسوب کرنے والے مصنفین میں خان آرزو کے علاوہ حسب ذیل فضلا ہیں، ٹیک چند بہار، علی ابراہیم خان خلیل، عبد الرزاق سورتی، غیاث الدین صہبائی، محمد بادشاہ، ان میں سے بہار، غیاث الدین اور محمد بادشاہ لغت نویس ہیں، ان کا بیان

کسی تحقیق کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ جو بات مشہور ہوتی ہے، لغت نویس اسے اپنے یہاں عموماً درج کر لیا کرتے ہیں، کیونکہ ان قدیم و جدید مصنفین کی تعداد جن کو ان کے لغت میں جگہ ملی ہے، کئی کئی ہزار تک ہوتی ہے، اور ایک مصنف خواہ کتنا ہی فاضل کیوں نہ ہو کئی ہزار مصنفین کے ہر واقعۂ زندگی کی تحقیق کیونکر کر سکتا ہے، یہ ضرور ہے کہ بعض واقعات میں وہ تلاش و جستجو بھی کر لیتا ہوگا، لیکن سب کے متعلق یہی خوش عقیدگی نہایت مضحکہ خیز ہے، اس لیے ان کے انتساب پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ٹیک چند بہار کی فضیلت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، اور اس کی کتاب بہار عجم کی شہرت و مقبولیت سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن ظہوری کے بارے میں اسے بھی دھوکا ہوا، چنانچہ انگشت بر در زدن کی تشریح کے ضمن میں یہ شعر پیش کرتا ہے۔[۱]

بہ کہ شاید باد اگر سر زند — پے رخصت انگشت بر در زند

دور کار قدیم کے ضمن کے چند شعروں کو "نورس پور" سے متعلق بتلاتا ہے،[۲] جو صحیح نہیں، یہ اشعار ساقی نامۂ ظہوری میں "تعریف شہر نو"[۳] کے ذیل میں آئے ہیں، "شہر نو" برہان نظام شاہ کا تعمیر کردہ تھا،[۴] اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کی داغ بیل برہان ثانی کی وفات کے چھ سال بعد پڑی، بظاہر مولف کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہوئی کہ ظہوری نے نورس پور کے بازار کی توصیف کے ضمن میں جو شعر درج کیے ہیں،[۵] وہ ساقی نامہ کے ہیں، مگر ان آٹھ اشعار میں بہار عجم میں نقل کیے ہوئے دونوں شعروں میں سے کوئی شعر بھی نہیں ہے، میرے پیش نظر نثر کے مطبوعہ نسخوں کے علاوہ پانچ قدیم قلمی نسخے بھی ہیں۔

اس سے نہ صاحب بہار عجم کی تنقیص مقصود ہے، اور نہ کسی اور لغت نویس کی، بلکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ کئی ہزار شاعروں کے کلام سے استناد پیش کرنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ سب کی چیزوں کی تحقیق کر کے لکھے۔

---

[۱] ج ۱ ص ۰۰ ... ج ۲ ص ۰۰ ... ص ۰۰ ... اسکا نام برہان آباد تھا، ملاحظہ ہو فرشتہ ج ۲ ص ۱۵۹ ... سہ نثر ص ۷۶

ابراہیم خلیل اہم مصنف ہے، مگر اس سے بھی ظہوری کی تصنیف کے متعلق بڑی سخت غلطی ہوئی ہے، اس نے خلاصۃ الکلام میں[1] ملک قمی کی منبع الانہار کے کئی سو شعر ظہوری کے ذیل میں نقل کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ نظم ملک کی نہیں بلکہ ظہوری کی ہے، لیکن میں نے متعدد دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ منبع الانہار ملک ہی کی ایک مثنوی ہے، جو مخزن اسرار کے جواب میں نظم کی گئی تھی، خود اس نظم میں سیکڑوں ایسے اشعار ہیں جن میں ملک کا تخلص صاف طور پر موجود ہے، اس لیے اس مصنف کی ہر بات اٹل نہیں ہوسکتی، غلطی کا امکان رہتا ہے، اور اس غلطی سے ان کی فضیلت پر حرف نہیں آتا۔

مولانا صہبائی کی علمی فضیلت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، ان کو شرح نویسی میں بڑا کمال حاصل تھا، مگر ان کی تحقیق آجکل کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی، اس لیے ظہوری کے سلسلے میں ان سے بھی کئی غلطیاں ہوئیں، مثلاً وہ سہ نثر کے الگ الگ حصوں کو دیباچہ نہیں کہتے، اس کے علاوہ، ظہوری کے تخلص کے سلسلے میں ان کا بیان بے حد دلچسپ ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔[2]

بعضے گویند کہ پیشتر تخلص مصنف خفائی بودہ واز وقتیکہ درخدمت عادل شاہ مشرف شدہ ظہوری یافتہ۔

اگرچہ وہ اس قول کو اپنا قول نہیں بتلاتے ہیں، مگر اس کو تسلیم کرنے کی طرف کچھ مائل ضرور ہیں لیکن بادی النظر میں یہ بیان سراسر غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ بیجاپور کے قبل کے ہزاروں اشعار ایسے ہیں جن میں ظہوری تخلص موجود ہے، اس کے علاوہ فیضی کی وہ تحریریں موجود ہیں جو ظہوری کے ورود بیجاپور کے قبل کی ہیں، بدایونی ظہوری کے بیجاپور جانے سے قبل سفر آخرت اختیار کرچکا ہے، مگر اس نے ظہوری کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے، اسی طرح امین احمد رازی نے ظہوری کے ورود

---

[1] ورق ۱۳۸ ب ببعد۔ اس سلسلے کی بحث ملاحظہ ہو، ظہوری ص ۳۰۳ ببعد [2] شرح سہ نثر ظہوری صد ۱۹۹

بیجاپور کا حال ہفت اقلیم میں لکھا ہے، ان واقعات کے بعد صہبائی کے بیان کی کیا حیثیت رہجاتی ہے، صہبائی کا وہ قول جس میں وہ مینا بازار کو ظہوری کی طرف منسوب کرتے ہیں نقل کیا جا چکا ہے، اور بہار عجم میں مینا بازار کے ساتھ ظہوری کا نام لکھا جانا، ان تمام قدیم و جدید مصنفین کے خیال کی تردید کرتا ہے جو اسے ارادت خاں واضح کی بتلاتے ہیں، اس لیے میرے خیال میں یہ فیصلہ تحقیق کے معیار پر پورا نہیں اترتا،

مختصر یہ کہ جن مصنفین نے ان کتابوں کو ظہوری کی طرف منسوب کیا ہے، ان میں سے بعض سے خود ظہوری کی متعلق غلطیاں ہوئی ہیں۔ اسلیے ان کے قول کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیجا سکتی۔ اس کے برخلاف مینا بازار کو ظہوری کی تصنیف نہ ماننے والوں میں قدیم تذکرہ نویسوں کے علاوہ چند محقق بھی شامل ہیں، جنھوں نے معقول وجوہ کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کیا ہے، خصوصاً مرزا قتیل اور غالب، اگرچہ ان کے اقوال بھی غلطی سے پاک نہیں ہیں لیکن انھوں نے معقول دلائل پیش کیے ہیں، اور ان کی ہمنوا قدیم مصنفین کی بھی ایک جماعت ہے، اس لیے ان کا قول زیادہ وقیع ہے۔

(۷) ظہوری ایسے بازار سے واقف تھا جس کی تفصیل مینا بازار پر صادق نہیں آتی، احمد نگر کے ایک بازار کا ذکر ساقی نامہ میں پایا جاتا ہے، جس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بازار میں بھی عورتیں ہوتی تھیں، مگر عام طور سے صنعت گروں کی دکانیں ہوتی تھیں، جن میں کمان گر، تیر گر، شمشیر گر، صیقلگر اور صباغ خصوصیت کے ساتھ ذکر ہوئے ہیں، پھر بزاز، عطار، زرگر اور جواہر فروش کی دکانوں کا ذکر ملتا ہے، مینا بازار میں بزاز، عطار، اور جوہری کے علاوہ سبزی فروش، حلوائی، تمباکو فروش، تنبولی، میوہ فروش، گل فروش کا بیان ہے، ان دونوں کے انداز بیان، انتخاب الفاظ، تشبیہ و استعارہ وغیرہ میں بڑا فرق ہے، پہلے ساقی نامے[1] کے جستہ جستہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

---

[1] ۱۲۱ بعد

چہ گویم ز آئین بازارہا   نہ بازارہا تازہ گلزارہا
بہ طول مقالات شیدائیاں   بہ عرض خیالاتِ سودائیاں
زبس زیور و زیب رشک سپہر   بروج دکاکیں پر از ماہ و مہر
برآوردہ در چارسو عشوہ جوش   بگرداب صد کشتی صبر و ہوش
تماشا یکے و ہزار آرزو   ز ہنگامہ بندانِ ایں چارسو
پر از وسعتش چار رکنِ جہاں   گرو بردہ از چار فصل زماں
غلط چارسو بر زبانم گزشت   کہ راہش چو راہ بہشت است ہشت
کہ دیدہ است مرکز بدیں دستگاہ   کہ پرکار دورش ندارد نگاہ
نمی داشت گر آسماں ایں زمیں   نمی داشت انگشترینش نگیں
زدہ حلقہ بر دور او کارواں   متاع جہاں داردش درمیاں
بروے ہم افتادہ کالا ورد   میاں گیری کرد سودا ورد
بصد زیب و زیور عروسِ ہنر   ز دکان صنعت گراں جلوہ گر
کمانگر خم ابروے دلبراں   نشانیدہ در خانہاے کماں
خدنگ آنچناں تیرگر کردہ ساز   کہ سوفار در زہ دہن کردہ باز
ز شمشیرگر کردہ بُرّاں حسام   در انگارکے کار خصماں تمام
ز صیقل گراں عکس آئینہ ہا   دم صبحدم چیدہ در سینہ ہا
ز صباغ کز باغ گیرد خراج   تلون تصرف کناں در مزاج
ز بزاز گل کردہ گلزار سود   دوزد گرم گردیدہ بازار سود
کشادہ خز و پرنیاں تنگ تنگ   ز ہر رنگ بر روے ہم رنگ رنگ

زعطّار آں نافہ بند شمال کہ در چیں خورد پیچ نافہ غزال
ززبیں دکانچۂ زرگری مرصع نگہ دیدۂ مشتری
چناں نوشد از زرگراں قدیم کہ شد یارۂ زہرہ کار قدیم
جواہر فروشاں بکنج دکاں ز بس مایہ تل کردہ دریا دکاں
زمرد ز بہر نگی چتر شاہ برافعی خراماں فرو بستہ راہ

بیجاپور میں بھی بازار لگتا تھا، اور اسد بیگ نے اس بازار کے جو چشم دید حالات لکھے ہیں، وہ یہ ہیں[1]:

بازار بہت وسیع تھا، ۳۰ گز چوڑا اور تقریباً دو کوس لمبا ہوگا، ہر دکان کے سامنے ایک خوبصورت ہرا بھرا درخت تھا، اور تمام بازار نہایت صاف ستھرا تھا، اس میں ایسے نفائس تھے جو کسی دوسرے شہر میں دیکھے گئے نہ سنے، اس میں بزاز، جواہر فروش، صنعت گر، شراب فروش، نانبائی، میوہ فروش کی دکانیں تھیں، پورے بازار سے روشناس کرانے کے لیے ایک حصہ کا تفصیلی بیان دیا جاتا ہے،

جواہر فروش کی دکان میں ہر قسم کے جواہرات موجود تھے، انواع واقسام کی چیزیں از قسم خنجر، چاقو، آئینہ، گلوبند اور رنگ برنگ کی چڑیاں توتے، فاختے، مور وغیرہ قیمتی جواہرات سے مرصع قرینے سے الماریوں اور خانوں میں تہ بہ تہ سجی ہوئی تھیں، اس دکان کی بغل میں نانبائی کی دکان تھی، اس میں ہر قسم کے کھانے قرینے سے لگے ہوئے تھے، کتان فروش کی دکان میں رنگ برنگ کے کپڑے الماریوں میں بڑے سلیقہ سے چنے ہوئے تھے، اس کے بعد بزاز کی دکان تھی.........

---

[1] وقائع اسد بیگ، الیٹ ج ۶ ص ۱۶۳-۱۶۴

اس کی بغل میں عطار کی دکان تھی، جس میں طرح طرح کے چینی کے برتن، قیمتی بلور کی بوتلیں، شیشیاں اور پیالے عمدہ قسم کے عطر سے پُر الماریوں میں سلیقہ سے سجے ہوئے تھے، دکان کے سامنے بڑے بڑے مرتبانوں میں دو آتشہ عرقیات تھے۔ اس دکان سے متصل میوہ فروش کی دکان تھی، جس میں ہر قسم کے میوے اور مٹھائیاں از قسم پستہ، اخروٹ، مصری، بادام وغیرہ بھری ہوئی تھیں، دوسری طرف شراب فروش کی دکان تھی، جہاں گانے اور ناچنے والے (مرد) اور خوبصورت عورتیں جواہرات سے لدی ہوئی موجود رہتیں، اور ہر قسم کے کھیل تماشے دکھانے کے لیے آمادہ رہتیں، قصہ کوتاہ، تمام بازار میں شراب، حسن، ناچ، تفریح، خوشبو، جواہرات، اشیاء خوردنی کی فراوانی تھی ..... غالباً دنیا میں کوئی مقام اس سے زیادہ دلفریب نظارہ پیش نہیں کر سکتا۔

بیجاپور کے اس بازار میں شمالی ہند کے زنانہ بازار کی طرح گلفروش، تنبولی اور سبزی فروش کی دوکانوں کا نہ ہونا بتلاتا ہے کہ زنانہ بازار کا مولف ظہوری سے مختلف ہے، جب احمد نگر اور بیجاپور کے بازار میں تمباکو فروش وغیرہ کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، تو ظہوری نے شمالی ہند کے بازار کے لیے تمباکو فروش، حلوائی اور تنبولی کا شمول کیوں ضروری قرار دیا،

نورس پور کے بازار کے بارہ میں سہ نثر میں چند مختصر جملے ہیں،[1] اور اس کے بعد ساقی نامے کے آٹھ شعر نقل کیے گئے ہیں، مگر ان میں اور مینا بازار میں کسی خاص قسم کی نسبت ظاہر نہیں ہوتی،

(۸) ظہوری کی تینوں نثریں جو تین دیباچوں پر مشتمل ہیں، بڑی وقفے کے درمیان لکھی گئی ہیں، دیباچۂ نورس سب سے متقدم ہے، کیونکہ اس کا ذکر دیباچۂ گلزار ابراہیم میں موجود ہے، اس کے بعد دیباچۂ گلزار ابراہیم لکھا گیا، چنانچہ اس کا ذکر دیباچۂ خوان خلیل (نثر سوم) میں پایا جاتا ہے،

---

[1] صفحہ ۷۶

ظہوری ۱۰۲۵ھ میں بیجاپور گیا ہے۔ اور دیباچۂ گلزار ابراہیم میں بادشاہ کی عمر تیسرے عشرے میں بتلائی گئی ہے، اس کی پیدائش ۹۷۹ھ میں ہوئی، اس حساب سے اس دیباچہ کی تکمیل ۱۰۰۸ھ کے کچھ قبل ہوئی ہوگی، اور اس سنہ سے بہت پہلے دیباچہ نورس لکھا گیا ہوگا، چند قرائن کی بنا پر دیباچۂ نورس کا سنہ ۱۰۰۵ھ اور دوسرے کا ۱۰۰۸ھ متعین ہوتا ہے، تیسرے دیباچے میں ظہوری نے اپنی عمر ۷۰ سال بتلائی ہے، چونکہ اس کی پیدائش ۹۴۴ھ کے قریب ہوئی تھی، اس لیے اس دیباچہ کو ۱۰۱۴ھ[1] کے قریب کا سمجھنا چاہیے،

ابتدا میں عرض کیا جاچکا ہے کہ مینا بازار عہد اکبری کے خاتمے کے بعد ہی لکھی جاسکی ہوگی، یعنی اس کتاب کی تکمیل ۱۰۱۵ھ کے قبل نہیں ہوسکتی، اگر یہ ظہوری کی تصنیف ہوتی تو یہ دیباچۂ خوان خلیل کے کچھ ہی زمانے کے بعد کی ہوتی،

ہم عرض کرچکے ہیں کہ ظہوری نے دیباچۂ خوان خلیل میں نورسپور کے بازار کے ضمن میں ساقی نامے کے وہ اشعار درج کئے ہیں، جو برہان نظام کے نو تعمیر شہر کے موقع پر لکھے گئے تھے، ساقی نامے کے متعدد جگہ کے اشعار اس دیباچے میں مختلف جگہوں پر نقل کر دیے گئے ہیں، مثلاً صفحہ ۶۵ کے ۴ شعر "شہ دو است الخ" ساقی نامے کے صفحہ ۱۱۸ سے لیے گئے ہیں۔ صفحہ ۶۶ کے ۵ شعر "ندارد غم الخ" صفحہ ۱۱۱-۱۱۴ سے ماخوذ ہیں، صفحہ ۶۷ کے ۱۱ شعر صفحہ ۱۲۱-۱۲۳ سے منقول ہیں۔ پہلا شعر البتہ کچھ بدل دیا گیا ہے، صفحہ ۶۸ کے ۴ شعر صفحہ ۱۱۲ سے لیے گئے ہیں، صفحہ ۶۹ کے پہلے تین شعر بھی صفحہ ۱۱۲ کے ہیں، اور دوسرے حصے کے تین شعروں میں سے پہلا صفحہ ۱۱۲ کا اور دوسرے تیسرے صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰ کے ہیں۔ صفحہ ۷۰ کے ۱۰ شعر صفحہ ۱۱۹-۱۲۰ کے ہیں۔ صفحہ ۷۷ پر ملک قمی کی تعریف کے ۱۲ شعر ساقی نامے میں لکھے جاچکے تھے (ملاحظہ ہو ۱۲۸-۱۲۹) میں ۷۹ کے دو شعر میں سے ایک شعر صفحہ ۱۲۷ پر ہے، ص ۷۹-۸۰ کے پانچ شعر صفحہ ۱۱۸ کے ہیں، صفحہ ۸۱ کی مثنوی ساقی نامہ کے صفحہ ۱۱۳ پر آئی ہے۔ صفحہ ۸۲ کے سب شعر ساقی نامے

---

[1] تحقیقی مطالعے ص ۸۴ و ۱۱۷ وغیرہ ۱

کے ہیں، ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۰-۱۳۱، ۲۱۸، ۱۴۶ - ۱۴۷، (گو مختلف جگہوں کے ایک ساتھ کر دیے گئے ہیں)

صرف یہی نہیں بلکہ اس دیباچہ کے قصیدے اور رباعیوں اور قطعہ کے اشعار بھی کلیات سے ماخوذ ہیں، جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ اشعار کسی دوسرے موقع پہ لکھے گئے تھے، جو ظہوری نے ضرورتاً یہاں ثبت کر دیے۔

جب نورس پور کے بازار کے لیے ساقی نامے کے اشعار جو تقریباً ۱۲ برس قبل نظم ہوئے تھے، لیے گئے تو پھر مینا بازار میں، جو اسی زمانہ میں لکھی گئی، یہ اشعار کیوں نہیں نقل کیے گئے، اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مینا بازار اور سہ نثر کے مصنف کے طبائع میں بڑا فرق ہے۔

(۹) ظہوری اپنی تمام تصانیف نظم و نثر میں اپنی شخصیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے، لیکن مینا بازار کے مولف نے ہر چیز پر بڑا سخت پردہ ڈال رکھا ہے۔ نہ تخلص آیا ہے، نہ کسی ممدوح کا ذکر ہے، نہ کسی اور جگہ کا نام ملتا ہے، نہ زمانے کی طرف اشارہ ہے، اس لیے جب تک کوئی خاص وجہ نہ بتائی جائے، یہ کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ مولف مینا بازار اور ظہوری جنکے مزاج میں نمایاں فرق ظاہر ہوتا ہے، ایک ہی شخص ہیں۔

شہادتِ کلام | اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ واقعاتی و خارجی شہادت کی رو سے مینا بازار ظہوری کی تسلیم نہیں کی جا سکتی، اب اس کے دوسرے اہم پہلو یعنی شہادت کلام سے بحث کی جاتی ہے، ایک ایسا ذریعہ ہے جس کی رہنمائی میں ہم کسی قطعی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔

جس طرح انسان شکل صورت، رنگ بو، اخلاق و طبائع میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اسی طرح [illegible]عار خیال اور ادائے مطلب میں ایک دوسرے سے متفاوت ہیں، اگر ایک ہی عہد کے دو انشا پرداز لیے جائیں [illegible]ان دونوں کے ادائے مضمون، انتخاب الفاظ اور اسلوب کلام میں نمایاں فرق ہوگا، ہر مصنف خواہ وہ کسی پایہ کا ہو [illegible]فاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے، جسکے ذریعہ وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے، اس ذخیرے میں بعض الفاظ، تراکیب، محاورات، کنایات

تشبیہات، استعارات، صفات مصنف کے نزدیک زیادہ مقبول و مطبوع ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان کا استعمال بالارادہ یا بلاارادہ زیادہ کرتا ہے، اور وہ اس کے روزمرہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

جس طرح ایک مصور کسی شخص کی ظاہری شکل و صورت اور خد و خال رنگوں کے ذریعہ دکھا سکتا ہے، اسی طرح ایک محقق یا ناقد کسی مصنف کے ان تمام خصائص کی جو اس کی تصنیف کے خصوصی خد و خال ہیں، سراغ رسانی کر سکتا ہے، اس لیے اب ہم کو سہ نثر اور مینا بازار کے خصوصی خد و خال کے موازنہ پر بحث کرنے ہیں، اس سلسلے میں ذیل کے معروضات قابل توجہ ہیں،

(۱) ظہوری کی تصنیفات میں حمد و نعت کا باقاعدہ التزام ہوتا ہے، چنانچہ سہ نثر کی تینوں نثروں میں جو بطور دیباچہ کے ہیں، ان میں بھی حمد و نعت موجود ہے، دیباچۂ نورس[1] میں خدا کی حمد جس خوبصورت پیرایہ میں کی گئی ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے،

سرود سرایان عشرت کدۂ قال کہ بنور تن سرابستان حال کار کام دزبان ساختہ بشہد ثنائے صانع عذب البیان اند کہ چاشنی نغمہ ہائے شکریں دررگ پے نے دوانیدہ الخ

دیباچہ گلزار ابراہیم[2] کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے، اور اس میں بڑی معنی آفرینی پائی جاتی ہے،

سرمی چمن سخن بطراوت حمد بہار پیرائے ست کہ گلزار ابراہیم در رخسار یوسف طلعتان نمرود نخوت رسانیدہ۔

دیباچۂ خوان خلیل[3] میں ایک رباعی کے بعد نثر کے ایک جملے میں خدا کی تعریف موجود ہے،

اس کے برخلاف زنانہ بازار کا مولف حمد و نعت کے بغیر زنانہ بازار کی آرایش کی خوشخبری سے اپنی کتاب شروع کرتا ہے،[4]

عصمتیاں روش حیا پرور خلوتیان عفت کوش پاک نظر را مژدہ باد،

---

[1] سہ نثر ص ۲ [2] ص ۴۴ [3] ص ۵۴ [4] ص ۲

کیا اس سے دونوں مصنفین کے طبائع کا اختلاف ظاہر نہیں ہوتا،

(۲) ظہوری سہ نثر کی تینوں نثروں کے خاتمے میں بڑے التزام کے ساتھ دعائیہ فقرے لکھتا ہے جن میں بڑی ندرت و لطافت ہے، دیباچہ نورس کے آخر کے فقرے[1] ملاحظہ ہوں،

"بتقریب ایں دعا یاد آمد کہ اطناب نہ از ادب است بزمزمہ دعاے اختتام دم نوازش اثر اہتمام واجب و لازم دانست نقرات دعائیہ تا از کاسۂ طنبور خورشید تا رشحاتی در دمیدن است نسیم نغمہ از مہب مجلس خدایگانی در وزیدن باد و تا بر قانون سخن تار نفس نواختۂ مضراب زبان است ترانۂ ثناے جہاں بانی ذخیرۂ کام و زبان جہانیاں باد"

اس کے بعد تین شعر کا ایک قطعہ ہے جس کا حسن قابل داد ہے۔

تا دو معنی بہر لفظ چنگ لے قانون آورند　　لفظ پردازانِ معنی ساز در بزم بیان
بازا قبالش بہ صیدِ ملک رنگین چنگ باد　　تا رِ چنگِ عشرتش بادا رگ سستن درامان
ہم بر آہنگ ثنایش نغمۂ قانون دہر　　ہم بہ وفقِ مدعایش رسم و قانونِ زباں

زیں دعا ہا را اجابت منت بسیار باد

دیباچہ گلزار ابراہیم کا خاتمہ ملاحظہ ہو:[2]

اما چوں آخر سکوت عجز مہر دہانِ سخن خواہد بود، دعا ہم احرام کعبۂ اختتام بستہ

گو اجابت لب بہ آمین باز کن

اس کے بعد ایک دعائیہ غزل ہے،

دیباچۂ خوان خلیل میں لکھتا ہے:[3]

اگر کسے از ینہا گوید ہمیشہ در ابتدا بودہ۔ اولی اختتام می نماید۔ بریں دعا ختم گردید

---

[1] ص ۲۳ [2] ص ۴۴ [3] ص ۴۸

تا دریں مہماں سرا خوان خلیل آید بیاد   میزبان خلق ابراہیم عادل شاہ باد

اس کے مقابلے میں مینا بازار کے خاتمے کی عبارت ملاحظہ ہو:

دریا دریا جواہر محامد بلند و مناقب ارجمند ش سکر وفانہ با لماس تفکر سفتم و گراں

جانی را کہ از دیر باز گریباں گیر روزگارم بود دعا گفتم۔

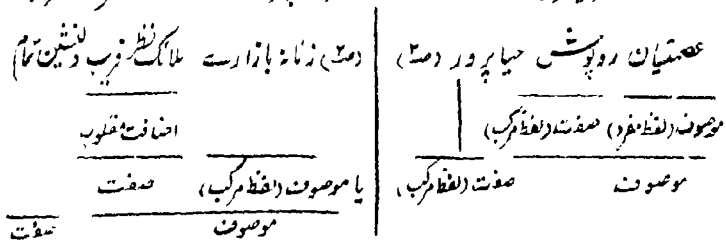
ظہوری نے خاتمے اور دعا میں جو نکتے پیدا کیے ہیں وہ مینا بازار کے "دعا گفتم" کے فقرے میں کہاں پائے جا سکتے ہیں، ظہوری کی تینوں نثروں میں لفظ اختتام موجود ہے، جو مینا بازار میں نہیں پایا جاتا، تینوں نثروں کا خاتمہ اشعار ہی پر ہوا ہے، مینا بازار میں اشعار سرے سے مفقود ہیں،

(۳) ظہوری ہر نثر کے ساتھ اتنی نظمیں شامل کرتا ہے کہ بعض اوقات نظم کا حصہ زیادہ ہو جاتا ہے، بالعموم وہ ہر موقع کے لیے تازہ نظمیں کہتا ہے، چنانچہ رقعۂ ظہوری بنام فیضی میں بھی بہت سے اشعار ہیں، جن میں اکثر اسی کے لیے لکھے گئے ہیں، رقعہ بنام عماد خاں میں بھی اشعار کی تعداد کافی ہے، دیباچۂ نورس میں بھی نظموں کی کمی نہیں، دیباچۂ گلزار ابراہیم میں ابراہیم عادل شاہ کی توصیف درج ہے، پہلے مختصر سی نثر ہے، پھر بڑے التزام کے ساتھ ایک مثنوی لاتا ہے، جس میں نو شعر ہوتے ہیں، اس طرح اس کے کل اشعار ملا کر نثری حصے سے شاید ہی کم ہوں، دیباچۂ خوان خلیل میں مثنوی، قصیدہ اور رباعی وغیرہ کی وافر تعداد ہے، حالانکہ اس حصے کے اشعار پہلے کے کہے ہوئے ہیں لیکن وہ نظم شامل کرنے کا ایسا عادی ہو چکا ہے کہ پرانے اشعار شامل کر کے اپنے ذوق کو پورا کرتا ہے، غالب اور صہبائی کے درمیان جو مکالمہ ہوا تھا، اس میں غالب نے اسی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے، جس کو آپ اس سے قبل ملاحظہ کر چکے ہیں،

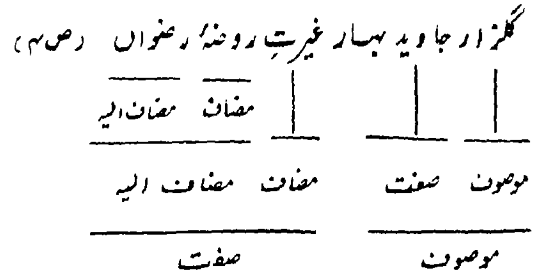
(۴) مینا بازار میں صفت در صفت اور مضاف در مضاف کی حسب ذیل صورتیں

قابل توجہ ہیں،

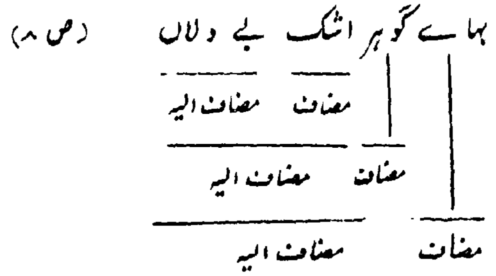
(ا) لفظ مفرد یا مرکب اور اس کی صفت لفظ مرکب پھر انکی صفت ایک دوسرا لفظ مرکب،



(ب) لفظ مفرد موصوف، صفت لفظ مرکب، مجموعہ موصوف ایسی صفت کے ساتھ جو تین لفظوں سے بنا ہو جن میں پہلا مضاف، دوسرا مضاف الیہ، تیسرا مضاف اور (آخری دونوں مضاف الیہ بھی ہوں)



(ج) تین مضاف کی مثال ملاحظہ ہو:



(د) تین مضاف اور ایک صفت موصوف کی مثال

نگاہ تماشائے گوہر آبدار غلطان (ص ۹)

موصوف صفت

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

(ی)، چار مضاف کی مثال،

کر شکستہ ہزار کوہ بار حسرت او

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

(ف)، تین مضاف مذکور ایک مضاف متصل یا محذوف مع ایک فک اضافت،

رخسار نور پاش لعل شب چراغش (ص ۱۰)

فک اضافت

مضاف مضاف الیہ (محذوف یا متصل)

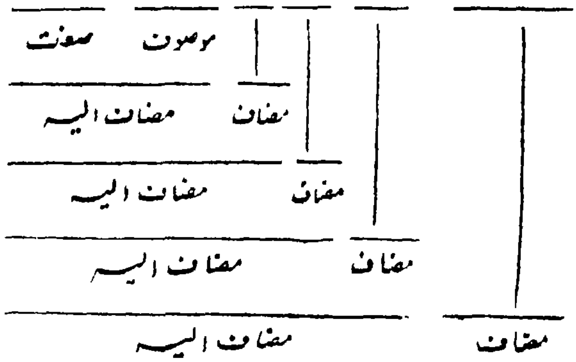
مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

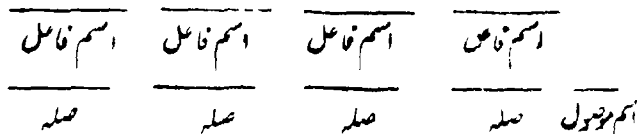
(گ) چار مضاف اور ایک صفت موصوف کی مثال،

رشک افزاے تجلی کدۂ طور دیدۂ نابینائے مادرزاد (ص ۱۰)



(ج) ایک اسم موصول اور چار صلہ جو اسم فاعل واقع ہوئے ہیں (ص ۷)

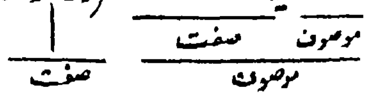
آں یاقوت لب۔ گوہر دنداں۔ مرجان پنجہ صدف دہاں



ظہوری کے یہاں[1] ج کی ایک مثال، اور ۲ کی بھی چند مثالیں مل جائیں گی، مگر بقیہ اور کی مثالیں نہیں پائی جاتی ہیں،

۲ کی مثال

رخسار یوسف طلعتاں فرود نخوت (ص ۲۴)



---

[1] دیباچہ نورس کے اس فقرے میں نمک تار طنبور تر کا لفظ تار الحاقی ہے، اسی دیباچہ کے ص ۱۹ پر مطبوعہ نسخے میں ایک فقرہ اس طرح آیا ہے "استادگان پایۂ سریر خلافت مصیر عرش نظیر"، مگر قلمی نسخوں میں خلافت مصیر محذوف ہے۔ دیباچۂ خوان خلیل کے مطبوعہ نسخے کے ص ۴۴ پر ایک فقرہ اس طرح آیا ہے: "برق سناں آفت خرمن آفتاب منیر" مگر رامپور کے نسخے میں منیر محذوف ہے۔

ج کی مثال

قانون سخن تار نفس (ص ۲۳)

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

مضاف مضاف الیہ

کیا اس میں فرق کے بعد دونوں مصنفین الگ الگ نہیں ہیں،

(۵) ظہوری کی سہ نثر میں تکرار لفظی (بہ معنی کثرت) کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

ختن ختن	ص ۷	تودہ تودہ	ص ۶۵
چمن چمن	"	پشتہ پشتہ	"
باغ باغ	۱۳	خیابان خیابان	۷۰
مصر مصر	"	رسالہ رسالہ	۸۴
سطر سطر	۱۹		
صفحہ صفحہ	"		

دیباچۂ دوم میں اس کی کوئی مثال نہیں ۔ (باقی)

"وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا"
کی
صحیح تاویل

از

مولوی ضیاء الدین صاحب اعظمی

کلام مجید کی جن آیات کی تاویل میں مفسرین کا زیادہ اختلاف ہے ان میں ایک آیۃ "وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا" بھی ہے، اس آیت کی صحیح تاویل کی تحقیق میں مندرجہ ذیل امور بحث طلب ہیں:

ا۔ "کُمْ" کی ضمیر کا خطاب کن لوگوں کی جانب ہے؟

ب۔ لفظ "ورود" کے کیا معنی ہیں؟

س۔ مابعد کی آیت "ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا" میں "ثم" کیا ہے اور آیت کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے،

ج۔ اس سلسلہ کی بعض حدیثوں کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے،

قبل اس کے کہ آیت بالا کا صحیح مفہوم اپنے خیال کے مطابق بیان کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہل تفسیر کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں، ——— یوں تو یہ آیت متاخرین و متقدمین سب کے یہاں معرض بحث بنی رہی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ متاخرین نے بالعموم متقدمین ہی کی پیروی کی ہے، اس لیے اجمال و اختصار کے پیش نظر سب سے متقدم تفسیر "جامع البیان" المعروف بہ تفسیر ابن جریر

کے حوالہ سے سلف کے اقوال کا ماحصل نقل کیا جاتا ہے ،

ابن جریرؒ نے اقوالِ سلف نقل کرنے سے پیشتر خود آیت کا مفہوم یوں بیان کیا ہے ۔

"لوگو! تم میں سے (کفار و مومنین) ہر ایک کو جہنم میں وارد (داخل) ہونا ہے ، اور اے محمدؐ ان سارے لوگوں کو جہنم میں داخل کرنا آپکے رب کا ایسا اٹل اور حتمی فیصلہ ہے کہ جسے اس نے ام الکتاب میں لازم اور واجب قرار دیا ہے"

پھر "ورود" کے معنی میں اہل تاویل کے اختلافات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ،

عبداللہ بن عباسؓ اور نافع بن الازرقؒ کے درمیان اس آیت پر مباحثہ ہوا تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ورود سے دخول مراد ہے حضرت نافعؒ نے انکار کیا تو ابن عباسؓ نے یہ آیتیں پڑھیں :

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	تم اور تمھارے معبودان باطل جہنم کے ایندھن ہو ،
حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ	تم اس میں داخل ہونے والے ہو ،

پھر یہ آیت پڑھی

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ	قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے ہوگا اور انھیں
النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ	دوزخ میں لیجا کر داخل کر دیگا ، بس کتنا برا گھاٹ
. . . .	ہے وہ جس پر یہ لوگ اتریں گے ،

اور دریافت کیا کہ یہ ورود ہے یا نہیں ،

عطا ابن ابی رباح سے روایت ہے کہ ابوراشد الحروری نے معارضۃً یہ آیت پڑھی ،

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا	جہنم کی آہٹ (مخفی آواز بھی) نہ سنیں گے ،

لہ ترجمہ کرنے کے بعد مولانا آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ دیکھا تو اس میں سبک اور بھنک تھا جو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے پھر استشہاداً وہی آیتیں تلاوت کیں جو اوپر گذر چکی ہیں اور یہ آیت بھی پڑھی کہ

نَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَى جَهَنَّمَ وِرْدًا ۔ مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانک کر لیجائیں گے۔

اس معنی کی کئی ایک روایتیں نقل کی ہیں جن کا منشا صرف یہ ہے کہ ورود سے دخول مراد ہے، اور "کم" کی ضمیر کا خطاب عام ہے، مومن و منافق، کافر و مشرک، نیک، و بد سب کو شامل ہے،

۲۔ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ ورود سے مراد مرور ہے یعنی جہنم پر سے سب کو گذرنا ہوگا، چنانچہ قتادہؓ سے روایت ہے:

عن قتادۃ فی قولہٗ وان منکم الا واردھا یعنی جھنم مر الناس علیھا ۔ (یعنی وان منکم الا واردھا کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم پر سے سارے لوگ گذریں گے۔

اس روایت سے زیادہ تصریح ابوالاحوص کی روایت میں ہے کہ جہنم پر تلوار کی دھار کی طرح کا تیز راستہ ہوگا تو پہلے طبقہ کے لوگ بجلی کی طرح تیزی سے اس پر سے گذریں گے، اور دوسرا طبقہ آندھی کی طرح، تیسرا طبقہ بہترین گھوڑوں کی طرح اور چوتھا طبقہ بہترین چوپایوں کی طرح سے گذرے گا، اور ملائکہ "اللھم سلم سلم" کہیں گے۔

۳۔ ان ہی ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہؓ سے روایت ہے کہ ورود کے معنی دخول کے ہیں اور خطاب صرف کفار کی طرف ہے،

۴۔ ابن زید وغیرہ سے روایت ہے کہ ورود مومن سے مراد مرور اور ورود کفار سے مراد دخول ہے،

۵۔ حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے روایت ہے کہ ورود مومن سے مراد وہ بیماریاں اور پریشانیاں مراد ہیں جو ایک مرد مومن کو دنیا میں لاحق ہوتی ہیں، یہ اور بعض ایسے ہی اقوال نقل کرنے کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں،

واولی الاقوال فی ذلک بالصواب قول من قال یردها الجمیع ثم یصدر عنها المؤمنون فینجیهم الله ویهوی فیها الکفار

ان اقوال میں سب سے زیادہ صحیح قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تمام لوگ جہنم میں داخل ہونگے، پھر مومنین اس سے نکل پڑیں گے اور اللہ انھیں نجات دیگا لیکن کفار کو اسی میں باقی رکھے گا۔

اس ترجیح کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ کثرت سے احادیث اسی کی تائید کرتی ہیں، یوں تو انھوں نے اس سلسلہ میں بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں لیکن ایک حدیث جو بہت مشہور اور صحاح کی ہے وہ یہ ہے:

لا یموت لاحد من المسلمین ثلثة من الولد فتمسه النار الا تحلة القسم

کسی ایسے مسلمان کو جہنم کی آگ نہیں چھو سکتی جس کے تین بچے مر گئے ہوں، مگر قسم کو حلال کرنے کے لیے۔

اہل تفسیر کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو "حتماً مقضیا" فرمایا ہے اس کی اس حدیث میں تحلۃ القسم کہکر توضیح و تشریح کی گئی ہے، ان کے خیال کے مطابق حضرت حفصہؓ کی روایت سے اس کی مزید توثیق ہوتی ہے:

لا یدخل النار احد شهد بدراً والحدیبیة فقالت حفصة الیس الله یقول وان منکم الا واردها فقال رسول الله ثم ننجی الذین اتقوا

آپ نے فرمایا کہ بدر اور حدیبیہ میں شریک ہونے والا کوئی شخص بھی جہنم میں داخل نہ ہوگا، تو حضرت حفصہؓ نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ "وان منکم الا واردها" آپ نے کہا کہ لیکن وہیں یہ بھی تو ہے کہ ثم ننجی الذین اتقوا۔

حافظ ابن کثیر نے بھی جو بالعموم علامہ ابن جریر کے اقوال کی پیروی کرتے ہیں، تقریباً اسی قسم کی

مگر اس سے مختصر بحث کی ہے، اور اسی عام و مشہور تاویل کو اختیار کیا ہے۔

امام رازیؒ نے حسب عادت دونوں فریق . . . . (عام و خاص ماننے والوں) کے دلائل نقل کیے ہیں، لیکن ان کی بحث کچھ اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ ہر شخص صحیح و سقیم کا آسانی سے پتہ نہیں لگا سکتا، امام صاحب کا رجحان معلوم کرنے میں بڑی زحمت معلوم ہوتی ہے

اسی طرح اکثر اہل ترجمہ و تفسیر نے بھی اسی معنی کو اختیار کیا ہے، ابن جریرؒ کے متعدد اقوال کے ذکر کے بعد اب اگر آیت کی کوئی اور تاویل اختیار کی جائے، اگرچہ ہم کوئی ایسی تاویل نہ کریں گے جو سلف کے معتقدات کے یکسر خلاف ہو، لیکن اگر کوئی دوسری تاویل کی بھی جائے جب بھی ہم پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا، کیونکہ خود سلف کے درمیان اس باب میں اختلاف موجود ہے، اور یہی اختلاف ہمارے لیے موجب رحمت بنا، اور یہ حقیقت ہے کہ کسی آیت کی تاویل پر عدم اجماع اس امر کی دلیل ہے کہ اس میں وسعت کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور فکر و نظر کی اگر کوئی جداگانہ راہ اختیار کر لیجائے تو یہ قطعاً مذموم نہ ہوگا، بشرطیکہ تدبر قرآن کی اس نئی راہ میں صحیح اصول تفسیر کو نظر انداز نہ کیا گیا ہو،

ہماری تاویل ہمارے نزدیک "کُم" کا خطاب عام نہیں ہے، بلکہ اس سے صرف کفار اور مشرکین ہی مراد ہیں، نیز ورود کے معنی دخول ہی کے ہیں، بڑی کاوش اور سعی کے بعد بھی "ورود" کے معنی "مرور" کے نہ مل سکے۔ قرآن مجید اور کلام عرب کے تتبع سے دو ہی معنوں کی طرف نشاندہی ملتی ہے،

(۱) "ورود" بمعنی داخل ہونا، چنانچہ مشرکین، اور ان کے جھوٹے شرکاء کے بارہ میں سورۂ انبیاء میں فرمایا گیا ہے،

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ — تم اور تمہارے معبود جہنم کے ایندھن ہیں۔
حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ — جس میں تم داخل ہونے والے ہو،

خود اسی سورۂ مریم میں فرمایا:

نَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا	ہم مجرموں کو جہنم میں پیاسا ہانک لیجائیں گے ،
. . . .	(یعنی جس طرح پیاسے اونٹ کو گھاٹ پر لیجاتے ہیں
. . . .	ویسے ہی یہ لوگ ہانک کر دوزخ میں داخل ہوں گے)

سورۂ ہود میں فرعون کی بابت کہا گیا ہے:

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَأَوْرَدَهُمُ	(فرعون) اپنی قوم کے آگے ہوگا اور انھیں دوزخ میں
النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُودُ	لیجا داخل کریگا، پس کتنا برا گھاٹ ہے جس پر وہ اتریں گے

ظاہر ہے کہ ان آیات میں مشرکین اور فرعون کے لیے "ورود نار" کا استعمال ہوا ہے، اس لیے کسی قسم کی تاویل نہیں کی جا سکتی ،

۲۔ دوسرے معنی قرب و دنو اور بلوغ کے ہیں، جیسا کہ سورۂ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ	جب مدین کے چشمہ پر پہنچے ،

یہاں ورود کے معنی قرب، اور بلوغ ہی کے لیے جا سکتے ہیں، نہ کہ مرور اور دخول کے، کیونکہ حضرت موسیٰؑ نہ تو چشمہ کے اندر داخل ہوئے تھے، اور نہ اس پر سے ہو کر فوراً گذر گئے تھے ،

عرب کہتے ہیں:

وردت القافلة البلدة	(قافلہ شہر میں آگیا)

یہ فقرہ اس موقع پر بولتے ہیں جب قافلہ شہر کے قریب آجائے اگرچہ اس میں داخل نہ ہو، سبعہ معلقہ میں زہیر کا مشہور شعر ہے ،

فلما وردن الماء زرقا جمامه ۔ ۔ ۔ وضعن عصی الحاضر المتخیم

(جب سواریاں (یا سواریوں کے اندر کی عورتیں) گہرے نیلگوں (صاف شفاف) چشمہ کے پاس پہنچیں تو انھوں نے اقامت اختیار کر لی)

ظاہر ہے دنو اور بلوغ کو اتنی وسعت نہیں دی جا سکتی کہ ان سے مرود کے معنی لے لیے جائیں ، جس کا مفہوم قطعی جدا ہے ، اب آیت کا سیدھا مفہوم یہ ہوگا کہ "تم کو یعنی کفار و مشرکین کو جنھوں نے دعوتِ الٰہی کی تکذیب کی ہے جہنم میں ضرور داخل ہونا ہے ، یہ اللہ تعالیٰ کا قطعی اور اٹل فیصلہ ہے"

مابعد کی آیت کا مفہوم | آیت مابعد تقابل کی واضح مثال ہے یعنی ایک طرف تو مشرکین کی ناکامی اور خسران کا ذکر کیا گیا ہے ، دوسری طرف مسلمانوں کے فوز و فلاح کا بیان ہے ، تاکہ دونوں گروہوں کا رویہ سامنے آجائے ، اور ان کے لیے سخت وعید اور شدید انذار اور مومنین کے لیے تسلی و تثبیت ہو جائے ، آیت کا مفہوم یوں ہوا کہ ایک طرف تو کفار و مشرکین کے بارہ میں کہا گیا کہ اللہ کا اٹل فیصلہ یہ ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے لیکن دوسری طرف اہلِ تقویٰ کیلیے مغفرت اور نجات ہوگی ،

حرف "ثم" سے بحث | غالباً اصل تاویل کے خفاء کا اہم سبب "ثم" ہے ، اس لیے ہم اس پر بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں ۔

"ثم" ترتیب اور تراخی کے لیے اس قدر مشہور اور عام ہے کہ اس کی مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں ، علمائے نحو کے اقوال طوالت کا باعث ہوں گے ، جوہری صحاح میں لکھتا ہے :

"ثم حرف عطف يدل على التراخي والترتيب" ثم ایسا حرف عطف ہے جو تعقیب و تراخی پر دلالت کرتا ہے ۔

"ثم" سے کبھی یہ دونوں ہی فائدے حاصل کیے جاتے ہیں ، لیکن کبھی وہ صرف ترتیب بیان کیلیے آتا ہے ، اور وہاں تعقیب و تراخی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ، مثلاً سورۂ زمر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا — تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی نفس سے اس کا جوڑا بھی بنایا تھا ۔

اب غور کرو کہ انسانوں کی خلقت مقدم ہے یا حضرت حوا کی؟ ظاہر ہے کہ حضرت حوا انسانوں سے پہلے پیدا ہوئی تھیں، اس لیے یہاں تعقیب زمانی سرے سے مقصود ہی نہیں، صرف ایک امر کو دوسرے سے ملحق کر دینا ہے، اور یہ قطعاً ضروری نہیں کہ وہ یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئے ہوں، مثلاً کہتے ہیں:

فانا اعطیتک الیوم شیئا ثم الذی	میں نے کچھ آج تمھیں دیا اور کل جو تمھیں
اعطیتک امس اکثر	دیا تھا وہ اس سے زیادہ تھا،

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ باتیں مقصود ہی نہیں ہوتیں، بلکہ دو طرح کے امور کا تذکرہ کرنا مقصود ہوتا ہے، اور وہاں بیانِ تقابل کے لیے "ثم" لا دیتے ہیں، یعنی ایک طرف تو ایسا ہوگا کہ ایک جماعت پوری کی پوری جہنم میں جائے گی، لیکن دوسری طرف ایسے لوگ ہوں گے جنھیں نجات اور فلاح ملیگی، اس قسم کے "ثم" کی مثال اگر تلاش کی جائے تو بہت مل سکتی ہے، یہاں صرف سورۂ نحل کی ایک آیت استشہاداً پیش کی جاتی ہے:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا	(دوسری طرف) پھر تمھارا رب آزمائے جانے کے بعد
مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰھَدُوْا	ہجرت کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو
وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِھَا	(اچھا بدلہ دیگا) کیونکہ تمھارا رب اسکے بعد
لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (نحل - ۱۱۰)	بخشنے والا اور مہربان ہے

اس آیت میں اوپر یہ بات بیان کی جارہی تھی کہ جو لوگ پورے شرح صدر کے ساتھ (مجبوراً نہیں) کلمۂ کفر ادا کریں گے، ان پر اللہ کا غضب اور سخت عذاب ہوگا، کیونکہ یہ ذرا بھی مصائب کی تاب نہ لاسکیں گے اور انھوں نے دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دی، اس لیے ان پر طبع قلب کر دیا گیا، اس لیے یہ غفلتوں میں سرمست ہیں لیکن یاد رکھو کہ یہ آخرت میں بالکل ناکام رہیں گے (ایک طرف تو یوں ہوگا) لیکن دوسری طرف ہجرت کرنے والوں، صبر کرنے والوں اور آزمائش میں ڈالے جانے والوں

کو اللہ اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے گا)

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورہ مریم کی مذکورۂ صدر آیت میں بھی اسی قسم کا "ثم" استعمال ہوا ہے،

اس تاویل میں ہم منفرد نہیں | آخر میں اطمینان عام کی غرض سے یہ بھی عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تاویل میں ہم منفرد نہیں ہیں، بلکہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہ سے بھی یہی روایت ہے، امام رازی کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے، اور صاحب بحرالمحیط نے بھی اسی تاویل کی توثیق کی ہے، موجودہ علما میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تاویل سے ہماری اس حد تک تو تائید ہوتی ہے کہ وہ "کم" کا خطاب صرف منکرین حق اور اور کفار کی طرف لیجاتے ہیں، مگر ان سے ترجمہ میں اتنا تسامح ضرور ہو گیا ہے کہ انھوں نے کفار کو مخاطب قرار دینے کے بعد بھی "گذرنا" ترجمہ کیا ہے، حالانکہ کفار کے لیے گذرنا نہیں بلکہ داخل ہونا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نص قطعی سے ثابت ہے،

اس تاویل کے اختیار کرنے کا سبب | لیکن بایں ہمہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تاویل کو اختیار کرنے کا سبب کیا ہے، کیوں نہیں اسی عام تاویل کو اختیار کیا گیا، جسے اکثر علمائے تفسیر نے اختیار کیا ہے اور صحیح حدیثوں سے بھی اسی کی جب تائید و توثیق ہوتی ہے، اس کے جواب میں ہم یہاں چند سرسری اشارات پر اکتفا کریں گے، شاید فکر و نظر کی کوئی راہ اس طرح باز ہو سکے،

جو لوگ قرآن مجید پر دقت نظر سے غور کرتے ہوں گے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہوگی کہ [قرآ]ن مجید صرف دو جماعتوں کی کامیابی اور ناکامی کا ذکر کرتا ہے، پہلی جماعت ان مومنین اور صالحین [کی] ہے جنھوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت کی ہے، اور اس کے نتیجے میں انھیں آخرت [میں] نجات حاصل ہوگی، اور وہ جہنم کی آگ سے بالکل دور ہمیشہ کے لیے جنت میں ہوں گے

دوسری جماعت اکافرین اور مشرکین کی ہے، جن میں سے اول الذکر نے اللہ کے احکام کی کھلم کھلا پوری ڈھٹائی کے ساتھ مخالفت کی ہے، موخرالذکر نے ایمان کے پردے میں اسلام کی آڑ میں اسلام و ایمان کے خلاف ہر قسم کی ریشہ دوانیاں کی ہیں، اس لیے یہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کیے جائیں گے اور ان پر اللہ تعالیٰ ذرا بھی نظر کرم نہیں اٹھائے گا۔ لئن اشرکت لیحبطن عملک

چنانچہ قرآن مجید نے نجات پانے والوں اور نہ پانے والوں جہنم میں جانے والوں اور جنت میں جانے والوں ہی کے ذکر پر صرف اکتفا کیا ہے، لیکن ایک تیسری جماعت کا پتہ صحیح حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے، اور وہ کوتاہی اعمال کرنے والوں کی جماعت ہے، جو نکہ اسلام و ایمان کی حقیقت اور صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر پورے طور سے کاربند نہ ہو سکی، اس لیے اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے جہنم میں جائے گی، مگر پھر ایمان و اعتقاد و خداوندی کے نتیجہ میں دوزخ سے نکال کر جنت میں لائی جائے گی۔ لیکن قرآن مجید سے کہیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ سارے مسلمان جہنم میں جائیںگے، یا کم از کم ان کا اس پر سے مرور ہوگا، سوائے اس آیت کے جس کی تاویل ہم نے کی ہے، بلکہ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ پختہ ایمان لانے والوں کو جہنم سے کوئی سابقہ ہی نہ پڑے گا، انھیں نجات ملے گی، اور وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رحمت الٰہی کے جوار میں ہوں گے، اس لیے یہ کہنا کہ پختہ ایمان لانیوالے بھی جہنم میں جائیں گے، ان کا وہاں سے گذر ہوگا بڑی جرأت کی بات ہے، کیونکہ اس طرح ان کے ناجی ہونے کے معنی ہی کچھ نہ ہوںگے، دوسرے نصوص قرآنیہ سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ وہ سرے سے جہنم ہی میں نہ جائیں گے،

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى — بلاشبہ وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے بھلائی

اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ — پہلے مقدر ہو چکی ہے وہ جہنم سے دور کیے جائیں گے،

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ مومنین بھی جہنم میں جائیں گے یا ان کا اس پر سے گذر ہوگا تو مبعدون

کے کیا معنی ہوں گے، اور اسی آیت کے بعد یہ تصریح بھی ہے کہ

لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا وَهُمْ فِي	وہ اس کی بھنک بھی نہ سنیں گے اور اپنی من مانی
مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ خَالِدُونَ	تمناؤں میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کو بڑی سے بڑی
لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ	ہولناکی بھی خوفزدہ اور غمگین نہ کرے گی۔

یہاں لا یسمعون حسیسھا اور لا یحزنھم الفزع الاکبر کی کیا تاویل کیجائے گی، ایک دوسری

جگہ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے:

وھم من فزع یومئذ اٰمنون	اور وہ لوگ خوف و دہشت سے اس دن بالکل مامون ہونگے۔

ان صریح اور واضح نصوص کے بعد یہ کہنا سخت مشکل ہے کہ جہنم سے اہل ایمان کو بھی کسی طرح کا

سابقہ پڑے گا۔

۲- اب ایک نظر اس سورہ پر بھی ڈالیے جس میں یہ آیت ہے تو معلوم ہوگا کہ موقع بیان، اسلوب

کلام اور نظم کلام کا تقاضا کس تاویل کو اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے،

سورۂ مریم اور سورۂ طٰہٰ دونوں مکی سورتیں ہیں، جبکہ مسلمانوں کو مشرکین مکہ کی جانب سے

سخت آزمایشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، مسلمان نہایت مضطرب اور پریشان تھے، اسی لیے سورۂ

مریم میں نماز کی تاکید اور صبر کی تلقین کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ صبر و ثبات کی قوت نماز ہی سے

پیدا ہوتی ہے، دل و دماغ کا سارا اضطراب نماز ختم کر سکتی ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے جو قصے بیان کیے گئے ہیں، ان میں بھی نماز کو نمایاں درجہ دیا گیا ہے،

دوسری طرف ان لوگوں کی حیرت اور استعجاب کو ختم کیا گیا جن کے نزدیک یہ معاملہ مشتبہ نظر آتا ہے،

کہ اللہ تعالیٰ محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کی مدد کر سکتا ہے، اور مسلمانوں کی موجودہ بے سروسامانی دیکھکر

ان کی ظاہر بین نگاہیں یہ فیصلہ کر رہی تھیں کہ ان کی یہ بے سروسامانی دائمی ہے اور ان کی بیکسی کبھی ختم

نہیں ہوسکتی، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ دشوار نہیں کہ وہ اسباب وظواہر کے خلاف یک بیک آن کی آن میں تبدیلی پیدا کردے، اور مظلوموں کو فتح و غلبہ حاصل ہوجائے، حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں اولاد دی جب وہ بالکل مایوس ہوچکے تھے، حضرت مریمؑ کے بطن سے حضرت عیسیٰؑ کو بن باپ کے پیدا کردیا، حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اللہ کی نصرت و دستگیری نے کیا کام کیا، ــــ ٹھیک اسطرح مسلمانوں کی بیچارگی کو ختم کردینا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں، اور ایک دن مجازات و مکافات کا بھی آنے والا ہے، اس دن ان لوگوں کو جو آج بڑی اچھی حالت میں نظر آرہے ہیں، سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا اور مسلمان جو آج ضیق و تنگی میں نظر آرہے ہیں نجات پائیں گے، چنانچہ اس سورہ کی آخری آیتوں میں قیامت کا ذکر کرکے اس کے متعلق ان کے استعجاب کو ختم کیا گیا ہے،

ویقول الانسان ءاذا ما مت لسوف	اور انسان (منکر قیامت) کہتا ہے کہ کیا جب میں
اخرج حیا اولا یذکر الانسان انا	مرجاؤنگا تو (دوبارہ) زندہ نکالا جاؤں گا،
خلقناه من قبل ولم یک شیئا	کیا اسے یاد نہیں کہ ہم نے اسے پہلے پیدا کیا حالانکہ
فوربک لنحشرنهم والشیاطین	وہ کچھ نہ تھا، پس قسم ہے ہم ان کو اور شیطانوں
ثم لنحضرنهم حول جهنم جثیا	کو ضرور جمع کریں گے، پھر انھیں جہنم کے گرد لا حاضر
ثم لننزعن من کل شیعة ایهم	کرینگے، دو زانوؤں پر گرے ہوئے، پھر ہر گروہ
علی الرحمن اشد عتیا ثم لنحن	میں سے انھیں نکالیں گے جو خدائے رحمٰن سے بہت اکڑنے والے
اعلم بالذین هم اولی بها صلیا	تھے، پھر ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو جہنم
وان منکم الا واردها کان علی ربک	میں داخل کیے جانے کے زیادہ مستحق ہیں، پھر تم
حتما مقضیا ثم ننجی الذین اتقوا و	(منکرین) میں کا کوئی نہیں جو جہنم میں نہ داخل ہو،
نذر الظالمین فیها جثیا	لیکن ہم اہل تقویٰ کو (جہنم میں جانے سے) بچالیں گے،

دیکھیے یہاں صاف "الانسان" سے کافر مراد ہیں کہ ان کو بعثت کے متعلق شبہ ہے اور وہ حیرت و استعجاب کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ کیا مرجانے کے بعد بھی میں زندہ کیا جاؤں گا، ان کے اس استعجاب کا ایک جواب تو اوپر کے قصوں میں دے دیا گیا تھا لیکن پھر ضمناً یہ کہا گیا کہ آخر اس بارے میں کیوں اتنا شدید استعجاب ہے، کیا انسان اپنی خلقت پر غور نہیں کرتا کہ ہم نے اسے لاشے سے شے بنادیا، وہ بالکل بے حقیقت اور غیر متصور تھا لیکن ہم نے اسے وجود بخشا تھا تو پھر کیا ہم اسے دوبارہ زندہ کرکے نہیں اٹھا سکتے، نہیں ضرور اٹھائیں گے، اور اس وقت اس کا سارا استعجاب ختم ہوجائے گا، اور اسے ہمیشہ کے لیے جہنم میں پہنچا دیں گے، اسی ضمن میں یہ آیت لائی گئی کہ اس قسم کے ہر انسان کو جہنم میں داخل کیا جائے گا، اور چونکہ یہاں انذار و ترہیب کا پہلو غالب ہے، اس لیے منکرین معاد کے انجام کا کسی قدر تفصیلی بیان ہے، مگر دوسرے گروہ سے یکسر تغافل نہیں برتا گیا بلکہ اس کے بارہ میں بھی تقابلاً یہ کہہ دیا گیا کہ اسے عذاب الیم سے نجات ملے گی، چنانچہ کچھ آگے چل کر پھر اسی قسم کی آیت آرہی ہے،

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ عَلَى الرَّحْمٰنِ	اس دن ہم متقیوں کو اپنے حضور مہمانوں
وَفْدًا وَّنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ	کی طرح جمع کریں گے اور مجرموں کو جہنم میں
وِرْدًا	ہنکا کر داخل کریں گے۔

غور کرو "وفد" عزت سے کنایہ ہے، اور "ورد" ذلت کی تعبیر کے لیے آیا ہے، ہم نے آیت کی جو یہ تاویل اختیار کی ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہی دونوں آیتیں ہیں، اس میں صاف صاف دونوں جماعتوں کا تقابلی ذکر کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایک جماعت وفد کی شکل میں عزت کے ساتھ دربار الٰہی میں حاضر ہوگی ـــــــ اور دوسری ذلت کے ساتھ جہنم میں پہنچا دی جائے گی۔

۱؎ قرآن مجید میں اکثر "الانسان" سے منکرین قیامت ہی مراد ہوتے ہیں (ض)

اب اگر آیت کی وہ تاویل اختیار کر لیجائے جسے اکثر اہل تفسیر نے بیان کیا ہے تو نظم کلام بالکل درہم برہم ہو جائے گا اور کوئی بات ہی نہ بنے گی، اور موقع و محل اس تاویل کو اختیار کرنے سے ابا کر رہے ہیں، اور اس سے مقصد کلام ہی فوت ہو جائے گا کیونکہ اصل بات تو یہ کہنی ہے کہ انکار کی روش اختیار کرنے والوں کو سزا سزا کا می ہوگی اور وہ جہنم میں داخل کیے جائیں گے لیکن اطاعت انقیاد کی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے کامیابی اور سرمدی جنت ہوگی، اس لیے یہ کہنے کے کیا معنی ہوں گے کہ ایمان والے بھی جہنم میں جائیں گے یا ان کا بھی اس پر سے مرور ہوگا،

۳۔ بعض قراتوں میں "وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا" کے بجائے "وَإِنَّ مِنْهُمْ" آیا ہے، اگر قرأت صحیح مان لی جائے تو پھر ہماری تاویل کے علاوہ کسی اور تاویل کی گنجایش ہی نہیں رہ جاتی، اگر مشہور قرأت پر شاذ قرأت کو ترجیح نہیں دیجا سکتی، اور اصل قرأت وَان منکم ہی ہے، اور اس سے لطف کلام دوبالا ہو جاتا ہے، باقی رہی دوسری قرأت تو وہ درحقیقت کسی صحابی کی تفسیر ہوگی، جسے راوی کے وہم نے قرأت سمجھ لیا ہوگا،

۴۔ آیت کی یہ تاویل کہ اہل تقویٰ بھی اہل فجور کے ساتھ جہنم میں جائیں گے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ قرآن مجید میں اولئك عنها مبعدون، وهم من فزع يومئذٍ آمنون کا صاف صاف اعلان ہے[1] اور اس اعلان کے بعد مومنین کا جہنم میں دخول کیسے صحیح ہو سکتا ہے، اگرچہ ہمارے مفسرین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان جہنم کے اس حصہ میں جائیں گے جہاں انھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا، یا جہنم ان کے لیے ٹھنڈی ہو جائے گی وغیرہ[2]۔ یہ رکیک توجیہات سنکر اقبال کا یہ شعر ہماری زبان پر آجاتا ہے:

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ‌‌‌‌ کس درجہ فقیہان حرم ہیں بے توفیق

---

[1] بیضاوی شریف [2] تفصیل کے لیے دیکھیے امام رازی کی تفسیر

بعض اہل تفسیر کا یہ قول کہ ان کا اس پر سے صرف مرور ہوگا، خواہ حدیثوں سے ثابت ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ ورود کے معنی مرور کے کب اور کہاں آتے ہیں، اہل لغت نے ورود کے معنی میں مرور کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا ہے، پھر یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ لفظ کو اصل معنی کو ترک کر دیا جائے،

۵۔ رہی یہ بحث کہ اس تاویل کو اختیار کر لینے کے بعد حدیثوں کی کیا توجیہ کیجائے گی تو اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں،

اس بارہ میں جو حدیثیں پیش کیجاتی ہیں، ان کو صحیح مانتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حدیثیں اس آیت کی تفسیر میں وارد نہیں ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع روایت ایسی نہیں ہے جس میں آپ نے اس آیت کی براہ راست تفسیر کرتے ہوئے یہ تبلایا ہو کہ "وان منکم الا واردھا" سے یہ مراد ہے کہ سارے اہل ایمان بھی جہنم میں جائیں گے کیونکہ اوپر جو چار پانچ اقوال نقل کیے گئے ہیں، ان سب کی تائید میں یکساں حدیثیں اور آثار موجود ہیں، اگر واقعی کوئی مرفوع روایت ہوتی تو پھر اسی پر اجماع ہوگیا ہوتا، اس لیے وہی قول مرجح ہو سکتا ہے، جو عقل و نقل دونوں کے مطابق ہو، البتہ حضرت حفصہؓ کی روایت سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ اس میں آیت زیر بحث کا ذکر ملتا ہے، مگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ حدیث بھی ہمارے مدعا کی تائید کرتی ہے، کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حدیبیہ اور بدر میں شریک ہونے والا کوئی شخص جہنم میں نہیں جا سکتا، تو حضرت حفصہؓ کے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوا اور انھوں نے دریافت کیا کہ آپؐ کیسے فرما رہے ہیں جب کہ اللہ نے فرمایا ہے "وان منکم الا واردھا" الخ، آپ نے جواب دیا کہ وہاں اہل ایمان کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، یعنی یہ حکم تو صرف کفار کے بارہ میں ہے، باقی مومنین کے بارہ میں تو اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ موجود ہے کہ "ثم ننجی الذین اتقوا" اس لیے اس روایت کو اثبات مدعا کے لیے دلیل بنانا صریح زیادتی ہے،

رہی دوسری حدیث تو اس سے جس نار کا ثبوت ہم پہنچتا ہے اس "نار" کا کوئی بھی قائل نہیں،
کیونکہ ایک جماعت تو صرف مرور کی قائل ہے لیکن دوسری جماعت جو دخول کی قائل ہے وہ
بھی یہ کہتی ہے کہ مومنین پر جہنم کا کوئی اثر نہیں پڑسکتا، اسلیے نتیجہ کے اعتبار سے اس حدیث کا مقصد
بھی وہی ہے،

اس مختصر بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو حدیثیں اس آیت کی تفسیر میں پیش کیجاتی ہیں وہ
سرے سے اس کی تفسیر میں وارد ہی نہیں ہیں، اس لیے ان کی بنیاد پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا،
البتہ اگر صحیح حدیثوں سے کوئی بات ثابت ہوتو اسے تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں، مگر ایسی کوئی
حدیث نہیں ہے، اس لیے ہماری تاویل نہ تو حدیث کے خلاف ہے اور نہ اس تاویل کو اختیار
کرنے کی وجہ سے ہم پر کوئی الزام عائد ہوتا ہے، وھذا ما ظھر لی من فضل ربی، واللہ عندی
علم الصواب۔

سلیمان نمبر

(مرتبہ شاہ معین الدین ندوی)

معارف کا سلیمان نمبر جس کا شائقین و قدردان معارف کو مدت سے انتظار تھا مئی میں شائع
ہوگیا، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور
انکے علمی و دینی، قومی و ملّی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے، پہلے سیرت و سوانح
کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین اور مقالات ہیں، اس کے بعد مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی
ڈالی گئی ہے آخر میں متعدد منظومات اور قطعات تاریخ ہیں، یہ نمبر معارف کے مستقل خریداروں کو عام
اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک کے چار روپیہ میں دیا جاتا ہے، صرف دو سو چھپا تھا، تھوڑے سے
نسخے اور رہ گئے ہیں، جلدی کیجئے۔

"منیجر"

سماتِ عرب

از جناب افتخار احمد صاحب اعظمی

اپنے محترم استاذ مولانا ابو الجلال ندوی کی نگرانی میں میں نے کئی برس لسانیات پر تحقیق کی، میری یہ تحقیق نوٹس (NoTe s) کی شکل میں کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، میں اپنے استاذ محترم کا رہین منت ہوں کہ انھوں نے سمات عرب جیسے اہم موضوع پر تحقیق کا ڈھنگ مجھے بتایا، اگر کہیں کوئی غلطی مقالے میں نظر آئے تو یہ غلطی میری ہی تحقیق غلطی سمجھی جائے نہ کہ استاذ محترم کی۔ (افتخار اعظمی)

دنیا میں خیالات کو قلم بند کرنے کے جتنے طریقے آج تک رائج ہوئے ہیں، ان میں قدیم ترطریقہ تصویر کشی ہی کو قرار دیا جاتا ہے، جن اقوام نے اپنے کارناموں کی تحریری یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں اہل مصر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، مصری آثار کی شہادت یہ ہے کہ ابتدا میں حروف نہیں تھے، بلکہ تصویروں کے ذریعہ احساسات وجذبات اور خیالات وتصورات قلم بند کئے جاتے تھے، اہل مصر سے زیادہ اہل بابل کی تہذیب و ثقافت پرانی ہے۔ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ سب سے پہلے کس قوم نے تحریر کا آغاز کیا، اہل بابل کی تحریریں زیادہ تر میخ نما نقوش کی صورت میں ہمیں ملتی ہیں، پرانے نقوش جو ہمیں ملتے ہیں، انھیں دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقوش بھی ابتدا میں دراصل اشیاء کی تصویریں تھے، بہر کیف تحریر کے جتنے طریقے بھی آج تک رائج ہوئے ہیں، ان سب کا سلسلہ یا تو اشیا کی تصویر کشی پر ختم ہوتا ہے یا ان کا نقطۂ آغاز عربوں کے "سماتِ ابل" کو قرار دیا جاسکتا ہے، عربوں میں نامعلوم زمانے

سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنے اونٹوں کے مختلف اعضا پر طرح طرح کے نشان بناتے رہے ہیں، جنھیں عربی میں "سمات" کہا جاتا ہے، اب تو یہ نقوش محض لایعنی ہیں لیکن اپنے آغاز میں ہر نقش بذاتِ خود ایک بامعنی کلمہ تھا، "سمات" لفظ "سمۃ" کی جمع ہے، جو کہ دراصل "وسم" تھا، نام کی عربی "اسم" ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ دراصل "سِمْوٌ" تھا لیکن یہ صحیح نہیں، اس لفظ کا عبری تلفظ "شِسم" ہے جس کی جمع "شِمُوتْ" ہے۔ "شِمُوتْ" کے معنی ہیں "اسماء واعلام"۔ بائبل کی دوسری کتاب کا نام Exodus ہے، عبرانی نام اس کتاب کا "شموت" ہے، یہ نام اس کتاب کو اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ابتدا ذیل کے فقرے سے ہوتی ہے:

وَاِلّےْ شِمُوتْ بنی یِسْرَاِل ھَبَّایِم	یہ ہیں نام ان فرزندانِ اسرائیل کے
بمصرَیْمہ	جو مصر میں آئے۔

یہی لفظ "شِمُوتْ" تھا جو عربی لب و لہجے میں "سمات" بنا، عربی میں دو لفظ ہیں "وسم" اور "وَشْم" عربوں میں نہایت قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ لوگ اپنے جسمانی اعضا پر طرح طرح کے گودنے بناتے تھے، اس طرح کی نقش آرائی کو "وشم" کہتے ہیں، جانوروں خصوصاً اونٹ کے اعضا جسم پر گرم لوہے سے نشانات لگانے کو "وسم" کہتے ہیں۔ اسی طرح "رسم" اور "رشم" وغیرہ متعدد الفاظ ہیں جن کے معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عرب اشیاء پر بھی مختلف قسم کے نشانات لگاتے تھے۔ سمات نویسی کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ نشان دیکھ کر یہ جان لے کہ اس چیز کا مالک کون ہے؟ کس قبیلہ کا ہے؟ اور کہاں رہتا ہے؟ بلکہ وسم اور وشم کے کچھ مقاصد بھی تھے، یہ نشان محض بے معنی نشان نہ تھے بلکہ اپنے پیچھے ایک مفہوم رکھتے تھے، چنانچہ "اِتَّسَمَ الرَّجلُ" کا مطلب ماہرینِ زبان نے یہ بتایا ہے کہ "جَعَلَ لِنفسِہٖ علاماتٍ لِیُعرفَ بِھَا" یعنی شناخت کی غرض سے اپنے لیے اس نے کچھ علامتیں بنالیں، حضرت حسانؓ بن ثابت کا یہ شعر ہمارے قول

کی بہت بڑی دلیل ہے،

"ہر قبیلہ کی ایک سمت ہوتی ہے جس سے اس کو پہچانا جاتا ہے، ہماری "سمت" شفا گو ئی ہے .... ہمارے "سمات" دشمنوں کو دسیاہ اور دوستوں کو سرخ رو کرتے ہیں ۔"

حضرت حسانؓ کے اس قول سے ظاہر ہے کہ عرب کے ہر قبیلے کا ایک "سماتی" نام تھا، اس کا تو ہمیں ثبوت نہیں ملتا کہ ظہور اسلام کے دنوں میں لوگ برہمنوں کی طرح اپنے ہاتھوں پر نقوش بناتے تھے لیکن اس کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ عرب اپنے اونٹوں اور دیگر املاک پر اپنے اپنے "سمات" نقش کیا کرتے تھے، ایک زمانے میں شاید اپنے ہاتھوں پر سمات منقوش کرتے رہے ہوں گے۔

غالباً "سمات" کا ابتدائی مقصود اونٹ کے مالک کو نامزد کرنا تھا، اونٹ کے بدن پر جو نقوش بنائے جاتے تھے، انہیں دیکھکر لوگ جان جاتے تھے کہ اس اونٹ کا مالک کون ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے،

حتی سقوا آبالهم بالنار   والنار قد تشفى من الأوار

چونکہ سمات عموماً آگ سے داغ کر بنائے جاتے تھے، اس لیے "سمة" کو نار یعنی آگ بھی کہتے تھے، شاعر کا مدعا یہ ہے کہ "آگ" (یعنی داغ) دیکھ کر لوگوں نے ان کے اونٹوں کو سیراب کر دیا، کیونکہ وہ جان گئے کہ یہ اونٹ کس کے ہیں، شاعر کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اکثر نقوش جو اونٹوں کے بدن پر ہوتے تھے، ان کا مقصود اونٹوں کے مالکوں کو نامزد کرنا تھا، عرب کے ہر قبیلے کا ایک نہ ایک نشان مخصوص تھا جس کو دیکھ کر لوگ جان جاتے تھے کہ اونٹ کا مالک کس قبیلے سے ہے،

"سمات" جنھیں لوگ اپنے اعضاء، اپنے اونٹوں اور دیگر املاک پر بنایا کرتے تھے اگرچہ حقیقت میں ابتداءً لایعنی نقوش تھے، مگر بعد میں یہ نقوش بامعنی الفاظ بن گئے، یہی وجہ ہے کہ

وسم سے مشتق لفظ "وشمۃ" با معنی کلمہ اور کلام پر بھی دلالت کرتا ہے، اہل عرب بولتے تھے کہ

واللہ ما کتمت وشمۃً حکاھا — قسم ہے اس نے جو بات کہی اس میں نے نہیں چھپایا،

ما عصیتك وشمۃً — میں نے آپ کی ایک بات بھی نہیں مانی،

بیننا وشمۃ — ہمارے درمیان کچھ ان بن ہے۔

ان محاوروں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہر "وسم" یا ہر "وشم" عربوں کے تصور میں ایک بامعنی کلمہ یا کلام تھا، ایک روایت ہے کہ

ان داؤد علیہ السلام وشم — یعنی داؤد علیہ السلام نے اپنی خطا کو اپنے

خطیئتہ فی کفہ — ہاتھ پر منقوش کر لیا تھا،

یہ روایت محض غلط ہے پھر بھی لسانی حیثیت سے اس بات دلیل ہے کہ واضع روایت کے تصور میں "وشم" کا مفہوم بامعنی لفظ یا بامعنی عبارت منقوش کرنا تھا، اونٹوں، پہاڑوں، لکڑی کے تختوں یا پتھر کی لوحوں پر منقوش کیے جانے والے اکثر سمات بامعنی اشارات، الفاظ اور عبارتیں تھیں،

وہ نشانات جو اونٹوں پر آگ سے داغ کر لگائے جاتے تھے، ان سے صرف اونٹوں کے مالک ہی کا پتہ نہیں چلتا تھا، بلکہ بعض اوقات ان سے بہت سے واقعات بھی سمجھ لیے جاتے تھے، ایک غارتگر شاعر اپنی اونٹنی پر یہ کہکر ناز کرتا ہے۔

ونار اھل العلمین نارھا — نجار کل ابل نجارھا

ہر اونٹ کا گھرانا اس کا گھرانا رہ چکا ہے، اور دنیا بھر کے داغ اس کے داغ ہیں

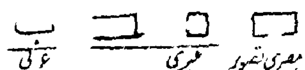
شاعر کا مقصود یہ ہے کہ میرا اونٹ باری باری کئی غارت گر قبائل کی ملک رہ چکا ہے، ہر قبیلہ کی "سمت" اس کے بدن پر نقش ہے، اس طرح یہ اونٹ بذات خود ایک چلتا پھرتا فوشتہ ہے، اس کے اعضائے جسم پر جو نقوش ثبت ہیں ان میں بہت سے واقعات کا ایک دفتر پنہاں ہے،

ان دلائل سے یہ بات پورے طور سے عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ "سمات" بے معنی نقش و نگار نہیں تھے، بلکہ ہر نقش اپنے اندر ایک مفہوم اور ایک معنی رکھتا تھا، جس طرح آج ہم حروف کو ایک خاص ترتیب دے کر ایک لفظ لکھتے ہیں، یوں ہی عرب بھی کبھی آڑے ترچھے خطوط کھینچ کر اپنے خیالات کی نقش آرائی کیا کرتے تھے، یہ "سمات" صرف حروف ہی کا کام نہیں دیتے تھے، بلکہ بامعنی الفاظ بھی ہوا کرتے تھے، ممکن ہے کہ آپ کو حیرت ہو کہ ایک مختصر سا نقش اتنی بڑی عبارت کو کس طرح ادا کرتا ہوگا، لیکن یہ بات بعض "سمات" کی تشریح سے بہت حد تک واضح ہو جائے گی،

ابتدا میں ہم نے بتایا ہے کہ ہر "سمت" کسی نہ کسی شخص کے نام کو یا کسی نہ کسی بات کو ظاہر کیا کرتی ہے، عربی "سماتِ ابل" میں سے ایک کا نام "سطاع" ہے، خیمے کے بیچ کے ستون کو سطاع کہتے ہیں، اس نقش کی صورت الازہری کے بیان کے مطابق ہماری اردو تحریر کے الف کی سی تھی، عربی تحریر میں یہ نقش الف کا کام دیتا ہے، کلدانی تحریر میں ایک لمبی میخ کے دائیں اوپر تلے دو چھوٹی چھوٹی میخیں ⊤⊥ رکھنے سے حرف "ا" بنتا ہے، اور اس نقش کو مکرر لکھا جائے تو اسکی آواز "ا" سے کی سی ہوتی ہے، آ عربی میں کلمۂ "زجر" ہے، ابن شمیل نے "لسان العرب" میں لکھا ہے کہ جب کسی جانور کو بلانا ہوتا یا کسی ہرے بھرے کھیت میں جانے سے اسے منع کرنا مقصود ہوتا تو "آء" بولتے، لسان العرب میں مذکور ہے کہ آء نام ہے ایک سدا بہار درخت کا جس کی عمر بہت طویل ہوتی تھی، مگر اس کے پتے جانوروں کے حق میں زہر قاتل تھے، اس درخت کو "آءَة" بھی کہتے تھے، بائبل میں جہاں جہاں اس درخت کا ذکر ملتا ہے، ان سب مقامات کو یکجا کرکے پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ کنعان کے باشندے اس سدا بہار درخت کے نیچے برہنہ ہو کر رقص کرتے تھے، اور اس رقص میں مرد عورت فعل ناشایستہ کے مرتکب بھی ہوتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ یہ رقص و برہنگی حضرت آدم و حوا کی یادگار ہے جس طرح وہ "شجر ممنوعہ" کے پاس برہنہ ہوئے تھے، اسی سنت کی گویا یہ بھی یادگار

بہر نوع یہ "سمت" جس کا نام "سطاع" ہے اور جس کی شکل "الف" کی سی ہے، کبھی ایک با معنی
نقش تھا جو عموماً زجر و توبیخ جیسے معانی کو ادا کرنے کے علاوہ "آ" کی آواز بھی دیتا تھا،

"سُطاع" کی بابت الازہری نے لکھا ہے کہ اونٹ کی گردن پر یہ نقش لگایا جاتا تھا، کھڑی لکیر
کو "سُطاع" کہتے ہیں اور "ب" جیسی پڑی لکیر کو "علاط" کہتے ہیں، ایک عربی ماہر لسان ابو علی کا بیان
ہے کہ "علاط" کبھی تو ایک لکیر ہوتی تھی، کبھی تلے اوپر دو لکیریں ہوتی تھیں اور کبھی ہر چہار طرف سے
خطوط کھینچ دیے جاتے تھے، اب ان عربی "سمات" کا بابلی حروف سے مقابلہ کیجیے، تلے اوپر دو
پڑی لکیریں عموماً رکھ دیجیے (═) یہ نقش انگریزی "B" کی آواز دے گا، یہی نقش ⊐ عبری
میں ב ہو جائے گا، پھر حمیری میں ب بن کر عربی میں ب ہو جائے گا، "باءة" کے معنی عربی
میں باڑے کے ہیں، عبرانی نام اس نقش کا بیت یعنی گھر ہے، گویا یہ نقش گھر کے مفہوم کو ادا کرتا تھا،
"با" کے معنی عربی میں مقام یا منزل کے آتے ہیں، ذیل میں "ب" کی مختلف شکلیں جو دوسری زبانوں
میں ہیں ہم درج کرتے ہیں



یہ شکل "بیت" کی تھی جو بعد کو مختلف زبانوں میں حرف "ب" بنی،

ایک "سُطاع" یعنی کھڑی لکیر کو جب ایک "علاط" یعنی پڑی لکیر کاٹ دے تو چلیپا
کی صورت بنجاتی ہے، اس نقش × کا عربی نام "تواء" ہے، اس نام سے عربی لفظ توِی اور
تادِ مشتق ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ "تَوِیَ مَالُہٗ" یعنی اُس کا مال ضائع ہو گیا، اس سے
ملتی جلتی ایک مصری شکل ہے ✗— یہ ایک ٹانگ پر دھری ہوئی چھری ہے، یہ شکل قتل،
خونریزی، جنگ اور جدال جیسے معانی کو ادا کرتی تھی، اس نقش کا مصری تلفظ "تبا" ہے۔

عربی زبان میں تبا، یتبو، تبو" کے معنی ہیں "جنگ کرنا یا لوٹ مار کرنا" اس مصری نقش کا عبرانی نام "تاو" ہے، یہ نقش کبھی کبھی سامی زبانوں میں "ت" کی آواز دیتا ہے، یہ نقش X حمیری وغیرہ کئی زبانوں میں "تائے قرشت" کا کام دیتا ہے، یہی شکل + تو ذرا سدھر کر انگریزی حرف T بنی۔ "تواء" X کے نیچے دونوں سروں پر دو حلقے لگا دیے جائیں تو قینچی X کی شکل بن جاتی ہے، اس شکل کا سماتی نام "جلمر" ہے، اس چیز کا جو کام ہے اسے عربی لفظ قص (بال کاٹنا) ادا کرتا ہے، انگریزی حرف X کی وجہ تسمیہ اس عربی لفظ قص سے بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ X سامی نقوش ہی کی ایک شکل ہو، کیونکہ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یورپ کو حرف ابجد کی تعلیم کنعان کے تاجروں نے دی، جنھیں "فینیقی" کہا جاتا ہے۔ اوپر "تواء" کی جتنی تصویریں دی گئی ہیں، ان سب میں مشترک جو معنی ہیں، وہ یہ ہیں کہ کسی چیز کو کسی چیز سے کاٹنا یا جراحت پہنچانا۔

"سطاع" (کھڑی لکیر) کے اوپر ایک حلقہ لگا دینے سے عربی سمت "ذاحل" ♀ بنجاتی ہے، جو حمیری میں حطی کے حرف سوم کا کام دیتی ہے، ایک حلقہ اور لگا دیا جائے تو یہ شکل ♀ بن جائے گی، اس "سمت" کو لوگ "قید الفرس" کہتے تھے، حمیری تحریر میں یہ نقش "ت" کی آواز دے گا، اس "سمت" کی بابت ایک شاعر کہتا ہے:

کوم علی اعناقہا قید الفرس تنجو از الیل تدانی والتبس

اس شعر سے ظاہر ہے کہ "قید الفرس" والی سمت بے معنی نہیں تھی، نہایت تیزرو اونٹنیوں کی گردن پر یہ نقش بنایا جاتا تھا، گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اونٹنیاں اتنی تیز رو ہیں کہ گھوڑے کو بھی قید کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں، یہ نقش ♀ جسے قید الفرس کہتے ہیں، ایسی اونٹنیوں پر لگایا جاتا تھا جو تیز رو ہوں اور غارت گری کے لیے استعمال کی جاسکیں، حمیری میں یہ نقش "ث"

کی آواز دیتا ہے، اور عربی میں کہتے ہیں

انأ ئی فی القوم اس نے لوگوں کو زخمی کیا،

انائی غالباً اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔

"قید الفرس" کے برخلاف "سمت زاجل" ایسی اونٹنیوں پر لگائی جاتی تھی جو کہ ذبح کرنے کے لیے پالی جاتی تھیں،

سمات میں سے ایک نام "شعب" ہے، ابن شمیل نے اس کی صورت یہ بتائی ہے کہ

"خطّان یُلاقی بین طرفیھا الاعلیین والاسفلان منفرقان"



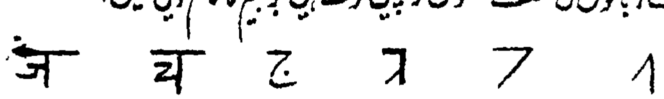
یہ شکل ہمدانی کے بیان کے مطابق حمیری جیم کے مختلف اشکال میں سے ایک تھی، اس شکل کی دائیں لکیر کو ذرا دراز کر دیجئے تو عرب کی ایک قوم "بنو منقر" کا نام بنجائے گا۔

بنو غطفان اور بنو ہوازن کے دو قبیلے بنو غاضرہ کہلاتے تھے، ان کے نشان کا ذکر ایک شاعر ان الفاظ میں کرتا ہے،

نار علیھا سِمَة الغواضر الحلقتان والشعائب الفاجر

اس شعر سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی شکل کو "بنو غاضرہ" پڑھا جاتا تھا،

ہم نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ "شعب" یا "شعاب" کی شکل ایک لکڑی میں بندھی ہوئی "انکسی" کی سی ہوتی ہے، یہ صورت حمیری جیم کی مختلف شکلوں سے ملتی جلتی ہے، ذیل میں ہم مختلف زبانوں کی مختلف شکلوں کو پیش کرتے ہیں جو جیم کا کام دیتی تھیں،



سمت شعاب حمیری جیم عبری جیم عربی جیم ہندی چ ہندی جیم

اوپر کے نقشے سے اندازہ ہوگا کہ عربی سمت "شعاب" متعدد تحریروں میں جیم کا کام دیتی ہے،

ابو علی اور ابن شمیل نے سمت "شاب" کی ایک صورت یہ بھی ¬ سی بتائی ہے، ان ماہرین زبان کے قول کے مطابق سمت "شاب" کے دونوں سروں پر دو حلقے لگا دینے سے "بنو غاضرہ بن بغیض بن ریث بن غطفان" کا نام بن جاتا ہے، اور اس سمت کو "سمت الغواضر" کہا جانے لگا ہے،

عربوں میں دستور تھا کہ جب مورث مرجاتا اور جائداد کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا تو ایک فریق کہتا

عَذِّرْ عَنِّیْ اِبِلَکَ ایک مزید نشان لگا کر اپنے اونٹوں کو ممتاز کر لو،

دوسرا فریق قدیم نشان میں دو خط کا اضافہ کر دیتا، اس اضافہ خط کو "تعذیر" اور اس پر مزید خط جو ہوتا اسے "عاذور" کہتے، جس کی جمع "غواذیر" ہے، یہ جو عربوں میں دستور تھا اس کا فائدہ یہ تھا کہ لوگ اونٹ کی سمت دیکھ کر مالک کا پورا نام و نسب جان لیا کرتے تھے، "سمت الغواضر" میں جو دو خطوط کا اضافہ کیا جاتا اس سے قینچی ✕ جیسی شکل بن جاتی، ہم نہیں جانتے یہ کس قبیلے کی "سمت" تھی، لیکن اس کا سماتی نام "جالم" یعنی قینچی ہے، اس چیز کا جو کام ہے اسے عربی لفظ "قص" (قینچی سے کاٹنا) بخوبی ادا کرتا ہے، انگریزی حرف X کی وجہ تسمیہ عربی کی سمت جالم پورے طور سے بتاتی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ حرف X سامی نقوش سے ماخوذ ہے تو یہ اس لیے صحیح ہے کہ حروف ابجد کی تعلیم یورپ کو جس نے دی وہ ہیں فینیقی تاجر (Phaenician)

عربی سمات میں سے ایک نام "مجدح" ہے، جس کے معنی ہیں "مَثْهِنٌ"، دو لکڑیاں صلیب کی شکل میں رکھ کر اگر اس کے نیچے ایک ڈنڈی لگا دی جائے تو سمت مجدح کی شکل اس طرح ✝ کی ہو جائے گی، یہی شکل بدلتے بدلتے Ψ ترشول جیسی بنی، جو کہ حمیری طرز تحریر میں حاء حطی کا کام دیتی ہے، تقریباً ایسی ہی شکل ▲ بابلی تحریر میں "حی" کی آواز دیتی ہے۔

عربی "سمات" میں ایک نام "حَوَرَاء" اس کی شکل انگریزی حرف "O" کی سی ہوتی تھی، یہ شکل کئی سامی زبانوں میں صرف عین ع کی ہے، یہ شکل عربوں کے تصور میں کوئی اہم مطلب

رکھتی تھی، ابوجہل نے اپنے گھٹنوں پر یہ شکل منقوش کررکھی تھی، اونٹ کی ران پر جب یہ شکل بنائی جاتی تھی تو اس کو "حلق" کہتے تھے، اور جس اونٹ پر یہ نشان بنایا جاتا تھا اسے "ذوحلق" اور "محلّق" کہتے تھے، نابغہ کا ایک مصرع ہے:

وذکرت من لبن المحلّق شربۃ

اس مصرع سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نشان اس اونٹنی پر لگایا جاتا جس کا دودھ خوش ذائقہ ہوتا، اس سمت کا دوسرا نام "تحجیر" اور "حاجور" بھی تھا، جس اونٹ پر یہ نشان ہوتا، اسکا مطلب یہ ہوتا کہ اسے گزند نہ پہنچاؤ، اسے ستانا یا کسی طرح کا نقصان پہنچانا "حجر محجور" یعنی قطعی ممنوع ہے،

عربی "سمات ابل" میں سے میں نے چند کا جو تذکرہ کیا ہے، ان سے بخوبی یہ اندازہ ہوگیا کہ سمات عرب مختلف زبانوں میں ا، ب، ت، ث، ج اور ح کا کام دیتے ہیں، عرب کے اونٹوں پر جو نقش ہوتے تھے، وہ لایعنی کلمات نہیں تھے، بلکہ اظہار خیال کے لیے وہ ہماری آج کی تحریروں کا سا کام دیتے تھے، وہ بامعنی کلام اور بامعنی عبارتیں تھیں، ان میں سے کچھ نقوش تو مختلف اقوام کے حروف تہجی بنے اور کچھ نقوش قبائل کے اسماء بن گئے،

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کا پس منظر

اسلام میں نسلی غرور کا خاتمہ

از
جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ کے ساتھ آپ کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کی شادی کے دینی مصالح تو معلوم و مشہور ہیں لیکن زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت زینبؓ سے نکاح کرنا بھی دینی مصالح پر مبنی تھا جس کی دلنشین تشریح اس مضمون میں کی گئی ہے ، ''م''

دنیا میں نسل کا غرور ہمیشہ سے چلا آ رہا اور اب تک چلا آ رہا ہے، بہت سی قومیں ایسی ہیں جنھوں نے نسل کے اعتبار سے انسانوں کو تقسیم کر رکھا ہے، اسلام کی پاکیزہ تعلیم آنے سے پہلے عرب میں بھی نسلی غرور پورے عروج پر تھا، قریشی اور ہاشمی عرب میں سب سے زیادہ اونچی ذات کے سمجھے جاتے تھے، چنانچہ قریشی حج کے موقعہ پر مزدلفہ سے واپس آ جاتے تھے، عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ جانا بھی ان کو پسند نہ تھا، قریشیوں نے اپنے نسلی غرور کا مظاہرہ جنگ بدر میں کیا جبکہ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ کی طرف سے جو انصاری مسلمان ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے آتے ہیں، ہم ان سے لڑنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ ہمارے درجہ کے نہیں ہیں، گویا غرور نسل اس درجہ کو پہنچ گیا تھا کہ قریشی اپنے سے کم درجہ کے ساتھ لڑنا بھی توہین سمجھتے تھے،

اسلام نے جہاں خدا کی وحدانیت کا پیغام دیا کہ سب انسان ایک خدا کے بندے ہیں، اسی طرح اس نے یہ بھی کہا کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں نسل، قومیت، وطنیت اور مال کے اعتبار سے کسی کو چھوٹا بڑا نہیں سمجھا جائے گا، سب رب العالمین (سارے جہان کا پالنہار) کے بندے ہیں، اور ایک آدم کی نسل ہیں، اس لیے کسی قسم کی بڑائی چھوٹائی انسانی نسل میں برداشت نہیں کیا جائے گی، البتہ انسانوں میں جو نیک ہے اور جس کا تقویٰ (کیرکٹر) بلند ہے، وہ قابل عزت سمجھا جائےگا، اور جس کا کیرکٹر اور تقویٰ گر چکا ہے، وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا، مگر اس کے باوجود بھی جو آدمی بدترین زندگی بسر کرتا ہو، اس کو بھی دینی کیرکٹر اور ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں کیا جائے گا،

نسلِ انسانی کے غرور کو ختم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا قدم اٹھاتیں جس سے عملی طور پر اس نسلی غرور کا خاتمہ ہو جائے، یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پیغمبروں کا طریقہ ہر معاملہ میں یہ ہے کہ وہ ہر نیکی اور سچائی پر خود عمل کرتے ہیں، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اس کی دعوت دیتے ہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نسلی غرور کے خاتمہ کے لیے اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ (جو کہ قریشی اور ہاشمی لڑکی تھیں) کا نکاح حضرت زید بن حارثہؓ سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے تجویز فرمایا،

اس تجویز کو سنکر زینبؓ اور ان کے بھائی نے انکار کیا، کیونکہ یہ تجویز کہ ایک ہاشمی لڑکی کا نکاح غلام سے کر دیا جائے، پورے عرب کی سرزمین کے نسلی غرور کو چیلنج تھا،

آج ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ اہلِ عرب کو اس نکاح کی تجویز سے کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تجویز چونکہ قرآن کی تعلیم اور اللہ تعالیٰ کے ارشادات کے مطابق تھی، اس لیے وحی الٰہی کے ذریعہ زینبؓ اور ان کے بھائی کو تنبیہ کی گئی،

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا	جب خدا اور اس کا رسول مومنین کے
قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ	کسی معاملہ کا فیصلہ کردیں تو ان کو پھر
لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ	اپنے معاملہ کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا،
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا	اگر کوئی اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کریگا
مُّبِيْنًا	وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہوگا،

قرآن کا یہ حکم سنتے ہی بہن بھائی نکاح کرنے پر راضی ہوگئے، چنانچہ حضرت زینبؓ کا نکاح زید بن حارثہؓ سے کر دیا گیا، یعنی ایک ہاشمی لڑکی کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز اور اللہ تعالےٰ کی مرضی سے ایک غلام کے ساتھ کر دیا گیا، نکاح کے بعد میاں بیوی میں ناموافقت پیدا ہوگئی، یعنی زینبؓ اپنے خاوند زید بن حارثہؓ کو اپنی نظر میں نہیں لاتی تھیں، ان سے جھگڑا رہتا تھا، اور ایسا ہونا ایک قدرتی امر تھا، کیونکہ دنیا کی انسانی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک اونچی ذات والی اور آزاد لڑکی کا نکاح ایک غلام سے کر دیا گیا ہو، عرب کی عورتوں نے حضرت زینبؓ کو کیا کہا ہوگا، یہ سب باتیں تجربہ کے ساتھ سمجھ میں آسکتی ہیں، میرا تجربہ ہے کہ عورت نسلی غرور اور مالی سربلندی کی وجہ سے خاوند کو کبھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھتی، اور اگر اس کا نکاح کسی چھوٹی ذات کے لڑکے سے کر دیا جائے تو اس کے خاندان کے لوگ اس کو طعن دیتے ہیں، جس کی وجہ سے میاں بیوی میں جھگڑا ہو جاتا ہے، جب میاں بیوی میں جھگڑا زیادہ بڑھ گیا اور حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا، تو وہ بار بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہتے تھے کہ میرا حضرت زینبؓ کے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا، قرآن کے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے بار بار فرمایا کہ خدا سے ڈر اور طلاق کا ارادہ نہ کر، مگر بالآخر حضرت زیدؓ نے مجبور ہوکر حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی،

حضرت زینبؓ کو اب یکے بعد دیگرے دو ذلتوں کا سامنا کرنا پڑا، ایک یہ کہ ان کا نکاح غلام سے کیا گیا، اور دوسری یہ کہ غلام نے ان کو طلاق دیدی۔ اس لیے نبی کریمؐ کے قلب مبارک میں یہ خیال آیا کہ زینبؓ نے اسلام کی سچائی کو عملی زندگی پہنانے کے لیے ایک غلام سے نکاح کیا اور غلام نے اسے طلاق دیدی، اس لیے اس کی دلجوئی کے لیے ضروری ہے کہ میں اس سے نکاح کر دوں، تاکہ اس کی ذلت عزت سے بدل جائے، مگر حضورؐ نکاح کرنے سے اس لیے رک رہے تھے کہ آپ حضرت زید بنؓ حارثہ کو منھ بولا بیٹا پکارتے تھے، اور عرب میں منھ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا، اور آپ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے میں تمام اہل عرب چلا اٹھیں گے، تب وحی الٰہی نازل ہوئی کہ ہم نے تمہارا نکاح زینب سے کر دیا ہے، تم اللہ سے ڈرو، لوگوں سے نہ ڈرو، اور کوئی منھ بولا بیٹا، بیٹا نہیں ہوتا، بیٹا وہی ہے جو حقیقی بیٹا ہو، اس نکاح سے دنیا کی ایک سب سے بڑی رسم کہ منھ بولا بیٹا بیٹا ہوتا ہے ختم کر دی گئی، اور اس واقعہ نے نسلی غرور کا ہمیشہ کے لیے عرب میں خاتمہ کر دیا، پھر یہی عرب تھے کہ انھوں نے غلاموں کو لڑکیاں دیں اور ان سے لڑکیاں لیں، اور کسی نے اس میں کوئی عار محسوس نہیں کی، اور پھر ان ہی میں سے بڑے بڑے انسان پیدا ہوئے،

ایک عورت چونکہ غلام سے نکاح کرنے میں ذلیل سمجھی گئی، اور جب غلام نے اسکو طلاق دیدی تو اس کی دہری ذلت ہوئی، اس لیے اس کی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ سب سے بڑے خدا پرست انسان نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے نکاح کریں، تاکہ لوگ یہ بات سمجھ لیں کہ غلام سے نکاح کرنا کوئی ذلت نہیں، اور اگر وہ طلاق دیدے تو عورت ذلیل نہیں ہو جاتی، بلکہ شریف آدمی کو چاہیے کہ وہ اس سے شادی کرلے۔

یہ قدم آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک پیغمبر ہی اٹھا سکتے تھے، اور کسی کے بس کی بات نہ تھی،

کفر سے توبہ کرنی آسان ہے لیکن رسموں سے توبہ کرنی مشکل ہے، مدینہ میں سچے اور مخلص مسلمانوں میں اس واقعہ سے حیرت پیدا ہو گئی، لیکن جب ان سچے مسلمانوں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن کا نکاح ایک غلام سے کر دیا ہے، تو وہ لوگ بھی غلاموں کو لڑکیاں دینے لگے اور اسی طرح لینے لگے،

آج دنیا میں اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لیے بڑے بڑے اقدام کیے جاتے ہیں، قانون بنائے جاتے ہیں، مگر ایک سو برس کی اس کوشش سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، انسانی نسل کی برتری اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جبتک کہ رشتوں کو خون کے ذریعہ ایک نہ کر دیا جائے،

ہندوستان میں ہریجنوں کو برابر کرنے میں تمام کوششیں اس لیے ناکام ہوئیں اور ہونگی کہ اونچی ذات کے لوگ نہ ان کو لڑکیاں دے سکتے ہیں اور نہ ان کی لڑکیاں لے سکتے ہیں، اگر ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی لیڈر ہریجن کی لڑکیوں سے شادی ہی کر لیتے تو تب بھی ان کی عزت کا کوئی راستہ نکل آتا، میں نام لیے بغیر کہتا ہوں کہ بڑے سے بڑے ہندوستانی لیڈر میں جرأت نہیں ہے کہ اچھوت سے لڑکی لے اور دے۔

تلخیص و تبصرہ

شاہجہانی عہد کا ہندوستان

ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ نے ۱۹۳۱ء میں لندن یونیورسٹی میں پی، ایچ، ڈی کے لیے "ہسٹری آف شاہجہان آف دہلی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا، جو بہت مقبول ہوا، اس کتاب میں انھوں نے شاہجہان اور اس کے عہد کی جو قلمی تصویر کھینچی ہے، اس کے کچھ اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

شاہجہانی دربار | شاہجہانی دربار اپنی شاہانہ شوکت و حشمت کے لحاظ سے منتہائے کمال پر تھا اور اس کے عہد میں مغل سلطنت میں بڑی خوشحالی اور دولت کی بڑی فراوانی تھی، ہندوستان کے تمول کی شہرت سن سن کر بیرونی ممالک کے سیاح یہاں بکثرت آتے، اور شہنشاہ کے جاہ و جلال کو دیکھکر چکا چوند ہوجاتے، اس کے دربار کا تزک و احتشام ان کے تخیل سے بہت زیادہ ہوتا تھا، اور وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوجاتے، برنیر، ٹیورنیر اور منوکی نے اپنے تاثرات اپنی کتابوں میں قلمبند کئے ہیں، اگرچہ ان میں بہت سی باتیں غیر معتبر بھی ہیں، پھر بھی ان کے بیانات سے مغل دربار کے عجائبات کا کچھ نقشہ سامنے آجاتا ہے،

شہنشاہ کی ذات | دربار کی سطوت و عظمت کا مظاہرہ شاہجہان کی ذات سے ہوتا تھا، وہ اپنے جلال و جبروت کے باوجود بڑا ہی محنتی اور جفاکش تھا، صفائی اور ستھرائی کا غیر معمولی لحاظ رکھتا تھا،

نماز کا بڑا پابند تھا، اور جب رمضان شریف میں دار السلطنت میں رہتا تو روزے بھی پابندی سے رکھتا، رمضان کی راتوں میں تراویح بھی پڑھتا، اور خیرات تقسیم کیا کرتا، عطر کا دلدادہ تھا، اس کے کپڑے ہمیشہ عطر میں بسے رہتے تھے، گفتگو میں بڑا خلیق اور متواضع تھا، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی "تو" سے مخاطب نہ کرتا، طلوع آفتاب سے دو گھڑی پہلے جاگتا، غسل اور وضو کر کے اپنی خاص مسجد میں چلا جاتا، اور مصلے پر بیٹھ کر فجر کی نماز کے وقت کا انتظار کرتا، نماز کے بعد طلوع آفتاب تک تسبیح پڑھتا رہتا، سفر میں نمازیں خیمہ ہی میں ادا کرتا، مسجد سے نکل کر درشن کے لیے جھروکہ پر آکر کھڑا ہو جاتا، اس کی ابتدا اکبر ہی کے زمانہ سے ہوئی تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ رعایا کا تعلق بادشاہ سے براہ راست رہے، اور وہ اس کو دیکھ کر مطمئن رہے کہ بادشاہ صحیح و سالم اور تندرست ہے، درشن کے موقع پر رعایا کو عام اجازت تھی کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر حکومت کے بڑے بڑے حکام کے خلاف عدل و انصاف طلب کر سکے، اس وقت شہنشاہ پوری توجہ سے اپنی رعایا کی ساری شکایتیں سنتا، اور بڑے بڑے حکام کو سخت سے سخت سزا دینے میں مطلق تامل نہ کرتا، اور یہ مغل حکومت کا ایک قابل تعریف پہلو ہے کہ رعایا کو انصاف حاصل کرنے کی اتنی سہولت حاصل تھی،

دیوانِ عام | جھروکہ سے بادشاہ دیوانِ عام میں آتا، یہ سنگ سرخ کی ایک شاندار عمارت تھی، جو چالیس ستونوں پر بنائی گئی تھی، یہ تین طرف کھلا ہوا صحن تھا، چوتھی طرف جالیدار دیوار تھی، جس کے وسط میں بڑے ہال کی سطح سے اوپر سفید سنگ مرمر کا ایک تخت تھا، جس میں مختلف قسم کی اعلیٰ صنعتیں دکھائی گئی تھیں، آگرہ کا دیوانِ عام سادہ ہے، اس میں دہلی کے دیوان عام کی جیسی ترصیع و آرائش نہیں ہے، لاہور کے قلعہ میں بھی ایک دیوان عام ہے،

اس دیوان میں بڑے بڑے عہدیدار، درباری اور لشکر کا ترتیب کے ساتھ کھڑے ہو کر بادشاہ کی آمد کا انتظار کرتے رہتے، ان کی نظریں تخت پر جمی رہتیں، دیوان کے حاشیہ کے بیرونی

حصہ میں چاندی کا کٹگھرہ تھا، جس کے اندر دو صدی سوار سے اوپر کے منصبدار داخل ہو سکتے تھے، وہ کھڑے کھڑے تخت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے، ستونوں کے پاس معزز منصبداروں کی جگہیں متعین تھیں، ان کے اردگرد قورچی شاہی جھنڈے اور علم لیے کھڑے رہتے، ان کی پشت دیوار کی طرف ہوتی، تخت کے دائیں بائیں سلطنت کے بڑے بڑے ارکان ہوتے، جو بادشاہ کے حضور میں کاغذات پیش کرنے کے لیے تیار رہتے، چاندی کے کٹگھرے کے بعد کی جگہ لکڑی سے گھری ہوتی، اور یہ لکڑیاں سرخ رنگ کی ہوتیں، یہ جگہ دو صدی سوار سے کم درجہ کے منصبداروں کے لیے مخصوص ہوتی، ان حدود میں تین پھاٹکوں سے ہوکر داخلہ ہوتا تھا، جہاں گرز برداروں کا پہرہ ہوتا تھا،

دیوان عام میں بادشاہ کا ورود سات بجکر چالیس منٹ پر ہوتا، اس کے تخت پر جلوہ افروز ہوتے ہی میر بخشی منصب داروں کی عرضداشتیں پیش کرتا، اور ان منصبداروں کو سامنے لاتا جنکی ترقی ہونے کو ہوتی، جو منصب دار باہر بھیجے جاتے، ان کو خلعت عطا کیا جاتا، اسکے بعد صدر الصدور کیطرف سے غربا، و مساکین کی درخواستیں پیش ہوتیں، اور پھر علماء و صلحاء کا تعارف کرایا جاتا، اسکے بعد میر سامان اور دیوان بیوتات اپنے اپنے شعبوں کے کاغذات پیش کرتے، اس کے بعد احدیوں کے بخشی، میر آتش اور مشرف توپخانہ اپنے اپنے محکموں کے بھرتی ہونے والے ملازموں کو پیشی میں لاتے، اس کے بعد دربار کے معزز منصب دار صوبہ کے صوبہ داروں، بخشیوں اور دیوان کی عرضداشتوں سے بادشاہ کو باخبر کرتے، بادشاہ ان کو خود پڑھتا، اور ان پر احکام جاری کرتا، سب سے آخر میں عرض مکرر منصب، جاگیر اور نقدی کے متعلق عرضیوں کو پیش کرتا، جب یہ سارے کام ختم ہو جاتے تو حاضرین کی ضیافت ہاتھیوں اور گھوڑوں کی نمائش سے کی جاتی،

دیوان خاص اس کے بعد بادشاہ دیوان عام سے دیوان خاص میں آتا، یہاں دو گھنٹے رہتا، جو کام انتظامی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر دیوان عام کے کھلے دربار میں انجام پانے کے قابل نہ ہوتے

وہ دیوان خاص میں انجام پاتے، اس وقت صرف وزراء حاضر ہوتے تھے، بادشاہ مختلف عرضداشتوں کو سنکر ان پر یا تو دست خاص سے احکام جاری کرتا یا لکھوا دیتا، ضرورت مندوں کی مدد معاش کی منظوری یہیں سے دی جاتی، مصوری اور جواہرات کے نادر نمونے بھی اسی وقت پیش کیے جاتے، داروغۂ عمارت مختلف شاہی عمارتوں کے نقشے بھی اسی وقت پیش کرتا، باہر سے جو باز، شکرے اور پالتو چیتے آتے وہ بھی یہیں لاکر نذر کیے جاتے۔

شاہ برج | دیوان خاص سے بادشاہ شاہ برج میں آتا، جہاں انتہائی راز کی باتیں ہوتیں، یہاں شہزادے یا دو چار مخصوص شاہی حکام کے علاوہ اور کسی کو بار نہ ہوتا تھا، تمام پوشیدہ احکام یہیں سے صوبوں میں بھیجے جاتے، خالصہ، طلب اور تنخواہ سے متعلق بعض امور یہیں طے پاتے۔

حرم | شاہ برج سے بادشاہ دوپہر کے وقت حرم میں جاتا، خاصہ تناول کرکے قیلولہ کرتا، جب وہ اٹھتا تو ممتاز محل غرباء و مساکین کے لیے خیرات اور امداد کی سفارشیں کرتیں، غریب اور مفلوک الحال لڑکیوں کے جہیز کے سامان کا حکم اسی وقت جاری ہوتا، بعض لڑکیوں کی شادیاں بھی شاہی خرچ سے انجام پاتیں، یتیموں اور بیواؤں کے روزینے مقرر ہوتے، محل میں جو بھی احتیاج لے کر جاتا وہ محروم واپس نہ ہوتا، اور روزانہ بڑی بڑی رقمیں غرباء کی امداد میں خرچ ہوتی رہتی تھیں۔

شام کے مشاغل | بادشاہ تین بجے سہ پہر کو محل سے باہر آجاتا، کبھی کبھی دیوان عام میں آکر محل کے محافظ سواروں کا معائنہ کرتا، لیکن عموماً محل سے نکل کر عصر کی نماز کے لیے مسجد میں چلا جاتا، نماز عصر کے بعد وہ دیوان خاص میں آجاتا، جہاں انتظامی امور کے متعلق پھر مشورہ کرتا، اس وقت کبھی موسیقی سنکر یا ہرنوں کی لڑائی دیکھکر تھوڑی سی تفریح بھی کرلیتا، دیوان خاص میں جس وقت بڑی بڑی قندیلیں روشن کیجاتیں تو ان کی روشنی سے زربفت اور کمخواب کے پردے اور فرش جگمگا اٹھتے، دیوان خاص کی گوناگوں دل آویزیوں ہی کو دیکھ کر اس کی دیوار پر یہ شعر لکھ دیا گیا تھا کہ

اگر فردوس بر روے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

خوابگاہ | آٹھ بجے شاہ برج میں بھی بادشاہ آدھے گھنٹے کے لیے آتا، پھر حرم خانہ میں جاکر رات کا خاصہ تناول کرتا، اس کے بعد کنیزوں کے گانے سنتا، دس بجے بستر پر چلا جاتا، پردے کی آڑ سے اچھی اچھی کتابیں پڑھوا کر سنتا رہتا، جس میں زیادہ تر بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں اور سفرنامے ہوتے تھے، بابر کی تزک اس کو بہت پسند تھی،

انصاف کا دربار | جمعہ کو دربار نہ ہوتا تھا، بدھ کو بادشاہ جھروکہ سے دیوان خاص میں جاتا، اور عدل و انصاف کا دربار منعقد کرتا، بادشاہ وہیں تخت پر بیٹھتا اور مفتی اور فقہا کی موجودگی میں داروغۂ عدالت مقدمات پیش کرتا، بادشاہ مدعی کی باتیں غور سے سنکر شرعی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتا،

دربار کا نظم | دربار میں نظم و ترتیب کا غیر معمولی لحاظ رکھا جاتا اس میں کسی قسم کا فرق آنے نہ دیا جاتا، تمام منصب دار اپنے اپنے مناصب کے مطابق کھڑے رہتے، صرف شہزادوں کو بیٹھنے کی اجازت ہوتی، مگر ان کو بھی بیٹھتے وقت بادشاہ کی اجازت لینی پڑتی، جہانگیر نے شاہجہاں کے لیے دربار میں ایک طلائی کرسی رکھوائی تھی، اسی خصوصیت کا اظہار شاہجہاں نے اپنے فرزند ارجمند دارا شکوہ کے لیے کیا تھا، صرف وزیر اور میر بخشی کو تخت کے زینے پر چڑھنے کی اجازت تھی، بقیہ امرا تخت سے دور کھڑے رہتے، اور احترام کا اظہار زمین بوس ہوکر اور چار تسلیم بجالاکر کرتے، زمین بوسی میں امرا اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین کو چھوتے، اور پھر دونوں ہاتھوں کو پیشانی تک لیجاتے، اور تسلیم میں جھک کر اپنی پیشانی، آنکھوں اور دونوں بازوؤں کو ہاتھوں سے چھوتے، شاہجہاں نے سجدہ کی رسم ترک کرادی تھی، پھر زمین بوسی کو بھی چھوڑ کر صرف چار تسلیم بجالانے کا حکم دیا تھا، علماء و مشائخ تسلیم بجالانے سے مستثنیٰ تھے، اور صرف السلام علیکم کہنے پر اکتفا کرتے تھے، بادشاہ جب جھروکہ یا دربار میں آتا تو "شاہ زندہ باد" کے نعرے لگائے جاتے، اگر بادشاہ کسی سے

کوئی بات کرنا چاہتا تو اس کی طرف اشارہ کرتا، گرزبردار اس کو اپنے ساتھ لے جاکر تخت کے سامنے کھڑا کر دیتا، وہ تعظیم بجا لاتا، اور نہایت ادب سے بادشاہ کی باتیں سننے کا منتظر رہتا، اگر بادشاہ اس کو کوئی خلعت عطا کرتا تو وہ اس کو جھک کر لیتا، اور انتہائی تعظیم سے پیچھے ہٹتا ہوا اپنی جگہ پر واپس آجاتا، تخت کی طرف پیٹھ کرنا بدتمیزی سمجھی جاتی تھی،

جشن | دیوان عام اور دیوان خاص یوں تو روزانہ دل آویزیوں سے معمور رہتے تھے لیکن جشن کے موقع پر ان کی زینت، آرایش، رنگینی، سجاوٹ اور جگمگاہٹ کی کوئی حد باقی نہیں رہتی تھی، جشن نوروز، جانشینی کی سالگرہ، عید، بقرعید، شب برات وغیرہ کے مواقع پر منعقد کیا جاتا، طلائی شامیانے کے نیچے امرا اپنے زرق برق لباس میں جمع ہوتے، بادشاہ ہیرے، موتی اور جواہرات سے مرصع ہوکر تخت پر بیٹھتا، اور نذرانے قبول اور انعامات تقسیم کرتا،

دربار کے عجائبات | شاہجہانی دربار کے نوادر میں سب سے اہم تخت طاؤس تھا، ٹیورنیر اس کو دیکھکر مبہوت ہوگیا تھا، اور اس کی پوری قلمی تصویر کھینچی ہے، دوسری اعجوبہ چیز کوہ نور تھی جسکو میر جملہ نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا،

کلچر کی ترقی | لیکن دربار محض تزک و احتشام اور شان و شوکت ہی کی غرض سے منعقد نہیں کیا جاتا، اس کی زینت و آرایش محض ضمنی چیز تھی، در اصل دربار کو کلچر کے فروغ کا بڑا خیال رہا، حکومت نے ہر جگہ امن قائم کر رکھا تھا جس کی وجہ سے آرٹ اور لٹریچر کو خود بخود ترقی ہونے لگی، پھر شاہانہ سرپرستی نے اس کو اور بھی آگے بڑھایا، شعراء، فضلا، فلسفی اور دوسرے ارباب کمال سرپرستی کا شہرہ سن کر دربار میں آتے، اور ان میں کوئی محروم واپس نہ جاتا، بادشاہ ان سب کو اپنے الطاف و کرم سے نوازتا، اس کی تقلید امراء بھی کرتے، اور ہر امیر فیاضی دکھانے میں دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتا، بعض امراء خود بھی اہل علم تھے، علی مردان خان، سعد اللہ خان، سعید خان ظفر خان، میر جملہ

افضل خاں اور راجہ جے سنگھ وغیرہ نہ صرف تلوار کے دھنی تھے بلکہ علوم و فنون کے بھی بڑے مربی تھے، اور وہ جہاں گئے، اپنے ساتھ دربار کی روایات لے گئے، اور مختلف صوبوں میں جاکر علوم و فنون کو ترقی دی،

تعلیم | آگرہ اور دہلی میں دو تعلیمی اداروں کے اخراجات کا بار شاہی حکومت پر تھا، اور اس کے اساتذہ کا تقرر بادشاہ کیا کرتا تھا، عوام کی تعلیم کا انتظام حکومت کی طرف سے نہ تھا، گو ایسی مسجدوں میں حکومت جاگیریں وقف کرتی رہتی تھی، جہاں طلبہ تعلیم پایا کرتے تھے لیکن نجی اور انفرادی کوششوں سے مدارس کی کمی نہ تھی، جہانگیر کے زمانے میں ہر گاؤں و ہر قصبہ میں مدرسے تھے، عام طور سے علما و علمی ہی مدارس میں کوئی اجرت لیے بغیر تعلیم دیا کرتے تھے، یا اگر اجرت لیتے بھی تو وہ بالکل نام کو ہوتی، ایسے تعلیمی ادارے لاہور، احمد آباد، برہانپور اور جونپور میں بہت تھے، شاہجہانی عہد میں مشہور اساتذہ و علما سرہند، تھانیسور اور انبالہ میں رہا کرتے تھے، جن کے پاس دور دور مقامات سے طلبہ آتے رہتے تھے، کشمیر بھی علوم کا اہم مرکز بن گیا تھا، اس کی خوشگوار آب و ہوا، پرامن فضا اور دل آویز مناظر کی بنا پر بہت سے ارباب علم یہاں آکر سکونت پذیر ہوگئے تھے، ملا محسن فرد غنی اور ملا محسن فانی کشمیر ہی کے تھے، خواجہ خداوند محمود یہاں آکر آباد ہوگئے تھے، ملا شاہ یہاں اکثر آتے رہتے تھے، کلیم اور قدسی نے یہاں رہ کر بادشاہ نامے منظوم کیے،

تعلیمی نصاب میں بہت سے مضامین ہوتے جن کو لائق اساتذہ ہی پڑھاتے، ہر مفید اور اہم مضمون کی تھوڑی تھوڑی چیزیں ضرور پڑھا دی جاتیں، مذہبی اور ما بعد الطبیعاتی مضامین کی اہمیت ضرور تھی، لیکن تاریخ، ریاضی، عروض اور خوشنویسی کی تعلیم پر بھی زور دیا جاتا، امتحانات کا رواج نہ تھا، ممتاز اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنا کافی ہوتا،

اس عام تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ علمی سرگرمیاں برابر قائم رہیں، فارسی سرکاری اور درباری زبان تھی، اس لیے اس کی سرپرستی ہوتی رہی، اور اس میں گوناگوں قسم کے علوم پیدا ہوئے۔

شعراء | اس سرپرستی کا شہرہ سنکر ایران سے بکثرت شعراء ہندوستان آئے، دربار میں جب کوئی تقریب ہوتی تو شعراء اپنے اپنے ذہن و اختراع کے نمونے پیش کرتے، اور ایک دوسرے سے بازی لیجاتے، دربار کا سب سے قدیم شاعر سعیدائے گیلانی تھا، جو داروغۂ زرگرخانہ کے عہدہ پر بھی مامور تھا، اس کے بعض تاریخی قطعات بہت مشہور ہوئے، ابوطالب کلیم دربار کا ملک الشعراء تھا، وہ جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، اور شاہجہانی عہد میں اس کو ملک الشعراء بنا کر سب سے بڑا علمی اعزاز عطا کیا گیا، شاہجہاں کی شان میں اس کے بہت سے قصائد ہیں، اس نے پادشاہنامہ کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی اور ظفر خان حاکم کشمیر کے لیے ایک ساقی نامہ قلمبند کیا، حاجی محمد جان قدسی کے اشعار بھی بہت پسند کیے جاتے تھے، اس نے بھی ایک پادشاہ نامہ لکھا، اس نے کشمیر کے چمنستان کی بھی ایک قلمی تصویر کھینچی ہے، اور پھر شاہجہاں کی تمام عمارتوں پر نظمیں لکھیں، جن میں تاریخیں بھی ہیں، مرزا محمد صائب اپنے خاص اور نئے طرز کے لیے شاہجہانی دربار میں بہت مقبول ہوا، گو وہ یہاں آخر وقت تک مقیم نہیں رہا، آخر میں ایران چلا گیا تھا، حسن بیگ رفیع کو اپنے اشعار کی داد دربار میں خوب ملتی تھی، باہر کے آنے والے شعراء میں سلیم طہرانی، حکیم رکن الدین کاشی اور فاروقی بھی قابل قدر شعراء تھے،

ہندوستان میں فروغ پانے والے شعراء میں ابوالبرکات منیر کا نام ممتاز تھا، ملا شیدا اپنی ہجو، بدیہہ گوئی اور ذہانت کے لیے مشہور تھا، اس نے اپنے معاصرین شعراء قدسی اور میر الٰہی کی سخت ہجو کہی، اس نے اپنی مثنوی دولت بیدار مخزن گنجور کے طرز پر لکھی، چندر بھان برہمن نامی ایک ہندو شاعر لاہور کا رہنے والا تھا، وہ اپنی رواداری اور وسعت نظر کے لیے پسند کیا جاتا تھا، اسکو اچھی نثر اور اچھی نظم لکھنے میں بڑی مہارت تھی، اس نے ابوالفضل کے طرز انشاء کی تقلید بڑی خوبی سے کی ہے، اس کی کتاب چہار چمن مرصع و مسجع عبارت آرائی کا نمونہ ہے،

حکیم ابوالفتح گیلانی کا بھتیجا حکیم حاذق بھی اس عہد کا مقبول شاعر تھا، وہ اپنے اشعار بڑی سوز و گداز کے ساتھ پڑھا کرتا تھا، حافظ محمد جمیل نے متعلق طبقات شاہجہانی کے مؤلف کا خیال ہے کہ وہ انوری کا ہم پلہ تھا، وہ امراء کی مدح سے پرہیز کیا کرتا تھا، وہ ہیئت، نجوم اور ریاضی کا بھی عالم تھا، محمد علی ماہر کے اشعار میں بڑی سلاست اور شگفتگی ہوتی تھی،

نثر | اس عہد میں نثر نگاری کی بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی، شاہجہان اپنی افتاد طبع کے مطابق چاہتا تھا کہ اس کے عہد کی تاریخ نہایت شاندار طریقہ پر لکھی جائے، پہلے تو اس نے حکیم حاذق اور ملا عبد اللطیف گجراتی کو اس کام کے لیے مامور کیا، لیکن دونوں میں بڑی چشمک پیدا ہو گئی، اس لیے شاہجہاں نے ان کو اس کام سے علحدہ کر دیا، انھوں نے جو کچھ لکھا، اسکا اب کہیں پتہ نہیں، امینائی قزوینی کی بعض تحریریں شاہجہاں کو بہت پسند آئی تھیں، اس لیے اس کو یہ خدمت سپرد کی، لیکن وہ شاہجہانی عہد کے ابتدائی دس سال کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ اس کو بھی علحدہ ہونا پڑا، اس تاریخ کا نام بادشاہ نامہ ہے، اس کی زبان سادہ اور شگفتہ ہے، تاریخی حیثیت سے ایک اہم تالیف ہی، ۱۶۴۲ء میں جلال الدین طباطبائی نے بھی بادشاہ نامہ کے نام سے ایک تاریخ لکھی، اسکا جو حصہ محفوظ ہے، اس میں شاہجہانی حکومت کے پانچویں سال سے آٹھویں سال تک کا ذکر ہے، اس کی عبارت ضرورت سے زیادہ مرصع ہے، ۱۶۴۸ء میں عبد الحمید لاہوری نے بھی شاہجہاں کے حکم سے بادشاہ نامہ لکھا، اس میں شاہجہانی عہد کے شروع کے بیس سال کی تاریخ ہے،[1] عبد الحمید لاہوری نے ابوالفضل کے طرز میں کتاب لکھنے کی کوشش کی، لیکن بعد میں اس طرز کو چھوڑ دیا، وہ اپنی ضعیفی کی بنا پر پورے عہد کے کوائف قلمبند کرنے سے معذور ہو گیا، تو اس کے شاگرد محمد وارث نے بقیہ حالات لکھے، اس کی تاریخ کا بھی نام بادشاہ نامہ ہے، اس میں شاہجہان آباد کی عمارتوں کا

---

[1] معارف: شاہجہاں اس کی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اس کو روپے میں تلوا کر انعام عطا کیا،

ذکر دل آویز طریقہ پر کیا گیا ہے، محمد صادق نے شاہجہان نامہ کے نام سے ایک غیر سرکاری تاریخ لکھی، جو اپنے معلومات کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے، محمد صادق داروغہ غسل خانہ کے عہدہ پر مامور تھا، اس کا ایک چچا اسحاق بیگ یزدی ممتاز محل کا میر سامان تھا، دوسرا چچا امیر خان میر تزک اور تیسرا باقی خاں اکبرآباد کا حاکم تھا، اس لیے اس کو ہر قسم کے معلومات حاصل ہوتے رہتے، اور گو اس کی تاریخ غیر سرکاری ہے، لیکن مستند ہونے میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں، محمد طاہر آشنا کی ملخص شاہجہانی عہد کے تیس سال کی مکمل تاریخ ہے، مآثر الامراء کے مصنف شاہنواز خاں نے اس کے ادب و انشاء کی تعریف کی ہے، اگرچہ اس نے اپنے عہد کے مورخوں کے لکھے ہوئے تاریخی واقعات کی تلخیص ہی کر دینے پر اکتفا کی ہے، ۱۶۵۹ء میں محمد صالح کنبوہ نے شاہجہانی عہد کی تاریخ عمل صالح کے نام سے قلمبند کی، اس کی عبارت بڑی ہی مرصع ہے، ۱۶۳۷ء میں شاہجہاں نے ملفوظات تیموری پر محمد فضل بخاری سے نظرثانی کرا کے اس کا ایک نیا اڈیشن تیار کرایا، مراد جب بلخ کی مہم پر روانہ ہوا تو اس کا حال ملا طغرائی نے مرآۃ الفتوح کے نام سے لکھا، اسی نے کشمیر کی تعریف میں فردوسیہ کے نام سے ایک کتاب قلمبند کی، پھر شہزادہ مراد کی مدح میں تاج المدائح اور شاہ شجاع کی تعریف و توصیف میں کنز المعانی لکھی،

ان تاریخی کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابیں لکھی گئیں، مثلاً منیر جونپوری نے ہرمز کے شہزادہ والا اختر کا ایک قصہ لکھا، جو بہت ہی مرصع زبان میں ہے،

لغت لغت میں، چار کتابیں شاہجہاں کے نام سے معنون ہوئیں، ان کے نام یہ ہیں، فرہنگ رشیدی، اور منتخب اللغات شاہجہانی از عبد الرشید ٹھٹوی، چہار عنصر دانش از امان اللہ، شاہد صادق از محمد صادق، موخر الذکر سائنس، مذہب، فلسفہ، سیاست، اخلاق اور نقشۂ عالم کی قاموس ہے،

ترجمے | دارا شکوہ سنسکرت زبان کا بڑا قابل قدر عالم تھا، اس نے اوپ نشد، بھگوت گیتا، اور یوگ وششت کے ترجمے فارسی میں کیے، اس کے سکریٹری بنوالی داس نے پربھودھ چندر اودے کو فارسی میں منتقل کرکے اس کا نام گلزار حال رکھا، اور ابن ہرکرن نے راماین کا فارسی میں ترجمہ کیا،

مذہبی کتابیں | اس عہد میں مذہب پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، جن میں دارا شکوہ کی سفینۃ الاولیاء اور محسن فانی کی دبستان المذاہب خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

طب | اس زمانہ میں بہت سے قابل قدر اطبا پیدا ہوئے جن کو طب کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی بڑا درک حاصل تھا، حکیم علیم الدین وزیر خان دربار کا طبیب تھا، وہ لاہور میں پیدا ہوا اور حکیم دوائی سے طب کی تعلیم پائی، اس کی نباضی مشہور تھی، شاہ جہاں کا بڑا مزاج شناس تھا، مختلف عہدوں مثلاً دیوان بیوتات، خانساماں اور میر عرض کے عہدوں پر بھی مامور رہا، پھر پنجہزاری منصب دار بنا کر پنجاب کا حاکم اعلیٰ بنایا گیا، حکیم مومنہ شیرازی بھی دربار کے اطبا میں تھا، اور اپنے پیشہ میں بڑا ماہر اور مقبول رہا، شاہجہاں نے اس کو دو ہزاری منصب عطا کیا، حکیم فتح اللہ شیرازی تشخیص الامراض اور علم الادویات میں بڑا ماہر تھا، حکیم صدرا، حکیم ابوالقاسم اور حکیم رکنائی کاشی بھی دربار کے ممتاز اطبا تھے، جراحی میں جگ جیون اور شیخ قاسم کو مقبولیت حاصل تھی،

نجوم و ریاضی | اس عہد کے سب سے بڑے منجم ملا فرید تھے، اس نے ایک زیچ زیچ شاہجہانی کے نام سے مرتب کی تھی، عطاء اللہ نے ریاضی پر ایک کتاب لکھی، اور شاہجہاں کے نام سے معنون کی، عبداللہ رشید نے بیج گنت کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ ریاضی کے اور دوسرے ماہرین کے نام یہ تھے:

مولانا محمود جونپوری، مولانا محمد یعقوب لاہوری، اور میر شمس الدین علجانی،

دیگر علوم | فقہ، مذہب، اخلاق، فلسفہ، عمرانیات وغیرہ مضامین عام طور پر بڑے شوق سے پڑھے جاتے، ہر گاؤں اور ہر قصبہ کی مسجد میں ایک ملا ان مضامین کے مطالعہ میں مشغول رہتا، اس عہد کے مشہور علماء میں ابوالمکارم، ملا حیدر کشمیری، مولانا عبدالسلام لاہوری، مولانا حسن دہلوی اور شیخ عبدالحق دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

ہندی | ہندی زبان وادب کی ترقی میں یہ عہد بہت زیادہ اہم اور شاندار ہے، شاہجہان ہندی آسانی سے بول سکتا تھا، وہ ہندی موسیقی کا شایق، ہندی زبان کے شعراء کا سرپرست رہا، دربار کے ہندی شعراء کے نام سندر داس چنتامنی اور کاوندرا چاریہ تھے، سندر داس گوالیار کا رہنے والا تھا، شاہجہاں نے اس کی غیر معمولی شاعرانہ قابلیت وصلاحیت کے لحاظ سے اس کو مہاکوی رائے کا خطاب عطا کیا، اسکو کبھی کبھی سفارتی مشن پر بھی بھیجا جاتا تھا، جھجھر سنگھ نے بغاوت کی تو سندر داس ہی اس کے پاس قاصد بناکر بھیجا گیا، اس نے ہندی شاعری کے آرٹ پر سندر سنگر کے نام سے ایک کتاب لکھی سنگھاسن بتیسی اور بارہ ماسا بھی اسی کی تصانیف ہیں، چنتامنی نے ہندی شاعری میں ایک نئی شاہراہ پیدا کی، اور وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر تھا، شاہجہاں نے اسکی پوری سرپرستی کی، اسکی تصانیف کے نام چھند وچار، کاویا وی ویک، کوی کول کال ترو اور کاویا پرکاش ہیں، اس نے ایک رامائن بھی لکھی جس کے چھند مشہور ہیں، کاوندرا چاریہ نے شاہجہان اور اس کے شہزادوں کی تعریف میں "کاوندر کال پلپا" منظوم کی، اس کی شاعری میں اودھی اور برج بھاشا کی بڑی دل آویز آمیزش ہے، وہ سنسکرت کا بھی ایک اچھا شاعر تھا، اور یوگ وشست کی تشریح لکھی،

عمارتیں | لیکن اس عہد میں زبان وادب نے جتنی ترقی کی، اس سے کہیں زیادہ فن تعمیرات کو فروغ ہوا، اور جس سے عام طور پر شاہجہانی حشمت وشوکت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہجہاں کو تعمیرات سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اور اس کے زمانے میں جو عمارتیں تیار ہوئیں وہ انجنیرنگ کے اعلیٰ کمالات کے

زندۂ جاوید نمونے ہیں، اور آج ان کو بنے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا، لیکن ان کی دل آویزی اور تازگی میں اتبک کوئی فرق نہیں آیا ہے، اور ان سے دنیا کے سیاحوں کے ذہن و نظر کی ضیافت اب بھی ہوتی رہتی ہے، ان میں رفعت، سکون اور شوکت پائی جاتی ہے، ممکن ہو کہ ماہرینِ فن کو ان میں کوئی نقص نظر آتا ہو، لیکن عام طور سے جو کوئی ان کو دیکھتا ہے مسحور اور مبہوت ہو جاتا ہے، شاہجہانی عہد کے تمام تاریخی لٹریچر ضائع ہو جائیں اور صرف اس زمانہ کی عمارتیں باقی رہ جائیں تو ان ہی کو دیکھ کر اس دور کو انتہائی پرشوکت کہنے میں ذرا بھی شبہہ نہ ہوگا، ان عمارتوں میں جو اسٹائل ہے، اسکو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک کلچر نے دوسرے کلچر کو کس طرح متاثر کیا، اور ان کو خاطر خواہ سرپرستی میں ایسا فروغ ہوا کہ وہ منتہائے کمال تک پہنچ گئے، شاہجہان کو فنِ تعمیر کا فطری ذوق تھا، اس کو اس سائنس میں پوری دسترس حاصل تھی، جب عمارت کا کوئی نقشہ اس کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ ماہرینِ فن کو طلب کر کے پہلے مشورہ کرتا، اس کے حسن و قبح پر گفتگو کر لیتا تو اپنی منظوری دیتا، اس کی خود بینی اور عالی حوصلگی ہمیشہ اس کو اس بات پر آمادہ رکھتی کہ جو چیز ہو وہ اپنی جگہ پر مکمل اور نہایت ہی اعلیٰ ہو، اسی خود بینی نے تعمیرات میں بھی نیا اسٹائل پیدا کر دیا، اس کو نئی نئی عمارتیں بنانے کا ایسا ذوق تھا کہ جہاں گیا عمارتیں بنوائیں، پھر بھی اس کی پیاس نہ بجھی، اجمیر، کشمیر، لاہور، امبالہ، باری، فیض آباد، گوالیار، کابل میں اس کی بنوائی ہوئی عمارتیں بہت سی ہیں، لیکن آگرہ اور دہلی میں اسکے اعلیٰ ذوق کی تکمیل ہوئی،

آگرہ میں دیوانِ عام، دیوانِ خاص اور حرم کے محلات میں سنگ مرمر کے فرش پر نقاشی اور گلکاری کے اعلیٰ نمونے ہیں، ثمن برج، جواہرات سے آراستہ و پیراستہ رہتا تھا، یہیں شاہ جہاں کی وفات ہوئی، قلعہ کے اندر سب سے سادہ لیکن اپنی جگہ پر لاجواب عمارت موتی مسجد ہے، یہ سات سال میں تین لاکھ روپے سے بنی، اس میں سادگی اور آرٹ کی آمیزش کا انتہائی کمال موجود ہے، قلعہ سے باہر جہاں آرا بیگم کی بنائی ہوئی جامع مسجد ہے، یہ پانچ سال اور پانچ لاکھ روپے میں تعمیر ہوئی، یہ اپنے خاکے، ساخت، تکمیل

ہمواری اور تناسب کے لحاظ سے فن تعمیر کا ایک بہت ہی عمدہ نمونہ ہے،

لیکن آگرہ کی سب سے دل آویز اور خوبصورت چیز تاج ہے، اور شاید دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، ہیول لکھتا ہے کہ یہ ایک نسائی تخیل کا نمونہ ہے، اور یہ اس نسائی تخیل کا تعلق عمارت سازی سے زیادہ سنگ تراشی سے ہے، اس کی لطافت، نفاست، تعمیری شوکت، حسن ذوق اور کاریگری کی تعریف کرنی ممکن نہیں، اس کے چمکتے ہوئے سنگ مرمر، پیاز نما گنبدوں، حسین جالی دار دیواروں اور مرصع کاریوں کا ذکر کوئی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا ہے، یہ ایک حسن ہے جس کو دیکھ کر مسرت کی لہریں ہمیشہ ہمیشہ اٹھتی رہیں گی، ہندوستان کی عمارت سازی کی تاریخ میں ایسی کوئی عمارت نہیں بنائی گئی جس میں ایسی شوکت ہو، ایسی سادگی ہو، ایسی ہمواری اور ایسا تناسب ہو، اس کو دیکھ کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور دلوں میں فرحت محسوس ہوتی ہے،

دہلی کا لال قلعہ بھی اپنے تناسب اور ہمواری کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے، یہ اپنے حسن اور شوکت کی بنا پر تو مشرقی ممالک میں لاجواب ہے، اور شاید دنیا میں بھی ایسی عمارت شاید ہی ہو، اس کے بڑے پھاٹک سے اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع کمرہ ملتا ہے جس سے آگے چل کر ایک صحن ہے، اس کے آگے نوبت خانہ ہے جس کے سامنے دیوان عام ہے، یہ آگرہ کے دیوان عام سے زیادہ شاندار ہے، پھر قلعہ کے شمال میں دیوان خاص ہے، جو اپنی مرصع کاری کے لحاظ سے شاہجہان کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ مزین ہے، ممکن ہے کہ تعمیرات کے ماہرین اس کے اسٹائل میں نقص نکالیں لیکن بظاہر یہ بہت ہی پرشکوہ ہے، اس میں تاج کی سادگی نہیں لیکن یہ تو شاہجہاں کی شوکت و حشمت کے انتہائے کمال کے مظاہرہ کے لیے بنایا گیا تھا، اور اس لحاظ سے یہ ایک مکمل نمونہ ہے، لال قلعہ کے سامنے بلندی پر جامع مسجد ہے، جو آگرہ کی موتی مسجد سے مختلف ہے، اس میں لال قلعہ ہی کی شوکت و حشمت نظر آتی ہے جو اس لیے مناسب ہے کہ محل کے سامنے بنائی گئی تھی، اس میں سنگ سرخ اسی لیے استعمال کیا گیا ہے

لال قلعہ میں بھی اسی رنگ کے پتھر لگے ہوئے ہیں،

مصوری شاہجہاں کو تعمیرات سے ایسا شغف رہا کہ اس نے مصوری کی طرف کم توجہ کی، لیکن اس کی شاہانہ سرپرستی بدستور سابق قائم رہی، اس کے دربار کے مصوروں میں محمد فقیر اللہ خان اور میر ہاشم امتیازی حیثیت رکھتے تھے، آصف خان اور شہزادہ داراشکوہ بھی مصوری کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے، داراشکوہ کے پاس مصوری کا جو البم تھا، اس سے اس کے آرٹ کی قدردانی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، لیکن اس عہد کی مصوری میں کوئی خاص جدت پیدا نہ ہو سکی، جہانگیر کے دور میں اس کی جتنی ترقی ہوئی تھی اس سے زیادہ نہ ہو سکی، بلکہ رنگ آمیزی اور مطلا جدول کو ضرورت سے زیادہ اتنا بڑھایا گیا کہ اس میں حسن کے بجائے قبح پیدا ہو گیا، خاکے کی تکمیل آرائی میں بھی کوئی جدت طرازی نہیں کی گئی،

خطاطی دربار میں مصور اور خطاط کی قدردانی یکساں طور پر ہوتی تھی، بعض مخطوطات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو بڑی محنت و مشقت سے تیار کیا جاتا تھا، دربار کا سب سے ممتاز خطاط محمد مراد شیریں قلم تھا، میر امام کا شاگرد آقا راشدہ مدور حروف لکھنے میں ماہر تھا، میر صالح اور محمد مومن بھی بڑے اچھے خطاط تھے، صالح فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا شاعر بھی تھا، مومن بھی فارسی میں اشعار کہا کرتا تھا، کفایت خان اور جلال الدین یوسف مشہور شکستہ نویس تھے،

موسیقی اکبری عہد میں تان سین نے موسیقی کو جو ترقی دی، اس سے زیادہ ترقی تو نہ ہو سکی لیکن شاہجہاں کو موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا، وہ دھرپد کو خاص طور پر پسند کرتا تھا، اور اس فن کا ماہر تان سین کا داماد لال خاں گن سمدر تھا، شاہجہاں موسیقی کے ہندو ماہرین میں سے جگن ناتھ کو بہت محبوب رکھتا تھا، اس کو مہاکوی رائے کا خطاب بھی دیا، وہ شاہجہاں کی شان میں مدحیہ اشعار بھی کہا کرتا تھا، جہانگیر کے عہد میں اس کو انعامات ملا کرتے تھے، اس عہد میں سکھ سین کو رباب اور سور سین کو بین بجانے میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی،

طرز حکومت | شاہ جہاں کی پوری سلطنت کی اساس ایک مکمل نظام پر تھی، اس کا اقتدار اعلیٰ ہر شعبہ پر قائم تھا، بلکہ مذہبی حیثیت سے وہ ظل اللہ بھی سمجھا جاتا تھا، اسی کا حکم آخری حکم سمجھا جاتا تھا، بشرطیکہ وہ اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو، نظری حیثیت سے اس کے اختیارات غیر محدود تھے لیکن عملی طور پر اسکے اختیارات پر پابندی بھی ہوتی تھی، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی فوج کے ذریعہ سے اپنی رعایا پر اپنے ہر حکم کو نافذ کرا سکتا تھا، لیکن ایسا کرنا ہر موقع اور ہر حال میں ممکن نہ ہوتا تھا، بادشاہ وقت کو روایتی اور رسمی قوانین کا احترام کرنا ضروری تھا، اور ازمنۂ وسطیٰ میں ان قوانین کی حیثیت موجودہ دور کے مدون قوانین ہی کے برابر ہوا کرتی تھی، اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں تحریری قوانین نہ تھے لیکن اس سے ہرگز یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ بادشاہ وقت جابرانہ حکومت کیا کرتا تھا، بعض یورپین سیاحوں نے اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے لیکن اس معاملہ میں ان کی رائے زیادہ وقیع نہیں، کیونکہ یہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر مغلوں کی حکومت مستبدانہ اور ظالمانہ ہوتی تو اتنے دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی، عوام بغاوت کرکے اس کو ختم کر دیتے، یورپین سیاح بعض جزوی واقعات کو سامنے رکھ کر عمومی نتیجے پر پہنچ جایا کرتے تھے، اور بعض اوقات وہ ایک معمولی سی شہادت پر ایسی بات قلمبند کر دیتے تھے جس کا تعلق محض ان کے ذہن کے اختراع سے ہوتا تھا، اس میں حقیقت نہیں ہوتی تھی،

مغل حکومت کے نظام کی تمام تفصیلات کاغذات میں درج ہوا کرتی تھیں، اور ان ہی کے مطابق نظم و نسق قائم تھا، روایتی قوانین کی پابندی سے بڑی بڑی پیچیدگیاں دور ہو جاتی تھیں، بلکہ ایک لحاظ سے رعایا خوش اور مطمئن رہی ہوگی کہ موجودہ دور کی طرح کسی کو مقدمہ بازی کر کے وکلا کے پنجوں میں گرفتار ہو جانے کی مصیبتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہوگا، بلکہ عدل و انصاف کے حصول میں اس کو دیر نہ لگتی ہوگی، اور قاضی بھی قوانین کے پھندوں میں الجھنے کے بجائے اپنے اختیار تمیزی اور ذہانت کو استعمال کر کے جلد فیصلہ صادر کر دیتا ہوگا،

مغل بادشاہ مطلق العنان ضرور تھے لیکن ان کی مطلق العنانی پر رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال حاوی رہا، اس کے علاوہ وہ اپنی حکمرانی کے سلسلہ میں (انگریزوں کی طرح) باہر سے حکم نہیں منگایا کرتے تھے، اس لیے ان کی سلطنت کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین میں مستحکم ہوتی رہی، اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغلوں نے ایسی تمام صورتیں پیدا کردی تھیں جن سے امن و امان کی زندگی ممکن ہوسکی، اور اس لحاظ سے ان کی مطلق العنانی کو روشن خیال مطلق العنانی کہا جا سکتا ہے، چنانچہ ٹیورنیر نے بھی لکھا ہے کہ شاہ جہاں لوگوں پر اس طرح حکومت نہیں کرتا جس طرح ایک بادشاہ اپنی رعایا پر کرتا ہے، بلکہ اس طرح جیسے ایک باپ اپنے خاندان پر کرتا ہے،

اس کے پورے نظام حکومت میں ایک قوت اور زندگی محسوس ہوتی تھی بلخ، قندھار اور دکن میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں، لیکن سلطنت کے دوسرے حصوں میں امن اور استحکام بھی قائم رہا، منوکی نے شاہ جہاں کے عدل و انصاف کے بہت سے واقعات لکھے ہیں، ٹیورنیر کا بیان ہے کہ شاہراہوں پر ایسا امن قائم تھا کہ کبھی کسی کو چوری کی سزا نہیں دی گئی۔ " ص ع "

بزم تیموریہ

بابر ایک بے مثل اہل قلم تھا، ہمایوں نے شعروشاعروں کے علاوہ ہیئت و نجوم کی بھی انجمن آرائی کی، اکبر کا عہد علوم و فنون کی روشنی سے جگمگا اٹھا، جہانگیر نے معارف پروری اور انشا پردازی کے اعلیٰ نمونے پیش کیے، اس خانوادہ کے آخری بادشاہوں نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی، بہادر شاہ نے عروس سخن کے گیسو سنوارے، تیموری شہزادوں نے بھی علم و ادب کی محفلیں سجائیں، دربار تیموری کے امرا، شعرا اور فضلانے شاہانہ سرپرستی میں گوناگوں کمالات دکھائے۔ ان سب کی تفصیل اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت : معہ

(مرتبہ : سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

منیجر

ادبیات

میری ملت

از

جناب شہ زور کاشمیری

ہے میری ملت، میری ہی ملت
اک بے نہایت تحریکِ الفت

شرحِ اذاں اور خود ہی اذاں بھی
نورِ ہدایت، روحِ عبادت

نشاءِ حق کی واضح نشانی
لطفِ خدا کی روشن علامت

امنِ جہاں کا ناطق صحیفہ
قرآنِ دل کی خاموش آیت

اس کے ارادے، اسکے عزائم
آئینِ فطرت، قانونِ قدرت

تفسیرکن ہے رفتار اسکی
ٹھہراؤ اس کا شرحِ قیامت

ہیں اس کے تیور اصلِ مقدر
اور اس کی نظریں رمزِ مشیت

مشرب میں اس کے اعلیٰ نہ ادنیٰ
مسلک میں کوئی پستی نہ رفعت

کیا شوق اس کی روحِ رواں کا
اللہ اکبر، شوقِ شہادت

"ابر کرم"

از جناب فضا ابن فیضی

انسان ہے فطرت کی کریمی کا گلہ مند — نادان سمجھتا ہے کہ یہ بحر ہے پایاب

"توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے" — ذرہ ہو کہ خورشید ستارہ ہو کہ مہتاب

بلبل کو چمن زار، پتنگوں کے لیے شمع — دریا کو صدف اور صدف کو گہر ناب

سوسن کو زباں، دیدۂ نرگس کو تحیر — لالے کو مقدر ہوا اک داغ جگر تاب

یہ لطف عیاں دیکھ کر شبنم سے چمن میں

ہیں پھول جو سیراب تو کانٹے بھی ہیں سیراب

"نوائے سروش"

از جناب فضا ابن فیضی

ذہن فسردہ کو پئے فکر و نظر تو کر — راتوں کی تیرگی سے طلوع سحر تو کر

اس راہ میں ملیں گے تجھے مہر و ماہ بھی — اے ذرہ دستگاہ! یہاں سے سفر تو کر

ہر ذرہ جمود کو جو دماغوں پہ ہے گراں — شعلہ تراش و شعلہ گر و شعلہ ور تو کر

ہجرت کے ہے قریب نشیمن مراد کا — اے عندلیب! ہمدمی بال و پر تو کر

آنکھوں میں تا بہ کے یہ خمار شبی کا رنگ — اس غفلت دراز کو اب مختصر تو کر

جو مہر کی شعاع سے پیدا نہ ہو سکی

داغ جگر سے اپنے وہ پیدا سحر تو کر

مطبوعات جدیدہ

اسلام کا نظام عفت و عصمت

از مولانا ظفیر الدین صاحب استاذ دار العلوم مفتاحی،

تقطیع بڑی، ضخامت ۲۹۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد :- صر

پتہ : ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔

عصمت و عفت نہ صرف شرف انسانی کے لیے ایک گوہر گرانمایہ ہے، بلکہ اس کا اجتماعی نظام عصمت و عفت پر موقوف ہے، اگر عصمت کی قید اٹھا دی جائے تو سارا عائلی نظام درہم برہم ہو جائے، اس لیے تمام مذاہب نے اس کی حفاظت کی تاکید کی ہے، اور اسلام نے اس میں اتنا اہتمام کیا ہے کہ ہر اس رخنہ کو بند کر دیا ہے جس سے بے عصمتی کے راہ پانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے، اور اس کے متعلق بہت سے تاکیدی احکام و ہدایات کلام مجید اور آیات نبوی میں موجود ہیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں ان تمام احکام و قوانین اور احتیاطی تدبیروں کو جو اسلام نے عصمت و عفت کے تحفظ کیلیے اختیار کی ہیں، مرتب طریقہ سے جمع کر دیا ہے، اس سلسلہ میں اسلام سے پہلے عورتوں کی حیثیت، انکو اسلام کے عطا کردہ حقوق، نسوانی عزت و حرمت کے تحفظ میں اسلام کے اہتمام، بے عصمتی کی اخلاقی و مادی مضرتوں، نکاح اور تعدد ازدواج کے مصالح اور اس سے متعلق احکام، تجرد کی خرابیوں، میاں بیوی کے حقوق و فرائض، خلع و طلاق کے قوانین وغیرہ، ان تمام امور و معاملات اور ان کے متعلق اسلامی احکام کو جن کا عفت و عصمت کے تحفظ سے ادنی تعلق بھی ہو سکتا ہے، اس جزوی تفصیل کیساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کا کوئی پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، بلکہ اس کا دائرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ بعض غیر متعلق باتیں بھی آگئی ہیں، کتاب کی جامعیت اور مباحث کے تنوع و کثرت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی

سے ہو سکتا ہے، اردو میں اس موضوع پر اس سے جامع کتاب نہیں لکھی گئی، انداز بیان شگفتہ اور دلنشین ہے،

اردو تنقید کی تاریخ جلد اول - مرتبہ جناب مسیح الزمان صاحب، لکچرار شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰۴ صفحات، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۸ روپیہ: خیابان نمبر ۱۱، سبزی منڈی، الہ آباد،

آج کل نثر نگاری میں سب سے زیادہ تختۂ مشق تنقید ہے، جس کو ذرا قلم پکڑنا آتا ہے، اس کا نزلہ سب سے پہلے تنقید کی طرف رجوع ہوتا ہے، تنقیدی مضامین کے علاوہ جن سے ادبی رسالے بھرے رہتے ہیں، اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں، مگر ان کے لکھنے والوں کی نظر عموماً عربی، فارسی اور اردو کے نقد الشعر کی تاریخ پر نہیں ہوتی، اور ان کا معیار تنقید مغربی ادب خصوصاً کمیونسٹ لٹریچر ہوتا ہے، جس نے تنقید کو شعر و ادب کے دائرہ سے نکال کر ایک طومار بنا دیا ہے، اس لیے ان کو اردو میں تنقید کا فقدان نظر آتا ہے، اور ان کی نگاہ میں اردو کا پرانا تنقیدی ذخیرہ نہیں جچتا، چنانچہ اردو میں تنقید پر جس قدر نئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ایک دو کے سوا اردو تنقید کو یا بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے یا محض اس کی بے مائگی دکھائی گئی ہے، مگر مرتب کی نظر عربی، فارسی اور اردو کے قدیم تنقیدی ادب پر بھی ہے، اس لیے انھوں نے صحیح نقطۂ نظر سے اردو تنقید کی یہ تاریخ لکھی ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہوگی، اس جلد میں ابتدا سے لیکر سنہ ۱۸۸۱ء تک کے تنقیدی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، کتاب کے شروع میں اردو شاعری کے ماخذ، عربی و فارسی کے نقد الشعر پر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد اردو کی تنقید کے مختلف دور قائم کر کے ہر دور کے اصول نقد، تنقیدی خصوصیات اور اس کے تدریجی ارتقاء کو دکھایا گیا ہے جس سے اردو تنقید نگاری کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے، اس سے انکار نہیں کہ جدید دور کے ترقی یافتہ فنون کی طرح جدید تنقید کا دائرہ بھی قدیم تنقید کے مقابلہ میں بہت

زیادہ وسیع ہے، لیکن جیسا کہ مصنف نے دکھایا ہے کہ عربی، فارسی اور اردو میں اس دور کے معیار کے لحاظ سے شعر و ادب کی تنقید کے اصول و ضوابط موجود تھے، جن میں حالات کے تقاضے کے مطابق برابر ترقی ہوتی رہی اور اس کا سلسلہ ابتک جاری ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب اردو میں پہلی تالیف ہے جس میں صحیح نقطۂ نظر سے اردو تنقید کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حی بن یقظان - مترجمہ جناب ظفر احمد صاحب صدیقی لکچرار شعبۂ فلسفہ و نفسیات، مسلم یونیورسٹی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے، پتہ: سعید احمد صدیقی، ذکار اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اندلس کے نامور فلسفی کی مشہور کتاب حی بن یقظان کا ترجمہ تمام ترقی یافتہ زبانوں میں ہو چکا ہے، اب لائق مترجم نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، یہ ابن طفیل کا ایک فلسفیانہ رسالہ ہے، جس میں فاضل مقدمہ نگار کی تحریر کے مطابق یہ عقیدہ پیش کیا گیا ہے کہ "مذہب اور فلسفہ ایک ہی سچائی تک پہنچنے کے دو راستے ہیں، پیغمبر عوام کو سمجھانے کے لیے جن حقائق کو استعاروں اور تمثیلوں میں ادا کرتے ہیں، ان ہی کو فلاسفہ مجرد تصورات کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں، اور چونکہ عوام مجرد تصورات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لیے فلسفہ صرف خواص کے لیے ہے اور مذہب عوام کے لیے، اور یہ کہ انسان کسی خارجی تعلیم و تربیت، روایت یا زبان وغیرہ کی مدد کے بغیر اپنی عقل و تجربہ اور مشاہدہ کی رہنمائی میں اس سچائی تک پہنچ سکتا ہے جس کو پیغمبر کا لایا ہوا مذہب پہنچاتا ہے"۔ اس کتاب میں اسی نقطۂ نظر سے فلسفیانہ انداز میں انسان کی تخلیق، اس کے عقلی قوا کے ارتقاء، اس کی قوتِ فکریہ، کائنات پر اس کے غور و فکر، تجربہ و مشاہدہ اور وجدان و روحانی کشف دونوں ذریعوں سے وصول الی الحق کو دکھایا گیا ہے، اور اس کو مذہب، فلسفہ اور روحانیت کے ایسے ملے جلے رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ کتاب مذہب و فلسفہ، اشراقیت و مشائیت، عقل و استدلال، تجربہ و مشاہدہ اور روحانی کشف کا مجموعہ بن گئی ہے، اس سے

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان فلاسفہ محض یونانی حکما، کے مقلد نہ تھے، بلکہ بہت سے مسائل میں مجتہد کی حیثیت رکھتے تھے، دقیق فلسفیانہ مباحث کا سلیس ترجمہ یوں بھی مشکل ہے، اور مترجم نے اصل متن کی پابندی کا بھی لحاظ رکھا ہے، اس لیے ترجمہ میں سلاست تو نہیں پیدا ہو سکی ہے، لیکن پیچیدگی اور ابہام بھی نہیں پیدا ہوا، اور اس کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، اس ترجمہ سے اردو میں ایک مفید فلسفیانہ کتاب کا اضافہ ہوا،

کاروانِ حجاز

از جناب ماہر القادری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۷۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ پتہ: مکتبہ فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی، نمبر ۱

لائق مؤلف گذشتہ سال حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ طیبہ کے شرف سے مشرف ہوئے تھے، کاروانِ حجاز اسی مقدس سفر کا سفرنامہ ہے، اس میں جذبات و تاثرات، حرمین کے مشاہد کے حالات، ان سے متعلق تاریخی واقعات، سفرِ حج کے مشاہدات و تجربات اور اس قبیل کے دوسرے واقعات جو عموماً حج کے سفرناموں میں ہوتے ہیں، اسمیں بھی موجود ہیں، مصنف کی تحریر کی دلآویزی اور باطنی کوائف نے اس سفرنامہ کو پر لطف اور پر اثر دونوں بنا دیا ہے، اور اس حیثیت سے یہ سفرنامہ اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

ڈاکٹر زور

مرتبہ جناب محمد بن عمر صاحب لکچرار جامعہ عثمانیہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے، رنبر جلد عا، پتہ: ادارہ ادبیات اردو، خیرت آباد، حیدرآباد، دکن،

اردو خصوصاً دکنی زبان کی خدمت کے اعتبار سے ڈاکٹر زور صاحب دکن کے بابائے اردو کہلانے کے مستحق ہیں، وہ تنہا ایک ادارہ ہیں، اور ادارۂ ادبیات اردو ان کا دوسرا نام ہے، اس لیے ادارہ کی سلور جوبلی کے موقع پر لائق مؤلف نے ڈاکٹر صاحب کے خدمات کے اعتراف میں ان کے متعلق مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں بہت سے اصحابِ علم و قلم کے پیامات، ڈاکٹر صاحب کی سیرت و سوانح اور ان کے علمی و ادبی کارناموں پر ان کے تلامذہ، احباب اور بعض دوسرے اصحابِ قلم کے مضامین ہیں، جس سے ڈاکٹر صاحب کے خدمات کا پورا اندازہ ہوتا ہے، مضمون نگاروں میں ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر عبد القادر سروری اور نصیر الدین صاحب ہاشمی کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں،

ودم ۱۱

مکتبہ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخِ اسلام (حصۂ اول) عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ یعنی آغازِ اسلام سے لیکر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت ۱۲ر

تاریخِ اسلام (حصۂ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت، ۱۲ر

تاریخِ اسلام (جلد سوم) (خلافتِ عباسیہ) یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابواسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت عہ ر

تاریخِ اسلام (جلد چہارم) (خلافتِ عباسیہ دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیوں کے تمدنی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلی تینوں سے کہیں زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت : ۔۔ ر

نئی کتابیں

تاریخِ سندھ سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی تاریخ :۔ قیمت : ۶ ر (چھ روپیے)

اقبال کامل ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ۔۔ ر

بزمِ تیموریہ تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلا کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل۔ قیمت عہ ر

امام رازی امام فخرالدین رازی کے سوانح و حالات انکی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت ۔۔ ر

بزمِ صوفیہ عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صاحبِ تصنیفات صوفیۂ کرام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتیؒ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت ۔۔ ر

تاریخِ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ کیساتھ اندلس کی و تمدنی تاریخ، قیمت عہ ر

اہلِ کتاب صحابہ و تابعین یہودی و نصرانی اہل کتاب صحابہ و تابعین کا تذکرہ للعہ ر

۱۹۵۵ء کی نئی کتابیں

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزم تیموریہ کے نام سے شائع ہو چکی ہے، ان سے پہلے کے مسلمان حکمران خاندانوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور ان کے درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور اطباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدان جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے، لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی، اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، عمید الدین سنامی، شمس دبیر، امیر خسرو، امیر حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء، فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے ممتاز مگر نادر روزگار شعراء دبیر، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظر عام پر لایا گیا ہے، ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمال فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے قیمت عہ

مآل و مشیئت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی تصورات مآل و مشیئت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انہی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار دو فقروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحوں میں پوری بحث پر تبصرہ ہے، (از صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالات روسو)

قیمت عہ

(طابع و ناشر سید صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰ اگست ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۷۶ ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۵ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان کے نامور بزرگ خواجہ حسن نظامی نے ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا، ان کی جیسی جامع الحیثیات شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں، وہ ایک خاندانی اور صاحب نسبت صوفی، صاحب طرز ادیب، ذہین و ماہر نفسیات داعی، کامیاب تاجر، غرض تنہا ایک دنیا اور دلی کی تہذیب و شرافت کی یادگار تھے، انھوں نے اپنی محنت اور خداداد ذہانت و قابلیت اور جد و جہد سے نہایت معمولی حالت سے جس قدر ترقی اور شہرت و ناموری حاصل کی، اس کی مثالیں کم ملتی ہیں، ان کا طرز انشا نہایت سادہ مگر دلنشین اور سہل ممتنع کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے بہت چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں پر جیسے مفید، دلچسپ، سبق آموز اور نتیجہ خیز مضامین لکھے وہ ان ہی کا حصہ ہے، ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، موضوع کا اتنا تنوع اور نشیب و فراز مشکل ہی سے اردو کے کسی مصنف کے مضامین اور کتابوں میں مل سکتا ہے، ان کی تصانیف میں غدر دہلی کے افسانوں کا سلسلہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے درجنوں اخبارات اور رسالے نکالے، ایک زمانہ میں ان کے زیر پرستی نکلنے والے رسالوں کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی، ان کے بہت سے شاگرد اور تربیت یافتہ اڈیٹر اور صاحب قلم بن گئے، اس لیے اردو زبان کی خدمت کے اعتبار سے وہ اس دور کے اساطین اردو میں تھے۔

ان کے ہر کام میں جدت و ذہانت نمایاں تھی، اور ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب ان کا یہی وصف تھا، ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا جس میں ہندو مسلمان، سکھ اور امراء و والیانِ ریاست سب داخل تھے، ایک زمانہ میں انھوں نے شدھی اور سنگھٹن کا بھی مقابلہ کیا، اور ہندو مسلمانوں کو ملانے کا بھی فرض انجام دیا، غرض علم و ادب، مذہب، سیاست، صنعت و تجارت ہر شعبہ میں ان کے کارنامے ہیں، اور ان کی پوری زندگی جد و جہد اور سعی و عمل کا نمونہ اور اس حیثیت سے دوسروں کے لیے قابل تقلید تھی، اور وہ اپنے زمانہ کے بڑے کامیاب انسان تھے، باقی بشری کمزوریوں سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، آج سے دس پندرہ سال پہلے تک سارا ہندستان ان کی شہرت سے گونجتا تھا، مگر ادھر چند سال سے کچھ حالات کے تغیر اور کچھ ضعف پیری نے خانہ نشین کر دیا تھا اور وہ گمنام سے ہو گئے تھے، ان کی زندگی کا یہ دور دنیا کی شہرت و ناموری کی ناپائیداری کا سبق آموز مرقع ہے۔ والبقاء للہ وحدہ اللہ تعالیٰ ان کو عالمِ آخرت کی کامیابی اور ناموری سے سرفراز فرمائے۔

~~~~~~~~~~

سلیمان نمبر کو اللہ تعالیٰ نے ہماری توقع سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائی، اخبارات اور رسالوں کے اڈیٹروں اور دوسرے اصحاب علم و ادب نے اس کے متعلق نہایت عمدہ رائیں ظاہر کیں، یہ سب اس نمبر کی نسبت اور صاحب یادگار کی شخصیت کا فیض ہے، اس نمبر کی اتنی مانگ ہو کر غالباً جلد ہی اس کا دوسرا اڈیشن چھاپنے کی نوبت آجائے، پہلے اڈیشن میں ہماری نگاہ میں جو خامیاں رہ گئی ہیں، وہ انشاء اللہ دوسرے اڈیشن میں دور کر دی جائیں گی، اور بعض مضامین کا بھی اضافہ کیا جائے گا،

~~~~~~~~~~

اپریل کے معارف میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ مئی کا پرچہ سلیمان نمبر ہوگا، پھر سلیمان نمبر میں تصریح کر دی گئی تھی کہ جون کا پرچہ شائع نہ ہوگا، ناظرین اس کا انتظار نہ کریں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریریں بعض

خریداروں کی نظر سے نہیں گذرے، چنانچہ مئی اور جون کے پرچے کی تقاضے کے خطوط اب تک آرہے ہیں، اسلیے پھر اطلاع دیجاتی ہے کہ ان دو مہینوں کے پرچے شائع نہیں ہوئے تھے، معارف کے جن خریداروں نے سلیمان نمبر نہیں خریدا ہے، انکے باقی پرچے کے معاوضہ میں انکی مدت خریداری میں دو مہینے کی توسیع کر دیجائے گی،

~~~~~~~~~~~~~~

پاکستان کے سکہ کی قیمت میں تخفیف کو تجارتی دنیا میں بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اور یقین ہے کہ پاکستان کی تجارت پر اس کا مفید اثر پڑے گا، اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان روپئے کے تبادلہ پر بھی سمجھوتہ ہو جاتا اور منی آرڈر، بیمہ اور وی پی کی موجودہ دقتیں دور ہو جاتیں تو دونوں ملکوں کے تجارتی حلقہ کے علاوہ وہاں کے تارکین وطن کو بھی بڑی سہولت ہو جاتی، امید ہے کہ دونوں کے سکوں کی قیمت میں توازن کے بعد یہ مسائل بھی حل ہو جائیں گے،

~~~~~~~~~~~~~~

اس مرتبہ سیلاب اور بارش کی کثرت نے اس صوبہ میں جو قیامت ڈھائی ہے، اس سے ضلع اور شہر اعظم گڈھ کو بھی بڑا نقصان پہنچا، اتنا بڑا سیلاب اعظم گڈھ کی تاریخ میں کبھی نہیں آیا تھا، مگر الحمد للہ دار المصنفین اس سے بالکل محفوظ رہا، اس سلسلہ میں بہت سے احباب اور دار المصنفین کے ہوا خواہوں نے دریافت حال کے لیے خطوط لکھے خصوصاً مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جس خلوص و ہمدردی کا ثبوت دیا ہے، اس کے لیے کارکنان دار المصنفین ان تمام مخلصین کے شکر گذار ہیں، یہ سیلاب نہیں قہر الٰہی تھا، جس نے لاکھوں انسانوں کو بے خانماں کر دیا، اور کروروں روپیے کا مالی نقصان ہوا جس کے اثرات مدتوں میں زائل ہوں گے، اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحم فرمائے اور اس مصیبت کے نتائج سے نجات دے،

~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~

مقالات

مینا بازار

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

(۳)

مینا بازار میں تکرار لفظی (بمعنی کثرت) کی مثالیں ۵۰ سے متجاوز ہیں، حالانکہ اس کا حجم دیباچہ سوم کے برابر ہے، اور اگر ظہوری کی تصنیف ہوتی تو اسی آخری نثر کے ایک سال بعد کی ہوتی، اب مینا بازار کی تمام مثالوں کو درج ذیل کیا جاتا ہے:

گلستان گلستان	ایک بار (ص ۲)	قافلہ قافلہ	۲ بار (ص ۱۲، ۲۵)
خار خار	۲ ״ (״ ۵، ۱۹)	دست دست	۱ ״ (״ ۲۶، کثرت کے معنی میں نہیں)
معدن معدن	ایک ״ (ص ۷)	صوت صوت	۱ ״ (״ ۱۹)
کوہ کوہ	۴ ״ (״ ۷، ۸، ۹، ۳۷)	خرمن خرمن	۲ ״ (״ ۲۰، ۲۲)
گل گل	۲ ״ (״ ۶، ۲۶)	خروار خروار	۱ ״ (״ ۲۰)
کاروان کاروان	۵ ״ (״ ۱۲، ۱۴، ۲۵، ۳۹، ۴۲)	شکر شکر	۱ ״ (״ ״)
کشتی کشتی	۲ ״ (״ ۷، ۲۷)	مصر مصر	۲ ״ (״ ۳۰، ۳۱)
دریا دریا	۴ ״ (״ ۷، ۹، ۲۹، ۳۷)	تودہ تودہ	۱ ״ (״ ۴۰)

شیریں شیریں	ایک بار	(ص ۲۳)	دامن دامن	ایک بار	(ص ۴۲)
پیراہن پیراہن	۱ ″	(″ ۲۵)	گلشن گلشن	۱ ″	(″ ۴۲)
کوچہ کوچہ	۱ ″	(″ ۲۹)	پرکالہ پرکالہ	۱ ″	
جہاں جہاں	۱ ″	(″ ″)	برگ برگ	۱ ″	
بدخشاں بدخشاں	[illegible]	[illegible]	یاقوت زرد		
ختن ختن	۱ ″	(″ ۳۰)	یاقوت زرد		(ص ۸)
زباں زباں	۱ ″	(″ ۳۴)	یاقوت زرد		

ظہوری کی تحریر ان لفظی رعایات کے بوجھ کو برداشت نہیں کرسکتی،

(۶) سہ نثر میں ظہوری نے ایک جگہ ایک فقرہ لکھا، اسی کے برابر وہی فقرہ بالعکس استعمال کردیا ہے، وہ فقرہ یہ تھا: سخن تیغ، تیغ سخن (سہ نثر ص ۱)۔ صاحب مینا بازار کو یہ صفت اسقدر مرغوب ہے کہ اسے ۱۱ جگہ استعمال کرڈالا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:-

۱- تجمل حسن - حسن تجمل	(ص ۹)	حسن صورت صورت حسن	(ص ۱۹)
۲- گوہر بہا - بہائے گوہر	(″ ۸)	چاشنی حلاوت حلاوت چاشنی	
۳- خیال وصال - وصال خیال	(″ ۱۳)	مہرہ چیں حقہ باز	(″ ۲۹)
۴- زیبائی حسن - حسن حسن	(″ ۱۵)	حقہ باز مہرہ چیں	
۵- اطلس چرخ - چرخ اطلس	(″ ۱۲)	نظر چشم - چشم نظر	(″ ۱۵)
۶- اعتبار چشم - چشم اعتبار	(″ ۱۹)	ہلال لب - لب ہلال	(″ ۳۲)

ظہوری اس طرح کے تصنعات کا عادی نہیں ہے۔

(۷) مفرد لفظوں اور ان لفظوں اور فقروں کے علاوہ جن کا تعلق نفس مضمون سے گہرا ہے

صاحبِ مینا بازار کے ذخیرہ میں کچھ ایسی ترکیبیں ہیں جن کا وہ بار بار استعمال کرتا ہے، اور وہ اس کے روزمرہ میں داخل ہوکر بالارادہ یا بلاارادہ نوکِ قلم پر آجاتی ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی ظہوری کے یہاں نہیں آیا ہے.

سبز بخت	(ص ۳۵-۴۳)	۱۰ بار	گلزار جاوید بہار	(ص ۴-۱۷-۱۸)	۳ بار
پشت گرمی	(″ ۱۷-۱۹)	۲ ″	رستۂ بازار	(″ ۱۴-۱۷)	۲ ″
فتح الباب	(″ ۴۲-۴۳)	۲ ″	مزیت و فوقیت	(″ ۱۸-۲۶)	۲ ″
بہ ہزار جاں ارزاں وصالش			تنگ شکر	(″ ۲۱)	۵ ″
بہ جاں ارزاں وصالش	(ص ۱۴-۱۵)		تہ گلگوں		۲ ″
متاع قیمتی وصالش			بساط گوہر برچیدہ	ص ۸	
قرۃ العین	(ص ۵-۷)	۴ بار	بساط گوہر فروشی سخن برچیدہ	″ ۱۰	
متاع روے دست وکال	(ص ۵، ۱۳)	۲ ″	بساط غریب برنگے چیدہ	″ ۵	
تہ دل	(″ ۵-۲۴)	۲ ″	گل رخ	(ص ۱۸)	۳ بار
لعل شب چراغ	(″ ۲)	۲ ″	بیرہ برداشتن	(ص ۲۶-۴۴)	۲ ″
گوہر شب چراغ	(″ ۹)		سیلان (سیلون)	(ص ۸)	۲ ″
خوش قماش	(۱۳ مرتبہ)	۱۳ ″			

ظہوری کے یہاں جو فقرے زیادہ استعمال ہوئے ہیں، ان کی فہرست درج ذیل ہے:

۱- بہ کرسی نشستن ۴ بار (ص ۲۰، ۴۱، ۴۷، ۶۵)

۲- جرب و نرمی ۲ ″ (ص ۳۶، ۶۰)

۳- بیگانگی ۲ ″ (ص ۳۸، ۴۷)

۴- خزدپہ نیاں	۲ بار	(ص ۷۴ ساقی نامہ ص ۱۲۴)
۵- عراق وخراسان	۴ "	(" ۱۸، ۷۰، ۷۱، ۷۹)
۶- سر تفاخر بآسمان رسانیدن کلاہ گوشۂ تفاخر " "	۲ "	(" ۱۰، ۷۲)
۷- ابجہ نیساں باریدن	۳ "	(" ۲۹، ۳۴، ۴۹)
۸- نمک مائدۂ ملاحت نمک خوان تکلم		(" ۱۴، ۵۲)
۹- تمن دقیق		(" ۵۳)
متن دہن		ساقی نامہ ص ۵۷
تن آشنائی		(ص ۳۶)
۱۰- نخ نارسائی		(" ۷۳)
نخ کمند		(" ۵)
۱۱- خزانگی		(" ۹، ۵۳)

ان میں صرف ایک فقرہ چرب و نرمی ایک بار مینا بازار میں آیا ہے (ملاحظہ ہو: ص ۲۳)

(۸) صاحب مینا بازار "آگیں" اور فرما کے سابقے سے لفظ بنانے کا مشاق ہے، مثلاً اس طرح کے لفظ مینا بازار میں زیادہ آئے ہیں،

شہد آگیں، نوش آگیں، بہار آگیں، نشاط آگیں، آرزو فرما، وسوسہ فرما،

ظہوری اسم کیفیت اور حاصل مصدر کے استعمال کی طرف زیادہ مائل تھا اس سلسلے کی حسب ذیل مثالیں قابلِ غور ہیں:

بیعانگی	(ص ۳۸، ۶۷)	کنایگی	(ص ۸۷)	شگفتگی	کئی بار
شعبگی	(" ۴)	گلدستگی	(" ۸۳)	کشادگی	کئی بار
تہ جرعگی	(" ۷۷)	بلند آوازگی	(" ۱۷)	پژمردگی	کئی بار
طفلگی	(" ۶۷)	کہنگی	(" ۱۸)	تازگی	کئی بار
عاطلگی	(" ۶۱)	بے ترنگی	(" ۱۰)	وغیرہ	
سرنگی	(" ۶۸)	خزانگی	(" ۹۰، ۵۳)	وغیرہ	

ان لفظوں سے بھی ان دو مصنفوں کی افتاد طبع کے اختلاف کا پتہ چلتا ہے،

(۹) مینا بازار کا مصنف ایک لفظ کو بڑی دور تک بار بار استعمال کرتا چلا جاتا ہے، اس سے عبارت گنجلک اور نفس مضمون دشوار ہو جاتا ہے، ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں،

(ا) ہرچند قوس قزح بر و یافتن از آفتاب صفت رنگ آمیزی را بر طاق بلند نہادہ است لیکن در برابر رنگینی بیش طاق تلون دکان رنگینش از طاق دل آسمان افتادہ (ص ۸)

اس میں 'طاق' تین بار آیا ہے۔

(ب) یاقوت زرد وش یاقوت زرد آفتاب را روز بازار نے فلک از شرم بساط گوہرش ہر سحر بساط گوہر برچیدہ و آفتاب از انفعال یاقوت زرد وش شکستہ رنگ گردیدہ تا نظر اعجوبہ نگر بر آئین دکانش افتادہ کوہ سیلان با وجود سنگدلی سیل اشک یاقوت رنگ کشادہ (ص ۸)

اس میں 'یاقوت زرد' تین بار اور 'یاقوت رنگ' ایک بار، 'بساط گوہر' دو بار آیا ہے۔

(ج) عکس آب و تاب گوہر شب چراغش در خانۂ چشم چراغ افروز و در جنب فروغ کی نور پاشی او آفتاب عالمتاب بے فروغ تر از چراغ روز، از گوہر تر صفا پر درش

دریا دریا موج طراوت در جوش وصفائی گوہرش ... الخ (ص ۹)

اس میں 'گوہر' تین بار، 'چراغ' تین بار اور 'فروغ' دو بار آیا ہے۔

(د) مثلث او نظر تثلیث .... مثلث نوشتہ (ص ۲۴)

اس میں 'مثلث' ۴ بار، 'روزی' دو بار اور 'گل' بھی دو بار آیا ہے۔

(ی) ص ۱۳ پر 'شیریں' ۵ بار اور ص ۳۰ پر ایک جملے میں 'ریشہ' تین بار آیا ہے۔

اس طرح کی مثالیں مینا بازار میں ہر جگہ موجود ہیں، لیکن سہ نثر میں اس کی مثال خال خال ہے، اور اگر کہیں ایک لفظ دور تک لے گیا ہے تو اس میں بھی غیر معمولی لطافت و خوبی پیدا کی ہے، سب سے اچھی مثال قابل غور ہے:-

در ہر دکان راستہ بازارش کہ منار شعاعی آفتاب طنابی گردیدہ کار ہزار سود وسودا راست آمدہ و قاعدۂ راستی و درستی این مرتبہ کہ گنج بیان از رستۂ راستی بیرون نتوانند رفت، چنانچہ آسمان از کہکشاں میان در بندگی خدایگان محکم کردہ زمین نیز بہ نفع رسانی کمر بستہ۔ (ص ۷۶)

اس کے پہلے حصہ میں بے شبہ لفظی رعایتیں زیادہ ہیں، مثلاً راستہ بازار کی رعایت سے راست، راستی، رستہ، راستی کا استعمال کسی قدر بار خاطر ہوتا ہے، لیکن دوسرے جملے کی لطافت و معنویت نے اس نقص کو بڑی حد تک پاک کر دیا ہے۔

زمین پر جو بازار لگا ہوا ہے وہ نفع رسانی خلق پر کمر بستہ ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آسمان نے خدایگان (بادشاہ) کی بندگی میں کہکشاں کی پٹی کمر میں باندھ رکھی ہے، آسمان، کہکشاں، میان، خدایگان مقفی لفظوں میں اس کا حسن بڑھا دیا ہے، "میان" کا لفظ خوب استعمال ہوا ہے۔ میان محکم کردن محاورہ ہے، مگر کہکشاں کے ساتھ جو آسمان کے درمیان ہوتی ہے، اس لفظ نے مزید لطف پیدا کر دیا ہے، "کمر بستن" کے محاورہ سے اس لطافت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے، مینا بازار

کا مصنف ایسے موقع کے لیے بیرہ برداشتن استعمال کرتا ہے، مگر دونوں میں جو فرق ہے وہ اہلِ نظر پر ظاہر ہے،

(۱۰) ابراہیم عادل شاہ کو لفظ نورس سے جو شیفتگی تھی، اس کے نتیجے میں مختلف چیزوں کو یہ نام ملا[1]، اور بالآخر خود بادشاہ شاہ نورس کے لقب سے ممتاز ہوا، چنانچہ بیجاپوری مصنفین کے یہاں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے، ظہوری کی تحریروں میں بھی یہ لفظ اکثر ملتا ہے، سہ نثر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، نورس سرابستان حال، نقش نورس، نورس شہریار، نورسپور، نغمہ نورس، کتاب نورس، نورس مراد وغیرہ بار بار آئے ہیں، اس کے برخلاف مینا بازار میں یہ لفظ ایک بار بھی نہیں آیا ہے، ظہوری نے اس کو صرف اسم علم کے طور پر استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اکثر بطور استعارہ وکنایہ بھی آیا ہے، مینا بازار میں اس کے بجائے لفظ نوبر دو جگہ آیا ہے، ظہوری نورس پر نوبر کو ترجیح دے یہ قیاس میں نہیں آسکتا، اس لحاظ سے مینا بازار اور سہ نثر ایک ہی مصنف کی ملک قرار نہیں پا سکتیں،

(۱۱) سہ نثر میں صرف ایک لفظ ہندی کا "جگت گرو" آیا ہے، جو بادشاہ کا خطاب تھا، برخلاف اس کے مینا بازار میں بیڑہ، کمرک، کٹھل، تمباکو، حقہ (بمعنی قلیان)، بوٹہ دار، چلم، تنبولی، سپاری، چونا، کتھا، اکال، بیرہ، پان وغیرہ موجود ہیں، ان میں سے بعض لفظ فارسی دانوں نے بے تکلف استعمال کیے ہیں، ظہوری کے عہد میں بھی بعض لفظ رائج تھے، اور اس کے معاصرین کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں، اور پان، بیرہ، اکال ظہوری نے اپنے ساقی نامے میں استعمال کیا ہے، اور ایک نظم کی ایک بیت میں تیلی، بقال، گھی وغیرہ کا لفظ آیا ہے، مگر یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ ظہوری نے نثر میں ہندی کے لفظ استعمال نہیں کیے ہیں، نہ سہ نثر میں، نہ رقعہ فیضی اور نہ رقعہ بنام عماد خاں میں،

---

[1] ظہوری ص ۱۴۳-۱۴۴

(۱۲) لفظ مالامال دونوں میں آیا ہے۔ سہ نثر میں ایک بار مضاف کے طور پر اور دوسری جگہ اس کے بعد "از" آیا ہے، مینا بازار میں ایک جگہ تو مضاف ہی، مگر دوسری جگہ اس کے بعد "بہ" آیا ہے، سہ نثر میں حرف کے طور پر عنان رفتن استعمال ہوا، اور مینا بازار میں عنان کشیدن[۱]۔ سہ نثر میں "رستہ بازارش" کا جو فقرہ آیا ہے اس سے وہ بازار مراد ہے جو نورسپور کو بیجاپور سے ملاتا تھا، مگر مینا بازار میں یہ فقرہ دوبار آیا ہے ایک بار رستۂ بازار زیبائی اور دوسری جگہ رستۂ بازار حسن، سہ نثر اور مینا بازار کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صاحب نظر پر بخوبی عیاں ہے، کیا یہ چیز قابلِ توجہ نہیں کہ ایک ہی مصنف کے بیان میں اس طرح کے تفاوت[۲] کیونکر پائے جا سکتے ہیں؟

(۱۳) مینا بازار کے بکثرت الفاظ اور فقرے ایسے ہیں جو سہ نثر اور ظہوری کی دوسری نثری تصنیفوں میں نہیں پائے جاتے، ان میں سے چند کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

عصمتیاں، خلوتیاں، ملائک نظر فریب، میحان حشمش مرساد، شبیہ شق القمر، یک نظر دیدن، مستغنیانہ، یک مژہ بیرون خرامیدن، تقدس فرش، تودو، زاغ خامہ، تہ دل، بسیار از بسیار، وسعت آباد، عصمت آباد، مفتی حیا، احتجاب (پردہ) شہر صورت سیاست، قرۃ العین، درالتاج، نیش مرجان، اقتباس روشنی، لعل شب چراغ، بچرخ در آمدہ، زمرد طالع، قطرۂ افسردہ، صعب گذار، لعل پیکانی، یاقوت کرکاکی کرک، کدب، سپارش (حاصل مصدر از سپردن)، ششکمانان، زمرد خط، لعل قطبی، گل دوز دوانغ، بستہ گھٹی یاران لباسی، انصاف مندان، زندان کدہ، گل میخ، گل باز، دستیوہ، نام خدا، مرارت، قند (حلوائی) مزہ، رشوتیاں، عذوبت آمایش، مثلث مہر و ماہ، مثلثات افلاک، کلالہ، مشک ریز، عود قماری،

---

[۱] بہارِ عجم میں عنان کے ساتھ کشیدن مصدر دیا ہے اور اس کے ساتھ نظیری کا شعر لکھا ہے (ج ۲ ص ۲۳۲) جس کا ایک مصرع یہ ہے: شادی کہ عنان می کشی و دم نمی زنی۔ لیکن ظہوری کا استعمال بھی صحیح ہے۔ [۲] ظہوری بساط افگندن لکھنے کا شائق ہے۔ ملاحظہ ہو: سینہ زجواہرش بساط افگندہ است، یا بگلزارش افگندہ عشرت بساط۔ اسکے برخلاف صاحب مینا بازار انداختہ لکھتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے مگر ظہوری سے کسی قدر متفاوت بساط موافقت انداختہ (ص ۳)

خانہ گیر، ترطیب، تعطر، غالیہ ریز، لخلخہ پیرا، شانچہ بندی، حقہ باز، عرق چیں، زنخ زن، آرد گشتن، بہرہ بر داشتن، موفور السرور، جوشش، دم اسد، قلم بر داشتہ، وغیرہ وغیرہ

ایک چھوٹی سی کتاب کے اتنے الفاظ اسی مصنف کی دوسری کتاب میں نہ آنا موجب حیرت ہے،

(۱۴) سہ نثر میں نثر مرجز کے بھی نمونے مل جاتے ہیں یعنی اس کے بعض حصے کسی نہ کسی بحر میں موزوں ہو جاتے ہیں، غالب ایک رقعہ[۱] میں لکھتے ہیں:

"حضرت ظہوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں

راتمش سرو بن گلشن فتح خنجرش ماہی دریائے ظفر، وزن اسکا فاعلاتن فاعلاتن فعلن ہے۔

کاتبوں نے ز تقفی کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور کچھ تصرف کیا ہے کہ نثر مرجز رہی نہ مقفی۔"

بعض نسخوں میں فتح کے بعد نصر کو واؤ عطف سے جوڑا ہے، غالب نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، مولانا صہبائی بھی اسی طرح[۲] کا خیال ظاہر کرتے ہیں:

"این عبارت شعر است نہ نثر، فرد است مطلع نیست تا احتیاج بتبدیل ضرب با عجز نوانہ بود و بار تکلف بر دوش توان بر داشت۔"

اس اعتبار سے بھی سہ نثر اور مینا بازار کے طرز متفاوت ہیں۔

(۱۵) سہ نثر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے جملوں کی ساخت اور جذبات و خیالات میں ہم آہنگی ہے، جس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح کے جملے صفحۂ قرطاس پر آتے رہتے ہیں، ہر پیراگراف میں ابتدا میں بڑے جملے ملیں گے، مگر جوں جوں خیالات میں تیزی و روانی پیدا ہوگی، جملے چھوٹے ہوتے جائیں گے، بالآخر ایسے جملے ملیں گے جن میں افعال و روابط محذوف ہونگے کبھی کبھی آخر والے جملے دو تین لفظوں پر ختم ہو جاتے ہیں،

اس طرح کا التزام نہ مینا بازار میں ہے اور نہ کسی اور کتاب میں۔

---

[۱] ادبی خطوط غالب ص ۱۶ [۲] شرح سہ نثر ظہوری ص ۵۰

(۱۶) ظہوری کی توجہ سہ نثر میں معنوی لطافت پیدا کرنے پر مرکوز ہے، وہ برابر اس کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے کلام میں شعریت و لنشریت پیدا کرے، وہ اپنی تحریر کو عمدہ اور دلچسپ صنائع سے آراستہ کرتا ہے، لغات سے حتی الامکان بچتا ہے، اس کے برعکس مینا بازار کا مولف لغات سے اپنی تحریر عالمانہ بنانا چاہتا ہے، اس لیے اس میں لفظی رعایتیں، تصنع وغیرہ بکثرت پائے جاتے ہیں، سہ نثر کی چند مثالیں نیچے درج کی جاتی ہیں:

(ص ۲-۳) جلاجل اوراق درختان بہواے او ترانہ ریز و منقار بلبلان بلبلان بنواے او نغمہ خیز

ہوا چلنے سے پتوں میں آواز ہوتی ہے، اس لیے انھیں گھنٹی یا جھانجھ کہتا ہے، پھر "ہوا" میں ایسا عمدہ ایہام کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ چونچ سے آواز نکلتی ہے اس لیے اسے بلبان یا مورچنگ بتاتا ہے، "نوا" میں نہایت اچھا ایہام ہے،

(ص ۷) بشمیم خلقش سمن از ختن ختن نافہ در جیب و داماں، بنسیم لطفش غنچہ را چمن چمن خندہ در زیر لب پنہاں۔

شمیم خلق میں اضافت تشبیہی۔ بادشاہ کے خلق سے سمن میں خوشبو پیدا ہونا حسن تعلیل۔ ختن ختن ایہام۔ نافہ میں استعارہ اور ایہام۔ جیب و داماں کا فقرہ ان ہی لفظوں کی مناسبت سے خوب استعمال ہوا ہے، دوسرے فقرے میں لطف کو نسیم بتایا ہے، جس کی وجہ سے غنچہ ہنستا ہے، چمن چمن میں نہایت عمدہ ایہام ہے، خندۂ غنچہ بہت اچھا فقرہ ہے۔

(ایضاً) شمال گلشن وفاق را تاکید غنچہ دل شگفانیدن و صرصر کوے نفاق را تہدید غبار بر خاطر نشانیدن۔

وفاق (دوستی) کو گلشن بنا یا گیا، پھر اسے شمال قرار دیکر دل کے غنچوں کے کھلانے کا کام سپرد ہوا۔ نفاق کو صرصر بتا کر دلوں پر میل و غبار بٹھانے سے تہدید کرنا کتنا عمدہ طریقہ ہے، تاکید و تہدید کے مناسب استعمال نے حسن بیان کو دوبالا کر دیا ہے۔

(ایضاً) نغمۂ نا ہنجار عدالتش ملک نواز شعلہ کانون سیاستش ظلم گداز۔

عدالت کو ساز (قانون) بتانا، پھر اس سے مالک نواز نغمے پیدا کرنا صرف ظہوری کا حق ہے،

اسی طرح سیاست کی بھٹی سے ظلم گداز شعلے بھڑکانا سحر طرازی ہے۔

(ص ۸) آب تیغش آتش خرمن زندگانی - بادتیرش صفیر مرگ ناگہانی

تیغ کی آب (چمک، باڑھ) سے خرمن زندگی کے لیے آتش (آگ) کا کام لینا معجز نگاری ہے،

اسی طرح تیر سے جو آواز نکلتی ہے، اسے مرگ ناگہانی کی آواز بتانا انشا پردازی کا کمال ہے۔

(ص ۱۳) تمنائے ارباب ہنر بہ پیرایہ التفاتش معشوق حصول،

یہ فقرہ نہایت لطیف ہے، کہنا یہ ہے کہ اس ہنر پرور بادشاہ کے عہد میں ہنرمندوں کی بڑی قدر ہوتی ہے، عام طور پر تمنا حصول یا مقصد برآری کی عاشق ہوتی، (ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی آرزو پوری ہو جائے) لیکن اس عہد میں معاملہ برعکس ہے یعنی حصول تمنا پر عاشق ہو گیا کیونکہ تمنا کو بادشاہ نے اپنی توجہ سے ایسا آراستہ کیا ہے کہ اس میں محبوبانہ صفات پیدا ہو گئے ہیں، یعنی بادشاہ خود ارباب ہنر کو تلاش کر کے ان پر انعام کی بارش کرتا ہے، اسی خیال کو ایک جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے،

(ص ۱۳) در ہیچ چیز حسن ہنر پنہان نگردیدہ کہ تمیزش آشکارا بآں عشقے نہ ورزیدہ۔

(ص ۱۶) ہر صفحہ چمنے، ہر سطر نخلے برگش لفظ دلکش بارش معنی بے غش

کتاب نورس کے صفحہ کو چمن، سطر کو نخل (درخت)، لفظ دلکش کو پتیاں اور خیال کو پھل بتا کر ایک سرسبز و شاداب چمن کا نقشہ کھینچا ہے۔

(ص ۱۶) بلبل فصاحت بر گل نزاکت تحریر در تقریر، نظر نظارگیاں از موج رطوبت عبارت

را ل دہ زنجیر۔

نازک و لطیف تحریروں کی فصاحت کو اس طرح کہتا ہے کہ فصاحت کا بلبل تحریر کے

گل نزاکت پر بیٹھا چہچہا رہا ہے، عبارت رواں کی شگفتگی کو جو دیکھنے والوں کو متحیر کردیتی ہے، ان الفاظ میں بیان کرتا ہے. عبارت رواں کی طوبت شگفتگی کی موج دیکھنے والوں کی نظروں کو مقید کرلیتی ہے. کیسی عمدہ توجیہ ہے اور کتنے عمدہ الفاظ سے کام لیا گیا ہے،

(۔۔) خضر تشنۂ سیرابی اداسیجا مردہ جاں بخشی ہوا (ص ۱۶)

حضرت خضر جو دوسروں کو آب حیات تک پہنچاتے ہیں وہ بھی اس کتاب میں جو سیرابی ہے، اس کے لیے لب تشنہ (عاشق) ہیں، اور حضرت عیسیٰؑ اس کی جاں بخش کیفیت کے جان دادہ (مردہ بمعنی عاشق) ہیں۔ الفاظ کے انتخاب مصنف کی قوت تمیز نے جو سحر کاری دکھائی ہے اسکا بیان نہیں ہوسکتا،

یہ مثالیں جو بطور نمونہ مشتے از خروارے پیش ہیں، صاف طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ یہ نثر در اصل نثر میں شعر کا[1] بہترین نمونہ ہے، تنہا مینا بازار کا ذکر نہیں، بلکہ اس اعتبار سے کوئی دوسری نثر اس کے ہم پایہ نہیں ہوسکتی،

(۱۸) ظہوری کے ساقی نامے میں[2] احمد نگر کے بازار میں عورتیں بھی سودا فروشی کا کام کرتی ہیں، شاعر نے ان کا بیان بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس حصے کا مقابلہ مینا بازار کی سودا فروش عورتوں سے بہت مستحسن ہوگا.

بطول مقالات شیدائیاں بعرض خیالات سودائیاں

وہ بازار عاشقوں کی گفتگو کی طرح طویل اور سودائیوں کے خیالات کے مثل عریض تھا۔

---

[1] انشائے فیضی ص ۷۰ میں ظہوری کے نام ایک رقعہ ہے جس میں لکھتا ہے:-

"مدتے است کہ از نوادر طبع لطیف انچہ روے دادہ باشد بفرستند و بر نثر تنہا اکتفا ننمایند، ہر چند نثر را بہ پایۂ نظم رسانیدہ باشند." [2] ص ۱۴۱ ببعد.

زبس زیور و زیب رشک سپہر　　بروج دکاکین پر از ماہ و مہر

وہ بازار اپنی آرایش کی بنا پر رشک سپہر ہو رہا تھا، دکانیں بروج آسمانی ہیں کہ ان میں ماہ و مہر (عورتیں) بیٹھی ہوئی تھیں،

بسودا ز بس دلبری کردہ اند　　مہ و زہرہ را مشتری کردہ اند

سودا بیچنے میں وہ دلبری دکھائی کہ مہ و زہرہ کو بھی مشتری (خریدار) کر لیا،

بسودائے ایشاں چو کوشید جاں　　بہ بیعانگی رفتہ دل درمیاں

ان سے جب جان نے خریداری کرنا چاہی تو دل بطور بیعانہ کے درمیان میں آگیا،

سیہ چشم سبز آں رنگیں نگاہ　　بہ شور نمک از شکر باج خواہ

ان کی ملاحت و رنگینی پر شکر ہزاروں دل سے فدا تھی، سیہ، سبز، شکر، نمک کا اجتماع بہت خوب ہے، شور میں ایہام ہے، اس کے معنی شہرت کے ہیں،

خرد در خم طرہ ہا مبتلا　　دل از ساعد و ساق بے دست و پا

عقل ان کے زلفوں کے پیچ میں الجھ کے رہ گئی اور دل ان کے ساق و کلائی کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے، "بے دست و پا" میں ایہام ہے،

بجذب دل و جانِ اہل وفا　　دل آہنی رشک آہن ربا

اگرچہ ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہیں، مگر عاشقوں کے لیے چقماق کی تاثیر رکھتے ہیں (سختی کے ساتھ آہن ربا کی کیفیت بتانا بہت خوب ہے)

سر عقل را داغِ دیوانگی است　　بلے حسن بازاریاں خانگی است

عاقلان ان کے حسن پر دیوانہ وار گر رہے ہیں، ہاں کیوں نہ ہو، ان کے حسن میں بازاری پن نہیں ہے،

ز عابد فریبانِ ہند و مپرس　　ز اعجاز چشمانِ جادو مپرس

ان کے عابد فریب حسن کی بابت کیا پوچھتے ہو، ان کی ساحرانہ آنکھیں اعجاز کر رہی ہیں،

ختن ہاست در چین ہر موے شاں　　خراسانیاں جملہ ہندوے شاں

ان کے بالوں کے پیچ میں نہ جانے کتنے ختن الجھے ہیں، اس کی وجہ سے تمام اہل خراسان ان کے غلام (ہندو) ہوگئے ہیں، (ختن، چین، خراسان، ہندو کا اجتماع کتنا دلچسپ ہے)

رمندہ غزالانِ صیاد فن　　صنم لیک در دوستی برہمن

ہیں تو وحشی ہرن لیکن اپنے فن میں بڑے استاد ہیں، صنم کی خصوصیت رکھنے کے باوجود عاشق پرست (برہمن) ہیں، صیاد اور برہمن میں لطیف ایہام تضاد ہے،

دل اہل دیں کعبۂ محترم　　وز ایشاں ہمہ کعبہ ہا پر صنم

اہل دیں کا دل کعبۂ محترم ہے، ان میں ان بتوں کا خیال جاگزیں ہونے سے ایسا خیال ہوتا ہے گویا کعبہ میں بت آگئے،

نگہ غیرت گلشن از چہر شاں　　دلے نیست بے ریشۂ مہر شاں

ان کے چہرہ دیکھنے کی وجہ سے نگاہوں میں گلشن کی خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے، اس لیے کوئی دل ان کی محبت سے خالی نہیں،

فتادند در کفر صبر و شکیب　　حذر از کمرہاے زنار زیب

ان کی زنار زیب کمر کی وجہ سے صبر و شکیب جاتا رہا، در کفر افتادن بمعنی ناشکرا ہونا، بے صبر ہو جانا،

سر تقوی ہر کہ می گرد درد　　ازیشاں سرے صندل آلود کرد

اگرچہ محبوب دشمنِ تقویٰ ہوتے ہیں، لیکن ان سے تقویٰ کو بھی آسودگی حاصل ہوگئی،

رہ مایہ واراں ایماں زنند　　بجز وار بیع[1] دل و جاں زنند

---

[1] سنتر شک کے مطبوعہ نسخے میں نقد دل ہے، مگر بہار عجم (ج ۱ ص ۱۷۹) اور سنتر کے تمام قلمی نسخوں میں ایسا ہی ہے۔

بیع زدن، خریدنا۔ رہ زدن، حملہ کرنا۔ ایمان کا سرمایہ انھوں نے لوٹ لیا۔ اور بکثرت دل و جان کے بھی خریدار ہو گئے۔

برآورده در چارسو عشوه جوش　　بگرداب صد کشتی صبر و ہوش

ان کے عشوہ و ناز و ادا کی وجہ سے صبر و ہوش کی کشتی گرداب میں جا پڑی۔

ان میں سے چند شعر ظہوری نے نورسپور کے بازار کی تعریف کے ضمن میں دیباچۂ خوان خلیل میں درج کر دیے ہیں، اور ان کے قبل بازار کا جو مختصر نقشہ نثر میں کھینچا تھا، وہ معنوی اعتبار سے ان اشعار کی خوبیوں کا حامل ہے،

ذیل میں وصف دکان میوہ فروش سے کچھ حصہ نقل کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان دونوں میں کیا نسبت ہے[1]:

نخل قامتش نہالیست خورشید بار و بر ردیش میوۂ ایست ماہ خریدار، نخل بندان گلشن نشاط را بے اندیشۂ بر ردیش نور تمنا کردن امر محال و چمن پیرایان باغ انبساط را بے خیال سیب زنخدانش بگلشن امید بخوردن محض خیال، بگلشن سبز بختی کسی برخوردار گردیده که در گلشن عالم مثال از تصور شفتالوی لبش ذوق یاب میوۂ وصال او گشته و بکام مدعا رسیده، اگر از شکست رنگ بر چہرہ ادب نمی اندیشیدم واز ملاحظۂ شاخچہ بندی پایۂ شناسی نمی ترسیدم میگفتم که قدش سرو سیست که بہ بر می آید و کسے بروز بان طعن بے بری نمی کشاید۔ الخ

اگرچہ مینا بازار کا یہ اقتباس نسبتہً صاف ہے، پھر بھی ساقی نامے کی سادگی اور معنوی لطافت سے یہ عبارت خالی ہے،

ظہوری نے ساقی نامے میں[2] پان کی تعریف و توصیف کی ہے، اس حصے کے چند شعر پیش ہیں،

---

[1] ص ۴۸ [2] ص ۵۷ - ۵۸

تاکہ ان کا مقابلہ مینا بازار کے اس حصے سے کرایا جائے جو تنبولی کی دکان کی وصف سے متعلق ہیں،

نہ پان مشک وہاں سخن پروراں سہیلِ عقیقِ لب دلبراں

پان سخن پروروں کے لیے مشک وہاں اور محبوبوں کے لبوں کی رنگینی کا سبب ہے،

از و گرم خوبان نسریں جبیں زبانہا چو برگ گل آتشیں

اس سے چنبیلی کی طرح پیشانی والے محبوب گرم یعنی شوخ وشنگ ہوجاتے ہیں اور زبان اس کے اثر سے گل سرخ ہو جاتی ہے،

برنگ زمرد ولے در اثر دہنہا از و حقۂ لعل تر

اس کا رنگ زمرد (ہرا) کا ہے لیکن اثر کا یہ عالم ہے کہ اس کی وجہ سے منہ لعل شاداب کی ڈبیا ہو جاتا ہے۔

ز پیچاک او نخلہا در چمن نمودہ نمودار رگہاے تن

پان کی بیل درختوں پر ایسی معلوم ہوتی ہے گویا جسم کی رگیں ہیں،

ز سرچشمۂ خضر بشست شوے چو سبزاں خوے کردہ تازہ رو

پان آب حیات سے دھل کر ایسا صاف ستھرا ہوگیا ہے گویا تازہ رو محبوب ہے جس کے چہرہ پر پسینہ آگیا ہے۔

چناں خوشنما چوں شود نقطہ دار کہ پروین بتشبیہ گردد نثار

جب پان میں نقطے پڑ جاتے ہیں تو وہ ایسے خوبصورت ہوجاتے ہیں کہ پروین اس پر ہزار بار سے فدا ہوتی ہے۔

باین شکل شد دستہ از باغباں کہ شد منبر کام از و خطبہ خواں

مالی نے پان کی ڈھولی اس طرح باندھی کہ زبان اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوگئی۔

بمعنی جسم و بصورت تنک بعزت گران و بقیمت سبک

ہلکا پھلکا پان اتنی خوبیوں کا حامل ہے، دام کچھ نہیں اور عزت سب سے زیادہ،

معماست بہاے اہل حیا کہ دیداست چو او معماکشا

اہلِ حیا کا لب کسی نے نہ دیکھا ہوگا، وہ گویا معما ہے، مگر پان کھانے سے معماکشائی ہو جاتی ہے،

باو معرفت پیشگاں را سر ہست کہ در بیرہ اش ہر ورق دفترے ست

اہل معرفت کے لیے پان کا بیڑہ حقائق کا دفتر ہے،

بلبہاے گلرنگ رنگے کشید کہ خواہند خوباں دیت از شہید

پان سے ہونٹ ایسے رنگین ہو جاتے ہیں کہ شہید کی رنگینی اس کے سامنے ہیچ ہے۔

شود چہرۂ زرد خورشید آں دہندش اگر ماہ رویاں اگال[1]

ماہ رو (محبوب) کے اگال سے خورشید کا زرد چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ ماہ میں بہت عمدہ ایہام تناسب ہے،

زغم عاشقاں رغ بناخن کنند چو خوبانش در سینہ ناخن زنند

جب معشوق پان کی رگ کو ناخن سے کھرچتے ہیں تو عاشق مارے رشک کے اپنا رخ چھیلنے لگتے ہیں۔

بود زیب ہند ایں حنائے عجب کہ برکف تہی رنگ رو ید زلب

ہندوستان کے لیے یہ عجیب حنا باعث زینت ہے، اس کو کف پر رکھیے اور ہونٹوں پر سرخی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اب مینا بازار کے چند حلیے ملاحظہ ہوں[2]۔

---

[1] ظہوری ایک جگہ اور کہتا ہے: ع غنچہ چو بشگفد گرفتہ اگال (بہار عجم ج ا ص ۸۷)

[2] ص ۳۶-۳۷

بر دکان.............. شمارش نمی آرد

تنبولی کی دکان پر ایک عالم جاں فدا کرنے اور عجز بکاری (جس پر لوگ قدرت نہیں رکھتے) کے سامان کا خیال رکھتا ہے، اور دکاندار (محبوب) برگ شماری میں اتنا مصروف ہے کہ اسے جان سپاری کی فکر نہیں اور وہ اسے شمار میں نہیں لاتا، اور نہ اس کی پروا کرتا ہے۔

سپاری میں ایہام ہے، کیونکہ ڈلی کو بھی سپاری کہتے ہیں، تینوں برگ میں سے پہلے اور تیسرے میں ایہام ہے، شماری اور شمار اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

"تا ہلال لبش از گونہ تنبول شفق گوں گشتہ ہلال از شفق غوطہ در خوں خوردہ"

جب سے اس کا ہلال جیسا لب پان کے رنگ سے سرخ (شفق گوں) ہو گیا، ہلال آسمانی بسبب رشک و حسد شفق کے خون میں ڈوب گیا ہے، پہلے ہلال اور شفق میں ایہام، گونہ، گوں میں تجنیس، شفق کو خون سے تشبیہ دی گئی ہے، شفق پھولنے کی وجہ رشک سرخی لب بتائی گئی ہے، اس لیے اس میں حسن تعلیل ہے۔

"تا گوہر دندانش از گونہ پان ہمرنگ مرجان شدہ مرجان جاں از شکنجۂ غم بیروں نبردہ"

جب سے معشوق کے دانت پان سے رنگین ہو کر مونگے کی طرح سرخ ہو گئے ہیں، مرجان کی جان غم کے شکنجے میں کس گئی ہے۔ دانت کو گوہر سے تشبیہ دی گئی ہے، مرجان اور جان میں تجنیس اور غم کو شکنجہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

ابر رنگین کردن لبہائے ماہ رویاں بیرہ بر داشتہ ہیچ لبے بجز لب ہلال بیرنگ نگذاشتہ

جب سے تنبولی نے ماہ رویوں کے لب کو رنگین کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے کوئی لب سوائے لب ہلال کے بیرنگ نہیں رہ گیا، ہلال کی بیرنگی کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے لب معشوق کی برابری کا دعوی کیا تھا، اس سے قبل کے فقرے میں لب کو ہلال اور یہاں ہلال کو لب بتایا ہے۔

زبان از فیض مدح رنگینی پانش برنگ گلبرگ رنگیں دہاں ہمین وصف بیرۂ عطر بارش چوں غنچۂ گل عطر آگیں

زبان پان کی رنگینی کی مدح سے اس قدر فیض یافتہ ہوئی کہ گلاب کی رنگین پنکھڑی کی طرح رنگین ہوگئی اور منہ اس کے عطر آلود پان کے بیڑہ کے وصف کی وجہ سے غنچۂ گل کی طرح عطر آگیں ہوگیا ہے۔

برگ پانش عجب طوطی است سینہ باز شکار و طرفہ زمردے ست از آب یاقوت سرشار ؛ سونش گوہرش در کنار

سینہ باز دو رنگ کی چڑیا ہوتی ہے، یہاں چونہ، کتھے سے کنایہ ہے، پان کا پتہ ایک طوطی ہے جس نے سینہ باز کو شکار کرلیا ہے، (کتھا، چونہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے شکار کرنا مستعمل کیا ہے) اور ایسا زمرد (بہ اعتبار سبزی) ہے جو یاقوت کی چمک (بہ اعتبار رنگینی) سے سرشار ہے، اور جس کے کنارے موتیوں کے برادے ہیں (چونا) ~~یا کتھا~~ (سارے جواہرات صرف میں آگئے)

چوناش کہ در سپیدی از جواہل زیادہ است باز سفیدے ست کہ در دام طوطی سبز رنگ افتادہ

چونا جو جواہل (بگلے) سے زیادہ سفید ہے، سفید باز ہے جو طوطی سبز رنگ (پان) کے جال میں پھنس گیا ہے، باز شکاری چڑیا ہے مگر یہاں خود شکار ہوگیا، (تین چڑیوں کا ایک ساتھ ذکر ہے)

برگ پان و چونہ اش برنگ بخت سبز و سفید باہم انجمنے ساختہ اند و طرح الفت افگندہ و بساط موافقت انداختہ

پان اور چونے کی موافقت بخت و سبز و سفید کی موافقت ہے۔

یک برگش بکوہ کوہ زمرد از بس ارزانی و یکدانۂ گوہر وزن چونہ اش بادریا دریا گوہر در لباس سبکی گرانی رایگانی

پان کا ایک پتہ بہت سے زمرد کے مقابلہ میں کافی ارزاں ہے اور ایک موتی کے وزن کے برابر چونا ہزاروں موتیوں کے مقابلے میں قدر و قیمت میں اتنا زیادہ ہے گویا مفت ہاتھ آگیا ہو (رعایاتِ لفظی و تصنعات سے بھرپور ہے)

گوہر از غم سر بسنگ زدہ پیش چونہ اش سفید نگردیدہ و پائے زمرد از اندوہ بسنگ آمدہ و برنگ پانش نرسیدہ

گوہر (جوہر مطلق) غم سے اپنا سر پتھر پر پٹک رہا ہے، (بہ اعتبار حجریت جو مروارید میں ہوتی ہے)

لیکن چونے کی سفیدی کی رونق سے عاری ہے، زمرو باوجود مشق برداشت کرنے کے (باعتبار پتھر سے پیدا ہونے کے) وہ پان کی طرح سرسبز نہ ہو سکا۔

ان مثالوں سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ لغات کی کثرت، لفظی رعایت، مشکل تشبیہات (جو عموماً تصنع سے پر ہوتے ہیں) وغیرہ مینا بازار کے خصائص ہیں جب کہ ظہوری اسی موضوع پر ساقی نامہ میں ایسے اشعار قلم بند کرتا ہے، جن میں دلچسپ تشبیہات اور معنی آفرینی کی افراط ہے، یہی معنی آفرینی سہ نثر کی جان ہے، اور اس لحاظ سے سہ نثر ظہوری اور ساقی نامہ میں بڑی مماثلت ہے، اور اسی وجہ سے سہ نثر اور مینا بازار کے طرزوں میں بڑا تفاوت ہے، ہم سہ نثر کی تھوڑی عبارت نقل کر چکے ہیں، اور اس کی مختصر تشریح بھی کر دی ہے، اب آپ مینا بازار سے اس کا مقابلہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ظہوری کی نثر میں جو دل آویزی ہے اس سے مینا بازار یکسر خالی ہے، اس لیے سہ نثر اور مینا بازار ایک ہی مصنف کی تراوش خامہ کا نتیجہ نہیں قرار دی جا سکتیں، یہ بھی معلوم ہے کہ سہ نثر کی تینوں نثریں تقریباً ۸ سال کے وقفہ میں لکھی گئیں، مگر ان تینوں میں باعتبار طرز کوئی خاص فرق نہیں، جبکہ مینا بازار آخری نثر کے قریب لکھے جانے پر بھی باعتبار طرز اس سے بڑی مغائرت رکھتی ہے۔

ہم بار بار عرض کر چکے ہیں کہ جن مصنفین نے مینا بازار کو ظہوری کی طرف منسوب کیا ہے، انھوں نے اپنے فیصلہ کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے، مگر مرزا قتیل نے اشارہ کیا ہے کہ ان کے فیصلہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ دونوں کے یہاں چند فقروں کی یکسانیت پائی جاتی ہے، لیکن صرف الفاظ، فقرات اور جملوں کی یکسانیت پر اس طرح کا قطعی فیصلہ غلط ہوتا ہے، اگر یہ معیار صحیح قرار دے دیا جائے تو ایک زبان کے سارے ادب چند مصنفین کی ملک ہو کے رہ جائیں، کیونکہ اس طرح کا التباس بالکل عام ہوتا ہے، طرز ادا کی یکسانیت، محاورے اور روزمرہ کا استعمال وغیرہ البتہ فیصلہ کن ہو سکتے ہیں، اور ناظرین نے تفصیل سے ملاحظہ کر لیا کہ اس اعتبار سے سہ نثر ظہوری وغیرہ اور مینا بازار کے طرزوں میں بون بعید

علاوہ بریں اگر مینا بازار کے چند فقرے سہ نثر ظہوری کے مشابہ ہیں تو ہمیں ان میں ایسے فقرے اور جملے مل جاتے ہیں جو عرفی، نظیری، فیضی، ابوالفضل، طالب آملی، نعمت خاں کے یہاں بھی موجود ہیں، اسلیے اس معیار سے فیصلہ کرنا دشوار ہو جائے گا، ذیل میں ان تمام مثالوں کو درج کیا جاتا ہے جو مختلف شاعروں اور ادیبوں کے کلام میں ملتی ہیں:

سہ نثر ظہوری	مینا بازار
بسط بساط انبساط پرداختہ (ص ۲)	وقت بسط بساط انبساط (ص ۲)
رطوبت ترانہ از مغز نہ یبوست چیں (ص ۲،۴)	گل چہرہ از مغز زہد خشک یبوست چیں (ص ۱۷)
ازسبکی بر خاطرہا گراں (ص ۱۳)	ازسبکی بر دلہا گراں (ص ۲۳)
تیرباران فاقہ (ص ۲۳)	از تیرباران طعنہ (ص ۱۱)
کلاہ گوشۂ تفاخر بر آسمان شکستہ (ص ۱۰)	کلاہ ناز بر سر زیبائی شکستہ (ص ۱۹)
آں سراب دایں محیط وآں مجاز ایں حقیقت (ص ۳۰)	بحرے را سراب انگاشتہ وحقیقت را مجاز پنداشتہ (ص ۱۰)
چرب و نرمی اصول (ص ۶۰)	چرب و نرمی حلوا (ص ۲۳)
چرب و نرمی سخن (ص ۳۰)	
قصائد عرفی	**مینا بازار**
دکانے چیدہ خُلقش بر سر بازار انسانی[1]	بساط غریب بے عار خود فروشی در دکان چیدہ (ص ۵)
کہ جنت را متاع روے دست ایں دکان بینی	بساط گوہر فروشی سخن بر چیدہ (ص ۱۰)
	متاع روے دست ایں بازار (ص ۵)
	متاع روے دست دکان (ص ۱۴)

[1] یہ شعر خان خاناں کی مدحیہ قصیدہ سے منقول ہے۔

غزلیات نظیری	مینا بازار
ز فرق تا قدمش ہر کجا کہ می نگرم کرشمۂ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست	تن یاسمین نازک اندامش فرق تا قدم کبود است (ص ۱۸)
اکبر نامہ در نگارستانِ دولت نور چشم شاہ را[1] مجلۂ چون پردہ ہائے چشم رنگین بستہ اند	مینا بازار پردۂ چشمش چون پردۂ چشم گل رنگین گردیدہ (ص ۲۰)
انشائے فیضی خاطر گل گل شگفت (انشائے فیضی ص ۸۵)	مینا بازار عنبرش گل گل شگفتہ (ص ۲۶)
طالب آملی ز غارت چمنت بر بہار منتہاست کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند (تزک جہانگیری)	مینا بازار ہر گلش از گل صبح تازہ تر (ص ۱۹)
وقائع نعمت خاں دریں دلا کہ طراوت لشکر فیروزی اثر رشک فرمائے[2] گلزار است و رنگینی جلوۂ فوج دریا موج خوں بہائے بہار پنجۂ مژگاں حنا رنگ بست حنائے تماشا نہ گردد[3]	مینا بازار خون صد ہزار بہار بگردن اوست (ص ۱۷)

[1] ابوالفضل نے شہزادہ سلیم کی شادی کے موقع پر دو شعر کا ایک قطعہ کہا تھا، اسکی دوسری بیت ہے، شادی جلوس کے تیسویں سال ۹۹۳ھ میں ہوئی تھی، (طبقات اکبری ج ۲ ص ۳۹۲ - ۳۹۳) [2] مینا بازار میں "فرمائے" لاحقے کے ساتھ بہت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں [3] ہندی لفظوں کو پیش نظر رکھ کر صاحب مینا بازار اور صاحب وقائع دونوں نے ایہام پیدا کیا ہے، مینا بازار

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۱۰۷)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سہ نثر کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے کم از کم دو فقرے بسط بساط انبساط، اور تیر باراں متقدمین کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ صاحب مینا بازار ظہوری کے طرز سے بہت متاثر تھا، اور غالباً ظہوری کی غیر معمولی شہرت نے صاحب مینا بازار کے بھی دل میں نقل کا جذبہ پیدا کیا ہوگا، اور یہ صرف اسی مصنف پر منحصر نہیں، بلکہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ظہوری کے بعد کے جتنے مصنفین نے نثر نگاری میں نام پایا ان سبھوں نے ظہوری سے فیض حاصل کیا ہے۔

مینا بازار میں رعایت لفظی و تکرار لفظی کی کثرت، ہندی الفاظ و فقرات و محاورات کی افراط، تمباکو کے ساری تفصیلات وغیرہ اس کے تاخر زمانی کا پتہ دیتے ہیں، کیا اس کے بعد یہ کہنے کی گنجائش دیجاتی ہے کہ مینا بازار ظہوری کی تصنیف ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۶) کے اس فقرے میں" دکان تنبولی خیال جاں سپاری" سپاری بہ معنی فدا کرنے کے ہیں، لیکن چونکہ یہ لفظ ڈلی کے معنوں میں آتا ہے، جو پان کا ضروری جز ہے، اس لیے اس میں ایک طرح کا ایہام ہوا، بالکل یہی صورت وقائع کے اس فقرے میں ہے،

لب نائی، حجام قضا کے رسد۔ نائی کے معنی بانسری بجانے والا ہے، لیکن ہندوستانی میں اسی کے معنی حجام کے ہوتے ہیں۔

مقدمۂ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ اور ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے عہد کی تاریخ کے ماخذ، عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ جنگ تک کے تمام واقعات و حالات پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے۔　　قیمت:- صہ

(مرتبہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی)

منیجر

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج

میں

سواروں کا نظام

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں عام طور سے تین حصے ہوتے تھے،

(۱) سوار، (۲) ہاتھی (۳) پیدل

تیموریوں کے زمانے میں بندوقچیوں اور توپچیوں کا اضافہ ہوا،

سواروں کی اہمیت، فوج کا بہترین حصہ عموماً سواروں پر مشتمل ہوتا تھا، ازمنۂ وسطیٰ کا ایک فوجی اپنی مردانگی اور شجاعت کا مظاہرہ گھوڑے کی پیٹھ ہی پر سے کرتا تھا، ایک سوار جب جنگی لباس میں ملبوس اور تمام ضروری اسلحہ سے مسلح ہوکر آراستہ و پیراستہ گھوڑے پر نکلتا تو اس کو اپنی اس امتیازی شان میں پندار محسوس ہوتا، اور غیر لشکری بھی اس کو عزت کی نظر سے دیکھتے، چنانچہ خصوصی وقار کا اظہار بعض سلاطین کے سکوں میں بھی ہوتا تھا، مثلاً سلطان شمس الدین التمش کے بعض سکوں میں ایک سوار اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نبرد آزما دکھائی دیتا ہے، لشکر کے بڑے سے بڑے عہدیدار کے لیے ایک اچھا شہسوار ہونا ضروری تھا، اس زمانہ میں جنگ کی نوعیت بھی کچھ ایسی تھی کہ رو برو اور بالمقابل لڑائی کے لیے

سوار ہی مفید ہو سکتے تھے، اس کے علاوہ دور دراز مقامات کی تسخیر اور فوج کی نقل و حرکت میں سواروں کے ذریعہ سے جو سہولت میسر ہوتی تھی، وہ لشکر کے کسی اور حصہ سے نہ ہوتی، اسی لیے لشکر میں سواروں کی تعداد نسبتہً زیادہ رہتی،

سلاطین دہلی کے سوار | تیموری عہد کے پہلے کے سواروں کا لباس عموماً زرہ، خود، جوشن اور دستوانہ ہوتا، اور آلات میں تلوار، سپر، کمان اور تیر ہوتا، کبھی وہ گرز، سنان، نیزہ اور ناچخ لے کر بھی اپنی شجاعت کا جوہر دکھاتے،

محمود غزنوی کے زمانہ میں ہر سوار کے پاس دو گھوڑے ہوتے تھے[۱]، شہاب الدین غوری نے خسرو ملک کے خلاف لاہور پر یلغار کی ہے تو فرشتہ کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ بیس ہزار دو اسپہ و سہ اسپہ سوار تھے،

"سلطان شہاب الدین محمد غوری از راہ دیگر با بیست ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ جریدہ و سبک از غزنین یلغار کردہ بکنار آب لاہور آمدہ"[۲]

اس سے یہی مراد ہو سکتی ہے کہ شہاب الدین غوری کے ہر سوار کے پاس دو یا تین گھوڑے ہوتے تھے، لیکن سلاطین دہلی کے زمانے میں سہ اسپہ سواری کی مثال بالکل ہی نہیں ملتی ہے، علاء الدین خلجی کے عہد میں بھی دو ہی قسم کے سوار تھے، ایک تو وہ جن کے پاس ایک گھوڑا رہتا تھا، دوسرے وہ جن کے پاس دو گھوڑے ہوتے تھے[۳]، (برنی ص ۳۰۳) دوسرے گھوڑے کے لیے علٰحدہ الاؤنس مقرر ہوتا تھا،

۱؎ بیہقی جلد ا ص ۱۳۳ بحوالہ ڈاکٹر محمد ناظم ۲؎ فرشتہ جلد اول ص ۵۲ نولکشور پریس ۳؎ ڈاکٹر اشتیاق قریشی نے اپنی کتاب ایڈمنسٹریشن آف سلطنیٹ آف دہلی" میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے سواروں کی تین قسمیں تھیں، مرتب، یک اسپہ دو اسپہ، مرتب کے پاس کوئی گھوڑا نہ ہوتا، یک اسپہ ایک گھوڑا، اور دو اسپہ دو گھوڑے رکھتا، مرتب سب میں معزز ہوتا، دو اسپہ سے یک اسپہ زیادہ معزز سمجھا جاتا، لیکن اس رائے سے راقم کو اتفاق نہیں، برنی کی مبہم عبارت کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے اور پیچیدہ بنا دیا ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کے مؤلف مولانا ضیاء الدین برنی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی کے زمانے میں عام طور سے ایک خان ایک لاکھ سوار، ایک ملک دس ہزار سوار، ایک امیر ایک ہزار سوار، ایک سپہ سالار ایک سو سوار اور ایک سرخیل دس سوار رکھتا تھا، (ص ۱۴۵)

مغلوں کی متواتر یورشوں کو روکنے کے لیے علاء الدین خلجی کو ایک لشکر جرار تیار کرنے کی ضرورت ہوئی تو سواروں کے گھوڑوں کی خریداری کے لیے اس کے پاس شاہی خزانے میں کافی رقم نہ تھی، اس لیے پہلے تو اس نے ضروری اشیائے زندگی اور اجناس کی قیمتوں میں کمی کرکے اقتصادی خوشحالی قائم کرنے کی کوشش کی، پھر گھوڑوں کی قیمت کا نرخ بھی کم کرایا، چنانچہ اول قسم کے گھوڑے کی قیمت ۱۰۰ تنکے سے ۱۲۰ تک، دوم قسم کی ۸۰ سے ۹۰ تک، سوم قسم کی ۶۵ سے ۷۰ تک اور ٹٹو کی ۱۰ سے ۲۵ تک رکھی گئی،[1] اس شاہی نرخ کی خلاف ورزی پر قتل اور جلا وطنی کی سزا دی جاتی تھی، علاء الدین ہر چالیس روز کے بعد یہ تحقیق کیا کرتا تھا کہ شاہی نرخ میں کوئی فرق تو نہیں ہے،[2] سوداگروں کو بازار میں گھوڑے فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی، حکومت ان سے براہ راست خریداری کرلیتی تھی،[3] لشکریوں کو گھوڑے کی قیمت شاہی خزانہ سے ادا کی جاتی،[4] اس طرح ہر سوار براہ راست بادشاہ کا ملازم تھا کسی لشکری کا گھوڑا میدان جنگ میں مارا جاتا تو اس کو دوسرا گھوڑا حکومت ہی کی طرف سے فراہم کیا جاتا،[5] گھوڑوں اور بازار کی اشیا کی قیمت پر قابو پالینے کے بعد علاء الدین خلجی کے پاس چار لاکھ چھتر ہزار سوار کی ایک جرار فوج تیار ہوگئی تھی،

لیکن علاء الدین کے ان ضوابط و قوانین کی پابندی اس کے بعد کے دور میں نہیں کی گئی، مختلف سلاطین اپنی سہولتوں اور ضرورتوں کے لحاظ سے قواعد بناتے اور ان پر عمل کرتے، محمد تغلق خان، ملک، امیر اور اقطاع داروں کو بڑی بڑی جاگیریں دیا کرتا، جو حسب مراتب ضرورت کے وقت سوار مہیا کیا کرتے

۱؎ برنی ص ۳۱۰ ۲؎ ایضاً ص ۳۱۴ ۳-۴؎ ایضاً ص ۳۱۳ ۵؎ ایضاً ص ۳۲۸

تھے، بڑی بڑی مہموں میں محمد تغلق خود بھی سوار بھرتی کر لیا کرتا تھا، مثلاً خراسان کی مہم میں تین لاکھ ستر ہزار سواروں کی بھرتی دیوان عرض کے ذریعہ سے کرائی اور گھوڑوں کی قیمت اور سواروں کی تنخواہیں شاہی خزانہ سے دیں، یہانتک کہ شاہی خزانہ بالکل خالی ہو گیا[1]، فیروز شاہ کے زمانے میں یا تو اقطاع دار (صوبہ کے حاکم) سوار فراہم کرتے یا دیوان عرض بھرتی کرتے تھے، فیروز شاہ باضابطہ فوج (وجہ دار) کے گھوڑوں کی قیمت شاہی خزانہ سے ادا نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کے لیے جاگیریں مقرر کر رکھی تھیں، بے ضابطہ فوج (غیر وجہ دار) کے گھوڑوں کی قیمت شاہی خزانہ سے ملتی تھی[2]، لودیوں کے زمانے میں جاگیر کا رواج تھا، ہر جاگیر دار سوار مہیا کیا کرتا تھا[3]، اور وہی ان کو تنخواہ بھی دیا کرتا تھا، شیر شاہ نے جاگیرداری بالکل ختم کر دی تھی، وہ خود لشکری بھرتی کر کے ان کو مختلف صوبوں میں تعینات کر دیتا تھا، اس طرح ہر فوجی سوار اپنے کو بادشاہ کا ملازم سمجھتا تھا، اور فوجی امرا کو محض سردار، شیر شاہ کے دور میں ایک سپاہی کی تنخواہ میں اس کے گھوڑے کی قیمت اور خوراک بھی شامل ہوتی تھی، اسی لیے فوج کے تمام گھوڑے شاہی ملکیت سمجھے جاتے تھے[4]،

گھوڑوں کی فراہمی سلاطین دہلی بہتر سے بہتر گھوڑوں کی فراہمی کا پورا اہتمام رکھتے تھے، عربی، ترکی تاتاری اور روسی گھوڑے لشکریوں کے لیے برابر منگائے جاتے تھے، بلبن کہا کرتا تھا کہ

"آراستگی ملک ہندوستان از پیل و اسپ است" (برنی ص ۵۳)

اس کی پائگاہ میں یعنی (جہاں گھوڑوں کی نسلیں تیار ہوتی تھیں) ہر قسم کے گھوڑے تھے، وہ سندھ سے بھروچ اور تاتاری گھوڑے منگایا کرتا تھا، پھر سامانہ، بھٹنڈہ، بھٹنیر وغیرہ سے جیدہ جیدہ ہندی گھوڑے منگواتا تھا، اس کا خود بیان ہے کہ ان گھوڑوں کی وجہ سے اس کے لشکریوں کو اچھے اور سستے گھوڑے اتنی فراوانی سے مل جاتے کہ مغلوں کے دیار سے گھوڑے درآمد کرنے کی حاجت

---

[1] برنی ص ۴۷۷ [2] عفیف ص ۲۲۱ [3] الیٹ جلد ۴ ص ۴۱۲ [4] ایضاً ص ۴۲۵

باقی نہیں رہ گئی تھی[۱]، علاء الدین خلجی کی پایگاہ میں اچھی نسل کے ستر ہزار گھوڑے تھے[۲]، اگر کسی کو اچھی نسل کا گھوڑا دیا جاتا تو یہ بہترین تحفہ سمجھا جاتا، محمد تغلق ہر سال دس ہزار اچھی نسل کے عربی گھوڑے تحفہ میں تقسیم کیا کرتا تھا، فیروز شاہ تغلق کی سلطنت میں پانچ بڑی بڑی پایگاہیں تھیں، جن میں خاص خاص نسل کے گھوڑے پیدا کیے جاتے تھے[۳]،

سواروں کی نبرد آزمائی | سواروں کی کارکردگی، زیرکی، ہوشمندی، چالاکی، چستی، پھرتی اور نبرد آزمائی ہی پر عموماً لڑائی کی فتح و کامرانی کا دار و مدار ہوتا تھا، راجہ پتھورا کے خلاف ترائن کی لڑائی میں شہاب الدین غوری کو اس لیے فتح حاصل نہ ہو سکی کہ پتھورا کے دو لاکھ سواروں کے مقابلہ میں اس کے سوار موثر نہ ہو سکے، لیکن اسی جنگ میں ایک سوار کی غیر معمولی جرأت اور شجاعت نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ ہی بدل دیا، میدان جنگ میں شہاب الدین اپنے سواروں کے ساتھ ایسی مردانگی کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ دوست و دشمن سب ہی اس کی ثنا خوانی کر رہے تھے، فرشتہ کا بیان ہے

"سلطان ...... شمشیر از نیام کشیدہ باتفاق لشکر قلب بر سپاہ خصم تاختہ آغاز کارزار کردہ"

بر آں تن کہ زد خنجر سخت کوش | درآمد سرش پائے کوباں ز دوش
بہر سو کہ شمشیر او کار کرد | یکے را دو کردہ دو را چار کرد

چنانچہ دوست و دشمن بر میدان داری و خنجر گزاری او آفریں کردہ مراسم تحسین بجائے آوردند" (جلد اول ص ۵۷)

سلطان شہاب الدین کے افغان اور خلجی سردار راجپوتوں کے دباؤ سے منتشر ہو رہے تھے،

---

[۱] برنی ص ۳۰۵ [۲] ایضاً ص ۲۶۳ [۳] عفیف ص ۳۴۰

اور سلطان کا پورا لشکر راجپوتوں کی طویل صفوں کی گود میں آگیا تھا لیکن اس خطرہ اور انتشار کا خیال کیے بغیر سلطان دشمنوں کے بیچ میں گھس گیا، پہلے تو تلوار سے لڑا، پھر نیزہ لیکر گوبند رائے (یا کھنڈے رائے) سپہ سالار دہلی کے ہاتھی کی طرف بڑھا، اور قریب پہنچکر ہاتھی پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کے دانت ٹوٹ گئے، لیکن گوبند رائے (کھنڈے رائے) نے بھی سنبھل کر ہاتھی کی پیٹھ پر سے سلطان شہاب الدین غوری کے بازو پر تلوار کا ایک کاری زخم لگایا، اور قریب تھا کہ سلطان غش کھاکر گھوڑے سے نیچے گر جائے کہ ایک خلجی سوار بڑی برق رفتاری سے سلطان کے پیچھے گھوڑے کی پیٹھ پر کود کر بیٹھ گیا، اور سلطان کو اپنی گود میں سنبھال کر میدان جنگ سے لے اڑا، اس کا میدان جنگ چھوڑنا تھا کہ اس کے سپاہیوں نے میدان چھوڑ دیا[۱] لیکن اگر خلجی سوار کی شجاعت کام نہ کرتی اور سلطان معرکۂ کارزار میں شہید ہو جاتا تو ہندوستان میں اسکے جانشینوں کی حکومت سے جو نیا تمدن اور نیا کلچر پیدا ہوا، اس سے محروم رہتا، شہاب الدین غوری ایک سال کے بعد اپنی فوج کی از سر نو تنظیم کرکے پھر پتھورا کے خلاف معرکہ آرا ہوا، اس کی فوج میں ایک لاکھ سے زیادہ سوار تھے، جدھر سے ان کا پرا گزرتا، تیروں، تلواروں اور نیزوں کا بن نظر آنے لگتا تھا، پتھورا کے پاس بھی تین لاکھ سوار بے شمار پیادے اور ہاتھی تھے، ترائن کے میدان میں شہاب الدین غوری کے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ دیکھ کر اس طرح بھڑکتے تھے جس سے سواروں کو قدم جماکر لڑنے میں بڑی دقت ہوتی تھی، دوسری جنگ سے پہلے سلطان نے گھوڑوں کو اس طرح سدھایا کہ مٹی اور لکڑی کے قوی ہیکل ہاتھی کے مجسمے بنوائے، اور ان کو عماری اور برگستوان کے ساتھ ایک میدان میں لاکھڑا کیا، اور پھر سواروں کو ان نقلی اور مصنوعی ہاتھیوں کے آس پاس گھوڑے دوڑانے کو کہا، اس طرح گھوڑے ہاتھیوں کے کچھ ایسے عادی ہوگئے کہ ان سے انکا خوف جاتا رہا،[۲]

---

[۱] طبقات ناصری ص ۱۱۹ [۲] فتوح السلاطین ص ۷۵-۷۴، مدراس اڈیشن

شہاب الدین غوری کے لشکر ہی اس مرتبہ شریک ہو کر میدان جنگ میں شریک ہوئے، وہ طے کر کے آئے تھے کہ اپنی جانبازی اور پامردی سے سر دے کر جاں بحق ہو جائیں گے، لیکن پیٹھ نہ دکھائینگے، اس لیے حریف کی کثرت تعداد سے بالکل خوفزدہ نہ تھے، جنگ کے آغاز سے پہلے سلطان نے اپنے سواروں کو چار حصوں (میمنہ، میسرہ، خلف و قدام) میں تقسیم کر دیا، یہ سوار مسلح ہو کر جس طرح صف آرا ہوئے اس کی تصویر عصامی نے اس طرح کھینچی ہے:

شنیدم درین بار با شہریار ... رسیدہ سوارے صد و سی ہزار
ہمہ زیر پولاد و آہن نہاں ... ہمو نان شان غرق برگستواں
چو شد از دو سو لشکر آراستہ ... ز جولان شان گرد برخاستہ

سلطان نے ان سواروں کو حکم دیا کہ جب لڑائی شروع ہو تو آگے نکل نکل کر غنیم کے جنگی ہاتھیوں اور سواروں پر حملہ کریں اور جب وہ بڑھیں تو پیچھے ہٹ کر ہر طرف منتشر ہو جائیں، اور اپنے تیروں اور تلواروں اور نیزوں کی کاری ضربوں سے دشمنوں کا صفایا کریں، چنانچہ یہی ہوا، سلطان کے جانباز اور تربیت یافتہ سوار اپنے صبا رفتار اور تند گھوڑوں پر آگے بڑھتے، پھر پیچھے ہٹ کر پلٹ پلٹ کر غنیم کے بازوؤں کی صفیں الٹ دیتے تھے، پتھورا کے عظیم الجثہ جنگی ہاتھی چنگھاڑیں مار کر ادھر اُدھر منتشر ہونے لگے، ان کی جھولوں میں جو آئینے لگے ہوئے تھے وہ سورج کی کرنوں سے چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے، لیکن سلطان کے سوار مطلق خوفزدہ نہ ہوتے، ہاتھی ان کی طرف بڑھتا تو وہ گھوڑوں کو ایڑ لگا کر دور نکل جاتے، اور پھر پلٹ کر تیروں کی بوچھار سے ہاتھیوں کے جسم کو خار پشت بنا دیتے، اور جب ان میں کافی انتشار پیدا ہو گیا تو سلطان نے بھی میان سے تلوار کھینچ لی، اور جب وہ آگے بڑھا تو اس کے ساتھ بارہ ہزار جرار سواروں کی بھی تلواریں فضا میں چمکنے لگیں، پھر ان ہی سواروں نے اپنے نیزے گھوڑوں کے کان پر سیدھے رکھ لیے اور

گھوڑے اٹھا کر غنیم پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کا دل بادل پراگندہ ہونے لگا، وہ تاب نہ لا سکے اور منہ موڑ کر پیٹھ پھیر دی،[1]

بعض بہادر سوار | سلطان شہاب الدین کے ماتحت سرداروں نے بھی سواروں کی حربی قیادت میں عجیب و غریب مثالیں پیش کیں، جب سلطان نے گکھروں کے خلاف فوج کشی کی تو التمش بھی بداؤں سے ایک بڑی فوج لیکر اس کی مدد کے لیے پہنچا، گکھروں کی فوج دریائے جہلم کے اس پار تھی، سلطان کے لشکریوں کا کوئی قابو غنیم پر چل نہیں رہا تھا، التمش نے اس موقع پر اپنی نبرد آزمائی کا جوہر دکھایا، اس نے برگستوان پہنے اپنے گھوڑے کو مردانہ وار دریا میں ڈالدیا ...... اس کے پیچھے اس کے ماتحت سوار بھی گھوڑوں پر پانی میں کود پڑے، اور دریا پار کر کے ہزاروں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، غوری التمش کی اس جرأت اور جلادت کا نظارہ کرکے بے حد متاثر ہوا، اور لڑائی کے بعد پیشین گوئی کی کہ اس سردار سے بڑے بڑے کام انجام پائیں گے، اور یہ صحیح ثابت ہوئی،[2]

سلطان کے ایک اور مشہور سردار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی اور اس کے سواروں کے کارنامے بھی حیرت انگیز ہیں، محمد بن بختیار خلجی کو جب اودھ کے حاکم ملک حسام الدین کی سرکار کی طرف سے اس کی جنگی خدمات کے صلے میں مرزاپور اور بنارس کے پاس پرگنہ بھگوت اور بھیولی جاگیر عطا ہوئی تو اس نے اور سواروں کے ساتھ منیر اور بہار کے قریبی اضلاع کو اپنی جولانگاہ بنالیا، اور صرف دوسو سواروں کی جلادت اور شہامت کی بدولت بہار کو فتح کرلیا، جو فتح و تسخیر کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے، محمد بن بختیار خلجی بہار میں اپنی قوت مستحکم کرکے مشرقی بنگال کی طرف بڑھا، اس کے ساتھ سواروں کا ایک چھوٹا سا رسالہ تھا، اس کو

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۳۰ فرشتہ جلد اول ص ۵۸ فتوح السلاطین مدراس اڈیشن ص ۷۷-۷۸ [2] طبقات ناصری ص ۱۶۹-۱۷۰

مشرقی بنگالہ کے دارالسلطنت ندیا پہنچنے کے لیے جھارکنڈ (چھوٹا ناگپور) کے جنگلی علاقوں کے دشوار گذار راستوں سے گذرنا پڑا، اور جب وہ دومنزل سہ منزل کوچ کرکے ندیا پہنچا تو اس کے ساتھ کل اٹھارہ سوار تھے، اور بقیہ پیچھے چھوٹ گئے تھے، مگر یہ اولوالعزم اور نڈر سردار اپنے سواروں کی تعداد کی کمی کا خیال کیے بغیر راجہ کے قلعہ کے دروازہ پر پہنچ گیا، اور اپنے سواروں کو تلواریں کھینچ لینے کا حکم دیا، اور محل کے دربانوں کو مارتا کاٹتا اندر داخل ہوگیا، راجہ کھانا کھانے بیٹھا تھا کہ چیخ پکار کی آوازیں آئیں، اور وہ ایسا بدحواس ہوا کہ ننگے پاؤں محل کے چور دروازے سے نکل بھاگا، اور اس طرح بنگالہ پر اٹھارہ سواروں کی بدولت خلجی کی حکومت کا پرچم لہرا گیا، محمد بن بختیار نے اپنا پایہ تخت لکھنوتی (گور) میں قائم کیا اور تمام جنگی محاذوں کی ناکہ بندی کرکے لکھنوتی سے دس ہزار سواروں کا ایک لشکر لے کر تبت و ترکستان کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا، اس مہم کے راستے بہت ہی دشوار گذار اور صبر آزما تھے، لیکن اس منچلے فوجی سردار کو اپنی جانبازی اور قوت جسمانی پر غیر معمولی بھروسہ تھا، وہ بڑھتا چلا گیا، پہاڑی قبیلوں کوچ و میچ کے علاقہ میں پہنچا تو موخر الذکر قبیلہ کے سردار نے اسلام کی شوکت و عظمت کو دیکھ کر محمد بن بختیار خلجی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا جس کا نام علی میچ رکھا گیا، محمد بن بختیار بڑھتا ہوا کامرود (کاروپ) پہنچا، اور ایک دریا (بنگ متی) پار کرکے پہاڑی دروں سے گذرتا ہوا سولہ روز کی منزل طے کرکے تبت کے علاقہ میں گھسا، اور سرحدی علاقہ کے باشندوں کو مغلوب کیا، اس سے آگے بڑھنے میں اس کے ہوا خواہوں نے اس کو روکا، حالانکہ وہ کرم بٹن جیسے مشہور شہر کے قریب ہوگیا تھا، جہاں پندرہ سو گھوڑے روزانہ بازار میں فروخت ہوتے تھے، لیکن محمد بن بختیار کے سوار بہت تھک چکے تھے، اور ان کی رائے یہ ہوئی کہ آئندہ سال کے لیے یہ مہم اٹھا رکھی جائے، چنانچہ وہ تبت کو تسخیر کیے بغیر واپس ہوگئے لیکن اسی اثنا میں دشمنوں نے واپسی کے راستوں میں آگ لگا کر سارے علاقہ کو بے آب و گیاہ بنا دیا تھا، پندرہ روز تک

ان لشکریوں کو نہ کھانے کی کوئی چیز ملی اور نہ گھوڑے کو ایک پرکاہ، فاقہ سے پریشان ہوکر انھوں نے گھوڑوں کو ذبح کرکے کھانا شروع کیا، اور جب وہ دریا کے پاس پہنچے تو پل بھی مسمار کر دیا گیا، لشکریوں کو کشتیاں نہ ملیں، تو انھوں نے دلیرانہ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے، محمد بن بختیار خلجی تو موجوں کو چیرتا پھاڑتا ساحل پر پہنچ گیا لیکن اس کے زیادہ تر ہمراہی سوار دریا کی طغیانی اور روانی کو مغلوب نہ کر سکے،[۱]

سواروں کے خورد و نوش کے سامان | سوار کوچ کرتے وقت اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان ضرور رکھتے، لیکن اس کی مقدار بہت ہی کم ہوتی، کیونکہ کیمپ کے بازاروں میں انکو ساری چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں لیکن پھر بھی روٹی گوشت اور گھوڑے کے لیے گھاس اور جو ساتھ رکھ لیتے، ان کے پاس زین کی مرمت کے لیے چھوٹے موٹے اوزار بھی ہوتے، ضرورت کے وقت وہ اپنے گھوڑوں کو آختہ بھی کر لیتے، گھوڑے زیادہ سرکش ہوجاتے تو انکے جسم سے خون بہا کر ان کو رام کر لیتے، اس ترکیب سے بھی ان کو آگاہی رہتی[۲]، چنگیز خانی سوار بڑی بڑی تعداد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاکر یورش کرتے، کبھی چھ چھ لاکھ سواروں کا بادل ہوتا، کوچ کے وقت ان کے دس دس سواروں کی ٹولیاں بنا دی جاتیں اور ہر ٹولی کے پاس کھانا پکانے کے لیے ایک دیگچہ اور پانی پینے کے لیے ایک مشک ہوتی، وہ گھوڑوں کا ایک گلہ بھی ساتھ رکھتے (جب خورد و نوش کا کوئی سامان نہ ملتا تو وہ گھوڑے کے گوشت یا گھوڑی کے دودھ سے پیٹ بھر لیتے،[۳]

تاتاری سواروں کی بے بسی | یہ عجیب بات ہے کہ چنگیز خانی سواروں نے تاشقند، خجند، بلخ، استرآباد، آذربیجان، مرو، خراسان، ہرات اور بدخشاں وغیرہ کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بالکل پامال

[۱] طبقات ناصری ص ۱۵۵ - ۱۵۶ [۲] آداب الحرب بحوالہ اسلامک کلچر اکتوبر ۱۹۳۷ء [۳] طبقات ناصری

کر دیا تھا لیکن یہ ٹڈی دل ہندوستان جب جب آیا تو یہاں خونریزی اور غارتگری کی ہولناکیاں تو ضرور برپا کیں مگر ہندوستان کے جانباز سواروں نے ان سے ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا، وہ ان سے لڑ لڑ کر کٹ کٹ کر میدان جنگ میں گرتے رہے لیکن ان کا قدم ہندوستان میں جمنے نہ دیا، ان مغلوں کی یورش کی روک تھام کے لیے غیاث الدین بلبن نے سواروں کا ایک ایسا جرار لشکر مرتب کیا تھا کہ ان کی مستعدی اور قواعد دانی دور دور کے ملکوں میں مشہور ہوگئی تھی، امن کے زمانے میں بلبن سواروں اور گھوڑوں کو شکار کے بہانے سے شکارگاہ لے جاتا، اور ان کو دوڑا دوڑا کر پسینہ سے شل کر دیتا محض اس لیے کہ امن کے زمانے میں کاہل نہ ہو جائیں اور لڑائی کے موقع پر بزدل نہ ثابت ہوں، (برنی ص ۵۵)

مغل سوار نہایت جری اور خونخوار ہوتے، ان کی قزاقی اور غارتگری سے دنیا کانپ اٹھی تھی، لیکن کسی قوم نے اگر شجاعت اور جاں بازی سے انکا دلیرانہ مقابلہ کیا ہے تو وہ ہندوستان کے ترک سوار تھے، جنھوں نے اپنی پیہم ناکامیوں کے باوجود مغلوں کے دلوں پر اپنی پامردی، نبردآزمائی، سرفروشی اور شمشیر زنی کا سکہ بٹھا دیا تھا، تاتاریوں کی پامالی سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کی خاطر بلبن نے ملتان کو ایک دفاعی مرکز بنایا تو اس کا اقطاع دار اپنے چہیتے شہزادہ محمد سلطان کو مقرر کیا، جس کی حکومت میں ساحل بحر سے دریائے جھیلم تک کے علاقے تھے، اور مستقر ملتان تھا، یہاں بارہ تیرہ سال تک رہ کر شہزادہ محمد سلطان نے چنگیز خانیوں کا مقابلہ جس مردانگی سے کیا ہے وہ اسکا ایک زریں کارنامہ ہے، اس مدت میں تاتاری سواروں کی بڑی سی بڑی جماعت کو بھی شمالی پنجاب کے عبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی، اور وہ کھلے میدان میں جب بھی لڑے، شکست کھائی، شہزادہ محمد سلطان بڑا ہی علم دوست، علم نواز اور ہنر پرور بھی تھا، اس کا وقت زیادہ تر شعرا، علماء اور صلحا کی مجلسوں میں گذرتا لیکن جب کبھی مغل حملہ آوروں کی خبر ملتی تو علمی و ادبی مجلسیں

چھوڑ کر سپاہی بن جاتا، اور خود بڑے سے بڑے مخدوش اور خطرناک جنگی مقام پر پہنچ جاتا، اس طرح اس نے تاتاریوں کے دو خوفناک حملوں کو بڑی دلیری سے روکا، تیمر خاں کی رہبری میں تیسرا حملہ جب ۶۸۳ھ میں ہوا تو شہزادہ نے لاہور کے پاس دریا کے کنارے اس کی بھی اچھی طرح سرکوبی کی، اور اس کو مار بھگایا، اور جب اس کی فوج مفرورین کے تعاقب میں آگے بڑھ گئی تو وہ ایک جگہ ظہر کی نماز پڑھنے لگا، کہ یکایک دو ہزار مغل کمین گاہ سے نکل کر شہزادہ پر حملہ آور ہوئے، شہزادہ نے نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھوڑے کی لگام تھامی اور اس پر سوار ہو کر بڑی دلیری اور جانبازی سے مغلوں کا مقابلہ کیا، گو اس کے ہمراہیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، اور وہ مقابلہ کرنے کے بجائے بچکر آسانی سے نکل سکتا تھا، لیکن اپنی شجاعت کے جوش میں پیچھے ہٹنا اور گھوڑے کا منہ موڑنا بزدلی سمجھا، اسکی پامردی سے مغلوں کے پاؤں اکھڑنے کے قریب ہی تھے کہ اچانک اس کو ایک تیر ایسا آکر لگا کہ اس کے زخم سے جانبر نہ ہو سکا، اس معرکہ کے آغاز میں شہزادہ محمد کے سوار جس طرح صف آرا ہوئے، اس کے چشم دید حالات امیر خسرو نے وسط الحیٰوۃ میں اس طرح منظوم کیے ہیں،

خنگ شہ دیدی و بہ گردون غبار انگیختن — باد پا بر کافران خاک را انگیختن
غلغلہ در انجم از جوش سپاہ انداختن — زلزلہ در عالم از شیر سوار انگیختن
از خروش کوس و بانگ اسپ آواز سواِ — لرزہ در صحرا و دشت و کوہسار انگیختن
انچہ ہیبت بود وقت کارزار آراستن — وانچہ وحشت بود گاہ گیر و دار انگیختن
نعل در آتش نہادن توسنان گرم را — وز سم بر آتشین لعلے غبار انگیختن
از فروغ تیغ در سر تفت و تاب انداختن — وز خیال نیزہ در دل خار خار انگیختن
پردلان در حملہ از بہر مخالف سوختن — بیدلان در حیلہ از بہر فرار انگیختن[1]

---

[1] وسط الحیٰوۃ ص ۱۶۳ - ۱۶۲ علی گڈھ اڈیشن

بلبن کے تربیت یافتہ سواروں نے اندرون ملک میں بھی اپنی شجاعت کا ڈنکا بجا رکھا تھا، بلبن کہا کرتا کہ اس کے چھ سات ہزار سوار ہندوؤں کے ایک لاکھ پایک اور دھانک کو تاراج کرنے کے لیے کافی ہیں[1]،

میدان جنگ میں ہاتھی اور گھوڑوں کی پرورش

میدان جنگ میں ہاتھی گھوڑوں کو دیکھ کر بھڑکتے، اور گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر بدکتے، لیکن فنون حرب کے مسلمان ماہرین نے ہندوستان میں آکر ان دونوں جانوروں کو لڑائی کے میدان میں اس طرح سدھایا کہ دونوں مل کر غنیم کی صفوں پر حملہ آور ہوتے، اور ان کو درہم برہم کر دیتے، ۶۹۷ھ میں تاتاریوں نے قتلغ خواجہ کی سرکردگی میں بڑے وسیع پیمانے پر دہلی پر حملہ کیا، اس کے ساتھ دو لاکھ سوار تھے، اور ایسی دلیری سے دہلی آپہنچا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندستان اس تاتاری سیلاب میں بالکل بہ جائے گا، علاء الدین خلجی نے بھی ایک لشکر جرار ان کے مقابلہ کے لیے بھیجا، اس میں قوی ہیکل ہاتھیوں کے علاوہ تین لاکھ صرف سوار تھے، اس کی کمان ظفر خاں، الغ خان، رکن خاں اور غازی ملک جیسے ہوشمند اور بہادر فوجی لیڈروں کے ہاتھوں میں تھی، فریقین کی فوج پانچ لاکھ سے زیادہ تھی، دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کیلی کے میدان میں ہوئی، جب لڑائی کا آغاز ہوا تو ظفر خان جو اپنی شجاعت کی وجہ سے رستم وقت کہلاتا تھا، جنگی ہاتھیوں کو لے کر آگے بڑھا، جن کے خوفناک حملوں کے ساتھ سوار بھی گھوڑے سے اتر اتر کر دشمن پر جا پڑے، مغل حملہ آور ہاتھیوں کی بلائے سیاہ سے بالکل ہی ناواقف تھے، وہ اپنی خونخواری اور گریز پائی کے باوجود ہاتھیوں کا مقابلہ نہ کر سکے، اس سے ان کی صفوں میں انتشار پھیلا تو شاہی سوار خونخوار مغلوں کو دھکیل دھکیل کر تہ تیغ کرنے لگے، اور جب ان کے کشتوں کا پشتہ لگ گیا تو وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے، ظفر خاں اپنے جوش تہور میں ان کو

[1] برنی ص ۵۲

مارتا کاٹتا اٹھارہ کوس تک پیچھے ہٹا دیا گیا لیکن ایک جگہ غنیم کے نرغے میں گھر کر گھوڑے سے گر پڑا، پھر بھی پیادہ لڑکر بے شمار مغلوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، لیکن بالآخر شہید ہوا، ظفر خاں کی اس شجاعت وجلادت کی دھاک مغلوں پر ایسی جمی کہ اگر کسی مغل لشکری کا گھوڑا پانی نہ پیتا تو وہ گھوڑے سے کہتا کہ کیا تونے ظفر خاں کو دیکھ لیا ہے[1]۔

علاء الدین خلجی کے گھوڑے اور سوار امیر خسرو علاء الدین خلجی کے فوجی گھوڑوں کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ وہ آہو کی طرح چوکڑی بھرتے تھے[2]، وہ جب کوچ کرتے تو ان کے سم سے کاسۂ سنگ ٹوٹتا رہتا، اور زہرۂ زمین میں شگاف ہوتا رہتا[3]، وہ بڑے بڑے دریا کو دتے پھاندتے نکل جاتے[4]، اور دشوار گذار ساحلی علاقوں پر بطوں کی طرح گذرتے ہوئے نظر آتے[5]، بعض گھوڑے ایسے تیز اور سبک رفتار ہوتے جیسے ہوا پانی کی سطح پر چلتی ہو، اور بعض پہاڑی گھوڑے پہاڑی علاقے پر اس طرح دوڑتے کہ پہاڑ تیغ ہندی کی طرح چمکنے لگتے[6]، یہ بجلی کی طرح برق رفتار اور ہوا کی طرح گریز پا ہوتے اور اہرمن کی طرح اپنا سایہ پیچھے چھوڑ دیتے[7]، ان گھوڑوں پر سوار کوچ کرتے دکھائی دیتے تو معلوم ہوتا کہ آسمان سے بہمن برس پڑے ہیں، یا بیسیوں سہراب اور بیژن ایک جگہ سے دوسری جگہ جارہے ہیں، یا لاکھوں رستم تیر و کمان کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، یہ سوار گرگین کی طرح اژدر تیر کی صولت کے ساتھ شیروں کو زیر کر سکتے تھے[8]۔

سواروں کی بزدلی پر سزا شاہی لشکر کے سوار میدان جنگ میں پیٹھ دکھانا اپنی سپاہیانہ غیرت و حمیت کے خلاف سمجھتے تھے، وہ لڑکر کٹ مرتے تھے لیکن لڑائی کے میدان کو چھوڑنا پسند نہ کرتے تھے، ترائین کی پہلی جنگ میں شہاب الدین غوری کے سواروں نے پیٹھ ضرور دکھائی، لیکن اس نے ان سواروں

---

[1] برنی ص ۲۶۱، فرشتہ جلد اول ص فتوح السلاطین ص ۲۶۲-۲۶۴ [2] خزائن الفتوح علی گڑھ اڈیشن ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۲۰ [4] ایضاً [5] ایضاً ص ۸۵ [6] ایضاً ص ۱۰۹ [7] ایضاً ص ۱۷۰ [8] ایضاً ص ۱۲۸

کے سرداروں کو ان کی کم ہمتی اور بے دلی کی بڑی عبرت ناک سزا دی۔ غور پہنچکر تو بر دن میں کچھے جو بھروا کر ان کی گردنوں میں لٹکا دیے۔ اور ان کو ایسی ہیئت کذائی سے شہر کے گرد گھمایا، اس کا حکم تھا کہ جو امیر اپنے توبرے کے کچھے جو نہ کھائے اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ خود اس کو اپنی ہزیمت کا اتنا غم تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے اختلاط چھوڑ دیا، اور بدن سے کپڑے اس وقت تک نہ اتارے جب تک کہ اس نے انتقام نہ لے لیا۔[۱]

تیموری دور کے سوار | تیموریوں کے زمانے میں گھوڑوں اور سواروں کی اہمیت بدستور سابق قائم رہی، اکبر گھوڑوں کو "اساس دولت خانۂ سلطنت" کہا کرتا تھا۔[۲] اس دور میں توپ و تفنگ کا اضافہ ضرور ہوگیا لیکن توپ و تفنگ کی لڑائی مردانگی اور شجاعت کی جنگ نہیں سمجھی جاتی تھی، اس لیے مردانہ اور دلیرانہ جنگ کے لیے سوار ہی موزوں سمجھے جاتے، ان کی بہتر سے بہتر تنظیم کے لیے شاہی خزانے کے روپیے زیادہ سے زیادہ خرچ کیے جاتے۔

منصب داری نظام | اکبری دور کے شروع میں امرا جو منصب ذات رکھتے تھے، اور اس کے لیے ان کو جو ماہانہ ملتا اس میں ان کو گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ کی ایک مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی، آئین اکبری میں جو پوری فہرست دی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر منصب دار کو کتنی تعداد میں گھوڑے اور دوسرے جانور رکھنے پڑتے تھے، مثلاً دہ ہزاری منصب دار کو ۶۸ عراقی ۹۸ مجنس، ۲۰۳۱ ترکی، ۲۰۳۱ یابو، ۱۳۹ تازی اور ۱۳۹ جنگلہ یعنی کل ۸۰۰ گھوڑے رکھنے کا حکم تھا، اسی طرح یکصدی منصب دار ۲ عراقی، ۲ مجنس، ۲ ترکی، ۲ یابو اور ۲ تازی یعنی کل دس گھوڑے رکھتا تھا۔

اس مقررہ تعداد کے علاوہ اکبر اپنے گھوڑے اور ہاتھی بھی ان منصبداروں کو حسب منصب

---

[۱] فرشتہ جلد اول ص ۷۵ [۲] اکبر نامہ جلد سوم ص ۱۹۲

رکھوالی کے لیے بھیجا کرتا تھا، ان کا خرچ شاہی خزانہ سے ادا ہوتا تھا (آئین اکبری ۱ - ۱۳۵)

اکبر نے اپنے آخری دور میں منصب داروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا، اور منصب کے ساتھ سوار کے منصب کا اضافہ کیا، مثلاً پنج ہزاری پنج ہزار سوار، پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ اگر سواروں کی تعداد منصب کے اعداد کے برابر ہوتی تو یہ اول درجہ کا منصب شمار ہوتا، اور اگر تعداد منصب کے اعداد سے نصف یا نصف سے زیادہ ہوتی مثلاً پنج ہزاری چار ہزار سوار یا پنج ہزاری سہ ہزار سوار تو یہ دوسرے درجہ کا منصب ہوتا، اور نصف سے بھی کم ہوتا تو تیسرے درجہ کا منصب ہوتا، منصب داروں کو منصب سوار کے لحاظ سے سواروں کی تعداد رکھنی پڑتی تھی، اکبر نے پورا اہتمام رکھا کہ منصب ذات کے ساتھ منصب سوار میں تطابق ہو،

ایک سوار کئی کئی گھوڑے رکھ سکتا تھا کیونکہ ایک گھوڑے کا سوار لنگڑا کہلاتا تھا، لیکن اکبر نے بعد میں حکم دیا کہ کوئی سوار تین گھوڑوں سے زیادہ نہ رکھے، ان گھوڑوں کے لیے الاؤنس شاہی حکومت کی طرف سے مقرر تھا، اکبری دور میں دہ باشی امیر کے رسالے میں دو چار اسپہ، تین سہ اسپہ، تین دو اسپہ اور دو یک اسپہ سوار رہتے تھے یعنی دس سوار ۲۵ گھوڑے رکھ سکتے تھے، دوسرے منصب دار بھی اسی تناسب سے سواروں اور گھوڑوں کے سردار مقرر ہوتے تھے[۱]، جہانگیری اور شاہجہانی عہد میں چار اسپہ سوار کی مثال نہیں ملتی،

جہانگیر نے منصب کا اعزاز بڑھانے کے لیے سوار کے منصب کے ساتھ دو اسپہ اور سہ اسپہ کی اصطلاح کا بھی اضافہ کیا، مثلاً ہفت ہزار ہفت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ[۲]، اس سے بظاہر تو یہ مراد ہے کہ ایک ہفت ہزاری منصب دار سات ہزار دو اسپہ اور سہ اسپہ رکھ سکتا تھا دو اسپہ سوار کو دو گھوڑے رکھنے کی اجازت تھی، تاکہ اس کا ایک گھوڑا لڑائی میں زخمی

---

[۱] آئین اکبری ص ۱۳۲ [۲] تزک جہانگیری جشن بست و نہم نوروز کے موقع پر ہے "خانخانان را بمنصب ہفت ہزاری بذات و سوار افزاز دو اسپہ و سہ اسپہ سرفراز نمود"

ہو جائے تو وہ دوسرا گھوڑا استعمال کر سکے، اس طرح سہ اسپہ سوار کو تین گھوڑے رکھنے کی اجازت تھی، لیکن سواروں اور گھوڑوں کی تعداد فراہم کرنا لڑائی یا معائنہ کے موقع پر ضروری سمجھا جاتا تھا، ورنہ یہ تعداد مناصب کے محض امتیاز و اعزاز اور تنخواہوں کا گریڈ قائم کرنے کے لیے مقرر کی جاتی، دور دراز علاقوں کے منصب داروں یا دور دراز مہموں پر جانے والے فوجی سرداروں کو دو اسپہ اور سہ اسپہ سواروں کے مناصب عموماً زیادہ دیے جاتے، تاکہ ان کے پاس گھوڑوں کی کمی نہ ہونے پائے، مگر چونکہ یہ ماہانہ شاہی حکومت کی طرف سے ملتا، اس لیے بعض اوقات دو اسپہ سہ اسپہ سوار کی تعداد مقرر کر دی جاتی، جو منصب سوار سے مختلف ہو جاتی، شاہجہانی عہد کے دو اسپہ اور سہ اسپہ سواروں کے منصب داروں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی، تو شاہجہاں نے ایسے منصب داروں کے لیے دو اسپہ سہ اسپہ کی تعداد بھی مقرر کرنے کا اہتمام رکھا، مثلاً دارا شکوہ کو بیست ہزاری بیست ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا، تو اس میں دس ہزار سوار دو اسپہ اور سہ اسپہ کی تعیین کر دی گئی، اور پھر جب دارا شکوہ کو شصت ہزاری چہل ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب ملا تو اس میں اس کو تیس ہزار دو اسپہ سہ اسپہ سوار رکھنے کی اجازت تھی، اسی طرح اور منصب داروں کے ساتھ تعداد متعین کر دی جاتی، کہ کتنے گھوڑے اور سوار رکھنے لازمی، کتنے رعایۃً معاف اور کتنے فرضی ہیں،

بادشاہ نامہ مؤلفہ عبد الحمید لاہوری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بلخ و بدخشاں کی مہم کے وقت پنج ہزاری پنج ہزار منصب دار نے داغ کے وقت اپنے منصب کا ½ حصہ یعنی ایک ہزار سوار پیش کیے، اگر یہ منصب دار اپنے سواروں کے لیے بارہ مہینے کی تنخواہ دینے کے لیے جاگیر رکھتے تو ایک ہزار سوار میں تین سو سوار سہ اسپہ (یعنی ۹۰۰ گھوڑے) ۶۰۰ دو اسپہ گھوڑے (یعنی ۱۲۰۰ گھوڑے) اور ایک سو اسپہ (یعنی ۱۰۰ گھوڑے) ہوتے، یعنی ایک ہزار سوار ۲۲۰۰

رکھتے، اور اگر یہ منصب دار گیارہ مہینے کی تنخواہ کی جاگیر رکھتے تو ایک ہزار سوار میں ۲۵۰ سہ اسپہ ۵۰۰ دو اسپہ اور ۲۵۰ یک اسپہ سوار ہوتے، یعنی ان کے پاس دو ہزار گھوڑے ہوتے، اسی طرح دس مہینے کی تنخواہ پانے والے منصب داروں کو ایک ہزار سوار میں ۸۰۰ دو اسپہ اور ۲۰۰ یک اسپہ سوار ہوتے، اور ان کے پاس ۱۸۰۰ گھوڑے ہوتے، نو مہینے کی تنخواہ پانے والے منصب دار کو ایک ہزار سوار میں ۶۰۰ دو اسپہ اور ۴۰۰ یک اسپہ رکھنا ہوتا، اور ان کے پاس ۱۶۰۰ گھوڑے ہوتے، علیٰ ہذا القیاس۔

لیکن پنج ہزاری پنج ہزار سوار منصب دار کے ساتھ دو اسپہ سہ اسپہ کا بھی منصب رہتا تو ایسی صورت میں اس کو سہ اسپہ دو اسپہ سوار کی تعداد داغ کے وقت دوگنی دکھانی پڑتی، کیونکہ بادشاہ نامہ (جلد دوم ص ۵۰۷) کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو دوگنی تنخواہ دی جاتی، اس لیے وہ دوگنے سوار اور دوگنے گھوڑے رکھتے، اس طرح پنج ہزاری پنج ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ منصب دار کو دو ہزار سوار میں ۶۰۰ سہ اسپہ (یعنی ۱۸۰۰ گھوڑے) ۱۲۰۰ دو اسپہ (یعنی ۲۴۰۰ گھوڑے) اور ۲۰۰ یک اسپہ (یعنی ۲۰۰ گھوڑے) دکھانے پڑتے، اس طرح دو ہزار سوار ۴۴۰۰ گھوڑے رکھتا۔

یہ تو بلخ و بدخشاں کی مہم کے وقت کیا گیا، لیکن شاہجہاں نے یہ حکم جاری کر رکھا تھا کہ ایک منصب دار اگر اسی صوبہ میں ہے تو اپنے منصب سوار کی مقررہ تعداد کا ۱/۳ حصہ داغ کرنے کے لیے حاضر کرے، اور اگر ایسے صوبہ میں ہے جو اس کی جاگیر میں نہ ہوتا تو وہ اپنے منصب سوار کا ۱/۴ حصہ داغ کے لیے پیش کرے، اس طرح بارہ مہینے کی تنخواہ پانے والا یک ہزاری ہزار سوار ۱/۴ حصہ پیش کرتے وقت ۲۵۰ سوار حاضر کرتا، جن میں مندرجہ بالا حساب سے ۷۵ سہ اسپہ ۱۵۰ دو اسپہ اور ۲۵ یک اسپہ سوار ہوتے یعنی ان کے پاس ۵۵۰ گھوڑے ہوتے، اور اگر منصب دار

یک ہزاری ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ ہوتا تو اس کو اپنے سواروں اور گھوڑوں کی تعداد دوگنی دکھانی پڑتی، ۵۰۰ سوار داغ کے لیے لاتا جن میں ۱۵۰ سہ اسپہ ۳۰۰ دو اسپہ اور پچاس یک اسپہ سوار ہوتے، اس طرح ان کے پاس گیارہ سو گھوڑے ہوتے،

ہر منصب دار کے پاس اوسطاً اس کے منصب سوار کا ⅓ حصہ ضرور رہتا، اس طرح عبدالحمید لاہوری مولف بادشاہ نامہ (ج ۲ ص ۷۱۵) کا بیان ہے کہ شاہجہاں کے پاس دو لاکھ سوار تھے، جن میں اٹھ ہزار منصب دار، ۷ ہزار احدی اور برق انداز سوار اور بقیہ ایک لاکھ پچاس ہزار شہزادوں اور امرا کے تابینان تھے،

عالمگیر کے زمانے میں دکن میں تیس ہزار سوار تعینات تھے، کابل میں بارہ سے پندرہ ہزار تک اور کشمیر میں چار ہزار سوار رہتے، اسی طرح بنگال میں سواروں کی ایک کثیر تعداد رہتی، بادشاہ کے ہمرکاب ۳۵ یا ۴۰ ہزار سوار رہتے اس طرح پوری سلطنت میں دو لاکھ سوار تھے (برنیر ص ۳۹۳-۹۴)

احدی | سواروں کی ایک قسم احدی بھی تھی، وہ کسی منصبدار کے ماتحت نہ ہوتے، بلکہ براہ راست بادشاہ کی نگرانی میں رہتے، شاہی ملازمت میں داخل ہونے کے وقت وہ اپنے گھوڑے ساتھ لاتے، ان گھوڑوں کے مرنے کے بعد حکومت کی طرف سے ان کو گھوڑے دیے جاتے، اس کے لیے وہ متعلقہ عہدہ داروں کی سند پیش کرتے جس کو اصطلاح میں سقط نامہ کہا جاتا، احدیوں کی نگرانی کے لیے علیحدہ دیوان اور بخشی مقرر کیے جاتے، اور ایک عالی مرتبہ امیر انکا سردار ہوتا[1]، وہ بادشاہ وقت کی متفرق خدمت انجام دیتے، کسی دوسرے شعبہ میں بھی کام کرتے، اور ضرورت کے وقت سوار کی خدمت بھی بجالاتے، لڑائی کے زمانے میں جنگی محاذ پر بھی بھیج دیے جاتے؟ کی شہسواری عام سواروں سے بہتر ہوتی، اس لیے وہ پانچ گھوڑے بیک وقت رکھ سکتے تھے، ان کی تنخواہ بھی عام سواروں سے زیادہ ہوتی،

---

[1] آئین اکبری ص ۱۳۲

منصب دار داخلی | اگر کسی منصب دار کی مرتب فوج کے کسی حصہ پر کوئی امیر سردار مقرر کر دیا جاتا تو وہ منصبدار داخلی کہلاتا، چہرہ نویسی کے دفتر میں وہ شاہی حکم کے مطابق نیچہ سوار لکھے جاتے، اور ان کی تنخواہ خالصہ سے ادا کی جاتی[1]

کشک | اکبر نے اپنی سلطنت کے تمام سواروں کو بارہ حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، اور ہر حصہ باری باری ایک ایک مہینہ پایۂ تخت میں آکر کشک یعنی چوکی کی خدمت انجام دیتا، وہ دن رات شاہی آستانہ پر حاضر رہتا، یہ حصہ سات دستوں میں تقسیم کر دیا جاتا اس طرح ہر روز ایک ایک دستہ شاہی آستانہ پر حاضری دیتا، اور شاہی احکام کی تعمیل میں لگا رہتا، بارگاہ شاہی میں روزانہ شام کو یہ دستے بادشاہ کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر تسلیم عرض کرتے یعنی سلامی دیتے، اگر کسی روز بادشاہ نہ ہوتا تو اس کی قائم مقامی شہزادے کرتے، پورے کشک کی سلامی ہر شمسی مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہوتی، اس سلامی میں سواروں کو اپنی کارکردگی پر انعام اور کاہلی پر سزا ملتی، اس طرح کے آئین سے اکبر کو اپنی پوری فوج دیکھنے اور پرکھنے کا موقع مل جاتا، اور خود سواروں کو شاہی قربت حاصل ہونے پر شاہانہ نوازشوں سے مستفید ہونے کی آسانیاں فراہم ہو جاتیں، اس کشک میں سرحدوں پر متعین سواروں کا آنا ضروری نہ تھا۔[2]

(باقی)

---

[1] آئین اکبری ص ۱۴۷ [2] آئین اکبری جلد ۱ ص ۱۳۶-۱۳۵

حکمائے اسلام

(اول)

اس میں دوسری صدی سے لیکر خاندان خیر آباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات ہیں یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکمائے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے

(مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت سعر

منیجر

امام اوزاعیؒ

از جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

یہ مضمون زیر طبع کتاب تبع تابعین کا ایک ٹکڑا ہے۔ "م"

امام اوزاعی ممتاز ائمہ تبع تابعین میں ہیں، ان کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں فقہ و حدیث کے جو مکاتب فکر پیدا ہوئے، ان میں ایک مکتب فکر کے بانی امام اوزاعی بھی ہیں، انھوں نے تقریباً پوری زندگی شام ہی میں بسر کی۔ اس لیے زیادہ تر یہیں انکے مسلک و فتاوے کی ترویج و شہرت ہوئی،

شام ہی بنو امیہ کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا، اس لیے اموی حکومت پر بھی ان کے علم و فضل اور فقہ و فتاوے کا اثر پڑا تھا، غالباً اسی وجہ سے حکومت نے ان کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا تھا مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۳۲ھ میں جب مشرق سے بنو امیہ کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس خاندان کے بعض حوصلہ مند افراد مغرب اقصیٰ پہنچے اور اندلس میں ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی، اس خاندان کے ذریعہ امام اوزاعی کا مسلک بھی اندلس آیا، اور ایک مدت تک اہل اندلس کا اس پر عمل رہا، شام میں تقریباً دو صدی تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی یعنی حاکم بن ہشام متوفی ۲۰۶ھ کے عہد تک یہ مسلک زندہ رہا۔ اس کے بعد مشرق میں حنفی و شافعی اور مغرب میں مالکی و حنبلی مسلکوں نے اسکی جگہ لے لی، اور آہستہ آہستہ اس مسلک پر تعامل ختم ہو گیا، یوں کتابوں میں اس کا تذکرہ اب بھی ملتا ہے، اس کی مزید تفصیل آیندہ صفحات میں آئے گی،

ابتدائی حالات | امام اوزاعی کا نسبی تعلق یمن کے قبیلہ بنو ہمدان یا بنو حمیر سے تھا، مگر ان کا خاندان وہاں سے ترک وطن کرکے شام چلا آیا، اور یہاں دمشق کے قریب ایک بستی اوزاع[۱] میں بود و باش اختیار کر لی، اسی نسبت سے ان کو اوزاعی کہا جاتا ہے،

بچپن کا نام عبد العزیز تھا، بعد میں انھوں نے اسے تبدیل کرکے عبد الرحمٰن رکھا، اور اسی نام سے وہ مشہور ہیں، ان کی کنیت ابو عمرو اور والد کا نام عمرو تھا[۲]،

شام کے مشہور شہر بعلبک میں سـ۸۸ـھ میں ان کی ولادت ہوئی، ابھی بچے ہی تھے کہ سرسے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ اور یہ یتیم ہو گئے، ماں نے نہ جانے کن کن مصیبتوں اور تکلیفوں کے ساتھ انکی پرورش کی، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کا نشو و نما کسی ایک جگہ نہیں ہوا، بلکہ ان کی والدہ (غالباً معاشی پریشانیوں کی وجہ سے) ان کو شہر بہ شہر لیے پھرتی تھیں، بہت دنوں تک ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد خدا نے نہ جانے کیا صورت پیدا کر دی کہ یہ نیک بخت بیروت میں قیام پذیر ہو گئیں،

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی ولادت بعلبک میں اور پرورش کرک[۳] میں ہوئی، اس کے بعد ان کی والدہ ان کو کرک سے لیکر بیروت چلی آئیں، اور یہیں قیام پذیر ہو گئیں[۴]، بہرحال بیروت پہنچنے کے بعد غالباً ان کو کچھ اطمینان نصیب ہوا، تو یہیں انکی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا،

ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے واقعات اور بچپن کے دوسرے حالات و کوائف کا ذکر تذکروں میں بہت ہی کم بلکہ قریب قریب نہیں ملتا ہے، اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے،

جو بچے خوشحال اور فارغ البال گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں یا کم از کم ان کو اپنے والدین

---

[۱] بعض ارباب تذکرہ نے لکھا ہے کہ اوزاع یمن کے قبیلہ ذوالکلاع کی ایک شاخ کا نام ہے، یمن سے ترک وطن کرکے جب یہ لوگ شام آئے تو جہاں یہ آباد ہوئے اسی مقام کا نام اوزاع پڑ گیا، مگر میں نے سمعانی کے بیان کو ترجیح دی ہے۔ [۲] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۲ سمعانی لفظ اوزاعی۔ [۳] دمشق کے پاس ایک گاؤں تھا، اس نام کے دوسرے مقامات بھی ہیں۔ [۴] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۲ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انھوں نے آخری عمر میں بیروت میں سکونت اختیار کر لی تھی، مگر دوسرے تذکرہ نگاروں نے وہی لکھا ہے جس کو میں نے اختیار کیا ہے،

کا سایۂ عاطفت ہی نصیب ہوتا ہے، ان کا بچپن ایک خاص نہج سے گزرتا ہے، ان کی تعلیم ایک خاص نظم و ترتیب اور تربیت ایک خاص معیار کے مطابق ہوتی ہے، ایسے بچے آگے چل کر جب کسی ممتاز حیثیت کے مالک ہوتے ہیں تو ان کے بچپن اور ان کی تعلیم و تربیت کے واقعات سینکڑوں آدمیوں کو یاد ہوتے ہیں، اس لیے سوانح نگاروں کو ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، مگر امام اوزاعی اس طرح کی تمام نعمتوں سے محروم تھے، نہ تو وہ کسی خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے، نہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر پر تھا، حتیٰ کہ ان کو سن شعور تک کسی ایک جگہ رہنا بھی نصیب نہیں ہوا، ان کی ولادت کہیں ہوئی، بچپن کسی اور جگہ گذرا، اور جوانی کے ایام کہیں اور بسر ہوئے، ایسی صورت میں ان کے بچپن کے حالات اور تعلیم و تربیت کے ابتدائی واقعات پردۂ اخفا میں ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں،

تعلیم اور اساتذہ: مگر اس کے باوجود ان کی انشا پردازی، فصاحت و بلاغت اور تحریر و تقریر کی بے پناہ قوت و صلاحیت سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انکی ابتدائی تعلیم و تربیت ایسے ماحول اور ایسے اساتذہ کی صحبت میں ہوئی جو ان حیثیتوں سے ممتاز تھے،

اہل تذکرہ نے ان کے زمانۂ طالب علمی کے جو دو ایک واقعے بیان کیے ہیں اور ان کے جن اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے، ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ بیروت میں ... آ کر بیروت میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہ بیروت ہی میں تھے کہ ایک بار ان کو یمامہ جانے کا اتفاق ہوا، یمامہ میں اس وقت ممتاز محدث یحییٰ بن کثیر کی مجلس درس برپا تھی، اس میں شریک ہونے لگے، ان کو یحییٰ کی مجلس ایسی پسند آئی کہ اسی کے ہو رہے، کچھ دنوں کے بعد (غالبًا ان کی صلاحیت کے اندازے کے بعد) استاذ نے ہدایت کی کہ وہ بصرہ جا کر محمد بن سیرین اور شیخ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما سے سماع حدیث کریں، استاذ کے حکم کے بموجب وہ بصرہ

روانہ ہوگئے، مگر یمامہ سے بصرہ پہنچنا کچھ آسان نہ تھا، یمامہ اور بصرہ کے درمیان کئی سو میل کی مسافت تھی پھر امام اوزاعی کو نہ تو سواری میسر تھی اور نہ بھرپور زاد راہ، نہ جانے وہ کس کس طرح اور کتنے دنوں میں افتاں وخیزاں بصرہ پہنچے، وہاں پہنچتے ہی یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ جن بزرگوں سے سماع حدیث کے لئے وہ اتنی دور سے پا پیادہ آئے ہیں، ان میں سے ایک یعنی امام حسن بصری واصل بحق ہو چکے ہیں، اور دوسرے امام محمد بن سیرین صاحبِ فراش ہیں، اس خبر سے ان کو جو رنج ہوا ہوگا، اس کا اندازہ دکھونا مشکل ہے، مگر سوائے صبر کے چارۂ کار کیا تھا،

وہ ابن سیرین کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ بستر مرگ پر پڑے ہیں، ایسی حالت میں تو وہ سماع حدیث سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی سعادت اسی میں سمجھی کہ جو مہلت بھی میسر ہے اس میں حضرت ابن سیرین کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں، چنانچہ وہ جب تک وہاں رہے برابر ان کی عیادت کے لیے جاتے رہے، ممکن ہے اس اثنا میں انھوں نے ان سے زبانی کوئی حدیث سنی ہو، جیسا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے، مگر عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کو محمد بن سیرین سے سماع حدیث حاصل نہیں ہے۔

انھوں نے تابعین کی ایک کثیر تعداد سے حدیث نبوی کی سماعت کی ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے

ادرک خلقا من التابعین (البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶) — تابعین کی ایک کثیر تعداد کی انھوں نے صحبت اٹھائی ہے،

اہل تذکرہ نے ان کے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند ممتاز تابعین اور تبع تابعین کے نام یہ ہیں،

عطاء بن ابی رباح، قتادہ، نافع مولی ابن عمر، امام زہری، محمد بن ابراہیم، شداد بن ابی عمارہ، قاسم بن مخیمرہ، ربیعہ بن یزید وغیرہ،

لہ البدایہ والنہایہ

امام زہری اور یحییٰ بن ابی کثیر کے بارے میں امام اوزاعی کا خود بیان ہے کہ ان دونوں اماموں نے (غالباً زبانی سماع حدیث کے بعد) مجھے اپنے اپنے صحیفے (جن میں ان کی مرویات لکھی ہوئی تھیں) دیے اور فرمایا کہ

ارو ھا عنی — میرے واسطے سے تم اس کی روایت کرو،

یعقوب بن شیبہ نے یحییٰ بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام زہری سے امام اوزاعی کی روایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، مگر یہ قول نقل کرنے کے بعد خود فرماتے ہیں،

" زہری سے امام اوزاعی کی روایت خاص چیز ہے "[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شیبہ نے ابن معین کی اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے۔

درس و افتا بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ تیرہ برس کی عمر سے مسند درس و افتا پر بیٹھ گئے تھے، مگر اس روایت میں یا تو مبالغہ ہے یا غلط فہمی کی بنا پر یہ عمر درج ہو گئی ہے، صحیح بات وہی ہے جو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے کہ ۱۱۳ھ سے جبکہ ان کی عمر پچیس برس کی تھی انھوں نے فتویٰ دینا شروع کر دیا تھا،[2] یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے باقاعدہ اپنی کوئی مجلس درس قائم کی تھی، مگر تمام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل میں اہل شام ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ہقل بن زیاد جو ان کے خاص شاگرد ہیں ان کا بیان ہے کہ

افتی الاوزاعی فی سبعین الف مسئلۃ بحدثنا و اخبرنا[3] — انھوں نے ستر ہزار مسئلوں کا جواب حدیث کی روشنی میں دیا،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کوئی خاص مجلس درس تو قائم نہیں تھی، مگر دوسرے طریقوں سے اہل علم ان سے استفادہ اور روایت کرتے تھے، ان سے روایت کرنے والوں میں متعدد اکابر ائمہ ہیں چند نام یہ ہیں

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۴۲ [2] البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶ [3] ایضاً

امام مالک، امام شعبہ، سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان، ابن ابی الزناد، ہقل بن زیاد، ابو اسحاق الفزاری وغیرہ،

امام اوزاعی کو یہ فخر حاصل ہے کہ امام زہری اور قتادہ نے جو ان کے استاذ اور ائمہ تابعین کے سرخیل ہیں، ان سے روایت کی ہے۔[۱]

فضل وکمال ان کے فضل وکمال کا اعتراف تمام اکابر ائمہ فقہ وحدیث نے کیا ہے، یحییٰ بن معین فرماتے تھے، ائمہ تو چار ہیں، امام ابو حنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی،[۲] عبد الرحمن بن مہدی کا قول ہے کہ اس وقت حدیث میں چار امام ہیں، امام اوزاعی، امام مالک، سفیان ثوری اور حماد بن زید،[۳] ان ہی کا قول ہے کہ شام میں امام اوزاعی سے زیادہ سنت نبوی کا جاننے والا کوئی دوسرا نہیں ہے، امام شافعی کا بیان ہے کہ میں نے حدیث میں ان سے زیادہ سمجھدار اور فقیہ آدمی نہیں دیکھا،[۴] سفیان بن عیینہ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اپنے زمانہ کے امام ہیں، ابو اسحاق فزاری کا قول ہے کہ میں نے امام اوزاعی اور سفیان ثوری جیسا صاحب علم وفضل نہیں دیکھا،[۵]

ابو زرعہ رازی فرماتے تھے، امام اوزاعی اپنے علم وفضل اور کثرتِ روایت کی بنا پر اہل شام کے مرجع بن گئے تھے، اور اہل شام ان ہی سے فتاوے لیتے تھے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے تقریباً ستر ہزار مسائل کا جواب حدیث وآثار کی روشنی میں دیا تھا، امیہ بن زید سے کسی نے پوچھا کہ مکحول[۶] کے مقابلہ میں اوزاعی کا کیا درجہ ہے، انھوں نے کہا کہ اوزاعی کا رتبہ ہمارے نزدیک مکحول سے زیادہ ہے، پوچھا کہ مکحول نے تو صحابہ کرام کو دیکھا تھا، فرمایا کہ ہاں

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۹ [۲] البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶ ابھی تک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے مسلکوں کی شہرت نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسلامی مملکت کی بیشتر آبادی ان ہی ائمہ کے تفقہ وفتاوے پر عامل تھی، [۳] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۹ ان کے حالات کتاب میں درج ہیں [۴] ایضاً ص ۲۴۲ [۵] ایضاً [۶] مشہور تابعی ہیں

روایت صحابہ کا فضل انھیں ضرور حاصل تھا، مگر یہ فضل اضافی ہے، امام اوزاعی میں جو فضل و کمال ہے وہ ان کا ذاتی ہے،[1]

امام مالک فرماتے تھے کہ امام اوزاعی ان ائمہ میں ہیں جن کی اقتدا کیجا سکتی ہے (البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶)

امام نووی ان کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقد اجمع العلماء علیٰ امامة	امام اوزاعی کی امامت، جلالت شان،
الاوزاعی وجلالته وعلو مرتبته	علو مرتبت اور فضل و کمال پر سب کا
وکمال فضله	اتفاق ہے۔

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اظہار حق میں ان کی جرأت و ہمت کے بارے میں سلف کے اقوال مشہور و معروف ہیں،[2]

حافظ ابن کثیر نے ان کے علم و فضل کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

خلفاء، وزراء اور تجار وغیرہ کے کسی طبقہ میں بھی ان سے زیادہ صاحب علم و فضل اور فصیح و بلیغ، متقی و پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا گیا، فقہ و حدیث، سیرت و مغازی اور دوسرے اسلامی علوم میں نہ صرف اپنے اہل وطن پر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر ان کی سیادت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، زبان و ادب کا ذوق بھی ان میں فطری تھا، ان کی تحریر و تقریر دونوں نہایت فصیح و بلیغ ہوتی تھیں، ان کی زبان سے جو بات بھی نکلتی لوگ حسن بیان اور فصاحت کی وجہ سے اس کو لکھ لیتے تھے، اور وہ تحریر بطور نمونہ اپنے پاس رکھتے تھے، دربار خلافت میں بھی ان کی تحریریں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں خصوصیت سے عباسی خلیفہ منصور کو ان کی تحریر بہت پسند تھی، ایک بار اس نے اپنے خاص کاتب سے کہا کہ حکومت کی طرف سے جو خطوط و فرامین ملک کے دوسرے حصوں میں بھیجے

---

[1] تہذیب الاسماء ج ا ص ۲۹۹-۳۰۰ [2] ایضاً

جانتے ہیں، ان میں تمھیں امام اوزاعی کی تحریر سے مدد لینی چاہیے تاکہ ان خطوط کی زبان فصیح و بلیغ سمجھی جائے۔ کاتب نے کہا کہ امیرالمومنین! پوری مملکت میں اس وقت ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی تحریر کا چربہ اتار سکے یا اس کی تقلید کر سکے۔[1]

ان کے علم و فضل کا تذکرہ تصنیفات کے ضمن میں آئے گا

خلافت کی اہلیت علم و فضل کے ساتھ انتظام ملکی کی صلاحیت بہت کم جمع ہوتی ہے، مگر یہ دونوں خوبیاں بیک وقت ان میں موجود تھیں، ایک بار امام اوزاعی اور سفیان ثوری امام مالک کے پاس تشریف لے گئے، جب وہاں سے واپس ہوئے تو امام مالک نے فرمایا کہ سفیان علم میں بڑھے ہوئے ہیں، اوزاعی علم کے ساتھ انتظام ملکی کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، امام ذہبی نے لکھا ہے کہ

وکان یصلح للخلافۃ وہ خلیفہ بنائے جانے کے لائق تھے،

سیرت و کردار سیرت و کردار میں صحابہ و تابعین کا نمونہ تھے، زہد و قناعت، سخاوت و فیاضی، حق گوئی و بیباکی، وعظ و پند اور امت کی خیر خواہی یہ سب ان کے نمایاں اوصاف تھے،

بچپن سے انھوں نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، زہد و قناعت کا حال یہ تھا کہ کبھی دربار خلافت کا رخ نہیں کیا، خلفائے بنوامیہ کے یہاں معزز و محترم تھے، خلفائے عباسیہ میں بھی ان کا وقار اور اعزاز تھا، مگر کبھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی، خلفائے بنوامیہ نے ان کو متعدد جاگیریں دی تھیں، نیز دربار خلافت کی طرف سے مختلف اوقات میں تقریباً ستر ہزار دینار کے عطیے ان کی خدمت میں پیش کیے گئے، مگر انھوں نے نہ تو کبھی ان جاگیروں کے کسی حبہ سے فائدہ اٹھایا اور نہ نقد رقم کا ایک حبہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کیا، بلکہ یہ ساری جائداد اور پوری رقم فقرا و مساکین، اور جہاد فی سبیل اللہ میں لگا دی، اور خود ہمیشہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، جب انتقال ہوا تو سارا اثاثہ بیتہ

---

[1] البدایہ ص ۱۱۷ ج ۱۰

سات دینار کی مالیت سے زیادہ کا نہ تھا،

حق گوئی و بیباکی انکی سیرت کا ایک نمایاں وصف تھا، بنو امیہ کی حکومت سے امام اوزاعی کا کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، مگر جس ظلم و تشدد کے ساتھ وہ شام سے جلاوطن کیے گئے تھے، غالباً وہ امام کو پسند نہیں تھا، ممکن ہے کہ انھوں نے اس بارے میں کچھ اظہار خیال بھی کیا ہو، عبداللہ بن علی جس نے شام سے بنو امیہ کا خاتمہ کیا تھا، جب اس کو بنو امیہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے ان تمام لوگوں کا صفایا کرنا شروع کیا، جن کو اموی حکومت سے کسی درجہ میں بھی ہمدردی تھی، اس سلسلہ میں امام اوزاعی کی بھی تلاش ہوئی، یہ کئی دن چھپے رہے، مگر پھر جرأت کرکے خود دربار میں حاضر ہوگئے، فرماتے ہیں کہ جس وقت میں دربار میں داخل ہوا تو دیکھا کہ عبداللہ ایک تخت پر متمکن ہے، اور اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے، اس کے ارد گرد بہت سے جلاد نما سپاہی ننگی تلواریں لیے کھڑے ہیں، میں نے پہنچکر سلام کیا، اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اپنے نیزہ کو زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا، اوزاعی! ہم نے ان ظالموں (بنو امیہ) سے ملک اور اس کے باشندوں کو نجات دلانے میں جو جنگ کی ہے، یہ جہاد ہے کہ نہیں؟

امام اوزاعی کے لیے یہ بڑا سخت وقت تھا، مگر انھوں نے نہایت ہی حکیمانہ جواب دیا، فرمایا کہ میں نے یحیی ابن سعید کے واسطہ سے یہ حدیث نبوی سنی ہے کہ

تمام اعمال کا دار نیت پر ہے، ہر شخص اپنے اعمال میں جیسی نیک و بد نیت کرے گا ویسا ہی اسے اجر ملے گا،

اس بنا پر اگر تمہاری نیت صرف ملک گیری کی تھی تو تم کو اس کا اجر ملے گا، اور اگر اعلاے کلمۃ اللہ مقصود تھا تو یہ جہاد کا ثواب ملے گا،

یہ غیر متوقع جواب سنکر ابن علی غصہ سے بیتاب ہوگیا، اور اسی غصہ میں اپنے نیزہ کو زمین پر ایک دفعہ تیزی سے ٹیکا اور معاً دوسرا سوال یہ کیا کہ

یااوزاعی ماتقول فی دماء بنی امیۃ — اے اوزاعی! بنی امیہ کے خون کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (یعنی ان کا قتل کرنا جائز ہے یا حرام)

آپ نے اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے نہایت ہی متانت کے ساتھ ایک حدیث پھر سنائی، وہ حدیث یہ ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون کرنا تین حالتوں میں جائز ہو سکتا ہے، قصاص کے وقت یا کوئی شادی شدہ زانی ہو یا پھر کوئی مرتد ہو جائے۔

یہ جواب بھی اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا، اسی لیے اس نے اس دفعہ اور زیادہ غصہ کا اظہار کیا، پھر پوچھا کہ اچھا

"بنو امیہ کے مال کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے"؟

آپ نے فرمایا" ان کے پاس جو دولت تھی اگر وہ حرام ذریعہ سے ان کے ہاتھ میں آئی تھی تو بہرحال وہ تمھارے ہاتھ میں پہنچکر حلال تو نہیں ہو سکتی اور اگر وہ حلال تھی تو تم اس کو اسی طریقہ سے لے سکتے ہو جس طرح شریعت نے اجازت دی ہے"۔ یہ جواب سنکر وہ بالکل آگ بگولہ ہو گیا، امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں اس جواب کے بعد متوقع تھا کہ ابھی وہ میرے قتل کا حکم دیدے گا مگر اب اس نے ترہیب کے بجائے ترغیب سے کام لینا شروع کیا، اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیوں اگر آپ کو عہدۂ قضا سونپ دیا جائے تو کیا ہرج ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ کے اسلاف نے اس ذمہ داری سے مجھے سبکدوش رکھا تو میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسی روش پر قائم رہیں،

اس سوال و جواب کے بعد اس نے ان کو واپس جانے کی اجازت دیدی، امام اوزاعی دربار سے رخصت ہو کر ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ عبداللہ کا ایک قاصد لپکا ہوا ان کے پاس پہنچا، امام اوزاعی نے دیکھا تو سمجھے کہ وہ غالباً میرے قتل کا پروانہ لا رہا ہے، چاہا کہ فوراً سواری سے اتر کر دو رکعت

نماز ادا کریں[1] چنانچہ انھوں نے نماز کی نیت باندھ لی، قاصد انتظار کرتا رہا، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے دو سو دینار کی ایک تھیلی پیش کی، اور کہا کہ یہ امیر نے آپ کے لیے بھیجا ہے، امام اوزاعی کا بیان ہے کہ میں نے خوف کی بنا پر یہ رقم لے لی، مگر گھر پہنچنے سے پہلے پوری رقم صدقہ کر دی[2]،

عبادت و تقویٰ | عبادت و تقویٰ میں بھی وہ ممتاز تھے، نماز نہایت ہی خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، خصوصیت سے رات کا بیشتر حصہ ذکر و نوافل میں گزرتا تھا، فرماتے تھے کہ جو لوگ رات کی نمازوں میں جتنا طویل قیام کریں گے، اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے قیامت کے قیام کو ہلکا کر دے گا، اپنے اس قول کے ثبوت میں وہ قرآن کی اس آیت کو پیش کرتے تھے،

وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ	اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اسکو اور پاکی بول
لَيْلًا طَوِيْلًا ۝ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ	اسکی بڑے رات تک یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے
الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ	والے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک
يَوْمًا ثَقِيْلًا ۝ (دھر - ۲)	بھاری دن کو،

حج کے لیے سفر کیا تو زیارت حرمین کا ذوق و شوق اتنا غالب تھا کہ پورے سفر حج میں بے خبر ہو کر ایک دن نہیں سوئے، نیند کا زیادہ غلبہ ہوا تو کجاوے سے ٹیک لگا لی یا لیٹ پوٹ لیا، ابن عساکر کا قول ہے کہ امام اوزاعی کثرت عبادت اور نماز کی خوبی میں ممتاز تھے،

ولید بن مسلم کا قول ہے کہ عبادت میں امام اوزاعی سے زیادہ کوشش و اہتمام کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا[3]،

رات کے وقت نماز میں اس قدر روتے تھے کہ مصلیٰ تر ہو جاتا تھا، ایک بار ایک عورت ان کی اہلیہ سے ملنے آئی، اس نے دیکھا کہ مصلے کا ایک حصہ تر ہے، پوچھا کہ کیا مصلے پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہے

---

[1] قتل سے پہلے دو رکعت نماز ایک صحابی حضرت خباب نے ادا کی سنت ہے [2] البدایہ والنہایہ ص ۱۱۸، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۲، ۱۹۳
[3] البدایہ ص ۱۱۷ ج ۱۰

نیک بخت بولیں

ھذا من اثر دموع الشیخ من بکائہ	یہ شیخ کے آنسوؤں سے تر ہوگیا ہے، یہ روزانہ
فی سجودہ ھٰکذا یصبح کل یوم (ف)[1]	سجدوں میں اسی طرح رویا کرتے ہیں۔

ابومسہر کا قول ہے کہ

کان اوزاعی یحیی اللیل قرآناً وبکاءً[1]	اوزاعی رونے اور نماز میں قرآن کی تلاوت میں رات ختم کر دیا کرتے تھے۔

مگر ان کی یہ رقیق القلبی رات کی تنہائیوں تک محدود تھی، مجمع عام میں وہ بڑے ضبط سے کام لیتے تھے، بدایہ میں ہے کہ "ان کو مجلس میں روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا، مگر جب وہ تنہائی میں ہوتے تھے تو اس قدر روتے تھے کہ ان کے حال پر رحم آتا تھا"،

نہایت خاموش اور سنجیدہ آدمی تھے کبھی قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے، اور نہ مذاق و ہنسی کرتے تھے،

خشوع | خضوع و خشوع کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اوپر خدا کی عظمت و برتری اور احساس ذمہ داری اور قیامت کی باز پرس کی ایک مستقل کیفیت طاری ہو جائے، نماز سے اس کیفیت کا تعلق ضمنی یا بطور مشق ہے، امام اوزاعی پر یہ کیفیت ہمہ وقت طاری رہتی تھی، بشر بن منذر کہتے تھے کہ

وکان من شدۃ الخشوع کانہ اعمیٰ[2]	شدت خشوع کی وجہ سے یہ اندھے معلوم ہوتے تھے۔

اوپر ان کی رقت قلبی کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے وہ بھی اسی خشوع قلب کا نتیجہ تھی، ایک بار کسی نے ان سے خشوع کی تعریف پوچھی تو فرمایا کہ آنکھوں اور بازوؤں کے جھکاؤ اور رقت قلب کا نام خشوع ہے[3]،

امر بالمعروف | امت مسلمہ کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو برائی سے روکا جائے اور اسے بھلائی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۱ [2] ایضاً [3] ایضاً

کی ترغیب دی جائے، اللہ تعالیٰ نے دست و بازو، زبان وقلم، قوت و اقتدار اور مال و دولت یا اس کے علاوہ جو بھی صلاحیت عطا کی ہے، ان کو اسی راہ میں لگا دینا ایمان کی سب سے بڑی علامت ہے، امام اوزاعی اس وصف میں صحابہ و تابعین کا نمونہ تھے،

ان کو اللہ تعالیٰ نے زبان وقلم کی جو صلاحیت عطا کی تھی، اس کو انھوں نے اسی مقصد میں پورے طور سے لگا دیا تھا، ان کے تمام معاصرین کا بیان ہے کہ

وکان انصح الامۃ[1] امت کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے،

ہر طبقہ میں ان کی عزت تھی اپنے ان ہی اوصاف و محاسن اور سیرت و کردار کی وجہ سے ہر طبقہ میں معزز و محترم تھے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ

کان الاوزاعی فی الشام معظماً مکرماً امرہ اعز عندھم من امر السلطان (ص ۱۲۰) امام اوزاعی شام میں اس قدر معزز و مکرم تھے کہ ان کا حکم اہل شام کی نظر میں بادشاہ وقت کے حکم سے زیادہ قابل قدر اور محترم تھا،

شام کے بعض امراء نے ان کے بارے میں کوئی سخت قدم اٹھانا چاہا تو ان کے ہم نشینوں نے مشورہ دیا کہ ان کو نہ چھیڑو ورنہ

واللہ لو امر اھل الشام ان یقتلوک لقتلوک (ص ۱۲۰) خدا کی قسم اگر اہل شام کو وہ تمھارے قتل کا حکم دیدیں تو وہ تم کو قتل کر دیں گے،

امام اوزاعی کی وفات کے بعد شام کے امیر نے آپ کی تدفین کے بعد کہا کہ خدا آپ کے حال پر رحم فرمائے، مجھے جس نے امارت سپرد کی ہے (یعنی منصور) میں اس سے بھی زیادہ آپ سے ڈرتا تھا،[2]

بقیہ بن ولید کہتے تھے کہ ہم لوگوں کو امام اوزاعی کے ذریعہ آزماتے تھے، اور اگر کوئی شخص

---

[1] تہذیب ج ۶ ص ۲۴۲، [2] ص ۱۲۰ ج ۱۰

ان کے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا تو ہم اس کے بارے میں سمجھتے تھے کہ انہ صاحب سنۃ یہ متبع سنت ہے

امام اوزاعی حج کے لیے تشریف لے گئے تو سفیان ثوری نے جو پہلے سے وہاں موجود تھے، بستی سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا اور ان کے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے آگے آگے پیدل چل رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے،

طرقوا للشیخ (شیخ کے لیے راستہ دے دو)

بیش قیمت اقوال | فرمایا کہ جب تم کو کوئی حدیث نبوی مل جائے تو پھر اس میں چون وچرا کی گنجایش نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے تھے وہ اللہ کے مبلغ کی حیثیت سے کہتے تھے۔

سلف صالحین یعنی صحابہؓ و تابعین کے اقوال و اعمال کو اپنے اوپر لازم کر لو اگرچہ لوگ اس میں تمہارا ساتھ نہ دیں، اس کے مقابلہ میں اور کسی شخص کی رائے کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے اور دلفریب پیرائے میں کیوں نہ پیش کی گئی ہو، کوئی اہمیت نہ دو، اور اس کے قبول کرنے سے پرہیز کرو، اس سے دین بھی واضح اور روشن رہے گا، اور تم بھی راہ راست پر قائم رہوگے،

فرماتے تھے

العلم ماجاء عن اصحاب محمد — حقیقی علم وہ ہے جو صحابۂ کرام سے ثابت اور

وما لم یجیٔ عنہم فلیس بعلم — منقول ہے اور جو ان سے ثابت نہ ہو وہ علم نہیں ہے

ولید کا بیان ہے کہ میں نے امام اوزاعی سے خود سنا ہے، وہ کہتے تھے کہ "دنیا میں انسان عمر کی جتنی گھڑیاں گزار رہا ہے، وہ سب اس کے سامنے ترتیب سے پیش کی جائیں گی، تو زندگی کی جو ساعت اللہ کی یاد سے غفلت میں گزری ہے اس پر نفس کو سخت افسوس ہوگا"

لے شذرات الذہب ج ۱ ص ۲۴۱

ان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی شخص کوئی بات پوچھتا تھا تو اس کا جواب ضرور دیتے تھے،

ایک عیسائی نے ایک مٹکا شہد ہدیۃً دیا، اور کہا کہ آپ ایک خط شہر بعلبک کے والی کو دمالی مدد کے لیے، لکھ دیجئے، آپنے اس سے کہا کہ اگر خط لکھوانا چاہتے ہو تو اس کی شرط یہ ہے کہ یہ شہد واپس لے لو، ورنہ میں شہد تو قبول کر لوں گا مگر خط نہیں لکھ سکتا، وہ راضی ہو گیا، آپنے شہد واپس کر دی، اور اس کی امداد کے لیے خط لکھ دیا، اور اس کی مدد ہو گئی،

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مقصد کے حصول یا سفارش کے لیے جو ہدیے پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں،

فرمایا کرتے کہ سلامتی اور عافیت کے دس اجزا ہیں جن میں ۹ کے برابر تو خاموشی ہے اور اسی کا ایک جز لوگوں سے بے نیازی ہے،

ایک بار اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ جو شخص موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اس کو ہر معاملہ میں آسانی میسر آتی ہے۔ اور جو شخص یہ جان لے کہ گفتگو بھی ایک عمل ہے (جس کی باز پرس ہوگی) تو وہ بات چیت کم کرے گا،

ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ امام اوزاعی کہا کرتے تھے کہ "ایک زمانہ ایسا آئیگا جس میں سب سے زیادہ کمی مونس و غمخوار بھائی کی، حلال پیسے اور اتباع سنت کی ہوگی"

فرماتے تھے کہ سلف صالحین کا حال یہ تھا کہ صبح صادق کے وقت یا اس سے کچھ پہلے ہی سے وہ ذکر و عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے، جب طلوع آفتاب کا وقت ہوتا تھا تو سب لوگ جمع ہو کر پہلے قیامت اور اس کی ہولناکی کے بارے میں بات چیت کرتے تھے، پھر تعلیم دین کا چرچا ہوتا تھا،

فرماتے تھے کہ پانچ باتیں تمام صحابہؓ اور تابعین میں مشترک تھیں،

(۱) اجتماعیت (۲) اتباع سنت (۳) تعمیر مساجد (۴) تلاوت قرآن پاک، پانچویں بات کا ذکر نہیں ہے۔

فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تو اس میں بحث ومباحثہ اور جدال ومناظر کا دروازہ کھول دیتا ہے اور علم وعمل کے دروازے ان کے لیے بند کر دیتا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں کی محبت ایک مومن ہی کے قلب میں جمع ہو سکتی ہے۔

جو شخص علماء کے شاذ ونادر اقوال پر عمل کرے گا وہ ایک دن اسلام کے دائرہ سے نکل جائیگا۔

فرمایا کہ برا ہو غیر عابد فقہا اور حرام چیزوں کو شبہہ کی بنا پر حلال کر دینے والوں کا، جس شخص نے کوئی دین میں بدعت ایجاد کی، اس کا ورع وتقویٰ سلب ہوا۔

ان کے فقہی مسلک کے زوال کے اسباب ابتدا میں ذکر آچکا ہے کہ فقہ میں ایک مکتب فکر کے بانی امام اوزاعی بھی تھے، جس پر شام میں دو صدی تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی تک عمل درآمد رہا، مگر اس کے بعد کچھ داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر یہ فنا ہو گیا۔ اس سلسلہ میں مزید کچھ تاریخی معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

امام اوزاعی کا ذہن قدرۃً بھی محدثانہ طرز فکر سے زیادہ ہم آہنگ تھا، اور ان کی تعلیم وتربیت بھی حدثنا واخبرنا ہی کے ماحول میں ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان سے پیش آمدہ مسائل میں استفسار کیا جاتا تھا، تو وہ حدیث نبویؐ اور آثار صحابہ کی روشنی میں سادہ طور سے ان کا جواب دیتے تھے، زیادہ تدقیق وتفتیش اور فرضی قیاس آرائی کو پسند نہیں کرتے تھے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے ستر ہزار مسائل کا جواب حدیث وآثار کی روشنی میں دیا تھا، جب تک مسلمانوں میں سادہ اسلامی زندگی کا رواج رہا، اس وقت تک ان کے مسلک پر تعامل باقی رہا، مگر جب فقہا کی ژرف نگاہی اور باریک بینی کا دور شروع ہوا اور انھوں نے فرضی اور امکانی

مسائل کی تخریج و تفریع کی بھرمار کر دی تو امام اوزاعی کا سادہ اور ٹھیٹھ مسلک انکی دقت پسندی کے آگے نہ ٹھہر سکا، اور ان کا خالص محدثانہ مکتبِ فکر فقہی مکتبِ فکر کے سامنے شکست کھا گیا[۱] گو اس کے کچھ سیاسی اسباب بھی تھے، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

میں نے یہ رائے اسی دور کی تاریخ فقہ و حدیث کی روشنی میں قائم کی ہے۔ ممکن ہے کہ میری یہ رائے پورے طور پر صحیح نہ ہو، یا اس میں کوئی تاریخی غلطی یا مبالغہ آمیزی ہو، مگر بہرحال مجھے یقین ہے کہ میری اس رائے کو بالکل غلط نہیں کہا جا سکتا۔

امام اوزاعی کے مسلک کے زوال کے اسباب و وجوہ پر عام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بہت کچھ روشنی نہیں ڈالی ہے، قدما میں لسان الدین بن الخطیب نے اور متاخرین میں علامہ کرد علی اور حضرمی نے قدرے تفصیلی گفتگو کی ہے، ہم یہاں تمام تذکرہ نگاروں کی رائیں پیش کرتے ہیں۔ امام ذہبی نے لکھا ہے،

کان اهل الشام ثم اهل الاندلس	اہل شام پھر اہل اندلس امام اوزاعی
علی مذهب الاوزاعی مدة	کے مسلک پر ایک مدت تک عامل رہے
من الدهر ثم فنی العارفون به[۲]	پھر اس کے جاننے والے ختم ہو گئے،

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ذہبی کے نزدیک اس مسلک کے اختتام کا سبب یہ ہے کہ اس کے جاننے والے باقی نہیں رہے تھے، مگر اس کے جاننے والے کیوں باقی نہیں رہے؟

---

[۱] اس دور میں دوسرے محدثانہ مکاتب فکر مثلاً سفیان ثوری، داؤد ظاہری، اسحاق بن راہویہ، اور طبری وغیرہ کا بھی یہی حشر ہوا، ان مسلکوں کی شکست سے امت کو سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کا تعلق اصل ماخذ کتاب و سنت سے کم ہونے لگا اور آخر میں انھوں نے تقلید جامد کی وہ صورت اختیار کی کہ ان کی وسعت نظری اور عالمگیری ختم ہو گئی اور وہ اس دنیا میں پتھر کی ایک چٹان بنکر رہ گئے جس میں نہ عزم ہے نہ حرکت،
[۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۶۴

اس کا جواب اس بیان میں نہیں ہے،

حافظ ابن حجر تہذیب میں لکھتے ہیں :-

والیہ فتوی الفقہ لاھل الشام	اہل شام فقہی مسائل میں ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے،

دوسری جگہ اس کتاب میں ہے

کانت الفتیا تدور بالاندلس	اندلس میں امام اوزاعی کے مسلک کے مطابق فتاوے
علی رای الاوزاعی الی زمن الحکم	دیے جاتے تھے اور حکم بن ہشام متوفی ۲۰۶ھ
بن ھشام المتوفی ۲۵۶ھ[۱] (ج ۶ ص ۲۴۲)	کے زمانہ تک اسی مسلک پر تعامل رہا،

اس بیان سے زوال مسلک پر تو کوئی روشنی نہیں پڑتی مگر اس سے یہ پہلو واضح ہوجاتا ہے کہ دوسری صدی کے نصف آخر تک اندلس کی اموی حکومت میں اس مسلک کے مطابق فیصلے ہوتے تھے،

حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں بڑی تفصیل سے امام اوزاعی کے حالات لکھے ہیں، مگر اس بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا ہے، البتہ اپنی ایک دوسری کتاب میں اتنا لکھا ہے کہ

وقد کان اھل الشام علی مذھب	اہل شام دو سو برس تک امام اوزاعی کے
الاوزاعی نحواً من مائتی سنۃ[۲]	مسلک پر عامل رہے،

اس بیان میں ایک دوسرا گوشہ واضح ہوگیا، وہ یہ کہ شام میں دو سو برس تک ان کا مسلک چلا، شیخ کرد علی نے کچھ اور زیادہ وضاحت کی ہے، یہ علم نہیں ہوسکا کہ ان کا ماخذ کیا ہے،

یعمل بمذھبہ فی الشام نحو مائتی	شام میں تقریباً دو صدی تک ان کے مسلک
سنۃ وآخر من عمل بمذھبہ احمد	پر عمل باقی رہا، شام کے آخری قاضی جنھوں نے
بن سلیمان قاضی الشام وعمل	ان کے مسلک پر عمل کیا وہ احمد بن سلیمان تھے،

---

[۱] کتاب میں ۲۵۶ھ اس کی وفات درج ہے مگر صحیح ۲۰۶ھ ہے، ابن اثیر، نفح الطیب وغیرہ [۲] اختصار علوم الحدیث ص ۹۹

اهل الاندلس بمذهبه اربعين سنة	اہل اندلس محض چالیس ہی برس ان کے مسلک پر
ثم تناقص بمذهب الامام مالك	عمل کر سکے تھے کہ امام مالک کے مسلک سے یہ شکست کھا گیا،

خضری نے التشریع الاسلامی میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے،

وكان اهل الشام يعملون بمذهبه	اہل شام بہت دنوں تک ان کے مسلک پر
ثم انتقل مذهب الاوزاعي الى	عمل کرتے رہے، پھر انکا مسلک بنو امیہ کے ان
الاندلس مع الداخلين اليها	لوگوں کے ذریعہ اندلس پہنچا جنھوں نے اندلس
من اعقاب بني امية ثم اضمحل	میں جاکر اپنی حکومت قائم کی، پھر شام میں امام
امام مذهب الشافعي في الشام	شافعی کے مسلک کے آگے اور اندلس میں امام مالک
وامام مذهب مالك في الاندلس	کے مسلک کے سامنے یہ کمزور پڑ گیا اور یہ تیسری نصف
وذلك في منتصف القرن الثالث (ج۲)	صدی ہی ہوا

شام کے بارے میں تو عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ وہاں دو سو برس تک امام اوزاعی کا مسلک زندہ رہا، مگر اندلس کے بارہ میں انھوں نے کسی مدت کی تعیین نہیں کی ہے، اس کے لیے ہم اندلس کے سب سے قابل وثوق مورخ لسان الدین بن الخطیب کا بیان نقل کرتے ہیں،

اہل اندلس اور اہل شام ابتدا میں امام اوزاعی کے مسلک کے پیرو تھے، مگر اندلس کے تیسرے اموی حکمران حکم بن ہشام کے زمانہ میں فقہ وفتاوی کی مسند مالکی فقہا نے سنبھال لی، پھر آہستہ آہستہ مالکی مسلک کا وہاں عام چرچا ہوا، اور اندلس اور قرطبہ دونوں جگہ یہی مسلک رائج ہو گیا، اور اس مسلک کے فروغ کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ حکم نے خود اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا،

اس تبدیلی مسلک کا سبب [illegible] مصنف نے لکھا ہے کہ اس بارے میں دو مختلف رائیں ہیں

۱؎ خطط الشام ج ۳ ص ۲۵۵

عام اہل علم کا خیال یہ ہے کہ

ان سببه رحلة علماء الاندلس الى المدينة فلما رجعوا الى الاندلس وصفوا فضل مالك وسعة علمه وجلالة قدره فاعظموه (ص۱۵۸ ج۲)

اس تبدیلی کا سبب یہ ہوا کہ بہت سے علمائے اندلس تحصیل علم اور سماع حدیث کے لیے مدینہ منورہ گئے وہاں امام مالک کی مجلس درس برپا تھی (اس میں شریک ہوکر) جب اندلس واپس ہوئے تو امام مالک کے فضل و کمال اور جلالت علم کا عام چرچا ہوا، چنانچہ اہل اندلس ان کی عظمت کے قائل ہوگئے، (اور ان کا مسلک اختیار کرلیا)

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ جب علمائے اندلس امام مالک کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے یہاں کے حاکم کے عدل و انصاف اور اس کے سیرت و کردار کی تحقیق کی، امام مالک چونکہ عباسی حکومت کو اس کے ظلم و تشدد کی وجہ سے پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے ان کو اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی اور فرمایا

نسأل الله تعالیٰ ان یزین حرمنا بملككم.. فنمت المسألة الى ملك الاندلس مع ما علم من جلالة مالك ودينه فحمل الناس على مذهبه (ص ۱۵۹)

ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے حرم (مکہ) کو تمھارے حکمراں کے (عدل و انصاف) سے مزین کردے... یہ بات جب اندلس کے حکمراں تک پہنچی اور ساتھ ہی وہ امام مالک کی جلالت علم اور ان کے دین و تقوی سے واقف ہوا تو اس نے امام اوزاعی کے مسلک کو ترک کردیا، اور امام مالک کے مسلک کے اختیار کرلینے پر اہل اندلس کو آمادہ کیا۔

پہلی رائے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی مسلک کا سبب صرف علمی اور دینی تھا، مگر دوسری رائے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلک کی تبدیلی صرف علمی نہیں تھی، بلکہ اس میں کچھ سیاسی مصلحت بھی پوشیدہ تھی، صاحب نفح الطیب نے پہلی رائے کو ترجیح دی ہے، اور دوسری رائے کو ضعیف بتایا ہے، مگر میرے نزدیک دوسری رائے قابل ترجیح ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر فقہ وفتاوے کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کوئی فقہی مسلک کسی ملک میں اسی وقت رواج پذیر ہوا ہے جب اس کو حکومت نے اپنایا ہے، محض عوام کے حسن ظن یا ان کی خواہش کی بنا پر شاید ہی کوئی تبدیلی ہوئی ہو، یہ بات ضرور ہے کہ اس میں کچھ علمی اور دینی اسباب بھی ہوتے ہیں، مگر ان کی نشاندہی بہت مشکل ہے،

اوپر کے تمام بیانات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں،

(۱) شام میں امام اوزاعی کا مسلک دوسو برس تک زندہ رہا،

(۲) حضری کے بیان کے مطابق اندلس میں ان کا مسلک بنو امیہ کے ذریعہ پہنچا،

(۳) کردعلی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اندلس میں مسلک اوزاعی صرف چالیس برس زندہ رہا، مگر نفح الطیب کے بیان اور بنو امیہ کی حکومت کے قیام کی تاریخ ۱۳۸ھ اور ہشام کے دور حکومت میں قضاۃ کے تقرر کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مدت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے، زیادہ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے

(۴) شام میں امام اوزاعی کے مسلک کی جگہ شافعی مسلک نے لی، اور اندلس میں مالکی مسلک نے،

تصنیف | تعجب ہے کہ ارباب تذکرہ میں کسی نے بھی ان کی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا نام لیا ہے، (۱) کتاب السنن فی الفقہ (۲) کتاب المسائل فی الفقہ، اس کے علاوہ انھوں نے ایک کتاب جس کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا (۱)" ابوحنیفہ کے مسائل سیر مغازی"

کے رد میں لکھی تھی جو کہ جواب میں امام ابو یوسف نے ایک کتاب الرد علی السیر الاوزاعی لکھی، اور امام محمد نے السیر الکبیر میں جا بجا اس کے جوابات دیے ہیں،

یہ علم نہیں ہو سکا کہ امام اوزاعی کی کتاب دنیا کے کسی کتب خانہ میں موجود ہے یا نہیں، مگر امام ابو یوسف کی کتاب لجنۃ المعارف النعمانیہ کی طرف سے چھپ کر منصۂ شہود پر آگئی ہے، اس کتاب سے امام اوزاعی کی کتاب کی حیثیت اور سیر و مغازی میں آپ کے علم و نظر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوتا ہے،

سیر و مغازی کے جو مسائل امام ابو حنیفہ اپنے درس میں املا کراتے تھے، تلامذہ ان مسائل کو مرتب کر لیا کرتے تھے، خصوصیت سے امام محمد نے ان مسائل کا جو مجموعہ السیر الصغیر کے نام سے مرتب کیا تھا وہ بہت مقبول ہوا، یہ مجموعہ جب امام اوزاعی کی خدمت میں پہنچا تو انھوں نے پوچھا یہ کتاب کس کی تصنیف ہے؟ بتایا گیا امام محمد عراقی کی، بولے، اہل عراق نے سیر و مغازی کے موضوع پر تصنیف کیوں شروع کر دی؟ اس لیے کہ ان کو سیر و مغازی کا کوئی علم نہیں ہے، (یہ علم صحابہ کے ذریعہ پہنچا ہے) اور صحابہ تو شام کے ایک حصہ اور حجاز میں پہنچے تھے، عراق تو بہت بعد میں فتح ہوا ہے[۱]،

چنانچہ امام اوزاعی نے ان مسائل کی تردید میں ایک کتاب لکھ ڈالی، جب یہ کتاب امام ابو یوسف اور امام محمد تک پہنچی تو انھوں نے اس کا جواب دیا[۲]،

امام اوزاعی نے امام ابو حنیفہ سے سینکڑوں مسائل میں اختلاف کیا ہے، امام ابو یوسف نے اپنی کتاب میں ان تمام مسائل میں امام صاحب کی پوری وکالت کی ہے، اور ان کے اقوال کی ترجیح کے لیے عقلی و نقلی دلائل کا انبار لگا دیا ہے، مگر پھر بھی بعض مسائل میں انھوں نے اپنے امام اور استاذ کے مقابلہ میں امام اوزاعی کے قول کو ترجیح دی ہے، یا اس کی طرف رجوع کر لیا ہے، ان مسائل کا

---

[۱] السیر الکبیر ص ۱، [۲] مقدمہ الرد علی السیر الاوزاعی ص ۲

تذکرہ طوالت کا سبب ہوتا، اہل علم کے لیے اس کتاب میں ص ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۷، ۹۷ وغیرہ کا مطالعہ دلچسپی کا سبب ہوگا۔

وفات | امام اوزاعی کی وفات بڑے دردناک طریقہ سے ہوئی، یہ بیروت میں تھے، ایک دن حمام میں غسل کیلیے گئے، صاحب حمام لاعلمی میں باہر سے دروازہ بند کرکے کہیں چلا گیا، اندر آگ جل رہی تھی، اور باہر سے ہوا جانے کا کوئی راستہ تھا نہیں، اس لیے اسی حالت میں وہ جاں بحق ہوگئے، جب صاحب حمام واپس آیا اور اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ آپ کا داہنا ہاتھ سر کے نیچے ہے اور قبلہ رو فرش زمین پر مردہ پڑے ہیں[1]، یہ حادثہ عظمی صفر یا ربیع الاول ۱۵۷ھ میں پیش آیا،

آپ کی وفات تو بیروت شہر میں ہوئی مگر مدفین بیروت کے باہر ایک موضع خنتوس میں ہوئی، اس بستی کے بارے میں ابن خلکان نے اپنے زمانہ کا حال لکھا ہے کہ اس بستی کے تمام باشندے مسلمان ہیں اور بستی کے خواص تو امام اوزاعی سے واقف ہیں، مگر عوام صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہاں ایک بزرگ کی قبر ہے، ان کی موت پر بعض شعراء نے مرثیے بھی کہے، مرثیہ کا ایک شعر یہ ہے۔

عرضت لك الدنيا فاعرض مقلعا   عنها بزهدك ايما اقلاع

دنیا ان کے سامنے پیش کی گئی مگر انھوں نے زہد و قناعت کی وجہ سے اس سے ہمیشہ گریز کیا، ان کے زہد و قناعت کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ جب انتقال ہوا تو پورا اثاث بیت چند درہم سے زیادہ کا نہیں تھا۔

[illegible] | ابن خلکان نے ان کا حلیہ یہ بتایا ہے، میانہ قد، گندمی رنگ، ہلکی داڑھی جس میں مہندی کا خضاب لگا ہوا تھا[2]۔

---

[1] بعض تذکروں میں ہے کہ آپ کی اہلیہ نے لاعلمی میں دروازہ بند کر دیا تھا،

[2] ابن خلکان جلد ۱ ص ۳۰۹

ادبیات

غلط فہمیاں

از جناب سید اختر علی صاحب تلہری

بندۂ زر کو حرم کا پاسباں سمجھا تھا میں | رہزنِ ملت کو میرِ کارواں سمجھا تھا میں
جو نہیں تھا محرمِ اسرارِ عشقِ پاک ذوق | بدنصیبی سے اسے پیرِ مغاں سمجھا تھا میں
خود پرستی کے نہاں تھے اسکی طینت میں شرار | جس کو فخرِ دودمانِ قدسیاں سمجھا تھا میں
وہ تو نکلا اور بھی اوہام کے زیرِ نگیں | جس کو میرِ مجلسِ دانشوراں سمجھا تھا میں
ایک بجلی ایک آندھی سے جو بچ سکتے نہ تھے | ان خس و خاشاک کو آرامِ جاں سمجھا تھا میں
الاماں یہ میرے ذوقِ معرفت کی گمرہی | ارضِ کعبہ ہی کو اس کا آستاں سمجھا تھا میں
اللہ اللہ یہ فریب وہم کی بازی گری | خاکدانِ دہر کو اپنا مکاں سمجھا تھا میں
اب جو دیکھا تو جہاں کی وسعتیں تھیں بے پناہ | چار دیوارِ عناصر کو جہاں سمجھا تھا میں
تھی وہ اپنے ہی مذاقِ دید کی معجز گری | جس کو رنگینیٔ روئے دلبراں سمجھا تھا میں
ہوش جب آیا تو ان میں بھی نہ پایا کوئی کیف | نغمۂ و مے کو نشاطِ جاوداں سمجھا تھا میں
بال و پر جب ہوگئے بیکار تب آنکھیں کھلیں | وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں
چند نوحے نکلے اسکے زمزموں کی کائنات | عندلیبِ خوش نوا کو نغمہ خواں سمجھا تھا میں

غور سے دیکھا تو نکلے خار بھی جانِ چمن
ان گلوں ہی کو متاعِ گلستاں سمجھا تھا میں

بیگناہوں کے لہو سے تھا وہ یکسر لالہ زار
کوچۂ محبوب کو دارالاماں سمجھا تھا میں

جادۂ عرفاں میں اسکی ضو بکھر کر رہ گئی
عقلِ خود بیں کو چراغِ رہبراں سمجھا تھا میں

اس کے نالوں میں نہیں سوز و گدازِ زندگی
قیس شوریدہ کو اپنا ہم زباں سمجھا تھا میں

اب کھلا یہ بھی ہے حسنِ زندگی کا ایک رخ
عشق کو دل کی متاعِ رائگاں سمجھا تھا میں

حیف اختر یہ بھی نکلا حسرتوں کا اک مزار
اپنے دل کو کامگار و کامراں سمجھا تھا میں

غزل

از جناب شفیق جونپوری

سو گیا راہ میں احساسِ رفیقانہ کہاں
تو ہمیں چھوڑ گیا اے دلِ دیوانہ کہاں

تیرے لائق تھا مرے دل کا یہ غم خانہ کہاں
تو بھی آباد ہوا اے غمِ جانانہ کہاں

میں کہوں قصۂ بے بادہ و میخانہ کہاں
رند ٹکرا کے گئے شیشہ و پیمانہ کہاں

تو تو بہکا ہے لیے جاتی ہے اے یادِ وطن
مجھے ڈھونڈھے گی مری غربتِ ویرانہ کہاں

جلوۂ طور سہی نور سہی حور سہی
جانِ رنداں یہ تری نرگسِ مستانہ کہاں

ہیں غنیمت یہ غریب الوطنی کے دن بھی
پھر بیاباں کے بگولوں سے بھی یارانہ کہاں

وحشتِ غم میں ترا کیا کام تھا اے بادِ بہار
تو ادھر آگئی غارتگرِ ویرانہ کہاں

عالمِ قدس کا انکار نہیں ہے لیکن
اے فرشتو یہ مری لغزشِ مستانہ کہاں

مدتوں اہلِ حرم سے بھی ملاقات رہی
میرے ساقی ترا اندازِ کریمانہ کہاں

ان کا آگاہ نہ ہونا ہی مناسب تھا شفیق
ہائے پہنچا ہے مرے عشق کا افسانہ کہاں

بَابُ التَّقرِیظِ وَالانتِقَاد

"مختصر تاریخ ہند"[1]

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب

مدراس یونیورسٹی ہر سال تامل، تلگو، کنڑی، ملیالم اور ہندی زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی جدید اور سائنٹفک علوم و فنون پر کتابیں اور ترجمے شائع کیا کرتی ہے، یونیورسٹی کی طرف سے اردو کی یہ خدمت قابل قدر ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، سنہ ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے دو آئی سی، اس، ایچ مورلینڈ اور اتل چندر چیٹرجی نے مل کر ایک مختصر تاریخ ہند لکھی تھی جس کے کئی اڈیشن ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئے، گو یہ مختصر تاریخ ہے، پھر بھی زیر نظر ترجمہ ۶۶۰ صفحے پر مشتمل ہے، مترجم ہمارے ادارہ کے سابق رفیق افضل العلماء محمد یوسف کوکن صاحب ام اے ہیں، جو اب مدراس یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار ہیں، ترجمہ بہت ہی رواں سلیس، اور شگفتہ ہے، جس کو پڑھ کر لائق مترجم کی ادبی صلاحیت اور اردو زبان پر غیر معمولی قدرت کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے، وہ خود تو جنوبی ہند کے ہیں لیکن ان کا قلم شمالی ہند کا معلوم

[1] از ایچ مورلینڈ اور اے سی چیٹرجی، مترجم جناب مولوی محمد یوسف صاحب کوکن ایم اے لکچرار اردو، مدراس یونیورسٹی، ضخامت ۶۶۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت ۵ روپے ملنے کا پتہ: مدراس یونیورسٹی، مدراس

ہوتاہے: اس علمی کارنامہ پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، لائق مترجم کو شاید یونیورسٹی کی طرف سے اس ترجمہ پر حواشی اور نوٹ لکھنے کی اجازت نہ تھی، اگر ان کو اجازت ہوتی تو وہ چونکہ خود ایک مندیافتہ عالم، اور اسلامی قوانین و تاریخ کے واقف کار ہیں، اس لیے جابجا حواشی لکھ کر مولفین کی بعض دل آزار باتوں اور غلط بیانیوں کی تردید کرتے جاتے۔ مثلاً صفحہ ۱۶۲ پر ہے "اگر اسلام قبول کرنے سے کوئی انکار کرتا تو تمام بالغ مرد قتل کر دیے جاتے، اور عورتیں بچے غلام بنا لیے جاتے"۔ اسی طرح صفحہ ۱۶۲ پر ہے" اس زمانہ کے مسلمانوں کے نزدیک ہندو مندر یا زیارت گاہ سب سے زیادہ قابل نفرت چیز تھی، جب کبھی موقع ملتا، اس کو ناپاک اور برباد کرنے میں کبھی تذبذب نہیں کرتے تھے، اس سلسلہ میں خواہ مخواہ کی قیاس آرائی کرکے کتاب کے ناظرین کا ذہن یہ لکھ کر مسموم کیا گیا ہے" چونکہ ترک زیادہ گوشت کھانے کے عادی تھے، اس لیے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہر سال گائے اور بیل کی ایک بڑی تعداد ذبح ہو جاتی ہوگی، اگرچہ اس کے متعلق کوئی شہادت نہیں تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ایسا ہونا لازمی تھا" (ص ۱۶۴) ص ۲۸۹ پر اورنگ زیب کے متعلق ہے" وہ خود ایک پکا مسلمان تھا، اور اپنی سلطنت کو اسلامی قوانین کے مطابق چلانا چاہتا تھا، اس نے سیاسی مصلحتوں کا کچھ خیال کیے بغیر اسلامی قانون کو نافذ کیا، اس کی یہ حکمت عملی اس کی سلطنت کی تباہی کا باعث ہوئی"۔ مولفین نے اس مختصر تاریخ ہند میں ایسے تمام واقعات قلمبند کرنے سے گریز کیا ہے جو عام طور سے معلوم ہیں، لیکن اورنگ زیب کے متعلق یہ تحریر میں لانا ضروری تھا کہ اس نے بنارس اور متھرا جیسے مقدس مقامات میں مندروں کے گرانے کی باقاعدہ کوشش کی، اس نے کم از کم ایک مرتبہ ایک مندر کے اندر گائے کو ذبح کیا اور اس مندر کی بے حرمتی کی۔...... ہندوؤں کے خلاف رسواکن قوانین کا نفاذ ہوتا تھا، اور ان کو مذہبی میلوں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی، اور ان کے تہواروں کو گھٹانے کی کوشش

کی جاتی تھی"۔ (ص ۲۹۰)

اورنگ زیب پر اس قسم کے الزامات کی تردید برابر ہوتی رہی ہے، لیکن غیر مسلم مورخین آج سیاسی مصالح کی بنا پر ان کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اورنگ زیب کے ساتھ سیواجی کا ذکر لازمی ہے، لیکن فاضل مولفین نے سیواجی کے ذکر میں اپنی فرض شناسی کا ثبوت یہ لکھ کر دیا ہے کہ ایک مورخ کا فرض ہے کہ سیواجی کے متعلق احتیاط سے کام لے کیونکہ اس کے کارناموں پر جذبات اور تعصب کے پردے پڑ گئے ہیں (ص ۲۹۰)۔ کیا یہی احتیاط اورنگ زیب کے ساتھ روا نہیں رکھی جا سکتی تھی، مؤلفین سیواجی کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ اس کی شخصیت کو چھوڑ کر جس کا مطالعہ اس سے بھی بڑی کتابوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے، ہم صرف اس کے کارناموں کو گنانے کی کوشش کریں گے، اگر یہی رواداری مورخین اورنگ زیب کے لیے اختیار کریں تو شاید اورنگ زیب کو بدنام کر کے ہندو مسلمانوں میں باہم کشیدگی پیدا کرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہو،

یہ عجیب بات ہے کہ ہندوؤں اور انگریزوں کے دور میں ہر طرح کے حکمراں گذرے، بعض ان میں ظالم، سفاک، عیاش اور بدمست بھی تھے، ہندو اور بودھ مذہب میں بڑی کشمکش رہی جس سے بڑے ناخوشگوار واقعات پیش آتے رہے، سانچی اور نالندہ میں اب بھی بودھ مت کے ایسے بہت سے مسخ شدہ بت ہیں جن کو دیکھ کر اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ان کی تذلیل و اہانت کی خاطر ان کو مسمار کرنے کے بجائے مسخ کر دیا گیا ہے، خود بودھ مذہب اسی سرزمین کے لیے اجنبی ہے، جہاں اس کا جنم ہوا،

انگریزوں کے عہد میں ہیسٹنگز، کلائیو، کیننگ، جنرل اوڈائر، ریڈنگ، ولنگڈن، ویول کے زمانے میں ظالمانہ، سفاکانہ اور مکارانہ کارناموں کی ایک طویل داستان ہے، لیکن قدیم ہند

اور برطانوی ہند کی تاریخ قلمبند کرتے وقت دونوں عہد کے صرف روشن پہلو پیش کیے جاتے ہیں، ان دونوں دور کے کسی حکمراں کے متعلق ناروا اور بے جا الفاظ استعمال نہیں کیے جاتے، جیسا کہ زیر نظر تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہے لیکن یہی مؤلفین جب مسلمانوں کے عہد کی تاریخ لکھتے ہیں تو ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دیتے ہیں، اور مسلمان حکمرانوں کے متعلق سخت سے سخت الفاظ استعمال کرنے میں تامل نہیں کرتے، مثلاً محمود غزنوی کے متعلق ہے کہ وہ ظلم و ستم، بے رحمی و سفاکی اور حرص و آز کا پتلا تھا، (ص ۱۹۴) علاء الدین خلجی کے بارہ میں ہے کہ غیر مخلص، بے رحم، مکار اور عیاش تھا، ہند کی تاریخ میں سب سے گھناونا کردار اسی کا نظر آتا ہے" (ص ۱۸۱) بہمنی بادشاہوں کے ذکر میں ہے کہ ان میں اکثر شرابی تھے، بعض تو اتنے عیاش تھے کہ ان کو اپنے حرم سرا کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی، ان میں ایک نے تو سفاکی و خونریزی اور جبر و استبداد میں وہ نام پیدا کیا کہ اس کے نام ہمایوں کے ساتھ ظالم کا لفظ لکھا جانے لگا (ص ۲۰۲) کشمیر کے حکمراں سکندر کے بیان میں ہے کہ وہ آگے چل کر بت شکن کے نام سے مشہور ہوا، اس نے غیر مسلموں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ مسلمان ہو جائیں (۲۱۷) سکندر لودھی نے بھی اپنی سلطنت میں جبری طور پر مذہب اسلام کو فروغ دینے کی کوشش کی (ص ۲۱۷)

انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخوں میں تو یہ زہر چکانیاں سیاسی مصالح کی بنا پر کیجاتی تھیں اور ان سے جو زہریلے اثرات پیدا ہوئے ان سے ہندوستان کو کافی نقصان پہنچا لیکن اب نئے ہندوستان میں اس زہر کا تریاق پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہاں کے مختلف باشندوں کی ذہنی تربیت کا صحیح نشو و نما ہو لیکن ان باتوں کو قطع نظر کر کے اس تاریخ میں بہت سی مفید اور پر مغز معلومات بھی ہیں، لائق مترجم اور مدراس یونیورسٹی کے ارباب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کا ترجمہ کر کے اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

(ص، ع)

مطبوعات جدیدہ

معین العارفین۔ مؤلفہ جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب ضخامت ۲۱۰ صفحے، لکھائی چھپائی، کاغذ بہتر، قیمت فی جلد ۳ روپے، ملنے کا پتہ: شعبۂ تبلیغ و اشاعت، دفتر درگاہ خواجہ صاحب اجمیر شریف۔

یہ ہماری علمی اور مذہبی زندگی کا ایک بہت ہی افسوسناک پہلو ہے کہ فارسی اور اردو دونوں میں سے کسی زبان میں بھی حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحؒ کی کوئی مستند اور جامع سوانحعمری نہیں، ان کے فیوض و برکات سے ہندوستان کی سرزمین نور اسلام سے منور ہوئی، اور سینکڑوں برس سے ان کا مرقد مبارک مرجع خواص و عوام ہے لیکن ان کے حالات زندگی بعض تذکروں کی متضاد روایتوں اور مختلف سنین میں کچھ ایسے گنجلک ہو کر رہ گئے ہیں کہ کوئی ان کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، تو وہ ان میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن خوشی کی بات ہے کہ جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب نے معین الارواح کے دراڈلیشن اور مذکورہ بالا کتاب لکھ کر حضرت خواجہ کے سوانح حیات سنہ وار ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، حضرت خواجہ کے حالات زندگی میں اس پر تو اتفاق ہے کہ ان کا وصال ۶ رجب لمرجب کو ہوا لیکن اس کے علاوہ ان کی زندگی کی کوئی تاریخ ایسی نہیں جو تذکروں میں اختلاف کے ساتھ مرقوم نہ ہو، لیکن جناب خادم حسن زبیری صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے حضرت خواجہ کے تمام واقعات زندگی کو سنین کے ساتھ تطبیق دیا ہے، جس سے نہ صرف حالاتِ زندگی میں ترتیب پیدا ہو گئی ہے، بلکہ ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے لیکن فاضل مؤلف نے سنین کی ترتیب دینے میں قدیم و جدید مستند و غیر مستند تذکروں اور کتابوں کا خیال مطلق نہیں کیا ہے، بلکہ جو بھی تذکرہ یا کتاب ان کے ہاتھ آ گئی اس کا حوالہ دے کر

اپنا مطلب پورا کر لیا ہے۔ یہ انداز تحقیق و تدقیق آج کل بلند معیار پر تو پورا نہیں اترتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ لائق مؤلف نے اس کتاب میں جو محنت و کاوش کی ہے، اس سے حضرت خواجہ کے حالات زندگی پر آئندہ ریسرچ کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، بعض تصانیف حضرت خواجہ کی طرف منسوب ہیں، کچھ مبصروں نے ایسی تمام تصانیف کو جعلی اور فرضی قرار دیا ہے لیکن فاضل مؤلف نے گنج اسرار، انیس الارواح، رسالہ تصوف منظوم، رسالہ آفاق و انفس اور دیوان معین وغیرہ کو حضرت خواجہ ہی کی تصانیف منوانے کی کوشش کی ہے۔ وہ مُصر ہیں کہ مجتبائی پریس کانپور کا چھپا ہوا دیوان معین حضرت خواجہ ہی کا مجموعۂ کلام ہے، وہ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم اور دوسرے محققین کی اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ دیوان مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی والہراتی کا ہے لیکن اس سلسلہ میں فاضل مؤلف نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ بہت زیادہ مسکت اور تشفی بخش نہیں، فاضل مؤلف کو حضرت خواجہ کا جو بھی ملفوظ اور مکتوب کہیں مل گیا ہے، اس کو نقل کر کے ان کی تعلیمات پیش کر دی ہیں، جس سے حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں کے لیے مفید لٹریچر فراہم ہو گیا ہے لیکن ان ملفوظات اور مکتوبات کے مستند ہونے پر کوئی بحث ہوتی تو زیر نظر کتاب اور بھی زیادہ وقیع اور قابل قدر ہو جاتی۔ اس میں سوانح مبارک سیرۃ مقدس کے علاوہ حاضریاں، عمارات، مراسم درگاہ، تصرفات روحانی اور اجمیر کے عنوانات سے کل چھ مفید ابواب ہیں، جن میں لائق مؤلف نے عقیدت مندانہ رنگ کے علاوہ محققانہ اور مورخانہ انداز بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور اب تک حضرت خواجہ پر جتنی سوانح عمریاں شائع ہوئی ہیں ان میں یہ نسبتہً زیادہ جامع اور مفصل ہے، جس کا مطالعہ نہ صرف عام زائرین، بلکہ بزرگانِ دین سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی مفید ہوگا،

اسلام اور ہم (انگریزی) از جناب محمد الیاس برنی صاحب، ضخامت ۲۴۹، تقطیع اوسط،

کتابت، طباعت، کاغذ معمولی، ناشر بیت السلام، سیف آباد، حیدرآباد دکن۔

جناب محمد الیاس صاحب برنی کا قلم ہمہ گیر واقع ہوا ہے، وہ ہر موضوع پر کتابیں لکھکر اپنے ذوق کے تنوع، مطالعہ کی گہرائی اور نظر کی وسعت کا ثبوت دے چکے ہیں، اس علمی ذوق کے علاوہ وہ ایک سچے مومن کی طرح اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھتے ہیں، اس لیے اب زیادہ تر ایسے عنوانات پر کتابیں اور رسالے لکھا کرتے ہیں جن سے مذہب کی اشاعت و تبلیغ ہو، زیر نظر انگریزی کتاب میں بھی یہی دینی جذبہ کارفرما ہے، یہ ۱۹۳۴ء میں جناب عبدالمجید قرشی کی فرمایش پر سیرت کمیٹی کے لیے لکھی گئی تھی، اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ، انبیاء، بنی نوع انسان، عام مخلوقات اور کائنات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات ہیں، ان کو کلام پاک کی آیات کی روشنی میں موثر اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس سے دین اسلام کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہوجاتا ہے، فاضل مولف کا مذہبی جذبہ اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ اس کتاب کی کوئی قیمت نہیں رکھی ہے، اور مفت تقسیم کرنے کا اعلان کیا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں خصوصاً غیر مسلموں تک پہنچائی جائے تاکہ اسلامی تعلیمات کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ ہو۔

سیرت و صورت (انگریزی) مرتبہ قاری سید داؤد الحی ندوی، ضخامت ۳۰ صفحے،

کتابت، طباعت و کاغذ بہتر، ناشر مجلس سیرت، ۱۰۲، اتن تن پورہ اسٹریٹ، بمبئی۔

بمبئی کی مجلس سیرت، اسلام کی خدمت کی خاطر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، زیر نظر رسالہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، فضائل اور شمائل کو انگریزی زبان میں مختصر لیکن جامع طریقہ پر قلمبند کیا گیا ہے، جس سے اسلام کی پوری تعلیم بھی واضح ہوجاتی ہے، انگریزی دانوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا، بمبئی کے ارباب ثروت نے اس مجلس کی سرپرستی کی تو امید ہے کہ یہ اس قسم کی علمی و تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے گی۔

Bibliography of Iqbal - مرتبہ جناب عبد الغنی و جناب خواجہ نور الٰہی، ضخامت ۱۷۰ صفحے، کتابت، طباعت، کاغذ بہتر، قیمت عہ ناشر بزم اقبال۔ ۲ - نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور۔

اس رسالہ میں ڈاکٹر اقبال کی تمام تصانیف کے علاوہ ان کتابوں اور مضامین کی بھی فہرست ہے جو اس شاعر اعظم پر وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں، یہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے لائق مطالعہ ہے، لیکن مرتبین نے زیادہ محنت و کاوش سے اس کو مرتب نہیں کیا ہے، اردو میں اقبال پر بکثرت مضامین لکھے گئے ہیں، ان میں سے بہت سے مضامین کا حوالہ اس فہرست میں نہیں، تعجب ہے کہ دار المصنفین کی شائع شدہ کتاب اقبال کامل مؤلفہ جناب مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا بھی ذکر نہیں، معارف میں ڈاکٹر اقبال پر بہت سے اہم مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، مرتبین کو شاید ان کی خبر نہیں، اس لیے ان کو بھی نظر انداز کر دیا ہے، امید ہے کہ اس رسالہ کا آئندہ اڈیشن پوری محنت اور توجہ کے ساتھ مرتب کیا جائے گا، تاکہ اس میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔

Atomic Power for Peace - از ڈی۔ ڈی آئزن ہور، ضخامت ۱۶ صفحے: ناشر یونائیٹڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس

اس رسالہ میں امریکہ کے صدر آئزن ہور کا وہ خطبہ ہے جو دسمبر ۱۹۵۳ء میں ادارہ اقوام متحدہ کے عام اجلاس میں دیا گیا تھا، اس میں چار نکاتی پروگرام ہے، جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ایٹمی طاقت کا مصرف کس طرح پر امن تعمیری کاموں میں لیا جا سکتا ہے، صدر امریکہ نے یہ پیام دیا ہے کہ اس طاقت کے ذریعہ سے انسانی ذہن و اختراع ہلاکت کے بجائے زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرے جو ہر طرح ممکن ہے۔

(ص، ع)

مکتبۂ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخِ اسلام (حصّہ اوّل) عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ یعنی آغازِ اسلام سے لیکر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخِ اسلام (حصّہ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت [illegible]

تاریخِ اسلام (جلد سوم) (خلافتِ عباسیہ) یعنی ابو العباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخِ اسلام (جلد چہارم) (خلافتِ عباسیہ دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیوں کے تمدنی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلی تینوں سے کہیں زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت : [illegible]

نئی کتابیں

تاریخِ سندھ سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی تاریخ :- قیمت : ۶ر (چھ روپیے)

اقبالِ کامل ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، [illegible]

بزمِ تیموریہ تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت [illegible]

امام رازی امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات انکی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت [illegible]

بزمِ صوفیہ عہدِ تیموریہ سے پہلے کے صاحبِ تصنیفات صوفیہ کرام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی خواجہ نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت [illegible]

تاریخِ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ کیساتھ اندلس کی تمدنی تاریخ، قیمت [illegible]

ابل بک آف حیات العین سیرت مصطفیٰ ان کتاب کا جیب کا تذکرہ [illegible]

مصنفین کی نئی کتابیں

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزم تیموریہ کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے، ان سے پہلے کے مسلمان حکمران خانوادوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور ان کے عہدوں سے متوسل علماء، مشائخ، ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء و شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدان جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی، اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، عمید الدین سنامی، شمس دبیر، امیر خسرو، اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے ممتاز مگر روزگار شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظر عام پر لایا گیا ہے، ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمال فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے قیمت عہ

مآل و مشیئت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی تصورات مآل و مشیئت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انہی دونوں موضوع پر سلسلہ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحوں میں پوری بحث پر تبصرہ ہے، (صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالات روسو)

قیمت عہ

(طابع و ناشر صدیق احمد)

ستمبر سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

(۱) جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی	صدر
(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی،	رکن
(۳) جناب ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی،	״
(۴) جناب مولانا عبد السلام صاحب ندوی	״
(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی	مرتب
(۶) سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے	شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن وتہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات ونتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ کی پر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: سے ؎

حکمائے اسلام جلد اول

دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکما کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکمائے فلسفہ سے مذہب کی تخریب بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید وحمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبد السلام ندوی)

قیمت: صعہ ؎

جلد ۷۶ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء عدد ۳

مضامین

مقالات

اثار علمیہ تاریخیہ

ادبیات

شذرات

ہندوستان و پاکستان کی علمی دنیا کا یہ بڑا افسوسناک سانحہ ہے کہ گذشتہ مہینہ مشہور صاحب علم و قلم قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ اسلامی علوم کے ممتاز فاضل تھے، خصوصاً اسلامی تاریخ پر انکی نظر نہایت وسیع تھی، اور ان کا علمی و تحقیقی مذاق بہت بلند تھا، عربی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں دستگاہ حاصل تھی، اور تینوں میں مضامین لکھتے تھے، ان کے مضامین ہندوستان و پاکستان کے تمام سنجیدہ علمی رسالوں میں نکلتے تھے، معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، ان کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا ہے، اقبال پر ان کی ایک کتاب حال ہی میں چھپی ہے، دار المصنفین سے بھی ان کی ایک کتاب ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم کا ترجمہ عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے، اگر ان کے مضامین جمع کیے جائیں تو کئی جلدوں میں آئیں گے۔

مرحوم ریاست جوناگڈھ کے جاگیردار تھے، وہاں کے انقلاب میں لٹ لٹا کر بڑی مصیبتوں سے کراچی پہنچے، کچھ دنوں تک انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے، اس کے بعد سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہو گئے تھے، طبعاً نہایت شریف، متواضع اور خاکسار تھے، دار المصنفین سے انکا تعلق بڑا پرانا اور مخلصانہ تھا، ابھی انھوں نے پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کی بیلائسنس دلانے میں بڑی مدد کی تھی، اب اس زمانہ میں ایسے صاحب کمال کی جگہ کا بھرنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے، انتقال کے وقت ۷۰ سال سے اوپر کی عمر رہی ہو گی،

دوسرا حادثہ مولانا عبد الحق صاحب مدنی کی وفات کا ہے، وہ ہندوستان کے ممتاز علما میں تھے، انکی پیدائش، تعلیم و تربیت اور نشو و نما مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی، اس لیے مدنی کہلاتے تھے، دینی علوم میں مہارت کے علاوہ عربی زبان و ادب

میں اہل زبان کی سی بصیرت حاصل تھی، مراد آباد کی شاہی مسجد کے مشہور مدرسہ میں درس و اہتمام کی خدمت انجام دیتے تھے، اور اب یہ مدرسہ ان ہی کی بدولت چل رہا تھا، اللہ تعالیٰ دینی علوم کے اس خادم کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز فرمائے، اب زمانہ کے اثر سے ہماری دینی درسگاہوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے؛ اور نئے علماء میں وہ روح نہیں پیدا ہوتی جو پرانے علماء کا طغرائے امتیاز تھی، اس لیے ان میں جو یادگار مٹ جاتی ہے اس کا بدل نہیں پیدا ہوتا،

بالآخر گاؤکشی کا بل اس صوبہ میں پاس ہوگیا، اس کارنامہ کی توقع اسی حکومت سے ہوسکتی تھی جس کے ہاتھ اردو کے خون اور مسلمانوں کی حق تلفی سے رنگین ہیں، چنانچہ گاؤکشی کے قانونی انسداد کا سہرا بھی اس کے سر رہا اور ابھی

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے یوں بھی گاؤکشی قریب قریب بند ہوچکی تھی، اس لیے اس قانون کی ضرورت ہی نہ تھی، لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دنیا کی نگاہوں میں نام نہاد سرکلرزم کا پردہ پوری طرح فاش ہوگیا، محض الفاظ کے طلسم سے حقیقت نہیں چھپ سکتی، ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس کے بعد ان سب جانوروں کو بھی جنھیں .... ہندو مذہب میں تقدس کا درجہ حاصل ہے، مارنا ممنوع قرار دیا جائے تاکہ پھر کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ باقی نہ رہے،

ہالینڈ استشراق کا پرانا مرکز ہے، وہاں کے فضلاء نے اسلامیات پر بڑا کام کیا ہے، اور اسلامی علوم و فنون کی بیشتر اہم قدیم اور نادر کتابیں ان ہی نے تلاش کرکے بڑے اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کی ہیں، وہاں اسلامی انسائیکلوپیڈیا بھی مرتب کی گئی تھی، اب اس کے نئے اڈیشن کی اشاعت کے لیے اس پر نظر ثانی کی جارہی ہے، ہم کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ نظر ثانی کرنیوالوں میں ایک بھی مسلمان نہیں، سب کے سب عیسائی، یہودی اور بعض اسرائیلی یہودی ہیں. جن کی اسلام دشمنی

شذرات

ہندوستان وپاکستان کی علمی دنیا کا یہ بڑا افسوسناک سانحہ ہے کہ گذشتہ مہینہ مشہور صاحب علم وقلم قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ اسلامی علوم کے ممتاز فاضل تھے خصوصاً اسلامی تاریخ پر انکی نظر نہایت وسیع تھی اور ان کا علمی وتحقیقی مذاق بہت بلند تھا، عربی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں دستگاہ حاصل تھی، اور تینوں میں مضامین لکھتے تھے، ان کے مضامین ہندوستان وپاکستان کے تمام سنجیدہ علمی رسالوں میں نکلتے تھے، معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، ان کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا ہے، اقبال پر ان کی ایک کتاب حال ہی میں چھپی ہے، دار المصنفین سے بھی ان کی ایک کتاب ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم کا ترجمہ مدت ہوا شائع ہو چکی ہے، اگر ان کے مضامین جمع کیے جائیں تو کئی جلدوں میں آئیں گے۔

مرحوم ریاست جوناگڈھ کے جاگیردار تھے، وہاں کے انقلاب میں لٹ لٹا کر بڑی مصیبتوں سے کراچی پہنچے، کچھ دنوں تک انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے، اس کے بعد سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہو گئے تھے، طبعاً نہایت شریف، متواضع اور خاکسار تھے، دار المصنفین سے انکا تعلق بڑا پرانا اور مخلصانہ تھا، ابھی انھوں نے پاکستان میں دار المصنفین کی کتابوں کیلئے لائسنس دلانے میں بڑی مدد کی تھی، اب اس زمانہ میں ایسے صاحب کمال کی جگہ کا بھرنا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے، انتقال کے وقت ۷۰ سال سے اوپر کی عمر رہی ہو گی،

دوسرا حادثہ مولانا عبد الحی صاحب مدنی کی وفات کا ہے۔ وہ ہندوستان کے ممتاز علما میں تھے، انکی پیدائش، تعلیم وتربیت اور نشو ونما مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی، اس لیے مدنی کہلاتے تھے، دینی علوم میں مہارت کے علاوہ عربی زبان وادب

میں اہل زبان کی سی بصیرت حاصل تھی، مرادآباد کی شاہی مسجد کے مشہور مدرسہ میں درس و اہتمام کی خدمت انجام دیتے تھے، اور اب یہ مدرسہ ان ہی کی بدولت چل رہا تھا، اللہ تعالیٰ دینی علوم کے اس خادم کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز فرمائے، اب زمانہ کے اثر سے ہماری دینی درسگاہوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے اور نئے علما میں وہ روح نہیں پیدا ہوتی جو پرانے علما کا طرہ امتیاز تھی، اس لیے ان میں جو یادگار مٹ جاتی ہے اس کا بدل نہیں پیدا ہوتا،

بالآخر گاؤکشی کا بل اس صوبہ میں پاس ہوگیا، اس کارنامہ کی توقع اسی حکومت سے ہوسکتی تھی جس کے ہاتھ اردو کے خون اور مسلمانوں کی حق تلفی سے رنگین ہیں، چنانچہ گاؤکشی کے قانونی انسداد کا سہرا بھی اس کے سر رہا اور ابھی

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے یوں بھی گاؤکشی قریب قریب بند ہوچکی تھی، اس لیے اس قانون کی ضرورت ہی نہ تھی، لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دنیا کی نگاہوں میں نام نہاد سیکلرزم کا پردہ پوری طرح فاش ہوگیا، محض الفاظ کے طلسم سے حقیقت نہیں چھپ سکتی، ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس کے بعد ان سب جانوروں کو بھی جنھیں .... ہندو مذہب میں تقدس کا درجہ حاصل ہے، مارنا ممنوع قرار دیا جائے تاکہ پھر کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ باقی نہ رہے،

ہالینڈ استشراق کا پرانا مرکز ہے، وہاں کے فضلاء نے اسلامیات پر بڑا کام کیا ہے، اور اسلامی علوم و فنون کی بیشتر اہم قدیم اور نادر کتابیں ان ہی نے تلاش کرکے بڑے اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کی ہیں، وہاں اسلامی انسائیکلوپیڈیا بھی مرتب کی گئی تھی، اب اس کے نئے اڈیشن کی اشاعت کے لیے اس پر نظر ثانی کی جارہی ہے، ہم کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ نظر ثانی کرنیوالوں میں ایک بھی مسلمان نہیں، سب کے سب عیسائی، یہودی اور بعض اسرائیلی یہودی ہیں، جن کی اسلام دشمنی

معلوم و مسلّم ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں میں اسلامیات کے بہت سے ماہر موجود ہیں، لیکن وہ اسلامی تاریخ اور مذہب اسلام کے بعض پہلوؤں پر صحیح نقطۂ نظر سے سوچ ہی نہیں سکتے، اسی لیے ان کی تحقیق اور ان کو پیش کرنے میں اکثر فاش غلطیاں کرتے ہیں جس کی مثالیں پہلے اڈیشن میں موجود ہیں، اس لیے ان کی تصحیح کے لیے کسی مسلمان فاضل کا رکھنا ضروری ہے، دوسرے اسلامی اداروں کو بھی حسب ذیل پتہ پر اس کی جانب توجہ دلانا چاہیے۔

Dr. N. W. Posthumus

E. J. Brill's Boekhandel

Leyden, Holland

سیرت سلیمانی کے متعلق استفسار کے خطوط برابر آتے رہتے ہیں، اس کی تالیف میں عرصہ لگنا، اس لیے جن لوگوں کو اس کا زیادہ اشتیاق تھا، ان کی تشفی کے لیے معارف سلیمان نمبر نکالنا ضروری تھا، اب انشاء اللہ جلد ہی سیرت سلیمانی شروع کرنے کا ارادہ ہے، اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے احباب اور متوسلین خاص سے بھی مشورہ کیا جائیگا، اور اگر ضرورت ہوئی تو قلمی مدد بھی لیجائیگی،

شمس الائمہ سرخسی کی اصول سرخسی، اصول فقہ کی اہم اور نادر کتابوں میں ہے، مولانا ابوالوفا صاحب ناظم لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے کئی نسخوں کی مدد سے اس کی تصحیح و مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اور ادارۂ مذکور نے بڑے اہتمام سے مصر میں چھپوا کر دو جلدوں میں شائع کی ہے، جن شائقین کو اس کی تلاش ہو وہ مذکورۂ بالا پتہ سے طلب کریں۔

مقالات

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کی فوج
میں
سوارون کا نظام

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم، اے

(۲)

تیمور کے سوار جب یہ سوار میدان جنگ میں آتے تو لڑائی کے وقت اسی تہور، طیش اور غضب کا مظاہرہ کرتے جس کے لیے تاتاری اور تیموری سوار مشہور تھے، تیمور کی ساری کشور کشائی اس کے بہادر سواروں ہی کی بدولت تھی، اس کے لشکر میں سواروں کی تنظیم بہت ہی اعلیٰ پیمانہ پر تھی، اس کے ہر امیر کو سو سو گھوڑے رکھنے کا حق تھا، اون باشی دس سپاہیوں کا سردار، یوز باشی سو سپاہیوں کا افسر اور مینک باشی ایک ہزار سپاہیوں اور امیر الامرا، دس ہزار سپاہیوں کے سردار ہوتے تھے، بعض سوار بازو پر آہنی سپر اور ہاتھ میں پانچ فٹ کا لمبا نیزہ رکھا کرتے تھے. وہ جب غنیم کی تعداد زیادہ دیکھتے تو ان کے سردار یہ کہہ کر ہمت دلاتے کہ اگر تم نے ان پر حملہ نہیں کیا تو پھر ان کے گھوڑے اور گھوڑون کی زینیں کیونکر ہاتھ آئیں گی، وہ حملہ کرتے وقت اتنے زور سے سورن (جنگی نعرے) لگاتے کہ ساری فضا میں لرزہ پیدا ہو جاتا، وہ پہاڑوں پر ہاتھوں میں سپر اور دوش پر کمان لٹکائے

کیڑوں کی طرح رینگتے نظر آتے، اور چٹانوں کے گوشوں اور ریخوں پہ پاؤں جماتے اوپر چڑھ جاتے، اور پہاڑ سے اتر کر نشیب میں اس طرح پھیل جاتے جیسے مٹی کے ڈھیر پر چیونٹیاں پھیل جاتی ہوں، پیدل اور بعض اوقات گھوڑوں سے اتر کر ان کی پیٹھ کی آڑ لے کر دشمنوں پر تیر چلاتے، تیمور بھی ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی پامردی سے لڑتا، ایرانیوں کے خلاف جب معرکہ آرا ہوا تو شاہ ایران منصور اس کے گھوڑے کی طرف بڑھا، تیمور نے یہ دیکھ کر اپنے نیزہ بردار سے نیزہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن نیزہ بردار پر غنیم نے اس طرح حملہ کر دیا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا، اور تیمور کو نیزہ نہ ملا، اس وقت اس کا ہاتھ تلوار کی طرف بڑھا، لیکن ابھی وہ تلوار کھینچنے نہ پایا تھا کہ شاہ منصور اس کی طرف جھپٹا، اور اس کے سر پر دو وار کیے، تیمور نے سر پھیر لیا، منصور کی تلوار اس کے خود کو چھوتی ہوئی نکل گئی، اور خود سر سے گر کر تیمور کی گود میں آپڑا، مگر وہ خود گھوڑے پر بالکل بے حس و حرکت بیٹھا رہا، یکایک ایک تاتاری سردار اپنا گھوڑا تیمور اور منصور کے گھوڑوں کے بیچ میں لے آیا، جس سے شاہ منصور کو پیچھے ہٹنا پڑا،[1]

ہندوستان میں تیمور محمود تغلق کے خلاف صف آرا ہوا، تو اس کے سوار محمود کے لشکر کے کوہ پیکر ہاتھیوں اور ان کے اژدہا نما سونڈوں سے بے حد ہراساں تھے، ان کو خبر ملی تھی کہ ہندوستان کے جنگی ہاتھی گھوڑوں اور سواروں کو سونڈ میں لپیٹ کر ہوا میں پھینک دیتے ہیں، اور زمین پر دے مارتے ہیں، اور ان پر تیر و شمشیر مطلق کام نہیں کرتے، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو تیمور کے سواروں نے نڈر ہو کر ہاتھیوں پر حملہ کیا، اور ان کو گائے کی طرح ہر طرف دوڑا کر پریشان کر ڈالا، ظفر نامہ میں ہے:

"پیلان را باآں شکوہ ہیبت گاؤ صفت می راندند" (ج ۲ ص ۱۰۴)

محمود کے قلب لشکر میں ہاتھی ہی ہاتھی تھے، لیکن تیموری سواروں نے ان پر حملہ کر کے ان قوی ہیکل

---

[1] ظفر نامہ ج ۱ ص ۶۱۰ - ۶۱۲

جانوروں اور ان کے مہاوتوں کو تلواروں اور نیزوں سے مار مار کر ڈھیر کر دیا، ظفر نامہ میں ہے:

"در میان آن نہنگان بے ستون ہیکل بچہار ستون رواں در آمدند و پیلبانان را از ظہر آن کوہہا نگونسار ساختند، و بہ تبر و شمشیر خرطوم آں … اخلقت پیلان را مجروح می گردانیدند و می انداختند"۔

اسی لڑائی میں تیمور کے پندرہ سالہ شہزادہ خلیل سلطان نے ہاتھی کے مقابلہ میں بڑی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا، اور اپنی مردانگی اور شمشیر زنی سے ایک فیل بان کو مار کر اور ایک عظیم الجثہ ہاتھی کو گھیر کر تیمور کے پاس اس طرح لے آیا جیسے کوئی دہقانی بھینس کو ہانک کر لاتا ہو، ظفر نامہ کے مؤلف نے اس واقعہ کو قلمبند کر کے کچھ اشعار بھی لکھے ہیں۔

…خیال ازیں چہ باشد دلیل — کہ طفلے ز خیلش سگالد بہ پیل
کجا بود شہزادۂ ارجمند — ہم از پانزدہ سالگی پیل بند
ہنوز از لبش می دہد بوے شیر — چو شیراں کند پیل جنگی اسیر[1]

بابر کے سوار | بابر ہندوستان آیا تو اس کے پاس بہت تھوڑی سی فوج تھی جس میں زیادہ تر توپچی اور سوار تھے، لیکن سواروں میں وہ تمام جنگی مہارت و تنظیم اور حربی چستی و چالاکی موجود تھی، جو لڑائی کے لیے ضروری ہے، رانا سانگا کنواہہ کے میدان میں دو لاکھ دس ہزار فوج لیکر اترا تھا جس میں تقریباً ستر ہزار سوار تھے، اس کے مقابلہ میں بابر کے پاس کل آٹھ ہزار فوج تھی لیکن وہ اپنے توپچیوں کی مستعدی اور ثابت قدمی اور اپنے سواروں کی تیز گامی اور قواعد دانی سے راجپوتوں کے انبوہ پر غالب آیا، آغاز جنگ سے پہلے بابر نے سواروں کے ایک چھوٹے دستہ کو غنیم کی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے بھیجا جس سے ایک ہلکی سی جھڑپ ہو گئی، اور جب یہ سوار اپنے

---

[1] ظفر نامہ ج ۲ ص ۱۰۸

نیزوں پر غنیم کے سر لاتے دکھائی دیے تو بابر کی پوری فوج کی ہمت بڑھ گئی، ان کو ایسا معلوم ہوا کہ فتح و کامرانی ان کے قدموں کو چومنے کی منتظر ہے، میدان جنگ میں بابر نے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ دائیں اور بائیں طرف بالکل کنارے یعنی تولقمہ اوج جوا نغار اور تولقمہ اوج بر انغار پر سواروں کے منتخب اور چیدہ دستے کو کھڑا کیا اور اپنے قول کے راست وچپ توپوں کے ارابے کے پیچھے خاصہ کے شیر دل سواروں کی ایک صف ترتیب دی، جب لڑائی شروع ہوئی تو تولقمہ کے تیز گام اور برق رفتار سوار حلکہ کاٹ کر راجپوتوں کے عقب اور پہلو میں پہنچ گئے، اور ان کو نیزوں اور تلواروں سے ڈھکیل ڈھکیل کر توپوں کی زد میں لے آئے، اس طرح ہر بازو کے راجپوت سپاہی اپنی صفیں توڑ توڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے جس سے بابر کے گولہ اندازوں کو ان پر آتشیں گولوں کی بارش کرنے میں آسانی ہوئی، اور جب ساری راجپوت فوج گڈمڈ ہو گئی تو ارابے کے پیچھے سے بابری سوار کود کود کر آگے بڑھے، راجپوتوں کو اپنی کثرت کی وجہ سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا دشوار ہو گیا، پھر تو بابر کے تفنگچیوں اور سواروں نے مل کر راجپوتوں کو ڈھیر کر دیا۔[1]

بابر میں اپنی سپاہ کو حرکت میں لانے کی حیرت انگیز قابلیت تھی، لڑائی سے متعلق جتنی باتیں ہوتیں ان کو ذہن میں رکھتا، اور اپنے سرداروں کو طلب کر کے ان سے امور و طریقۂ جنگ پر بحث کرتا، پھر میدان جنگ میں تمام لشکریوں کو مل کر اس طرح کام کرنے پر آمادہ کرتا جس طرح شہد کی مکھیاں مل کر کام کرتی ہیں، چنانچہ جس کے ذمہ جس قدر کام ہوتا وہ اسے کامل طور پر انجام دیتا تھا، اور اگر کوئی لشکری اپنے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کرتا تو اس سے گھوڑے اور اسلحہ چھین لیے جاتے،[2] یا وہ اپنے عہدہ سے محروم کر دیا جاتا، یا اس کی داڑھی منڈوا کر اس کو سارے لشکر میں گھما کر ذلیل و رسوا کیا جاتا،[3] سنگین سزا میں ناک کٹوا دی جاتی،[4] غداری کی سزائیں تو اور بھی سخت ہوتیں، غدار

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو بابر نامہ ص ۳۱۴ [2] بابر نامہ ص ۲۱۲ [3] ایضاً [4] ایضاً

کو سر بازار قتل کر دینے کا حکم ہوتا،[۱] اگر لشکری کسی معرکہ میں بزدلی اور بزدلی کا اظہار کرتے تو بابر انکے سامنے موثر تقریریں کر کے ان کی غیرت و حمیت کو ابھارتا کہ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے، وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، اور جو دنیا میں آیا ہے وہ یہاں سے جائے گا، بدنام ہو کر جینے سے نیکنام ہونا بہتر ہے،[۲]

بابر خود ایک بڑا اچھا شہسوار اور دلیر سپاہی تھا، اس نے ۱۹ سال کی عمر میں ۲۴۰ سواروں کی مدد سے سمرقند فتح کیا، تنہا پانچ پانچ سواروں کا مقابلہ کر کے ان کو زمین پر گرا کر ڈھیر کر دیتا، دونوں بازوؤں میں ایک ایک آدمی کو دبا کر ایک کنگرہ سے دوسرے کنگرہ پر جست کر جاتا،[۳] ان سپاہیانہ اوصاف کے علاوہ ایک فوجی قائد کی جتنی خوبیاں کسی میں ہوسکتی ہیں، وہ سب اس میں موجود تھیں، سخت سے سخت مشکلات میں وہ مطلق نہیں گھبراتا، اور انتہائی صبر و سکون سے حالات کا مقابلہ کرتا، ۹۰۸ھ ۱۵۰۲ء میں اندجان (فراغنہ) پر یورش کی تو ایک موقع کی جنگ کا حال اس طرح لکھتا ہے:

"شاید تین پہر رات گزری ہوگی کہ ایک دفعہ ہی غل غپاڑے کے ساتھ طبل جنگ کی آواز آئی، ہمارے ساتھی نیند میں تو تھے ہی، انھوں نے دشمنوں کی کمی بیشی پر خیال کیا، اور نہ ایک دوسرے کی خبر لی، دفعۃً سب کے سب بھاگ نکلے، مجھے بھی اتنی فرصت نہ ملی کہ ان لوگوں کو اکٹھا کروں، مگر میں باغیوں کی طرف چلا، میر شاہ قوچین، بابا شیرزاد، اور دوست ناصر میرے ساتھ تھے، ہم چاروں کے علاوہ سب بھاگ گئے، ہم تھوڑی دور آگے چلے تھے کہ وہ لوگ تیر مارتے اور غل مچاتے ہوئے ہم پر آ پڑے، ایک سوار جو قشقہ گھوڑے پر تھا، میرے قریب آ گیا، میں نے ایک تیر مارا، تیر گھوڑے کے لگا، گھوڑا فوراً مرگیا، وہ لوگ ذرا ٹھہر گئے، یہ تینوں آدمی جو میرے ہمراہ تھے کہنے لگے کہ اندھیری

۱؎ بابر نامہ ص ۲۱۲ ۲؎ ایضاً ص ۳۰۹ ۳؎ طبقات اکبری جلد ۲ ص ۲۷

رات ہے، دشمنوں کی تعداد معلوم نہیں، اور سارا لشکر بھاگ گیا، ہم چار کتنے آدمی مار سکیں گے، یہاں سے چل دیجئے، پہلے بھاگے ہوؤں کو سمیٹئے، اور پھر لڑیے، ہم دوڑے اور اپنے لوگوں میں پہنچے، ہر چند ڈنکا چابک تک مارے اور ٹھہرانا چاہا مگر کوئی نہ ٹھہرا، آخر ہم ہی چاروں الٹے پھرے، اور تیر مارنے لگے، ادھر والے ذرا ٹھہر گئے، جب دو ایک دفعہ ہم کو انھوں نے دیکھا کہ تین چار آدمیوں سے زیادہ نہیں ہیں تو پھر وہ ہمارے تعاقب میں اور گرانے میں مشغول ہوئے، اسی طرح تین چار دفعہ اپنے لوگوں کو میں نے ٹھہرانا چاہا، جب کوئی نہ رکا تو ناچار ان ہی تینوں کے ساتھ لپٹ کر ایسے تیر مارے کہ دشمنوں کا منہ پھیر دیا۔" (ص ۱۰۶ - ۱۰۵)

اس جنگ میں اس کو مراجعت کرنی پڑی، لیکن دوسرے سال اندجان (فراغنہ) پر پھر چڑھائی کی اور اس موقع پر جس جرأت اور پامردی سے لڑا اس کو پھر بیان کرتا ہے،

...... میرے سامنے جو دو آدمی آئے، ان میں ایک تنبل تھا، وہ بھی آگے بڑھا، بیچ میں ایک شاہراہ کے اس جانب سے اور وہ اس طرف سے آیا، یہیں ہم دونوں کا مقابلہ یوں ہوا کہ میرا سیدھا ہاتھ دشمن کی طرف اور تنبل کا سیدھا ہاتھ میری طرف ہو گیا، تنبل کے پاس گھوڑے کی زرہ کے علاوہ سارا سامان جنگ تھا، میرے پاس تلوار اور تیر کمان کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے کمان کو کان تک کھینچ کر ایک تیر جو میرے ہاتھ میں تھا، تنبل کو مارا، اس وقت ایک تیر شیبہ میری سیدھی ران میں لگا اور آرپار ہو گیا، میرے سر پر لوہے کی ٹوپی تھی، تنبل نے جھپٹ کر تلوار کا ایک ایسا ہاتھ اس پر مارا کہ میرا سر سن ہو گیا، اگرچہ ٹوپی کا تو ایک تار نہ کٹا، مگر میرا سر اچھی طرح زخمی ہو گیا، میں نے تلوار صاف نہ کی تھی، وہ کسی قدر زنگ آلود تھی، اس کے نکالنے کی مہلت نہ ملی، میں بہت سے دشمنوں میں اکیلا گھر گیا۔" (ص ۱۰۹ - ۱۰۸)

وہ اکیلا گھرا ہوا تھا، لیکن پھر بھی اس کے دشمن اس کو زیر نہ کر سکے، وہ ہمیشہ سر کف ہو کر

میدان جنگ میں اترتا، ۱۵۱۹ء میں ہزارہ ترکمانوں کے خلاف جنگ کی تو لکھتا ہے:

"......محمد علی مبشر بیگ میرے ان امیروں میں تھا جن کو میں نے بنایا تھا، بڑا بہادر اور نہایت عمدہ سپاہی تھا، جہاں دشمنوں نے لکڑیاں ڈال رکھی تھیں، اس طرف بڑھا، دشمنوں نے اس کی گردن میں تیر مارا جس سے وہ فوراً ہلاک ہوگیا، چونکہ ہم نے حملہ کرنے میں بہت جلدی کی تھی، اس لیے اکثر جیبہ پہنے ہوئے نہ تھے، دو ایک تیر میرے سر پر سے بھی گذرتے ہوئے گرے، احمد یوسف بیگ بار بار گھبرا کر چلاتا تھا کہ یوں ننگے کیوں گھسے جاتے ہو، میں نے دو تین تیر تمہارے سر پر سے جاتے ہوئے دیکھے ہیں، میں نے کہا گھبراؤ نہیں، ایسے تیر بہت سے میرے سر پر سے گذر گئے ہیں" (ص ۱۲۵-۱۲۴)

بابر کی اسی سرفروشی اور جانبازی کو دیکھکر اس کے ہمراہی سوار اور لشکری اس کے ساتھ جلتی ہوئی آگ اور بہتے ہوئے پانی میں کودنے کے لیے تیار رہتے، اور جہاں اس کا پسینہ گرتا وہاں وہ اپنا خون بہاتے۔[1]

اکبر کے سوار بابر کی شجاعت، جانبازی اور پامردی اس کے جانشینوں کو بھی وراثت میں ملی تھی، اکبر شہسواری کے فن میں طاق تھا، وہ دن دن بھر گھوڑے کی پیٹھ پر رہتا اور مطلق نہ تھکتا، اس نے ایک بار آگرہ سے اجمیر تک ۱۰۰ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کی، اور پھر دو تین دن واپس بھی ہوگیا[2]، وہ میدان جنگ میں تھوڑے سے سواروں کے ساتھ یورش کرتا تو صف اعدا میں کھلبلی مچ جاتی، ۱۵۷۳ء میں جب وہ محمد حسین مرزا گجراتی کے خلاف معرکہ آرا ہوا، تو محمد حسین مرزا کی طرف شاہ مرزا، اختیار الملک، رہبہ اور حبشیوں اور گجراتیوں نے یلغار پر حملہ کر کے لڑائی کی آگ مشتعل کردی، فریقین ایک دوسرے سے دست بگریباں تھے کہ اکبر نے

---

[1] بابرنامہ ص ۲۹۲ [2] اکبرنامہ ج ۳ ص ۱۵۱

ایک خشم ناک شیر کی طرح اپنے سو سواروں کے ساتھ محمد حسین مرزا پر حملہ کیا، محمد حسین مرزا اکبر کا نام سنتے ہی بدحواس ہوگیا، اور میدان جنگ سے بھاگا، پھر بھی اس کے چہرہ پر زخم لگا، اور اس کا گھوڑا بھی گھائل ہوا، زقوم کی ایک جھاڑی راستہ میں ملی، اس نے اپنے گھوڑے کو جست کرانا چاہا، مگر وہ زخمی ہونے کی وجہ سے جست نہ کرسکا، اور ٹھوکر کھاکر گر پڑا، اور شاہی لشکریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا، اس کی پسپائی دیکھ کر اس کے فوجی سرداروں نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ میدان جنگ سے بھاگ نکلیں،[1]

اس سے پہلے ۹۷۹ھ میں اکبر کھمبائت میں تھا کہ اس کو ابراہیم حسین مرزا کی مفسدانہ کارروائی کی خبر ملی، اس نے فوراً اپنے لشکر کا انتظام شاہزادہ سلیم، خواجہ جہاں اور قلیچ خان کے سپرد کیا، اور خود ۱۵۰ سواروں کی قلیل تعداد لے کر ابراہیم حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگیا، راجہ مان سنگھ، راجہ بھگوان داس، سید محمد خان اور شاہ قلی خاں جیسے آزمودہ کار اور چالاک سوار اس کے ساتھ تھے، قصبہ سترپال کے پاس دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی، ابراہیم حسین مرزا کے کثیر التعداد سواروں نے حملہ کرکے شاہی تیراندازوں کو درہم برہم کردیا، اکبر فوج کی کمی کی وجہ سے راجپوتوں کے ساتھ ایک ایسی تنگ جگہ پر کھڑا تھا جس کے دونوں طرف زقوم کی جھاڑیاں تھیں، اور تین سواروں سے زیادہ اس جگہ پہلو بہ پہلو کھڑا ہونا ممکن نہ تھا، حریف کے تین سوار آہستہ آہستہ اس جگہ آئے، جہاں اکبر کھڑا تھا، راجہ بھگوان داس نے برچھے سے ان میں سے ایک کا مقابلہ کیا، اور اس کو بھگا کر دوسرے سوار کی طرف متوجہ ہوا، اکبر نے جو اب تک زقوم کی آڑ میں کھڑا ہوکر دشمنوں پر تیر پھینک رہا تھا، یہ دیکھ کر راجہ بھگوان داس کی مدد کے لیے گھوڑا دوڑایا، حریف اکبر کے حملہ کی تاب نہ لاسکا اور اپنے ساتھی کے ساتھ بھاگا، اکبر فوراً

---

[1] فرشتہ ج ۱ ص ۲۶۰

تیراندازوں کے ساتھ زقوم کی آڑ سے باہر نکل کر محمد حسین مرزا پر حملہ آور ہوا، مرزا کے لیے میدانِ جنگ تنگ ہوگیا اور وہ لڑائی سے منہ موڑ کر بھاگا، اس جنگ کا ذکر کرکے فرشتہ لکھتا ہے کہ جب سے تاریخ کا پتہ چلتا ہے، اس وقت سے لیکر آج تک عرش آشیانی یعنی اکبر کے سوا کسی اور بادشاہ کے بارہ میں نہیں سنا گیا کہ اس نے اپنے لشکرِ جرار کو چھوڑ کر ایک قلیل جماعت کے ساتھ ایک ٹولی دشمن پر حملہ کرکے اپنے کو ایسے عظیم الشان خطرہ میں ڈالا ہو،[1]

ہاتھی اور سواروں کے مشترکہ تعاون سے اکبر صفِ اعداء میں جس طرح انتشار پیدا کر دیتا تھا وہ فنِ جنگ میں غیر معمولی ترقی کا ثبوت تھا، ۹۷۴ھ میں علی قلی خاں اور بہادر خاں نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو رائے بریلی کے پاس گنگا کے ساحل پر وہ ان کی سرکوبی کے لیے پہنچا، پہلے ہاتھی پر بیٹھ کر اپنی فوج کو لڑاتا رہا، پھر ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا، اور اپنے ہاتھیوں کو یکبارگی علی قلی کی طرف ہانک دیا، سب سے پہلے ہیرانند نامی شاہی ہاتھی علی قلی کی طرف دوڑا، غنیم کی طرف سے رودیانہ نامی ہاتھی مقابلہ میں آیا، ہیرانند نے رودیانہ کو زمین پر دے مارا، اس ہاتھی کے گرتے ہی سوار آگے بڑھے، اور لڑائی کی آگ بھڑک اٹھی، اتفاق سے ایک تیر علی قلی خاں کو آکر لگا، وہ اس کو بدن سے نکال رہا تھا کہ ایک اور تیر اس کے گھوڑے کو لگا، گھوڑا تیر کھا کر ایسا کمزور ہوا کہ علی قلی خاں اس کی پیٹھ پر سے اتر آیا، اس کے ایک لشکری نے دوسرا گھوڑا حاضر کیا اور چاہا کہ علی قلی کو سوار کرے کہ یکایک نرسنگھ نام شاہی فیل نے پہنچ کر علی قلی خاں کو زمین پر پٹک کر کچل ڈالا، یہ دیکھ کر اس کے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے،[2]

بعض اوقات اکبر کے شاہی سواروں کا پورا دستہ اپنی جانبازی اور سپہگری میں جلتی ہوئی آگ میں کود پڑا، قلعہ چتوڑ کے محاصرہ میں ساباط کے ذریعہ دو سرنگیں کھود کر برج تک پہنچا دی گئیں،

---

۱ فرشتہ جلد اول ص ۲۶۰-۲۵۹ ۲ ایضاً ص ۲۷۷

ان میں بارود بھر کر آگ لگا دی گئی تھی، اتفاق سے ایک سرنگ میں آگ لگ گئی، جس سے اسکے نیچے کا برج اڑ گیا، اور قلعہ کی دیوار میں ایک بہت بڑا رخنہ پیدا ہو گیا، دو ہزار لشکری اور سوار یہ سمجھ کر کہ دونوں سرنگیں آگ سے جل گئی ہیں اور حصار میں دونوں طرف سے راستے بن گئے ہیں یکبارگی حصار کی طرف دوڑے، ایک ہزار لشکری پہلے رخنہ پر پہنچ کر راجپوتوں سے دست و گریباں ہو گئے اور ایک ہزار دوسرے برج کے پاس پہنچے، ان لشکریوں نے جب اس برج میں رخنہ نہ دیکھا تو کچھ تو کسی تدبیر سے پلٹ آئے، لیکن کچھ غنیم سے لڑنے لگے، عین لڑائی کے وقت سرنگ میں آگ لگ گئی، اور برج آگ سے یکایک اڑ گیا، طرفین کے سپاہیوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ادھر اُدھر گرے، قلعہ کے محصورین میں سے بیشمار آدمی ہلاک ہوئے شاہی لشکر کے بھی پانچ سو منتخب سوار کام آئے لیکن بقیہ اور سواروں پر کسی قسم کی سراسیمگی طاری نہیں ہوئی اور وہ اسی دلیری اور پامردی سے قلعہ کا محاصرہ کیے رہے، اور دوسرے دن جب قلعہ میں داخل ہوئے تو راجپوتوں نے قلعہ کے اندر جم کر مقابلہ کیا لیکن ان کے تقریباً تیس ہزار آدمی مارے گئے، اور شاہی لشکر میں ایک آدمی کے سوا اور کوئی ہلاک نہیں ہوا۔[1]

اکبر کے فوجی سرداروں میں خان عالم، منعم خان خانخاناں، عبد الرحیم خانخاناں، خان زماں اور بہادر خاں گھوڑے کی پیٹھ پر سے جنگ کرنے میں بڑے مشہور تھے، ۹۸۲ھ میں اکبر نے جب داؤد خاں کے خلاف شاہی فوج بنگال بھیجی، تو اس مہم میں ہراول کے سردار خان عالم نے بڑی پامردی اور شجاعت کا جوہر دکھایا، شاہی لشکر کی ابھی صفیں بھی درست نہیں ہوئی تھیں کہ خان عالم نے جوانی اور بہادری کے جوش میں جنگی قواعد کو پس پشت ڈال کر تیزی سے اپنا گھوڑا بڑھایا اور دشمن کی فوج میں گھس پڑا، منعم خاں خانخاناں نے اس کو اس سے روکا اور واپس بلایا، اور جب لڑائی

[1] فرشتہ ج ۱ ص ۲۵۰-۲۵۷ اکبرنامہ ج ۲ ص ۳۱۳

شروع ہوئی تو داؤد خاں کی طرف سے گوجر خان اپنے جنگی ہاتھی کو لے کر آگے بڑھا، ہاتھیوں کی چنگھاڑ سے شاہی لشکر کے گھوڑے بھڑک گئے جس سے صف میں انتشار پیدا ہوگیا، خان عالم ایک نڈر اور تیز دم گھوڑے پر سوار تھا، وہ اپنی جگہ پر ثابت قدم اور جم کر لڑتا رہا، اور دشمنوں کو مار مار کر ڈھیر کردیا، لیکن یکایک اس کے گھوڑے کو تلوار کی ایک ضرب لگی، اور وہ جراغ پا ہوا، خان عالم زین پر سے زمین پر آگیا لیکن انتہائی چستی اور مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھوڑے پر سوار ہوکر پھر اسی پامردی سے لڑنے لگا، مگر اس کی قسمت نے یاوری نہیں کی، یکایک ایک جنگی ہاتھی اس کے پاس پہنچ گیا، اور اس نے اسکو نرغہ میں لے کر زمین پر گرا دیا، اور دشمنوں نے اس کو گھیر کر ہلاک کر دیا لیکن مرنے سے پہلے اس کو فخر تھا کہ اس نے اپنے شاہی آقا کے ناموس کے لیے پوری وفاداری اور جانبازی سے جنگ کی (اکبر نامہ ج ۲ ص ۱۲۴)

اسی لڑائی میں منعم خاں بھی گھوڑے ہی پر سوار ہوکر لڑا، اس کی پیشانی، گردن اور کندھوں پر متواتر ایسے زخم لگے کہ وہ منڈل بھی ہوگئے تو اس کی آنکھوں کی روشنی میں فرق آگیا، گردن گھما کر پیچھے دیکھنے اور سر تک ہاتھ لیجانے سے معذور ہوگیا، پھر بھی بڑی بڑی لڑائیوں میں شریک ہوتا رہا،[۱]

عبدالرحیم خانخاناں کے بارہ میں فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ معرکہ جیت لینے میں شہرۂ آفاق تھا،[۲] اکبر کے ۲۲ دیں سال جلوس میں مظفر گجراتی کے خلاف عبدالرحیم کو بھیجا گیا، تو احمد آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر سرکیج میں دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی، مظفر گجراتی کے پاس چالیس ہزار اور عبدالرحیم کی کمان میں صرف دس ہزار سوار تھے، خود اکبر نے عبدالرحیم کو اس وقت تک جنگ سے روکنے کے لیے لکھا جب تک مزید کمک نہ پہنچ جائے لیکن مرزا عبدالرحیم نے اپنی نبرد آزمائی کا زور دکھانے کی خاطر جنگ شروع کر دی، اور جب لڑائی انتہائی زور پر تھی تو عبدالرحیم ایک مقام پر سو لشکریوں

---

[۱] اکبر نامہ ج ۲ ص ۱۲۴ [۲] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۰

اور ایک سو ہاتھی کو لیکر کھڑا تھا کہ مظفر چھ سات ہزار سوار لیکر اس پر ٹوٹ پڑا، عبد الرحیم کی پامردی میں فرق نہیں آیا اور اس نے ڈٹ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ان کو مار بھگایا، اکبر نے اس کی اس جرات اور بہادری سے خوش ہوکر پنج ہزاری منصب اور خان خانان کا خطاب عطا کیا[1]،

[illegible]ھ میں نظام الملک اور قطب الملک کی فوجوں سے اکبری فوج کا مقابلہ قصبہ اشتی کے پاس ہوا، تو اس موقع پر بھی عبد الرحیم خانخانان نے حیرت انگیز بہادری کا ثبوت دیا، وہ رات رات بھر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر فوج کی آراستگی اور نگرانی میں لگا رہتا، ایک موقع پر غنیم کے پچیس ہزار سوار خانخانان کے پانچ ہزار سوار پر اچانک ٹوٹ پڑے، خانخانان کے تمام ساتھیوں کی ہمت نے جواب دے دیا، اس کے ایک ساتھی دولت خاں لودی نے اس کو جنگ کرنے سے روکا، اور کہا کہ اس انبوہ سے مقابلہ کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے، خانخانان کی غیرت جوش میں آگئی، وہ بولا کہ تم یہ کہکر دہلی کے نام کو برباد کرتے ہو، دولت خاں نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ دشمن کو شکست ہوئی تو سو دہلی آباد ہو جائے گی، لیکن اگر ہم لوگ ہلاک ہوئے تو پھر معاملہ خدا کے سپرد ہے، یہ کہکر اس نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھانا چاہا، سادات بارہہ کے بہادروں میں قاسم بارہہ نے یہ صورت حال دیکھی تو آگے بڑھا، اور دولت خاں کو روک کر بولا "ہم ہندوستانی ہیں، لڑکر مرجانا ہمارا شیوہ ہے"، دولت خاں جھلا کر خانخانان سے پھر مخاطب ہوا کہ یہی سہی دشمن کے انبوہ کے مقابلہ میں شکست دلانی ہے، لیکن یہ بتلاؤ کہ شکست کھا کے ہم لوگ تم سے کہاں ملیں"، خانخانان مردانگی اور بہادری سے پکار اٹھا اور بولا "لاشوں کے ڈھیر کے نیچے" یہ سنکر سارے لشکریوں میں ایک نئی غیرت اور ہمت پیدا ہوگئی، اور وہ سر بکف ہوکر اس طرح لڑے کہ دشمن کی کثیر تعداد تتر بتر ہوگئی، خانخانان نے اس غیر متوقع فتح و کامرانی کی خوشی میں میدان جنگ میں پانچ لاکھ روپے لٹائے[2]۔

---

[1] ماثر الامراء، ج ۱، ص ۷۰۰ [2] ایضاً ص ۷۰۱

اکبری امراء میں خان زماں علی قلی کے بھائی بہادر خان کے بارہ میں فرشتہ لکھتا ہے کہ وہ اپنی معرکہ آرائی کے سامنے اسفندیار کی ہفت خوان داستان کو بھی ہیچ اور بے معنی سمجھتا تھا، شیر خاں ولد محمد شاہ عدلی نے چالیس ہزار سواروں کے ساتھ جونپور کو مغلوں سے واپس لینے کے لیے دریائے گنگا کو عبور کیا تو اکبر کی طرف سے بہادر خاں نے لڑائی میں ایسے ایسے افغانیوں کو تہ تیغ کیا جن میں سے ہر ایک سوار اپنے کو ہزار ہزار سواروں کا ہم پلہ سمجھتا تھا[1]، خان زماں اور بہادر خاں دونوں ازبکوں کے سردار تھے، ازبک بڑے اچھے تیر انداز سمجھے جاتے تھے، مغل حکمراں زیادہ تر ان ہی کی جنگی شجاعت و تند خوئی کی بدولت جنگ جیتا کرتے تھے۔

سادات بارہہ سادات بارہہ بھی ہر فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ہر معرکہ میں انکی شہسواری اور نبرد آزمائی نمایاں رہتی، جہانگیر نے بھی اپنے عہد کی معرکہ آرائیوں میں ان کی جنگی خدمات کو سراہا ہے، وہ لکھتا ہے:

"بارہ بزبان ہندی دوازدہ را گویند، چو درمیان دوآب دوازدہ دیہ نزدیک بہم واقع است کہ وطن ایں سادات است بنابریں بسادات بارہہ اشتہار یافتہ اند وبعضے مردم در صحت نسب اینہا سخن ہا دارند، لیکن شجاعت ایشان برہانی است قاطع بر سیادت، چنانچہ دریں دولت ہیچ معرکہ نبودہ کہ اینہا خود را نمایاں ساختہ باشند وچندے بکار نیامدہ باشند، مرزا عزیز کوکہ ہمیشہ می گفت سادات بارہہ بلاگردان این دولت اند، الحق چنین است۔"[2]

وہ "بلاگردانِ دولت" ہی نہیں رہے، بلکہ آخر میں "شاہ گر" بھی ہو گئے تھے، جہاندار شاہ کے بعد سید حسین علی خاں اور سید عبد اللہ خاں نے تیموری تخت پر جس کو چاہا بٹھایا اور جس کو چاہا معزول کر دیا، ان کی تلوار اور نبرد آزمائی سے پوری سلطنت کانپتی تھی،

---

[1] فرشتہ ج ۱ ص ۱۵۱، [2] تزک جہانگیری ص ۵۷۔ ۳۷۳

جہانگیر نے اپنے فوجی سرداروں میں سید عبد الوہاب، سید یعقوب اور سید غلام محمد کی تعریف خاص طور پر کی ہے، سید عبد الوہاب کو اس کے شجاعانہ کارناموں کی بدولت جہانگیر نے دلیر خاں کا خطاب دیا تھا[1]، ۱۰۳۲ھ میں جہانگیر کی فوج گجرات کی تسخیر کے لیے عبد اللہ خاں کے خلاف بھیجی گئی، تو میدان جنگ میں سید غلام محمد نے بہادری کا پورا جوہر دکھایا، اور لڑتا ہوا گھوڑے کی پیٹھ پر سے زمین پر گرا تو اس بہادر فوجی سردار کے بچانے کے لیے سو سواروں نے اپنی اپنی جانیں دیں[2]۔

جہانگیر خود تو کوئی غیر معمولی جنرل نہ تھا، لیکن اکبری روایت کے مطابق اس کے فوجی سرداروں اور ان کے ماتحت سواروں کا رعب تمام سلطنت میں بدستور سابق قائم رہا، اور یہ فوجی سردار جنگی تہور بھی اسی شان سے دکھاتے رہے، جہانگیر انکو بڑی محبت و شفقت سے مہم پر روانہ کرتا، اور کبھی انکو رخصت کرتے وقت خود گھوڑے پر سوار کرتا، اپنی دستار پہنا دیتا اور بغل گیر ہونے میں اشکبار ہو جاتا[3]، جس سے متاثر ہو کر یہ سردار پوری وفاداری اور جانبازی سے مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے، جہانگیر کے ۱۹ ویں سال جلوس میں اکبر نگر میں افغانوں کے خلاف شاہی لشکر صف آرا ہوا تو اس کی کمان ابراہیم خاں کے ہاتھ میں تھی، اس کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے، بقیہ اور سوار دوسرے بازو پر متعین تھے، لڑائی شروع ہوئی تو دشمنوں نے ابراہیم خان کے لشکر کے دوسرے بازوؤں کو درہم برہم کر دیا، ابراہیم یہ دیکھ کر تاب نہ لا سکا اور بے قرار ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اس سے اس کی ساری فوج کی تنظیم بگڑ گئی، اور جب ابراہیم خاں کے ساتھیوں نے اس کی جان خطرہ میں دیکھی، تو اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اس کو میدان کارزار سے نکال لینا چاہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا، اور بولا کہ میدان جنگ سے منہ موڑنا مردانگی نہیں، اس سے بڑھ کر اور کیا دولت حاصل ہو سکتی ہے کہ بادشاہ کی خدمت میں اپنی جان نثار کردوں۔" پھر متواتر زخم کھا کر مردانہ وار جان دیدی، (تزک جہانگیری ص ۳۹۳)

---

[1] تزک جہانگیری ص ۴۰۳ [2] ایضاً ص ۳۰۲ [3] مآثر الامراء ج ۱ ص ۱۸۰

جہانگیر کے فوجی سردار جب بہادری کے کارنامے انجام دیکر میدان جنگ سے لوٹتے تو وہ ان کی شجاعت کی نوعیت کے لحاظ سے انکو خطاب دیتا، مثلاً فدائی خاں، زبردست خاں، ہمت خاں، دلاور خاں، دلیر خاں، داراب خاں وغیرہ، یہ دستور اور تیموری حکمرانوں کے عہد میں بھی رہا،

شاہجہانی عہد کے سوار | شاہجہانی عہد میں مغل فوجوں کی سربلندی میں اضافہ ہوتا رہا، انھوں نے اپنی نبرد آزمائی اور سپہگری کے جوہر بدخشاں، بلخ اور قندھار میں بھی جا کر دکھائے، ۱۰۵۵ھ میں شہزادہ مراد بدخشاں و بلخ کی مہم پر بھیجا گیا تو اس کی کمان میں پچاس ہزار سوار اور دس ہزار تفنگچی اور پیادے تھے، ان کی سربراہی تقریباً ڈھائی ہزار پرانے تجربہ کار فوجی سرداروں کے ذمہ تھی، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں، علی مردان خان، نجابت خاں، قلیچ خاں، لہراسپ خاں، دولت خاں، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ، راؤ ستر سال ہاڈا وغیرہ، شاہجہاں نے اس لشکر کا راستہ یہ متعین کیا کہ وہ کھوکھروں کے علاقہ، اٹک، اور حسن ابدال ہو کر جائے، کیونکہ ان علاقوں میں فوجی رسد کی کمی نہ تھی، اور جب موسم بہار شروع ہو تو شہزادہ مراد پشاور ہو کر کابل روانہ ہو، اور فوج کے دوسرے سردار بنگش کے زیریں حصہ سے ہو کر شہزادے سے کابل میں ملیں، اور جب فوجیں کابل میں جمع ہو جائیں تو کچھ سردار مثلاً قلیچ خاں، خلیل اللہ خاں اور مرزا نوروز اور کہمرد اور غوری پر قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں، اور بقیہ تمام لشکر بدخشاں اور بلخ کی طرف جائیں، شہزادہ مراد مقررہ وقت کے بعد کابل پہنچا تو اس وقت درہ طول برف سے ڈھکا ہوا تھا، کچھ دستے ان برفانی راستوں کو صاف کرنے کے لیے آگے روانہ کیے گئے، شہزادہ مراد تین منزلوں پر قیام کرنے کے بعد چاریکاران پہنچا، یہاں سے قلیچ خاں کی سربراہی میں ایک دستہ غوری اور کہمرد کی طرف بھیجا گیا، اور شہزادہ نے بدخشاں کے جانب کوچ کیا، قلیچ خاں کو راستہ بہت تنگ اور دشوار گذار ملا، اس لیے اس نے اپنی

لہ بادشاہ نامہ جلد ۲ ص ۴۳۴

فوج کے کئی ٹکڑے کر کے کوچ کو جاری رکھا، اور کہمرد اس طرح اچانک پہنچا کہ وہاں کے باشندے اپنی مدافعت میں کچھ نہ کر سکے، وہاں دو روز ٹھہر کر غوری پہنچا، تو یہاں بھی شاہی لشکر کا کسی نے مقابلہ نہ کیا، شہزادہ مراد کو برفانی راستہ طے کرنے میں دیر لگی، درۂ طول کے برف کو ہزار ہزار مزدور صاف کرتے تو سوار اور دوسرے لشکری کچھ آگے بڑھتے، بالآخر شہزادہ سراب پہنچا، یہاں پوری فوج اکٹھی ہوئی، اور وہ دیہ تاجکان ہوتی ہوئی نارین پہنچی، یہاں سے بڑھ کر اصالت خاں کی نگرانی میں سواروں نے قندز پر قبضہ کر لیا، قندز چھوڑتے وقت غنیم نے بڑی لوٹ مار اور غارتگری کی، مراد نے پہنچکر وہاں کے باشندوں کے نقصانات کی تلافی میں پچیس ہزار روپیے تقسیم کرائے، قندز کے قبضہ سے بدخشاں شاہجہاں کے حدود سلطنت میں آسانی سے آگیا، اور اب شاہی لشکر بلخ کی طرف بڑھا، یہ سیل رواں کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا، ان لشکریوں کی شجاعت اور نبرد آزمائی کا شہرہ وہاں تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا، اس لیے وہ کسی رکاوٹ اور مقابلہ کے بغیر کوچ کرتے ہوئے بلخ کے دروازے تک پہنچے، تفنگچی سواروں کو اپنی آڑ میں لے کر بلخ کے اندر گھسے، والی بلخ قلعہ کے اندر رہتا، لشکر ہراول کی آمد پر قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا، ازبک اپنی نبرد آزمائی کے لیے مشہور تھے، لیکن مراد کی فوجوں اور سواروں کی وہ بھی تاب نہ لا سکے، اور بلخ اور اس کے بعد ہی قلعۂ ترمذ پر شاہجہانی پرچم لہرانے لگا، شاہی فوج کے تمام دستے جب بلخ کے اندر داخل ہوئے ہیں تو وہاں کے باشندے اس لشکر کی آرائش و نمایش کو دیکھکر دنگ رہ گئے، کہ وہ بیکر او ربرق رفتار ہاتھیوں پر مخمل اور زربفت کی جھولیں پڑی تھیں، لشکریوں کی سیمیں اور طلائی لباس سے چمک دمک پیدا ہو رہی تھی، گھوڑوں کے زین اور لگام بھی زریں تھے، زرنگار اور مرصع جھنڈے اور علموں کی کثرت تھی، توپچیوں اور تفنگچیوں اور باندراروں کا بھی بڑا انبوہ تھا، اہل بلخ نے اس شان و شوکت کا لشکر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا[1] جب اس فتح کی خبر شاہجہاں کو پہنچی تو اس دیرینہ آرزو کی خوشی

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۵۳۱

میں آٹھ روز تک شاہانہ جشن منایا. فوجی سرداروں کے مناصب بڑھائے گئے. ان کو خلعت اور انعامات دیے گئے. اور شعراء نے قصائد لکھکر مبارکباد پیش کی[1].

مراد تو بلخ سے واپس چلا آیا لیکن شاہجہاں کے حکم سے سوار اور فوج کے کچھ اور دستے خاص خاص مقامات پر متعین کر دیے گئے مشرق کے جانب طالقان اور قندز میں، شمال مشرق کے سمت رستاق میں دریائے جیحون پر بلخ اور ترمذ میں، بلخ کے شمال میں میمنہ اور شمال مغرب کیجانب اندخود میں شاہجہانی سواروں نے ہندوستان کا پرچم لہرایا، مراد کی واپسی کے بعد شہزادہ اورنگ زیب بلخ بھیجا گیا، اسکے جلو میں ۳۰ ہزار فوج تھی جس میں زیادہ تر سوار ہی تھے، اس زمانہ کا بڑا تجربہ کار فوجی جنرل امیر الامراء علی مردان خاں بھی اسکے ساتھ گیا، اورنگ زیب پشاور ہوتا ہوا کابل پہنچا، جب کابل سے آگے بڑھا تو اسکے کچھ فوجی سردار اپنے لشکریوں کے ساتھ پیچھے رہ گئے، اوزبکوں نے شاہی لشکر پر تاخت کر کے اس کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی، انکے پاس ایک لاکھ سے زیادہ مسلح سوار تھے لیکن وہ میدان جنگ میں کھل کر لڑنے کے بجائے دشوار گذار راستوں اور پہاڑی علاقوں میں چھپ چھپ کر حملہ کرتے رہے، اس قزاقانہ جنگ کے مغل سوار عادی نہ تھے، لیکن اورنگ زیب کے سپاہیانہ تدبر اور احتیاط سے لشکر آگے بڑھتا چلا گیا، اوزبک حملہ کرتے اور مار کھا کر بھاگتے رہے، انکے چھ ہزار سوار مارے گئے اور شاہی فوج کے پانچ سو سواروں کی جانیں تلف ہوئیں، اورنگ زیب راستہ میں جوشن پہنے اور سپر سے ہمیشہ مسلح فوج کی نگرانی میں مشغول رہتا تھا، وہ درہ شیبر اور آق رباط ہو کر کہمرد کی طرف بڑھ رہا تھا کہ درہ گز کے پاس اوزبکوں نے پھر مزاحمت کی مگر اورنگ زیب نے ان کی سرکوبی اچھی طرح کر دی، اور وہ شکست کھا کر درّوں، پہاڑیوں اور گذرگاہوں کی کمین گاہوں میں چھپ گئے. اورنگ زیب اوزبکوں کی قزاقانہ جنگ کے طریقوں سے کچھ واقف ہو گیا تھا، اس لیے آگے بڑھا تو درہ گز سے ہو کر بلخ کو جانے والے دریائے بلخاب کی ناکہ بندی اچھی طرح کر دی،

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۵۳۰

پہلے علی مردان کو ہراول بنا کر آگے بھیجا، اس کے ساتھ "شیران زنجیر خا" "دلیران جوشن قبا" "بہادران نبرد پرداز" اور "تفنگچیان حکم انداز" تھے، اس کے پیچھے اورنگ زیب اپنے توپچیوں، جنگی ہاتھیوں، اور منتخب لشکریوں کے ساتھ روانہ ہوا، اوزبکوں نے ہراول پر تاخت کی، مگر زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا کہ علی مردان کے "صف شکن" "مرد افگن" سواروں نے اپنی تیغ آبدار اور سنان آتشبار سے ان کو منتشر کر دیا، اور دو کوس تک ان کا تعاقب کر کے ان کو پیچھے ڈھکیل دیا، اس کے بعد اورنگ زیب کو بلخ پہنچنے میں دیر نہیں لگی[1] بلخ میں کچھ احدی، سوار، پیادے اور تفنگچی چھوڑ کر وہ پوری تنظیم و ترتیب کے ساتھ آقچہ کی طرف بڑھا، پہلے تفنگچی بڑھ کر راستے کو محفوظ کر دیتے، انکے پیچھے سوار کوچ کرتے، کیونکہ اوزبک باغوں اور نہروں میں چھپ چھپ کر ان پر مسلسل تیراندازی کر کے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیتے تھے، لیکن یہ سر بکف فوج بڑھتی چلی گئی اور تیمور آباد پہنچی، اوزبک شہسواری اور تیراندازی میں بے مثل مہارت رکھتے تھے، لیکن شاہجہانی فوج کی تنظیم و ترتیب، تیز گامی اور ان سب پر مستزاد، شہزادہ اورنگ زیب کی سپہ سالاری اور بیدار مغزی سے ان کا سارا تہور شورش بے مدعا بن کر رہ جاتا، وہ چھپ چھپ کر شاہی فوج کے کمزور حصہ پر اچانک حملے کر دیتے، لیکن اورنگ زیب فوراً کسی ہوشیار اور بہادر جنرل کو بھیجکر یا خود پہنچکر ان پر ضرب کاری لگاتا، اثنائے راہ میں ایک مقام پر فریقین میں جو تصادم بھی ہوا اس کا حال خافی خاں نے اس طرح لکھا ہے کہ "چنداول جرانغار سعید خاں کی نگرانی میں تھا، وہ بیماری کے ضعف کی وجہ سے گھوڑے پر بمشکل سوار ہو سکتا تھا، اوزبک اس کے بازو پر اچانک حملہ آور ہو گئے، سعید خاں نے پانچ سو سوار ان کے مقابلے کے لیے بھیجے لیکن وہ مغلوب ہو گئے، پھر سعید خاں نے اپنے دو لڑکوں لطف اللہ خاں اور خان زماں

---

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۶۷۳ - ۶۷۱

کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، یہ دونوں بڑی بہادری سے لڑے، لیکن اوزبکوں کو مغلوب نہ کرسکے اور باپ سے کمک منگوا بھیجی، اس مرتبہ سعید خان خود علالت کے باوجود جنگی نعرے لگاتا ہوا فوج کے ساتھ آگے بڑھا، اس نے اپنی تلوار سے قیامت برپا کر دی لیکن اس کے گھوڑے کے پاؤں لڑکھڑا گئے جس کی وجہ سے وہ زخمی ہوکر زین سے زمین پر آگیا، اس کے کئی زخم لگ چکے تھے، پھر بھی وہ زمین سے تیزی سے اٹھا، اور تین چار دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس کا لڑکا لطف اللہ خاں باپ کی مدد کے لیے آگے بڑھا، تیروں کی بارش ہر طرف ہو رہی تھی، پھر بھی وہ اپنا گھوڑا باپ کی طرف لے چلا، یکایک ایک تیر آکر لگا، اور لطف اللہ گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہوگیا، سعید خاں کے دوسرے لڑکے خان زاد خان نے بھائی کو اس طرح مرتے دیکھ کر باپ کو بچانے کے لیے مردانہ وار گھوڑا بڑھا دیا، اور دشمنوں کو مارتا کاٹتا جا رہا تھا کہ تیروں کے متواتر زخم کھا کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا، اورنگ زیب کو اپنے فوجی سرداروں کی پسپائی کی خبر ملی تو ہاتھیوں، تفنگچیوں اور سواروں کا ایک دستہ لے کر ان کی مدد کو پہنچا، اور کوس دکرنا کا شور ایسا بلند ہوا کہ گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی، اورنگ زیب نے دو مست ہاتھی دشمن کی طرف چھوڑ دیے، اور ان کے پیچھے شیر دل سواروں نے ایسی یورش کی کہ اوزبک نہ ٹھہر سکے، اور ان کے کشتوں کے پشتے لگ گئے، سعید خاں کے نوکر اس کے پاس پہنچکر اس کو اور دونوں لڑکوں کو میدان جنگ سے باہر لائے، خان زاد خان میں رمق جان باقی تھی، اس نے اشارہ اور لکنت سے باپ کا حال دریافت کیا، اور اس کی روح بھی عالم بالا میں پرواز کرگئی، تھوڑی دیر بعد باپ بھی راہی عدم ہوا[1]۔

اورنگ زیب اس طرح لڑتا بھڑتا علی آباد پہنچا، یہاں اس کو خبر ملی کہ دشمنوں کی ایک فوج

---

[1] خافی خاں حصہ اول ص ۶۶۴ - ۶۶۳

بخارا سے بلخ کی طرف بڑھ رہی ہے، اس نے بلخ کی طرف مراجعت کرنا بہتر سمجھا، ازبکوں اور بلخ کے لشکریوں نے اورنگ زیب کے بلخ تک پہنچنے میں ہر قسم کی مزاحمت کی، اور جب اورنگ زیب پاشائے اور شیخ آباد ہوکر فیض آباد پہنچا تو دشمنوں سے پھر زبردست مقابلہ ہوا لیکن اورنگ زیب کی تربیت یافتہ فوج غالب آئی، اور اورنگ زیب بلخ میں داخل ہوگیا، بلخ سے روانگی اور واپسی کی مدت کل دس روز کی تھی لیکن اس اثنا میں لشکریوں نے مطلق آرام نہ لیا، ان کا کھانا ہاتھی کی پیٹھ پر تیار کیا جاتا تھا، رات رات بھر فوجی سردار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھکر لشکر کے چاروں طرف خندقیں کھدواتے اور انکی نگرانی کرتے، کھانے پینے کی چیزوں کا بھی قحط پڑگیا تھا لیکن اورنگ زیب کی مدبرانہ قیادت، دلیرانہ رہنمائی اور سپاہیانہ احتیاط نے لشکر میں انتشار اور بددلی پیدا نہ ہونے دی، اور اس کی ہمت، جرأت اور پامردی نے ہر وقت اس کا ساتھ دیا، وہ ازبکوں کے خلاف ایک موقع پر لڑ رہا تھا کہ دشمنوں نے مور و ملخ کی طرح اس کو گھیر لیا، اس گھمسان لڑائی میں ظہر کا وقت آگیا، اورنگ زیب گھوڑے سے اتر آیا اور نماز با جماعت کا قصد کیا، اس کے مقربین نے میدان کارزار میں اس طرح نماز ادا کرنے سے روکنا چاہا لیکن وہ نہ مانا اور تیروں کی بارش میں پورے اطمینان و سکون سے فرض، سنت اور نفلیں ادا کیں، ازبکوں کے سردار عبدالعزیز کو اس کی خبر ملی تو وہ بہت حیران ہوا اور یہ کہکر جنگ سے ہاتھ روک لیا کہ ایسے شخص سے جنگ کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے۔

"با چنیں کسے در افتادن بر افتادن ست"[1]

(باقی)

---

[1] مآثر عالمگیری صفحہ ۱۳۱ ۵

رقعات عالمگیر

اورنگزیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کیے گئے ہیں، اور ان سے علم، ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت للعہ

(جامع پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی)

منیجر

سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از

(جناب محمد اشرف خاں ایم اے، لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور)

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی ذات علم ظاہر و باطن، اور شریعت و طریقت کی جامع تھی، اگرچہ آخر عمر میں ان پر طریقت کا غلبہ ہو گیا تھا، لیکن اس سے انکی علمی حیثیت اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، لیکن ان کے وہ روحانی مسترشدین جنھوں نے انکو صرف آخری چند سالوں میں دیکھا ہے اور ان کو ان کی صحبت میں رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، ان کو محض ایک شیخ طریقت کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو ان کی زندگی کی محض اک رخی تصویر ہے، اس مضمون میں بھی یہ غلو ہے، لیکن اس سے سلوک و تصوف کے علاوہ ان کے مختلف افکار و خیالات، اقوال و ملفوظات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے، جس کو ناظرین معارف شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ ' م '

سید الملت حضرت الشیخ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ان یگانۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جنھیں ان کی جامعیت، ہمہ دانی، اور گوناگوں کمالات و فضائل کی بنا پر فرد کے بجائے امت کہا جائے تو بجا ہوگا، شبلیؒ کا یہ جانشین تنہا اورنگ علم و تحقیق ہی کا مسند آرا نہ تھا، بلکہ فقر و سلوک کی بھی زینت تھا، اگر سلیمان اعظم کی علمی فتوحات کا علم اسلامی علوم و فنون کی قلمرو پر نصب تھا، تو اس کے قلم کا فیضان سیرتِ طیبہ کے کوثر و تسنیم سے کام و دہن کو لذت بخش رہا تھا، اور اس کا فیضِ صحبت تربیت و تزکیہ کی سنت کو پورا

کر رہا تھا۔ اگر ایک طرف کلک سلیمانی نے علوم اسلامیہ کے خزائن کو بے نقاب کیا تو دوسری طرف عارفانہ رموز و حقائق اور قلبی اسرار و دقایق کو بھی فاش کیا، ظاہر و باطن کے اس مجمع البحرین کے فضائل و کمالات اسقدر مختلف النوع ہیں کہ انسان اس کی وسعت و گہرائی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، اس کا معجز نما قلم جس موضوع پر بھی اٹھا ہے اس کے جملہ پہلوؤں کو اپنے تلاش و تحقیق، وسعت نظر، حقیقت رسی، اور ژرف نگاہی سے اس طرح سمیٹتا چلا گیا ہے کہ اس کی تحقیقات حرف آخر بن گئی ہیں، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری علوم کی عظمت و تابانی کی بنا پر عموماً سلوک سلیمانی کی طرف کم نگاہیں جاتی ہیں، حالانکہ اگر اس فن کے متعلق آپ کے کاتیب و ملفوظات سے سلوک سلیمانی کو مرتب کیا جائے تو بحمد اللہ تعالیٰ اتنا کافی مواد مل سکتا ہے جس سے طریق کے متعلق حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نظریات پوری طرح روشن ہو جاتے، حضرت والا کا یہ وہ اہم پہلو ہے جو عوام تو کیا عموماً خواص کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہے،

کاش حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اشرف الحیات[1] مکمل ہو جاتی، تو سلوک سلیمانی اپنی پوری تابانی سے ظاہر ہو جاتا، لیکن یہ حکمت الٰہی میں مقدر نہ تھا، اگست ۱۹۵۳ء میں جب کتاب مذکور کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی گئی تو کس عارفانہ انداز میں فرمایا تھا کہ "کہاں کی تحریر و تصنیف، دیکھنا یہ ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کس سے راضی ہوتے ہیں"،

مولانا تھانویؒ کے متعلق مولانا عبد الباری صاحب ندوی اور مولانا دریابادی کی تصانیف کے بعد حضرت کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ تصوف کی حقیقت کو نئی پود کے سامنے اجاگر کرنے کے لئے

---

[1] کتاب مذکور کا مقدمہ مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہ کی کتاب تجدید تصوف و سلوک کے ساتھ چھپ چکا ہے، کچھ صفحات (غالباً ۴۰ - ۵۰) مسودے کی صورت میں سید سلمان سلمہ کے پاس موجود ہیں، جو "تبرک سلیمانی" کی حیثیت سے اشاعت کے قابل ہیں، مزید براں بعض ایسے فوائد بھی اس میں موجود ہیں جو دیگر کتابوں میں نہیں ملتے۔

کلکِ سلیمانی کی ضرورت ہے، تو ارشاد فرمایا" جی ہاں! وہ حضرات اپنا کام پورا کر چکے لیکن میں مکمل نہ کر سکا"۔

ایک طالب نے عرض کیا کہ حضرت حیاتِ شبلی لکھ کر آپ استاد کا حق ادا کر چکے، اگر اشرف الحیات پوری ہو جاتی تو شیخ کا حق بھی پورا ہو جاتا، کس سوز و درد سے فرمایا" حق کیا ادا ہوتا"، تاہم حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعۂ غزلیات" غزل الغزلات" میں تصوف کے متعلق کچھ تعلیمات نظم ہو گئی ہیں جنکی تشریح حضرت والا نے اس ناکارہ کے سامنے فرمائی تھی، افسوس میں اپنی بدنصیبی کی بنا پر انھیں قلمبند نہ کر سکا ورنہ خود شیخ کی زبانی سلوکِ سلیمانی کا نادر مجموعہ ہوتا، اشعار کا یہ مجموعہ مولانا تھانویؒ کے تعلق کے بعد کا ہے فرماتے تھے" یہ میرا غزلنامہ نہیں بلکہ سفرنامہ" یعنی حضرۃ الشیخؒ کی سیر سلوک کا مختصر روزنامچہ ہے جس میں سید الملتؒ نے مختلف منازلِ سلوک کی طرف اشارہ کیے ہیں، ارشاد ہے،

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں — اب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

دیوانگانِ عشق کو دیکر صلائے عام — آراستہ یہ محفلِ جم کر رہا ہوں میں

غلبۂ حال کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ" انسان پر جب چیز کا خیال چھایا ہوتا ہے وہی چیز سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ میں ایک مرتبہ لکھنؤ سے بھوپال جا رہا تھا، غلبۂ ذکر کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریل سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، وہ بھی الّا اللّٰہ الّا اللّٰہ کہہ رہی ہے، چنانچہ یہ شعر موزوں ہو گیا،

کوئی ہو آواز میرے کان میں — ہر صدا آواز الّا اللّٰہ ہے

اور پھر پوری غزل نظم ہو گئی"، اس غزل کی کیف انگیزیوں کا اندازہ صرف ایک شعر سے کیجئے،

وجد میں جاں ہو تو اعضا رقص میں — جام مے آواز الّا اللّٰہ ہے

اس واقعہ کی نقل سے مقصود یہ ہے کہ شیخ وقت کی" وارداتِ عشق کیونکر سپردِ قلم ہو جاتی تھیں، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا" میں یوں ایک شعر بھی نہیں کہہ سکتا، جب تک خاص حالت نہ ہو،

ایک صاحب میرا تخلص غزلوں میں ڈھونڈ رہے تھے، میں تخلص سے خلاص ہوں، میری شاعری میں کوئی جدت نہیں، البتہ یہ نئی بات ہے کہ تخلص نہیں، جو چاہے گا ان اشعار کو اپنی جانب منسوب کرلیگا، اللہ میاں کا بھی تو کوئی تخلص نہیں......

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ پر جس زمانہ میں عقل کا غلبہ تھا، اس دور کی شاعری کو جو بجائے خود سراپا عشق و ذوق کا وجد آور نغمہ ہے، دماغی شاعری قرار دیا ہے، ایک مرتبہ اپنا یہ شعر سنا کر

آنکھ میں توبہ کے آنسو، دل میں اس بت کی ہوس　　ہائے اس گنگا جل کو کیسے زمزم و کوثر کروں

فرمایا "میں نے اپنی شاعری کے تین حصے کیے ہیں، ایک نفسانی شاعری، دوسری تحیری، تیسری دماغی شاعری - یہ دوسرے دور کا شعر ہے،

ایک مرتبہ میں نے عرض کی کہ خواجہ مجذوب کے اشعار میں عجیب مستی ہے، فرمایا "جی ہاں! وہ پی کر مست تھے اور ہم بے پیئے ہی مست ہیں"؛ اس سے مراد یہ تھی کہ خواجہ صاحب پر ہر وقت سرشاری کا عالم اور جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی، اور حضرت والا تمکین و ضبط کے باوجود عشق الٰہی میں مست تھے جس کا اظہار حضرت کے اس شعر سے ہوتا ہے:

تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں　　دل سراپا جوش ہو لیکن زبان خاموش ہے

ایک مرتبہ فرمایا میں نے اپنا شعر

اندرونِ حلقۂ پیر مغاں　　کوئی سالک ہے کوئی مجذوب ہے

وصل صاحب کو لکھ کر بھیجا، اور ان سے پوچھا، مجذوب کو تو سب جانتے ہیں، سالک کون ہے، سالک سے غالباً خود حضرت والا کی ذات مراد تھی، کیونکہ یہاں جذب و سکر پر ضبط و صحو غالب رہتا تھا، اور جب کبھی جذب، ذوق و شوق غالب ہوجاتا تھا تو اس قسم کے اشعار نکل جاتے،

زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں سے پی　　گفتار ہے مستانہ، کردار ہے رندانہ

اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

الاماں اے سوزشِ داغِ فراق　　روز محشر تابشِ خورشید ہے
میکدہ مسجد میں یاد آیا کیا　　روز افزوں نشۂ توحید ہے

چشم ساقی میں بھری کیا بادۂ پرجوش ہے　　جس طرف آنکھ اٹھ گئی وہ مست بیہوش ہے
پھیر دے اے چشم ساقی گردشِ ایام کو　　یعنی امشب میری ہو جائے جو میرا دوش ہے
اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس　　ہوش جو تھا بیہشی ہے، بیہشی اب ہوش ہے

مجھ پہ جادو یہ چلایا کس نے　　مجھکو دیوانہ بنایا کس نے

دل اس پیری میں بھی غرقِ ہوسناکی ورندی ہے　　پھنسی ہے کشتیٔ عمر رواں گردابِ ساحل میں
مرے ہوش وخرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں　　لگا دے برقِ ایمن آگ تو اس میرے حاصل میں

لیکن ان اشعار سے بھی ان کیفیاتِ باطنی کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکیں　　شوقِ بے اندازہ، پیچیدہ وہ جو ہے دل میں ہے

سلوک سلیمانی کی روشنی تمام تر مشکوٰۃ نبوت سے مقتبس تھی، اور وہ بیرونی اثرات سے بالکل پاک تھا۔ سیرت نگار نبوی کے نزدیک تصوف سنت نبوی کے کامل ظاہری اتباع کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال قلبیہ اور اعمال باطنیہ کی پوری پوری پیروی کا نام تھا، ارشاد فرماتے تھے:

"لوگ سمجھتے ہیں کہ اتباع نبویؐ میں صرف ظاہری اتباع کافی ہے، سیاہ پگڑی باندھ لی، سرمہ لگا لیا، تہبند نصف ساق تک اونچا کر لیا، اور اتباع مکمل ہو گیا، ظاہری اتباع کی نفی نہیں کرتا لیکن اتباع نبوی میں . . . . باطنی اتباع بھی ضروری ہے، احوال میں اتباع ہو، کیفیات قلبی میں اتباع ہو، باطنی اتباع بھی تو ضروری ہے، اس کی طرف توجہ نہیں۔"

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے تھے، وہ ظاہر و باطن، جسد و روح، جسم و قلب کے جملہ

احوال کی اصلاح و تربیت کا جامع و مانع دستور العمل تھا، اگر تلاوت قرآن، تعلیم کتاب و حکمت نبوی اس کے طریق تربیت کا ایک پہلو تھا، تو دوسرا اہم پہلو تزکیہ قلوب، صفائی نفوس بھی تھا کہ انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت و تربیت میں قلوب کی اصلاح، روح کے تزکیہ اور نفس کی تطہیر کی اہمیت ظاہری اعمال کی پابندی سے کسی طرح کم نہیں، باطن ہی وہ سرچشمہ ہے، جو اگر صاف و پاک ہو جائے تو رگ رگ ایمان و یقین اور اعمال صالحہ کے آب حیات سے زندہ اور توحید و تقویٰ کے نور سے معمور ہو جاتی ہے، اور اگر یہ سرچشمہ عقائد باطلہ و خیالات فاسدہ سے گدلا رہے تو اعمال ظاہری کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی،

آیات قرآنی اور احادیث نبوی باطنی احوال و اصلاح کی تصریحات و اشارات سے مملو ہیں، اور بقول شخصے " مجھے تو کوئی ایسی آیت و حدیث نظر نہیں آئی جس میں تصوف نہ ہو" حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک مولوی صاحب سے جو تصوف و سلوک کے قائل نہ تھے، راقم کی موجودگی میں طریق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا،

" علوم دو طرح کے ہیں، ظاہری و باطنی، دونوں قرآن و حدیث سے ثابت ہیں، ظاہری و باطنی علوم کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری علم کے بتانے والے اور ہوں اور باطنی کے دوسرے، بلکہ اس کی مثال یہ ہے، ایک شخص نماز نہیں پڑھتا، اسے بتایا جائے کہ نماز فرض ہے، یہ ظاہری علم ہے، باطنی وہ ہے جو اعمال قلب سے متعلق ہے، جیسے ریا، کبر، حب جاہ وغیرہ قلب کے امراض ہیں، امراض قلب کو امراض باطنی کہتے ہیں، اور جو علوم امراض باطنی سے متعلق ہیں انھیں علوم باطنی کہتے ہیں، بغض، ریا، کینہ وغیرہ بری چیزیں ہیں، ان کا علاج کیوں نہ کیا جائے، حدیث میں ہے ان الحسد یاکل الحسنات اسی طرح ایک شخص نماز پڑھتا ہے، دیکھا جائے نماز میں اس کی روح بھی ہے یا نہیں، بتایا جائے خشوع کیونکر حاصل ہو، جس طرح علم ظاہری ضروری ہے اسی طرح علم باطنی بھی ضروری ہوا، اور نصوص سے ثابت ہے"

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ خلفاے راشد جو آپ کے بعد مسند ارشاد پر بیٹھے تعلیم کتاب وسنت کے ساتھ تزکیۂ روح و اصلاح قلب کی دولت سے بھی نوازے گئے کہ اس کے بغیر نبوت کی نیابت کا پورا فرض انجام نہیں دے سکتے تھے، کیونکہ ظاہر و باطن کی جامعیت کے بغیر انسان کی کامل اصلاح محال ہے، سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول "باطن کی صفائی اور قلب کی تابانی کے بغیر محض زبان کی روانی اور قلم کی جولانی سراب کے نمونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی"

قلب و باطن کی اس اہمیت کی بنا پر وہ قدسی صفات ہستیاں جن کے ذریعے سے انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیغام کو عالم میں پھیلایا گیا، زندہ و روشن دلوں اور نورانی روحوں کی حامل رہی ہیں اور ان کے قلوب تقوی کے نور اور حضور و معیت کے استحضار سے چمکتے رہے،

قرب بے غیبت نماز عاشقاں فی صلوٰۃ دائمون آرزو ست (سید صاحبؒ)

اور سنن نبویہ کا کامل اتباع ان کے ظاہر و باطن اور خلوت و جلوت کا معمول رہا، اور کتاب و سنت ہی کے نور سے وہ اپنے دیدہ و دل کو منور کرتے اور اپنی زندگی کو کتاب و سنت کا نمونہ بنا کر پیش کرتے رہے،

حضرت شیخ فرماتے تھے

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہر وقت جاری ہیں، اپنے میں استفادہ کا مادہ ہونا چاہیے اور اس کی صورت حضور علیہ السلام کی محبت عقلی ہے جس کا مظہر اتباع احکام و سنت ہے"

ایک دوسرے گرامی نامہ میں ارقام فرمایا،

"بے شبہہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سے ہر امتی بقدر استعداد بہرہ ور ہوتا ہے، اور ہوتا رہیگا، مگر اس کو منصب نبوت سے کوئی تعلق نہیں، کہ وہ بند ہو چکا"

ایک مرتبہ فرمایا کہ

"زندہ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کیجئے، جیسے دیئے سے دیا روشن ہو جاتا ہے صحبت سے دل روشن ہو جاتے ہیں۔"

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:-

"جیسے چراغ کو چراغ جلاتا ہے، اسی طرح جن کے قلوب میلے ہو چکے ہیں وہ روشن قلوب سے جلا دیں تو صاف اور روشن ہو جائیں گے، سراجاً منیرا قرآن میں کہا گیا ہے، جو صلحا موجود ہیں ان کے چراغ جلے ہوئے ہیں، شجرہ میں ان چراغ جلے ہوؤں کے نام لکھے ہیں، جیسے محدثین اپنی سندیں ملاتے ہیں، اسی طرح یہ چراغ جلے ہوئے اپنا سلسلہ (شجرہ میں) ملاتے ہیں، صحراؤں میں رکھے ہوئے چراغوں میں تو حرکت نہیں، اپنے اندر انوار پیدا کیجئے، دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی، ہمارے آپکے دل خالی ہو جائیں لیکن ابھی اللہ کے بندے موجود ہیں۔"

اندھیرا ہے عالم میں چھایا ہوا چراغ جہاں قلب آگاہ ہے (سید ملت)

ایک مرتبہ نہایت درد سے فرمایا:

"جو بھی آتا ہے یہی کہتا ہے چودہ طبق روشن ہو جائیں یہ کوئی نہیں کہتا دل روشن کر دیجئے۔"

سیدی و مولائی حضرت الشیخ رحمہ اللہ تعالیٰ ان ہی زندہ دل ہستیوں میں تھے جنھیں تقدیر الٰہی انسانوں کی اصلاح و فلاح، تربیت و تزکیہ اور دعوت و ارشاد کے نبوی فریضہ کی نیابت کے لیے چنتی ہے، اس لیے تربیت علیٰ منہاج النبوۃ سے آپ کو حصۂ وافر ملا تھا، اور روشن دل عطا ہوا تھا، جیسا کہ خود حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ کا ارشاد ہے

اے دلت پر نور از انوار حق اے دلت مسرور از اخبار حق
اے دلت معمور از اسرار حق اے دلت مخمور از آثار حق

اس لیے حدیث دل کے طلبگاروں کے لیے اس درویش بے گلیم کا آستانہ سکون وطمانیت کا مرجع تھا،

ایک مرتبہ فقیر نے دار منزل کے غرفہ کدہ میں جو آج ہزاروں سینہ فگاروں کا حریم شوق ہے عرض کیا "حضرت والا، کیا کسی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ع

نگاہ مست ساقی نے مری دنیا بدل ڈالی

فرمایا، جی ہاں، سچ ہے، میرا بھی ایک شعر ہے،

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

پھر متبسم نگاہوں سے مجموعۂ غزلیات سے اپنا ایک دوسرا شعر نکال کر پڑھنے کو دیا،

تری نظر میں ہے تاثیر مستیٔ صہبا تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے (سید اللہ)

یہ شعر پڑھ کر ساقی کی پرمعنی نگاہیں سالک کے چہرہ پر تھیں اور اسکا دل تھا کہ اڑا جاتا تھا،

شراب دیتے ہوے اس پہ چشم ساقی تھی سرورمے میں کہاں سب نشہ نگاہ میں ہے

مدہوشی و سکر کا یہ عالم اس ارشاد سے ہوش سے بدل گیا،

"آپ نے شعر پڑھ لیا"

عرض کیا۔ 'جی ہاں' اور سرور دل و جان کی رگ رگ میں سرایت کر گیا،

ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تصوف چند اوراد و اذکار اور چند مروجہ رسوم کا نام نہیں، بلکہ توحید کے ارفع و اعلیٰ مقام کا نام تھا، دل میں عقائد حقہ کا ایسا ایقان و اذعان ہوجائے کہ قال حال بنجائے اور حب الٰہی کے سامنے غیر کی محبت ماند ہوکر خلوت خانہ محبوب حقیقی کیلیے خاص ہوجائے احسان و تقویٰ طبعی تقاضے کی صورت اختیار کرلے، اخلاق نبوی کا پر تو ہر عمل میں جھلکنے لگے، حقوق العباد کی رعایت معاملات کی صفائی اور معاشرت کی پاکیزگی میں ادنیٰ کوتاہی نہ ہونے پائے، اعمال صالحہ سے رغبت اور برائیوں سے اجتناب فطرت ثانیہ بن جائے، غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریق حیات کے کامل و مکمل، ظاہری و باطنی اتباع کا نام تصوف ہے،

اندریں رہ مے تراش و مے خراش تا دم آخر دمے غافل مباش

حضرت والاؒ تحریر فرماتے ہیں:

"بندہ ہر حال میں گنہگار ہے، اور خدا کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف اور اپنی غلط کاری اور تساہل پر ندامت اور آئندہ گناہوں سے بچنے اور احکام الٰہی پر عمل کرنے پر استقامت اور ساری عمر اسی ریاضت میں گذار دینا ہی بندگی ہے۔"

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ ظاہر و باطن کے اوامر و احکام کی کامل فرماں برداری و امتثال ہی اصل طریق ہے، کتاب وسنت کے دائرے کے باہر شرعی تصوف کا کوئی وجود نہیں، اس کے خلاف جو چیز ہے وہ محض الحاد و زندقہ، بدعت و گمراہی ہے، حضرت شیخؒ فرماتے ہیں

لے جائیگا منزل سے بہت دور بشر کو جو جادہ سفر کا ترے جادے کے سوا ہو (سید سلیمان)

اس لیے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مسترشدین کو اسی حقیقت کی طرف ہمیشہ متوجہ فرماتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت والا رحمہ اللہ کے مکاتیب سے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں۔

۱۔ "تقویٰ کا خیال، حلال وحرام کی فکر، جائز و ناجائز کی تمیز ہر کام میں ضروری ہے، تقویٰ اصل اعمال ہے، یَا أَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ...... لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ"

۲۔ "تمام گناہوں سے بچنے کا اہتمام رکھیے، اگر غلطی سے کبھی ہو جائے تو یاد آنے پر فوراً استغفار کیجئے اور نیا عہد کیجئے کہ ان شاء اللہ اب اپنے قصد سے اس کا ارتکاب نہ ہوگا۔"

۳۔ "یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف والہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں، ان باتوں کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں، قرب الٰہی صرف ایمان و عمل صالح کا نتیجہ ہے۔ اس لیے دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیے۔"

۴۔ "کیفیات و احوال کی طرف توجہ نہ کیجئے، صرف حسن عمل اور کثرتِ ذکر کی طرف توجہ رکھیے۔"

۵۔ "معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے، اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں..... اصل میں یہی مرحلہ ہے جس کی طرف توجہ کم کیجاتی ہے۔"

۶۔ "اصل نظر اپنے احوال قلب اور اعمال پر رہنی چاہیے کہ صراطِ مستقیم سے کسی حال میں لغزش نہ ہو۔"

۷۔ "نجات تو صرف فضل الٰہی کا کرشمہ ہے، عقائد و اعمال کی صحت اس کے لیے بمنزلہ شرط کے ہے، بس اس میں مصروف رہنا چاہیے تاکہ اس کے فضل میں حصہ مل سکے۔"

۸۔ "اصل معاملہ عمل کا ہے، اس سے ترقی و تنزل کا اندازہ ہوتا ہے، معمولات اور احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز یہی اصل چیز ہے۔"

۹۔ "یہ سب احوال مبارک ہیں، مگر اصل شے اتباعِ احکامِ الٰہی کا اہتمام ہے۔"

۱۰۔ "امورِ خیر کی تعمیل اور گناہوں سے بچنا انسان کے اختیار میں ہیں، پس آپ سب وسوسوں اور خیالات کو چھوڑ دیں، اور دل سے یہ طے کر لیں کہ آج سے اللہ تعالیٰ کے کسی چھوٹے بڑے حکم کے خلاف نہیں کریں گے۔"

مولانا مسعود عالم ندویؒ کو مختلف مکاتیب میں اسی حقیقت سے آگاہ فرمایا ہے، چنانچہ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بار بار اپنی خوشی و راحت اور اپنے کسی فعل پر اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کو منجانب اللہ فضل محض بلا استحقاق کرنا ہی احسان کا زینہ ہے جس کا رسمی نام تصوف ہے، ولا مشاحة فی الاصطلاحات، ہم نے اب اس کا نام طریق تقویٰ رکھنا چاہا ہے، اسلام، ایمان اور احسان یا اتقاء، تین ارتقائی منازل ہیں، اسلام اطاعت ہے، ایمان اس اطاعت پر سکینت اور طمانیت ہے، اور اتقا یا تقویٰ دل کی وہ کیفیت ہے جس سے امور زیر ایمان پر عمل بسہولت

مداومت قائم ہو جائے، وللہ الحمد" (مکاتیب سلیمان ص ۱۶۰)

ایک دوسرے گرامی نامے میں مزید تشریح فرمائی ہے۔

" لفظ تصوف کا احسان کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے، جیسے حکمت کے ساتھ لفظ فلسفہ بولا جائے یا آجکل سائنس یا فلاسفی کہہ دیا جائے، بزرگوں نے لفظ احسان کو ان معنوں میں رکھا ہے اور ٹھیک ہے، کہ اس کا ورود حدیثوں میں ہے، لیکن اب تو مجھے اس کے لیے تقویٰ اور اتقا، کی اصطلاح اچھی معلوم ہوتی ہے کہ اس کا ورود قرآن پاک میں بکثرت ہے، اور عبادات بلکہ تمام ماموراتِ الٰہیہ کا مقصود اسی کیفیت کا حصول معلوم ہوتا ہے، ولا یخفی ذٰلک علی من یتتبع کتاب اللہ ...... معلوم ہوا کہ احسان کا درجہ ایمان سے اونچا ہے، اور اس کے بے شمار مدارج ہیں، مدارج قرب واقربیت کما لا یخفی جس طرح ایمان کا حصول شہادت پر مبنی ہے، احسان کا قرب کمال ایمان و تقویٰ پر ہے..

..... الغرض ہمارے علماء ظاہر نے صرف اس ایمان پر توجہ فرمائی ہے جو کفر کے بالمقابل ہے، اور علماے باطن نے اس کے بعد کی منزل کی رہبری کی، اور درجات و مدارج قرب کی نشاندہی فرمائی"

"..... طلب رضا اور اپنے ہر عمل میں طلب رضا کا شعور پیدا ہونا ہی اس طریق کا حاصل ہے" اور جب خدا اور بندہ کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو نسبت کہتے ہیں، اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یحبہم ویحبونہ اور رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ میں کی گئی ہے۔ یا ایہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ان ہی کے لیے نوید بشارت ہے" (ص ۱۱۴-۱۶۷، مکاتیب سلیمانی)

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ سلوک طریق حصول احسان و تقوی کا نام ہے، جس کا اصلی مقصد رضاے الٰہی ہے، اور یہ احسان و تقوی اور رضاے الٰہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل و مکمل ظاہری و باطنی اتباع ہی سے حاصل ہو سکتی ہے،

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

" غیر ماثور طریقے ہرگز اختیار نہ کریں" (مکاتیب سلیمان ص ۱۷۶)

اپنے نعتیہ اشعار میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت | جو پیرو احمد ہے وہ محبوب خدا ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی | محبوب خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے
سنت بیضا راہ تری، جاہ خدا کی جاہ تری | شافع عاصی جاہ تری عرش پہ مسند علےٰ علیٰ
لولاک لما عنوان ترا، فرمان خدا فرمان ترا | پیغام خدا پیغام ترا، ایمان خدا ایمان ترا
تیری محبت دین مرا اور دین ترا آئین مرا | ہر لفظ پہ تیرے یقین مرا عرفان خدا عرفان ترا

ایک دوسرے گرامی نامے میں ارشاد ہوتا ہے

"باقی ترکیات و بدعیات تو ان کا ذکر ہی کیا، لیکن جس طرح مسلمانوں کو دیکھکر اسلام پر آج حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ایسے ہی بازاری دکاندار رنگے ہوئے صوفیوں کو دیکھکر تصوف کو بدنام نہ کیجیے"

(مکاتیب سلیمان ص ۱۶۶ - ۱۶۷)

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ان تمام غیر شرعی عقائد و اعمال کو ناجائز، اور ان رسومات و قیود، فلسفیانہ تعبیرات و خیالات کو جو کہ بیرونی اثرات کی بنا پر تصوف میں داخل ہو گئے ہیں، سخت ناپسند فرماتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے مزاحاً ارشاد فرمایا : "آپ کو فقیری کا ایک آسان نسخہ بتا دوں" میں نے اثبات میں جواب دیا، فرمایا" دو پیسے کا گیروا رنگ لے لیجئے، اور ان سے اپنے کپڑوں کو رنگ لیجئے، اور اگر ایک ٹیڑھا سا ڈنڈا مل جائے تو اور بھی اچھا ہے، اور ہو حق کرنی شروع کر دیجئے، ہو گئی فقیری!..... پھر نہایت دردسے فرمایا "جاہل اور بازاری صوفیوں نے تصوف کا ناس کر دیا"، ایک تبہ لطائف ستہ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "تصوف جو سراسر عمل تھا اسکو فلسفہ بنا دیا، اور یہ یونانی اثر کی بنا پر ہوا"، فرماتے تھے "اسوقت دنیا میں تین قسم کا

تصوف ہے، ایک ملحدانہ تصوف، دوسرا عامیانہ یا بازاری تصوف، تیسرا صحیح اور اسلامی تصوف اور وہی حق ہے"۔

ملحدانہ تصوف، حکمائے فلسفیانہ موشگافیوں، نو افلاطینیت اور یوگ اور ویدانت سے متاثر ہوکر الحاد و زندقہ اور وحدۃ الوجود وغیرہ کی غلط تعبیرات سے صریح شرک اور عملی تعطل بن گیا، جاہل صوفیا نے تصوف کی غلط تعبیرات کا ایسا صور پھونکا کہ اس کی تاریکی میں اصل تصوف کا نور گم ہوکر رہ گیا، احکام کی کامل پابندی، سنن نبوی کا اتباع، فضائل اخلاق کا حصول، رذائل کا ترک، خلوص عبدیت اور احسان وتقویٰ کی تحصیل، قرب و رضائے الٰہی کی لگن، توحید و یقین اور محبت و خشیت الٰہی کی طلب، حضور و ذکر دوام کی تڑپ جو تصوف کے اصل عناصر تھے، نگاہوں سے اوجھل ہوکر رہ گئے، اور عوام کی اعجوبہ پرستی اور متصوفین کی بے راہ روی نے کشف و کرامات، الہام و وجدانیات ہی کو اصل تصوف اور سلوک کا مقصد قرار دیدیا، حالانکہ ان چیزوں کو مقاصد تصوف میں کوئی دخل نہیں، یہ صرف انفعالات اور مجاہدات کے ثمرات عاجلہ اور محض راہ کے تماشے ہیں، جو اگر کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو محمود ہیں لیکن مقصود نہیں کہ اصل مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے، جو صرف عقائد حقہ اور ایمان صالحہ کا نتیجہ ہے، اور ان اشیاء (کشف و کرامات وغیرہ) کو رضا اور قرب الٰہی میں قطعاً کوئی دخل نہیں، بلکہ بسا اوقات یہ چیزیں مانع طریق اور تنزل کا سبب بنجاتی ہیں، کیونکہ سالک ان "بزرگانہ اوہام" "روحانی حجابات" اور "پاکیزہ شعبدوں" میں اس طرح الجھ کر رہ جاتا ہے کہ اصل مقصد بلکہ راستے ہی کو گم کر دیتا ہے، اور تمام عمر ان ہی شعبدہ بازیوں میں سرگرداں اور ان کو حق کا نشان اور رضائے الٰہی کا ثمرہ و انعام سمجھ کر گمراہی اور جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے،

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوز مشتاقی　　فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

حضرت سیدی قدس سرہٗ اپنے متعلقین کو ہمیشہ اس حقیقت سے آگاہ و متنبہ فرماتے رہتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

۱۔ "کیفیات آتی جاتی ہیں، کشف والہام کو قرب میں کوئی دخل نہیں"

۲۔ "یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف والہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں، ان باتوں کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں، قرب الٰہی صرف ایمان وعمل صالح کا نتیجہ ہیں، اس لیے دوام ذکر اور کثرتِ اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیے۔"

ایک طالب نے لکھا تھا کہ "نماز میں اسرار وغیرہ منکشف کردیئے جاتے ہیں اور وارداتِ صحیحہ کا بعض اوقات بہت زیادہ نزول ہوتا ہے۔" اس کے جواب میں سیدی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عتاباً تحریر فرمایا:

"نماز کشفِ اسرار اور وارداتِ صحیحہ کا محل نہیں، یہ صرف عبودیت وعبدیت وتواضع وحضور کی کیفیت کا محل ہے، آپ ان شعبدوں کی طرف التفات نہ کریں، یہ امور قرب الٰہی میں کچھ دخل نہیں رکھتے، اور نہ اس سے حصولِ ثواب ہوتا ہے، کیا ریل میں راستہ کے مناظر پر نظر منزلِ مقصود کو قریب کردیتا ہے؟ کیا یہ خیال حماقت نہیں"،

کسی طالب نے تحریر کیا "الحمد للہ کیفیات واحوال کی طرف توجہ نہیں رہی، بلکہ ابتدا میں کشف وغیرہ کا جو عموم تھا اب نہیں ہے، اور نہ ہی اس کی طرف رغبت ہے"، اس کے جواب میں حضرت شیخؒ نے ارقام فرمایا:

"بحمد اللہ تعالیٰ کہ آپ نے اس گھاٹی کو پار کرلیا۔" اسی طالب کو ایک دوسرے مکرمت نامے میں تحریر فرمایا ہے:۔

"اب جو یہ صورتِ حال تواضع اور افتادگی کی پائی جاتی ہے، اس حال سے بہتر ہے جو آپ کی کشف وواردات کی تھی، وہ راہ خطرناک تھی کہ اس میں کبر وغرور کا شائبہ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ مانعِ ترقی ہے۔"

مندرجۂ بالا مباحث سے یہ چیز واضح ہوگئی ہے کہ حضرت سید الملۃ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سلوک صرف چند اوراد و اشغال اور احوال باطنی کا نام نہیں، بلکہ پوری زندگی کو سدھارنے، طریق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بنانے اور کمال تقویٰ و احسان کے حصول کی کوشش کا نام ہے جس میں کشف و کرامات وغیرہ کو کوئی دخل نہیں، اس لیے ظاہری بد اعمالیوں اور فسق و فجور اور احکام الٰہی اور سنت نبویؐ کی خلاف ورزی کے ساتھ باطن کی اصلاح قلب کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور دل کی نورانیت کا گمان ایک واہمہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، اور ایسے لوگوں سے اگر کسی خرق عادت چیز کا ظہور بھی ہو جائے تو نری شعبدہ بازی، استدراج و اہمال ہے، جو کبھی بھی مقبولیت الٰہی اور قرب خداوندی کا نشان نہیں ہو سکتا، حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

شعلے اٹھیں ہزار تجلی مگر کہاں ‏ ‏ ‏ یہ آگ ہے ضرور مگر طور کی نہیں

اس بنا پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ ظاہری اعمال کی اصلاح، اخلاق کی پاکیزگی، معاملات کی صفائی اور معاشرت کی درستگی اور حلال و حرام کی تمیز کو تصوف کا سب سے بڑا مقصد اور سالکین کے لیے ضروری سمجھتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ

"حضرت والا (مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے آخری دور میں اوراد و وظائف اور اشغال کی تعلیم سے پہلے اخلاق و معاملات کی اصلاح کی طرف متوجہ فرماتے تھے، اس سے مقصود یہ تھا کہ سالک کو اوراد و وظائف میں مشغول کرنے سے پہلے اخلاق و معاملات کی صفائی کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اس کیجانب توجہ کم کی جاتی ہے، بسا اوقات ذکر کی برکت سے طالب کے قلب پر انوار و واردات کا نزول ہو جاتا ہے جس کی بنا پر وہ اسی کو مقصد سمجھ لیتا ہے، اور اسی کو بزرگی سمجھ کر اصلاح اعمال اور درستگی اخلاق و معاملات سے غافل ہو جاتا ہے، اس طرح نہ صرف اسکی ترقی رک جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے حضرت الشیخ رحمہ اللہ

سالکین کی تربیت میں اس چیز کا خاص اہتمام فرماتے تھے کہ وہ دین کے تمام شعبوں کی اصلاح اور جملہ اوامر (ظاہری و باطنی) کی پابندی کو اپنا شیوہ بنائیں، اور ایک کو مقصد سمجھ کر باقی سے اغماض نہ برتیں آپ کا پہلا گرامی نامہ جو ایک طالب صدیقی غلام صابر صاحب کے نام ہے جس سے اس اصول پر روشنی پڑتی ہے ذیل نقل کیا جاتا ہے:

"مکرم و محترم حفظکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ فقیر نے آپ کا خط پڑھا، حالات معلوم ہوئے، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے کہ آپ کو صحیح ہدایت نصیب ہوئی کبھی مصیبتیں بھی ہدایت کا باعث ہوتی ہیں، آپ حضرت مولانا تھانوی کی کتابوں میں سے پہلے قصد السبیل پھر تعلیم الدین پڑھیئے، اور حضرت کے جس قدر مواعظ و ملفوظات مل سکیں مطالعہ کرتے رہیں، اور استغفار کی کثرت کریں، اور نماز پنجگانہ باجماعت کا اہتمام کریں، اور معاملات میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کریں، اور اچھے اخلاق اختیار کریں، اور برے اخلاق سے پرہیز کریں، اگر آپ کا جی چاہے، تو مجھ سے خط و کتابت جاری رکھیں، اور اپنے احوال سے مطلع کرتے رہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی مرضیات پر چلائے۔" سید سلیمان

ایک دوسرے طالب کو ارقام فرماتے ہیں:

"تقویٰ کا خیال، حلال و حرام کی فکر، جائز و ناجائز کی تمیز ہر کام میں ضروری ہے، تقویٰ حاصل اعمال ہے۔ یا ایھا الناس اعبدوا ربکم ...... لعلکم تتقون۔"

ایک اور گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"معمولات کی پابندی استقامت کی دلیل ہے، اس کے آثار اعمال، معاملات اور اخلاق میں نمایاں ہونے چاہئیں ......"

دوسرے مکتوب میں اسی طالب کو لکھا، "جی ہاں یہی مرحلہ ہے جس کی طرف توجہ کم کیجاتی ہے،

اس کے لیے ضرورت ہے کہ رسالہ صفائی معاملات پڑھیں"۔

ایک مرتبہ راقم چند سیاسی ساتھیوں کے ہمراہ پشاور سے کراچی کے سفر کے لیے روانہ ہوا، خوش قسمتی سے لاہور کے اسٹیشن سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی معیت کراچی تک نصیب ہوگئی، سکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ تھا، باقی رفقاے سفر بھی اپنے ہی ساتھی تھے، لاہور سے گاڑی روانہ ہوئی تو ایک سیٹ پر میں اور حضرت سید ی قدس سرہٗ بیٹھ گئے، حضرت والاؒ کی طبیعت نہایت مضمحل تھی، اور نیند کے غلبہ کی بنا پر گردن مبارک بار بار ادھر اُدھر جھک جاتی تھی، میں نے یہ دیکھ کر پیچھے تکیہ رکھنے کی کوشش کی، لیکن عجیب لبرانہ تبسم کے ساتھ انکار فرمادیا، کچھ دیر کے بعد حضرت والاؒ کے اضمحلال، ضعف اور نیند کے غلبہ کو دیکھ کر ہمارے ایک ساتھی نے عرض کیا "حضرت آپ لیٹ جائیں، اور آرام فرماویں، اشرف صاحب ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں گے"، حضرت والاؒ نے اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے فرمایا "گاڑی میں بارہ گھنٹہ کا جلسہ ضروری ہوتا ہے"۔ مراد یہ تھی کہ ریلوے کے قوانین کے مطابق دن کے اوقات میں بیٹھنے کی جگہ سے زیادہ جگہ لیٹنے کے لیے استعمال نہیں کرنی چاہیے، اس بنا پر لیٹنے سے معذوری ہے، تقویٰ اور صفائی معاملات کی ایسی نظیریں کہاں ملتی ہیں، اسی سفر میں راقم نے چائے منگوائی، اور حضرت والاؒ نے بھی میرے ساتھ نوش فرمائی، چائے پینے کے بعد 'بل' پوچھا، فقیر نے بلطائف الحیل ٹال دیا، کراچی اترنے سے پیشتر پھر ارشاد فرمایا "آپ نے بل نہیں بتایا" عرض کیا "حضرت میں ادا کرچکا ہوں، کوئی بڑی رقم نہیں"۔ فرمایا "کیا معلوم آپ کے حالات اس کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں"۔ حضرت والاؒ کے اصرار پر مجبوراً رقم بتانی پڑی، جو اسی وقت ناکارہ کو عطا فرمادی۔

ایک مرتبہ دارمنزل میں حاضری ہوئی، دوران ملاقات میں ایک مستعمل ٹکٹ جس پر مہر کا کوئی نشان نہیں تھا، اور دوبارہ استعمال کیا جاسکتا تھا، بندہ کو دکھا کر استفسار فرمایا، کیا اس کو دوبارہ استعمال کیا جاسکتا ہے؟ عرض کیا تقویٰ کے خلاف ہے"۔ فرمایا " تقویٰ کے تو خلاف ہے، فتوی کیا ہے"؟

عرض کیا آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا "ناجائز ہے" اور اسے چاک فرمادیا،

ایک سفر میں ملتان اتر کر مدرسہ خیر المدارس تشریف لے گئے، خادم ساتھ تھا، چہرہ مبارک راستے کے گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا، اس لیے وضو کے وقت صابن کا استعمال فرمایا۔ احقر نے دوران وضو میں لوٹا لیکر پانی ڈالنا چاہا، حضرت والاؒ نے یہ کہکر انکار فرمادیا کہ "آپ کو نیت کا سوال تو ل ہی گیا، دوسرے سے وضو کرانے میں پانی زیادہ صرف ہوتا ہے۔ جو مستحسن نہیں"۔

لائلپور کے ایک سفر کی واپسی میں (جس میں خاکسار کو خدمت کی سعادت نصیب ہوئی تھی) حضرت والاؒ کے بستر میں سے ایک روپیہ نکلا، میں پشاور جا چکا تھا، خط میں استفسار فرمایا "یہاں واپسی میں میرے بستر سے ایک روپیہ نکلا، میرا نہیں ہے، معلوم نہیں کس کا ہے، آپ کا تو نہیں"، میں نے جواباً لکھا کہ میرا نہیں اور ایک دو رفقاء سفر کے نام لکھ دیے کہ ان سے پوچھ لیا جائے، تحریر فرمایا "ان میں سے کسی نے اپنا ہونا نہیں بتایا، میں نے پوچھا تھا"۔ اسی طرح ایک دوسرے پشاوری طالب کا فونٹن پن حضرت شیخ قدس سرہٗ کے مکان پر رہ گیا اور وہ پشاور آ گئے، حضرت والا نے راقم کو تحریر فرمایا کہ مرتضیٰ صاحب کو سلام کے بعد کہہ دیں کہ ان کا فونٹن پن یہاں چھوٹ گیا ہے، اگر ان کا ہے تو اس کے بھیجنے کی تدبیر بتائیں"۔

ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں آپکے استعمال کی تمباکو الائچی دانہ پیش کی شیشی کے لیبل پر تصویر تھی، حضرت والاؒ نے اس کاغذ کی تصویر کا گردن سے اوپر کا حصہ اڑادیا، جو انتہائی احتیاط کی دلیل ہے،

گو بظاہر یہ واقعات معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان ہی سے تقویٰ کے اتباع کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی تھا کہ مسترشدین کو کسب حلال کی اکثر تلقین فرماتے تھے جس سے اس رسمی توکل کی تردید ہو جاتی ہے جو لوگوں کو اپاہج اور ناکارہ بنا دیتا ہے، اس کے متعلق بعض ارشادات ملاحظہ ہوں:

"تعلیم اور طلب رزق کے اسباب میں سستی نہ کیجئے کہ اس پر نفس کا اطمینان موقوف ہے جس کی بہت ضرورت ہے"،

ایک صاحب کے اس سوال کے جواب میں کہ "طلب رزق کے اسباب میں کوشش اور مشورہ طلبی توکل کے منافی تو نہیں"،

ارقام فرمایا: "ہرگز منافی نہیں، طلب رزق حلال بندہ پر واجب ہے، اس کی تدبیر اختیار کرنا بھی واجب، مگر نظر اللہ تعالیٰ پر رہے کہ وہی رزاق ہے"۔

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں: "طلب رزق حلال از جملہ فرائض و واجبات ہے، اس سے تو کسی حال میں تغافل درست نہیں، اللہ تعالیٰ مدد فرمادیں اور غیب سے سامان فرمادیں"۔

ایک طالب کو تلقین ہوتی ہے: "بے شبہ معاشی پریشانیاں بڑی آزمائش ہیں اس کے لیے جو تدبیر سمجھ میں آئے کیجئے برکت دینے والے اللہ ہیں، هو الرزاق ذو القوة المتين"۔

اسی طالب کو دوسرے مکتوب میں ہدایت ہے: "معاشی پریشانیوں کا علاج دعا اور تدبیر دونوں سے کرنا چاہیے"۔

راقم کو تحریر فرمایا: "تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں کہ یہ حصول رزق کی کوشش ہے، اس نسبت سے یہ تعلیمی جدوجہد بھی عبادت ہی میں شمار ہوگی، با ایں ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر کو قائم رکھیں"۔

دوسرے طالبوں کے مختلف خطوط میں بھی اسی طرح کی ہدایات پائی جاتی ہیں۔

"دنیاوی پریشانیاں اگر علاج پذیر ہیں تو تدبیر سے کام لیجئے، اور اگر علاج سے باہر ہیں تو حوالہ خدا کیجئے، کہ جو ہمارے حق میں مفید ہوگا وہ فرمائیں گے"۔

"رزق حلال کی کوشش بھی دین کے اجزاء میں سے ہے، نیت درست ہو تو یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے"۔

"طلب کسب حلال فرض ہے جب دیگر ذرائع کامیاب نہیں تو ملازمت میں کیا حرج ہے، اگر وہ کسی شرعی وجہ سے ناجائز نہیں، آپ دعا اور تدبیر میں لگے رہیں، جب صورت اچھی نکل آئے تو تجارت شروع کر دیں"۔

ان اقتباسات سے "سلوک سلیمانی" میں رزق حلال کی طلب اور معاشی تگ و دو کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

'سلوک سلیمانی' میں دعوت و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کے علاوہ سیاسیات کی تربیت بھی داخل تھی، اور سالکین کو کبھی کبھی مجاہدانہ اور سپاہیانہ زندگی کی تلقین بھی فرماتے تھے جس کا خانقاہی زندگی میں عموماً گذر نہیں، گو جہاد بالنفس، جہاد بالسیف اور قتال فی سبیل اللہ سے کم نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کی زندگی کا جہاد بالنفس ہی جس طرح مدنی زندگی کی سرفروشانہ اور عسکرانہ زندگی کی تربیت گاہ تھا، اسی طرح صحیح خانقاہی زندگی ان میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالی و جمالی شان کے مظاہر بدر و حرا اور حنین و شعب ابی طالب دونوں ہیں، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصی صفت یہی تھی کہ وہ رات کو عابد شب زندہ دار اور دن کو میدان جنگ کے شہسوار تھے، کامل اسلامی زندگی کی یہ جلالی (عسکریت) اور جمالی (سلوک و تصوف) شانیں ہم نے اسی مرد حق آگاہ میں پائیں، حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے سلوک کی یہ دو گونہ دلکشی اسی ذات جمیل و جلیل صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تھا، جو اس عالم میں جلالی و جمالی صفات الٰہیہ کا برزخ کامل تھا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا   بشیری ہے آئینہ دار نذیری

متعدد بار حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس عاجز کو تلقین و ترغیب کے طور پر اپنے مخصوص انداز میں فرمایا "آپ کو عسکریت سے دلچسپی نہیں"۔ ۱۴ اگست ۱۹۵۳ء کو یوم پاکستان کے سلسلہ میں ہوائی مظاہرہ اور فوج کی پریڈ تھی، اس سے پہلی رات مجھ سے استفسار فرمایا، کیا آپ مظاہرہ دیکھنے جائیں گے؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو ارشاد فرمایا، "آپ کو عسکریت سے دلچسپی نہیں"۔ ایک دوسرے طالب کے انکار پر فرمایا، آپ صرف خانقاہی زندگی سے دلچسپی رکھتے ہیں، پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، "ان فوجوں کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے، کم از کم انھیں اپنی فوجیں تو کہہ سکتے ہیں"۔ ان ارشادات سے حضرت کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، جو عصری سلوک میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔

اسی طرح سیاسیات کے متعلق بھی سالکین کے لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص نظریہ تھا،

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ عصری سیاست کو خالص اسلامی سیاست نہیں سمجھتے تھے اور اس میں انہماک مناسب نہیں جانتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ پاکستان کے ایک مشہور پیر کے متعلق فرمایا، پیر... صاحب کو اب کس طرح ادھر (خالص دین کی خدمت کی طرف) لایا جائے، وہ جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ سب کچھ سیاست ہی ہے مذہب کچھ نہیں، منہ کو خون لگ گیا ہے۔ چٹخارہ ہے "اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی"

ایک طالب نے سوال کیا موجودہ سیاست کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا "کہاں کی سیاست، اصل کام تو مسلمان بننا اور بنانا ہے"۔ فرمایا کرتے تھے: "اسلامی سیاست دعوت کے بعد پیدا ہوتی ہے"، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دعوت میں سیاست خود بخود آجاتی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فائننس کے وزیر اور سیاسی قوتیں جمع نہیں کیں، نہ یہ کہا کہ آؤ ملکر حکومت کریں، صرف کلمہ کی طرف لوگوں کو بلایا، دین کی دعوت دی، سیاست ذیل میں خود بخود آگئی، گو اسلام میں سیاست اور دعوت علیحدہ نہیں ہے، لیکن سیاست کے منافع اور مضرے دعوت پر بھی اثر پڑتا ہے، اور بسا اوقات سیاست کی وجہ سے دعوت کو نقصان پہنچ جاتا ہے ......"

راقم کی ایک سیاسی ناکامی پر ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا"، اور ایک دوسرے موقع پر ایک صاحب سے میری اس ناکامی کا تذکرہ کرکے فرمایا "سیاست کا کچھ تجربہ انھیں ہوا ہے، اب سمجھے ہیں کہ یہ کونین کی طرح کڑوی گولی ہے"، اور اسی کے متعلق مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا "الخیر فی ما وقع۔ بہر حال آپ کو سیاسیات کا تھوڑا سا تجربہ ہوگیا"۔ اپنے سیاسی انہماک کی وجہ سے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں بھی حاضری ہوتی تو سیاسی باتیں اکثر چھیڑ دیتا، ایک مرتبہ ندامت کے طور پر عرض کیا، حضرت آپ کی مجلس کے آداب بجا نہیں لاتا، اور سیاسی بکواس شروع کر دیتا ہوں، فرمایا "کیا حرج ہے، انسان وہی اگلتا ہے جو اندر ہوتا ہے، اچھا ہے قے ہو جائے گی"۔ خدا کی شان حضرت کے اس ارشاد کے بعد روز بروز سیاسی جھمیلوں سے بیزاری اور عملی سیاست سے کنارہ کشی

کا میلان بڑھتا رہا یہاں تک کہ تعلیمی خدمت میں مشغول ہو رہ گیا، جب حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع دی گئی تو ارقام فرمایا "جماعتی کاموں میں اتنی کثیف گندگی ہے کہ اس کا ازالہ ہم ضعفاء سے ممکن نہیں"۔ تاہم حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے آخر وقت تک سیاست کے چھوڑنے کا حکم نہیں دیا، بلکہ میری آخری حاضری کے ایام میں ایک مرتبہ جب سیاسی خرابیوں کا تذکرہ چھڑا اور ایک دوسرے صاحب نے راقم سے کہا، آپ اس گندی سیاست کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ حضرت والا نے اس موقع پر فرمایا "یہ معاملہ ہر ایک کی اپنی قوت وضعف اور نیت کا ہے"۔ ایک مرتبہ راقم نے تحریر کیا کہ "موجودہ سیاست کے ساتھ چلنا اور انھیں صحیح بنیادوں پر اٹھانا نہایت ہی دشوار کام ہے، قدم قدم پر پاؤں ڈگمگاتے ہیں، اللہ تعالیٰ رحم فرماویں"۔ اس کے جواب میں ارقام فرمایا:

'تو پاک باش مدار از کس باک'

ایک مرتبہ راقم بغیر اپنی کوشش کے ایک اہم سیاسی جماعت کا عہدہ دار بنا دیا گیا، حضرت کو مطلع کیا تحریر فرمایا" اللہ تعالیٰ اس کی قوت آپ کو عطا کریں، جب واقعہ ہو چکا تو مشورہ دینے کا موقع نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر کریں"۔

رفقاء کے پیہم دباؤ کی بنا پر عاجز نے سرحد اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہونے کا مشورہ طلب کیا، تو نہایت ہی بلیغ جواب تحریر فرمایا

"یہ معاملہ اپنی قوت وضعف کا ہے، اگر آپ یہ قوت اپنے میں پاتے ہیں یا کم از کم ارادہ رکھتے ہیں کہ مواقع خیر میں خیر کی اعانت کریں گے تو کھڑے ہو جائیں، مگر انتخاب کے لیے وہ مکائد و وسائل کام میں نہ لائیں جو اہل دنیا اور طالب جاہ و مال کرتے ہیں، پس جاہ و مال کی طلب سے خالی ہو کر کرنے کی طاقت پائیں تو کھڑے ہوں"۔

ایک مرتبہ چند شامی نوجوان خدمت میں حاضر ہوئے، اور نظام اسلامی اور شریعت کے نفاذ پر بات چیت ہوئی. ان کے رخصت ہونے پر حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فقیر سے فرمایا:

"آج ہر جگہ نوجوانوں میں دینی احیا اور شریعت کے نافذ کرنے کا جذبہ ہے لیکن کیا کیا جائے کہ سٹیرنگ دوسروں کے ہاتھ میں ہے"

مذکورۂ بالا ارشادات سے سیاست کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کے مسلک پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے کہ سیاست کو مقصد سمجھ کر اس میں انہاک کو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن اگر سیاست کو دین وخیر کے فروغ کا سبب و ذریعہ سمجھکر کمال احتیاط سے اپنے کو حب مال وجاہ کی آلائشوں سے بچاتے ہوئے اس میں شرکت کیجائے تو مسلک سلیمانی میں اس کی گنجائش ہے لیکن یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اور حضرت شیخؒ ہی کے الفاظ میں "جماعتی کاموں میں اتنی کثیف گندگی ہے کہ اس کا ازالہ ہم ضعفاء سے ممکن نہیں، تاہم ہر ایک کی اپنی قوت و ضعف اور نیت کا معاملہ ہے"۔

(باقی)

سلیمان نمبر

(مرتبہ شاہ معین الدین ندوی)

معارف کا سلیمان نمبر جسکا شائقین و قدردان معارف کو مدت سے انتظار تھا، مئی میں شائع ہو گیا، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر وسوانح، اخلاق وشمائل، فضائل وکمالات اور انکے علمی و دینی، قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے، پہلے سیرت وسوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین اور مقالات ہیں، اس کے بعد مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں متعدد منظومات اور قطعات تاریخ ہیں، یہ نمبر معارف کے مستقل خریداروں کو ۲ میں اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک کے چار روپیہ میں دیا جاتا ہے، صرف ۱۵ سو چھپا تھا، تھوڑے نسخے اور رہ گئے ہیں، جلدی کیجئے۔

منیجر

حکیم فغفور لاہجانی

از جناب سید اختر مسعود صاحب رضوی لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی

جن تابناک ستاروں نے عہد جہانگیر کے آسمان شاعری کو سجایا تھا، ان میں ایک فغفور بھی تھا، اس شیریں بیان شاعر کے دیوان کا سراغ نہیں ملا، لیکن فارسی شعراء کے اہم تذکروں میں اس کے حالات زندگی، اور اشعار کے نمونے ملتے ہیں، اس مضمون میں ان تذکروں کی مدد سے فغفور کی زندگی کا ایک خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے، اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔

فغفور کا نام محمد حسین اور باپ کا نام سید احمد تھا، جو گیلان کے حاکم احمد خاں کے مقربوں میں سے تھا، فغفور لاہجان میں پیدا ہوا، اور باپ کی وفات کے بعد ایران کی سیاحت کرتا رہا[1] تذکرۂ عرفات العاشقین کے مؤلف سے غالباً اسی دوران میں فغفور کی ملاقات اصفہان میں ہوئی،

"قبل ازآنکہ بہ ہند آید دیرا در صفاہان بصحبت رسیدہ ام ...... سالے از تاریخ تحریر بعرصۂ ہند قدم نہادہ ......"

فغفور گھومتا پھرتا آذربائیجان پہنچا اور وہاں سے گرجستان چلا گیا، کچھ عرصہ گرجستان کے حاکم کی خدمت میں بسر کیا لیکن فغفور کو گرجیوں کے مذہبی عقائد پسند نہ تھے، اس لیے موقع پاکر عراق چلا گیا، یہاں فغفور کی ملاقات حکیم شفائی سے ہوگئی، اس ملاقات میں دو بڑی دلچسپ چوٹیں رہیں جن کا ذکر میخانہ میں اس طرح درج ہے:

---

[1] میخانہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۲ [2] قلمی نسخہ کتب خانہ بانکی پور، ص ۵۱۱ الف۔

"...... اول شفائی متکلم شد و از فغفور به این عبارت کم و بیش پرسید که "میر من تو کجائی؟"
فغفور جواب: "او کرگیلک" آن ہزال بے عدیل فی الحال بہ وگفت کہ "گیلک و کودن بہ حساب جمل
در عدد با ہم مطابق یکدیگر اند" فغفور بے اندیشہ و تامل گفت "وبلے ہم چناں کہ صاحب جمل مرکب
و شفائی بہ ہماں حساب باہم موافق و برابر اند"[1]

شفائی لاجواب ہوگیا اور پھر کبھی اس طرح کی بات نہیں کہی، اس کی خبر ایران کے فرماں روا شاہ عباس صفوی تک پہنچی تو اس نے فغفور کو بلایا اور اس سے گفتگو کی، اس کے بعد فغفور نے شاہ عباس کی شان میں قصیدے کہے اور صلے پائے، لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے حکمراں جہانگیر کی فیاضی اور علمی قدردانی کا دریا اس زور سے بہہ رہا تھا کہ ممتاز شعراء کے کہیں اور قدم نہ جمتے تھے، چنانچہ فغفور نے بھی ہندوستان کا رخ کیا، راستے میں قندھار پڑا، جہاں اس زمانے میں مرزا غازی بیگ ترخان جہانگیر کی طرف سے حاکم تھا، جو علم و شعر کی سرپرستی میں یگانۂ روزگار تھا،[2] اس نے فغفور کو بڑی قدردانی سے اپنے پاس بلایا اور اس سے مہربانی سے پیش آیا، لیکن اس کے دو درباری شعراء مرشد بروجردی اور مولانا اسد قصہ خواں نے فغفور کو پریشان کرنا شروع کیا اور رشک و حسد میں اس کے کلام پر بیجا اعتراضات کرنا شروع کر دیے، حاسدوں کے اس رویے سے فغفور آزردہ خاطر ہوا، اور ایک روز کسی کو اطلاع کیے بغیر قندھار چھوڑ کر لاہور روانہ ہوگیا، مرزا غازی کو تین دن بعد یہ خبر ملی تو اس کو بڑا صدمہ ہوا، اور اس نے اسد اور مرشد کو مخاطب کر کے کہا کہ

"شما بہ شومی حقد جبلی خود ما را رسوا کردید، من در عالم مردم شناسی بسیار دور از کاری دانم
کہ مثل فغفور کسے در ایام حکومت من برسد و بلے آنکہ فیضے بہ بیند مفارقت گزیند"[3]

اور فغفور کو ایک خط لکھا جس میں اپنی برأت کا ذکر کر کے اس کو واپس بلایا، اور اسد اور مرشد کو حکم دیا

---

[1] میخانہ ص ۲۳۳ و ۲۳۴ [2] دیکھیے میرا مضمون معارف نومبر و دسمبر ۱۹۵۲ء [3] میخانہ ص ۲۳۳ و ۲۳۴

کہا کہ تم دونوں نے اس کو دکھ پہنچایا ہے، اس لیے تم لوگ معذرت نامے لکھوا اور اس کو واپس بلاؤ، انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور فغفور کو لکھا، اگر آپ واپس آجائیں تو ہم اپنی خطاؤں کی معافی مانگ لیں اور آپ کے لیے انعامات منظور کرائیں، یہ سب تحریریں اس کو راستے میں ملیں، لیکن اس کی خودداری کو بڑی ٹھیس لگ چکی تھی، اس لیے وہ قندھار واپس جانے پر تیار نہیں ہوا، اور جواب میں یہ رباعی فی البدیہہ لکھکر بھیجدی

ان جیفہ کہ در چنگ دو کرگس باشد — حیف است کہ لوث دامن کس باشد
خر را طلب شاخ زیادت طلبی است[1] — با یک سر خر دو گوش خر بس باشد

فغفور کی یہ رباعی شاعرانہ حیثیت سے کتنی بلند پایہ کیوں نہ ہو لیکن مرزا غازی سے کوئی ایسی سنگین غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی کہ اس کو "جیفہ" اور "خر" سے مخاطب کر کے دشنام طرازی کی جائے۔

فغفور قندھار سے لاہور پہنچا، شہر کی سیر کر کے آگرہ گیا، جو اس کی منزل مقصود تھی، حکومت مغلیہ کے امراء اپنے بادشاہ کی طرح علماء اور شعراء کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کرتے تھے، اور انکو اپنا مہمان بنا کر عزت کے ساتھ رکھتے تھے، آگرہ میں فغفور حکیم علی گیلانی کے ساتھ کچھ دن مقیم رہا، اس کو یہ امید تھی کہ حکیم علی کی سعی و سفارش سے اس کی رسائی شاہی دربار تک ہو جائے گی لیکن اس کی ٹال مٹول سے فغفور بددل اور ناامید ہو گیا اور جب اس کو جہانگیر کا درباری شاعر بننے کی آس نہ رہی تو اس نے کسی شہزادہ کا دامن عاطفت پکڑنے کی کوشش کی اور برہانپور جا کر شہزادہ پرویز کی ملازمت اختیار کر لی (مخزن الغرائب[2]) میں ہے کہ وہ پرویز کا ملازم طبیب کی حیثیت سے ہوا تھا لیکن دوسرے تذکروں میں اس کا ذکر نہیں کہ فغفور کسی حیثیت سے بھی فغفور کے ملازمین کے زمرے میں داخل ہوا ہو، فغفور نے اس کی مدح میں قصائد لکھے، انعام حاصل کیے، شاہزادہ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا اور بڑی عزت کرتا تھا فغفور

---

[1] مے خانہ ص ۴۴۳ - ۴۴۵ [2] سب تذکرے متفق ہیں [3] قلمی بانکی پور کتب خانہ ص ۴۴۴

شاعری کے علاوہ موسیقی، طب، خطاطی، شطرنج بازی اور علم ہندسہ میں بھی دخل رکھتا تھا، تمام تذکرے متفق ہیں کہ فغفور پہلے رسمی تخلص کرتا تھا، بعد میں فغفور اختیار کیا، لیکن صاحب مخزن الغرائب نے ایک واقعہ درج کیا ہے جس سے فغفور کی موسیقی دانی کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تخلص کی یہ تبدیلی کس موقع پر ہوئی۔ اس کا بیان ہے کہ

"اول در ایران رسمی تخلص می کرد بعد از ان فغفور تخلص نمود، سبب آنکہ روزے در مجلس شہزادہ خرمی و نشستہ بود کہ کاسہ نوازے بہ نیز دستی تمام مجلس را محظوظ کردہ بود مگر شہزادہ چندان از و خوش نہ گردید چرا کہ او در چینی نوازی ناقص بود، شہزادہ رو بہ حکیم کرد و گفت شنیدہ ام کہ در ایران چینی نواز خوب بہم می رسد، گفت اگر ادب مانع نباشد بندہ درین کار ہم دستے دارد۔ فرمود بسم اللہ ازین چہ بہتر، حکیم بطریقے کاسہ نواخت کہ شہزادہ فتنہ او گشت و او را فغفور خطاب بخشید، بدان جہت وے تخلص فغفور قرار دادہ"

جہانگیر کے فرمان[1] کے مطابق جب پرویز دکن سے الہ آباد روانہ ہوا تو فغفور اس کے ہمراہ تھا، اس کا ہم عصر تذکرہ نگار صاحب عرفات العاشقین لکھتا ہے:

"..... ہزار و بیست و پنج کہ بندہ در اجمیر بودم، وے در خدمت شہزادہ پرویز الہ آباد رفتہ اند ....."[2]

تذکرہ میخانہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ فغفور شہزادے کے ساتھ دکن سے الہ آباد آیا،[3] ۱۰۲۰ھ میں پرویز کے بڑے لڑکے کا انتقال ہو گیا،[4] اس موقع پر فغفور نے ایک پر درد مرثیہ کہا،[5] اگرچہ فغفور طبیب کی حیثیت سے پرویز کا ملازم ہوا تھا لیکن شعر و سخن کا مشغلہ جاری تھا، طاہر نصیر آبادی

---

[1] تزک جہانگیری جشن یازدہمین نوروز، جمادی الاولیٰ ۱۰۲۵ھ [2] قلمی، کتب خانہ بانکی پور ص ۱۰۵ الف [3] ص ۲۳۵

[4] تزک جہانگیری جشن چہار دہمین نوروز [5] مخزن الغرائب، قلمی، بانکی پور، ص ۴۴۶ عدد ایضاً،

اپنے تذکرے[1] میں لکھتا ہے:

"با ملا نادم و محمد قلی سلیم مشاعرہ داشت، چنانچہ محمد قلی سلیم در غزلے می گوید

کمتر نیم از سنجر و فغفور کہ من ہم   در ہند سیہ بختی خود شاہ سلیم

فغفور نے ایک رسالہ اصابع پر لکھا تھا، یہ رسالہ مختصر لیکن مفید تھا[2]، نشتر عشق، صحف ابراہیمی، سرو آزاد، خلاصۃ الافکار میں اس کا سال وفات ۱۰۲۸ھ درج ہے لیکن میخانہ اور عرفات العاشقین میں جو اسی زمانے میں لکھے گئے ہیں ۱۰۲۹ھ ہے[3]، میخانہ میں ہے کہ اس کا مدفن آگرہ کی شاہراہ پر الہ آباد سے نیم کروہ پر واقع ہے، صالح تبریزی نے جو تفنگ سازی کے فن میں بڑی شہرت رکھتا ہے فغفور کی تاریخ وفات کہی جو لوح مزار پر کندہ کر دی گئی

رفت فغفور سخن از ملک نظم   داغہا بر سینۂ احباب ہست

تا دہد آب از سحاب چشم ما   گوہر یکدانہ را در خاک کشت

چوں بہشتی بود شد تاریخ او   ہم نوا با عندلیبان بہشت[4]

فارسی کے جن تذکروں نے فغفور کا حال لکھا ہے، اس میں عموماً اس کے تبحر علمی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا ہے، طاہر نصیر آبادی نے اس کا دیوان دیکھا تھا "قریب بہ چہار بیت دیوانش بہ نظر رسیدہ"[5] اس کے علم و فن کے بارے میں مختلف تذکرہ نویسوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، ذیل میں چند آراء درج ہیں:

---

[1] قلمی، بانکی پور، ص ۱۲۸، الف [2] عرفات العاشقین (قلمی) بانکی پور) ص ۱۱۰ الف [3] میخانہ میں درج ہے کہ دکن سے الہ آباد آنے کے دو سال بعد فغفور کا انتقال ہوا یہ غلط ہے، تزک جہانگیری اور عرفات سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہزادہ پرویز ۱۰۲۵ھ میں دکن سے الہ آباد آیا، خود میخانہ میں اسکی تاریخ وفات ۱۰۲۹ھ درج ہے، جس کی تائید عرفات سے ہوتی ہے، اس طرح دکن سے الہ آباد آنے کے دو سال نہیں بلکہ چار سال بعد فغفور کا انتقال ہوا تھا [4] میخانہ ص ۲۲۶ [5] قلمی، بانکی پور ص ۱۲۸ الف،

"سیدزادۂ عالی فطرت واقی فکرت مستجمع فضائل .... جامع کمالات حاوی حالات، معدن حکمت و فرہنگ مرادت مبرا از زنگ قیصر قصور معمورہا و بغایت عالی فکرت، متوالی نظم خوش ادراک نازک ادائے نیکو روشن است خاقان سپاہ طبیعتش باخیل فضائل بیشمار فغفور بلاد تحقیق باعساکر کمال بسیار است ..... الحق از جملہ نوادر و افاضات متتبع اکثر علوم و رسوم کردہ در ہنر موسیقی بہ غایت ماہر است، چنانچہ صاحب تصانیف با مزہ شدہ و نسخ و نستعلیق را خوب می نویسد و در شطرنج بازی از نکتہ بازان عرضہ ندانست شیوۂ نظمش از آب حیات گوارا تر و از دم عیسی جان فزاتر است در اقسام سخن نادر و ماہر آمدہ ...." (عرفات العاشقین[۱])

"...... حاوی فنون و فضائل بودہ علی الخصوص در علم موسیقی کمال مہارت داشت، در شیوۂ شاعری نیز مراتب اعلیٰ دارد، حکیم در غزل بے بدل است، در دیوانش معنی ہائے بکر بسیار است ......" (مخزن الغرائب[۲])

"خاقان ترکستان سخنوری و مسیح بیمارستان معنی پروری است، نفس پاکش، شفابخش اذہان سقیم و شربت ادراکش روح افزائے ابدانِ الیم بودہ در موسیقی گوئے سبقت از زہرہ چنگی می ربودہ و در نبض شناسی قانونِ کمالات و یگانۂ دہر و در ارغنون نوازی بزم ہنرمندی وحید عصر بود ......" (ریاض الشعراء[۳])

"طبیعتش خالی نیست...... در طبابت ہم دستے داشت ......" (تذکرۂ طاہر نصیرآبادی[۴])

"در اجلۂ اطباء و موسیقی دانان و شعرا محسوب می گردد...... بسلطان پرویز متوسل گردیدہ و در کمال مروت و حرمت اوقات بسر بردہ ......" (خلاصۃ الافکار[۵])

"...... در خوش نویسی و طبابت و شعرگوئی ممتاز اقران بود ...... از شاہزادہ

---

۱ قلمی، ورق ۱۱۰ الف ۲ ایضاً ص ۲۴۴ ۳ ایضاً ص ۳۰۶ الف ۴ ایضاً ص ۱۴۱ الف ۵ ایضاً ص ۱۴۰

پرویزمراعات و دلجوئی یافتہ......" (نشتر عشق[1])

"...... از سادات لاہجان و ملبند فطرتان زمان خود است، در فن طبابت و شعر و خوش نویسی دستے بکمال داشت..... تتبع اکثرے از علوم نمودہ قصائد بہ قدرت تمام می گفت وغزلیاتش ہم سیر نمک است و در فن موسیقی و شطرنج بازی بہ غایت ماہر بود....." (صحف ابراہیم[2])

"در فن طبابت و شعر و خوش نویسی ممتاز زماں بود....... شاہ مصوران کشور فصاحت است و خسرو نقش طرازان قلمرو کتابت...... نقاش فکرت بہ این حسن نقادیری کشد[3]"

"...... حکیم فغفور یگانہ سخن سرایان دہر و نادرۂ صیرفیان ایں عصر است، نکتہ سنجی قدرت آثار و سخن وری تمام عیار است، بہ فرط کیاست و دانش و وفور فراست و بینش از اکثر ناظمان نامی ایں عہد ممتاز و در شعرفہمی و تازہ گوئی بے انباز بود، در فن حکمت نہایت حذاقت و خط نستعلیق را بہ غایت خوب می نوشت و علم موسیقی رانیکو می دانست..." (میخانہ[4])

فغفور کی شاعری پر ایک نظر فغفور کی غزلوں کا دیوان یا کلیات دستیاب نہیں ہو سکا، مختلف تذکروں میں اس کی چند غزلیں، غزلوں کے متفرق اشعار، قصائد کے کچھ اشعار، چند رباعیاں اور ایک ترجیع بند ملتا ہے لیکن قصائد کے اشعار اور رباعیاں تعداد میں اتنی کم ہیں کہ ان کے بارہ میں کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے، تذکرۂ میخانہ میں فغفور کا ایک طویل ترجیع بند درج ہے، اس ترجیع بند میں پندرہ بند ہیں اور ہر بند میں بیت ترجیع ملاکر آٹھ اشعار ہیں، اس طویل مسلسل نظم کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف تذکرہ نگاروں نے فغفور کی نکتہ سنجی کی جو تعریفیں کی ہیں وہ صرف شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے، میخانہ میں ساقی نامون اور اس قسم کی دوسری نظموں کی بڑی تعداد ہے، جن میں شراب، اس کے متعلقات اور اس کی کیفیات کا بیان ہے، ترجیع بند کا موضوع بھی یہی ہے، جہاں تک خیال کی پرواز اور بیان کی دلآویزی کا تعلق ہے، فغفور

---

[1] قلمی، بانکی پور، ص ۱۳۴، ۲۳۱-۱۳۲ [2] قلمی، ذخیرۂ کتبخانۂ نادر آغا لکھنوی، ص ۲۸-۱۳ [3] سرو آزاد، ص ۳۰ [4] مطبوعہ لاہور

کی نظم کو میخانے کی دوسری بہت سی نظموں پر فوقیت حاصل ہے، اس موازنہ کو طوالت کے خیال سے نظر انداز کیا جاتا ہے، تذکروں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فغفور شراب پیتا تھا، لیکن اس کی پوری نظم میں ایسی سرمستی اور سرشاری ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فغفور شب و روز دخت رز سے ہم کنار رہتا تھا ممکن ہے وہ شراب نہ پیتا ہو اور میگساری کے انداز اور نشے کی کیفیات کا اندازہ اس کو اپنے مربی شاہزادہ پرویز کی صحبت میں ہوا ہو، پرویز کی مے کشی بلکہ بلانوشی مشہور ہے، کثرت میخواری ہی سے وہ جوانی ہی میں فوت ہو گیا[1]، فغفور اپنے محسن کی بزم آرائیوں میں شریک رہتا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے خم کے خم لنڈھائے اور مے آتشیں کے جام پر جام چڑھائے جاتے رہے ہوں گے، اگر فغفور خود شراب نہ پیتا رہا ہو تب بھی اس ماحول میں اس کی شاعرانہ ذکاوت حس نے مے گساری کے اسرار و رموز کو خوب سمجھ لیا ہو گا، زبان پر پوری قدرت اور خیالات میں پرواز کی صلاحیت تھی، اسی لیے شراب سے متعلق ایسی لطیف اور "تشبیلی" نظم کہہ سکا، ان اشعار سے بڑی رندی اور سرمستی کا اظہار ہوتا ہے،

ساقی بدہ آں بادہ کہ خورشید شرار است — چوں آتش گل ریزہ بر دامان بہار است
آں آتش بے دود کہ موسیٰ مجوسیست — واں نور فروزندہ کہ سوزندۂ نار است
چوں غنچۂ جامش ز دم غنچہ بخشد — گوئی کہ لبالب دہنش از لب یار است
برخاست دل ما ز جہاں تا بہ مے افتاد — از غرقۂ ایں بحر دو عالم بکنار است

ما دجلہ کشی یاد گرفتیم از استاد
ما را خط بغداد بہ از خطۂ بغداد!

---

[1] جہانگیر تزک میں لکھتا ہے: "شاہزادہ پرویز از فرط بادہ پیمائی بمرض صرع مبتلا شدہ رفتہ رفتہ از غذا انفرت بہم رسانیدہ و قوی بتحلیل رفت ہرچند اطبا بمعالجات و تدبیرات پرداختند چوں زماں ناگزیر رسیدہ بود، اثرے براں مترتب نگشت و شب چہارشنبہ بتاریخ ہفتم شہر صفر سنہ ہزار و سی و شش ہجری پیمانۂ حیاتش لبریز گردید"

رفتیم بہ یکبارہ رہ دیر و حرم را یکدست گرفتیم صمد را و صنم را
دریوزہ گر کوے خرابات مغانیم در کاسۂ سر ریختہ ام حق قدم را
ما مست شرابیم چہ دریا و چہ قطرہ دیریست کہ نہ بیش شناسیم و نہ کم را
تو منکر پیمانہ و من منکر پیماں زاہد! نہ خورم جاے مئے ناقسمم را
جام عرقی خوشترم آید ز عراقین مستاں چہ شناسند عرب را و عجم را
ما و حلبہ کشی .... الخ

فغفور مے خانہ اور مے خواری کی خصوصیتوں اور کیفیتوں کا اس طرب انگیز انداز میں ذکر کرتا ہے کہ خیام کی مے پرستی و سرشاری یاد آجاتی ہے:

چوں خوشۂ پروین کہ از دانہ فشردند از بہر دل ما دل انگور فشردند
از جنت میخانہ بہ نوش از کف غلماں آں بادہ کہ گوئی ز لب حور فشردند
سرمستی و دیوانہ دلی قسمت ما شد آں روز کہ در مغز جنوں شور فشردند

ترجیع بند کی دوسری نمایاں خصوصیت اس کی موسیقیت ہے، اس میں قافیہ اور ردیف زیادہ تر ایسے استعمال کیے ہیں جن سے دلکش صوتی ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے، اس خاصیت کا لحاظ الفاظ کے انتخاب میں بھی رکھا گیا ہے، موسیقی کا ماہر تھا، زبان پر قدرت تھی، ترنم الفاظ کو برمحل استعمال کرنے کا سلیقہ بھی تھا، اس لیے ساقی نامے میں بڑی لطیف نغمگی جا بجا ملتی ہے،

از بسکہ سرم ہم چو کدو لت پر از مے چوں شیشہ چکد بادہ ام از طرّہ طرّار
ما جام نہ نوشیم مگر جام لبالب ما کاسہ نہ گیریم مگر کاسۂ سرشار
زاہد! اگرت میل سبکساری جاں است بر دوش سبو گیر کہ سجادہ گراں است
اینجا نہ مہ و ہفتہ حساب از دم نقد است اینجا نہ شب جمعہ نہ روز رمضان است

در جام خزان است کہ در عین بہار است | در بزم بہار است کہ در عین خزان است
ساقی ہمہ یک دور بدہ قسمت ما را | تا دور دگر ہستی ما را کہ ضمان است
گر خانہ بر یغمائے عسس رفت چہ نقصان | صد شکر کہ جاں در گرو رطل گران است

فغفور نے اس نظم میں پے در پے تلمیحات کے استعمال سے حسن پیدا کر دیا ہے، موسیٰ، منصور، داؤد، یوسف، جمشید، خضر، عیسیٰ، تہمتن، زال، سیاوش، نوح، چشمۂ حیواں کی طرف اشارے ملتے ہیں، ان تلمیحات سے جا بجا بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے، فغفور نے اس نظم میں ثقیل الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثلاً عزقہ، شنشہ، مرغزل، دائرہ ارزق، نغیا، لجہ اخضر وغیرہ لیکن اس سے نظم کی لطافت مجروح نہیں ہونے پائی ہے،

فغفور کی غزل گوئی فغفور کی غزلوں میں، اچھے برے دونوں طرح کے اشعار ملتے ہیں، لیکن "جو برے ہیں وہ بہت برے نہیں، جو اچھے ہیں وہ بہت اچھے"، عرفی، نظیری، صائب وغیرہ کی طرح فغفور کا اپنا کوئی مخصوص "رنگ شاعری" نہیں ہے، زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جو اس زمانہ کی عام روش کے مطابق کہے گئے ہیں، پھر بھی طرز ادا کی دلکشی کی وجہ سے اس کے فرسودہ مضامین کے حامل اشعار ذوق لطیف پر بار نہیں ہوتے، مثلاً

سر رشتۂ ترانہ بہ دیوانگی کشید | تارے مگر ز زلف تو بر ساز بستہ ایم[1]
بیا کہ تا تو گرفتی کنارہ ز آغوشم | گرفتہ حسرت آغوش در کنار مرا
خون از کرشمہ در دل تنگم چہ می کنی | در شیشۂ شکستہ چہ ریزی گلاب را
از رشک صبا واکہ نسیمش بہ ربایہ | بر گوشۂ دستار تو گل ریشہ دواند

---

[1] اس طرح میں فغفور اور تذکرہ عرفات العاشقین کے مؤلف نے آگرے میں ساتھ بیٹھ کر غزلیں کہی تھیں، لیکن مؤلف نے صرف فغفور ہی کی غزل درج کی ہے۔ (دیکھیے عرفات العاشقین قلمی، بانکی پور کتب خانہ ص ۵۱۱ الف)

دل دیوانہ را شہر است زندان خوشا صحرا خوشا صحرانشیناں
نے عندلیب برخورد از ما نہ باغباں خود را بہ شاخ چوں گل پژمردہ بستہ ایم

ذیل میں فغفور کی غزلوں کے ایسے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جو دونوں حیثیتوں سے بلند پایہ ہیں:

ناخدا گو از پر پروانہ سازد بادباں زانکہ ما را زورق از موم است و دریا آتش است
ایں شیوہ ام ز شمع خوش آمد کہ ہیچ گاہ پروانہ را نہ سوخت مگر در حضور خویش
نخواہد ماند ایں فارغ دلی بر خود چہ می نازی تو ہم روزے چو ما بے صبر و بے آرام خواہی شد
روز محشر چوں برآرم نالۂ "قاتل نیک" شور برخیزد کہ "تہمت بر مسیحا بستہ"!
پا بر اثر قافلۂ عشق سبک نہ نقشِ قدمِ "گرم روان" آبلہ دارد
ہمچو رہزن بر در مشرق نمی دزدیم چشم ما کلید صبح پیش آفتاب انگندہ ایم
در عشق چو سبحہ بہ تسبیح شماراں صد عقدہ بہ پیش آمد و از راہ نہ گشتیم
تارے ز زلف خویش بسوے چمن فرست شاید کہ چاک پیرہن گل رفو کند!
تو باغ دل کشائی و ما ابر نو بہار خندیدن از تو خوش بود از ما گریستن
بہ دم تیغ قاتلم آب بقا حسد برد خضر کجا ست تا نہد لب بہ لب جراحتم
فغفور چو خاکے کہ بود ہم سفر باد گشتیم جہاں یکسر و دل خواہ نہ گشتیم
ہنوز از کفر زلفش رنگِ صد آلودگی دارد بہ چندیں آب اگرچہ خرقۂ ایمان خود شستم
خرابات است و مے در جوش و مطرب سرخوش آنجا سبو افتان و خیزان در سماع از چنگ در دو آنجا

یہ ان جواہر پاروں کا ایک مختصر نمونہ ہے، جو مختلف تذکروں میں بے ترتیبی سے بکھرے پڑے ہیں، فغفور کا کلیات دستیاب ہو جائے تو کیا عجب کہ جہانگیر کے عہد کی فارسی شاعری کے خزانہ میں آبدار موتیوں کا قابلِ قدر اضافہ ہو جائے!

تذکرۂ لباب الالباب

تالیف

محمد عوفی[1] کا ایک اہم مخطوطہ

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

لباب الالباب فارسی شعراء کا قدیم ترین[2] تذکرہ ہے، اور بعض وجوہ سے اہم ترین[3] بھی ہے، اسکی اہمیت کے پیش نظر مشہور مستشرق پروفیسر ای، جی، براؤن (Browne)[4] نے اس کی دوسری جلد "متون تاریخی فارسی" کے سلسلہ میں ۱۹۰۳ء میں بڑے اہتمام سے شائع کی، اور پہلی جلد مرزا محمد بن

---

[1] مؤلف کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مقدمۂ لباب الالباب ج ۲ [2] اس تذکرہ سے پہلے کی صرف دو کتابوں کا پتہ چلتا ہے، جو تذکرہ کے مشابہ ہیں، ایک مناقب الشعراء تالیف ابوطاہر خاتونی جو اواخر قرن پنجم و اوائل قرن ششم ہجری کا ایک مصنف گزرا ہے، دوسری چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی جو ۵۵۰ھ ہجری کے حدود میں مرتب ہوئی، مگر ان میں سے کسی ایک کا مقصد اولین ترجمہ احوال شعراء نہ تھا، مناقب الشعراء جو نایاب ہو چکی ہے، بظاہر شاعروں کی حکایتوں، مشاعروں وغیرہ پر مشتمل ہوگی، چہار مقالہ بادشاہی کے چار خواص، دبیر، شاعر، منجم اور طبیب کے متعلق حکایات وغیرہ پر مشتمل ہے، اس لیے ان کو حقیقتہً تذکرۂ شعراء نہیں کہا جا سکتا، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ لباب (ج ۲) نوشتہ مرزا محمد قزوینی ص و تا ح) یہ تذکرہ ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الملک فخر الدین الحسین بن شرف الملک رضی الدین ابی بکر اشعری کے نام ۶۱۸ھ کے قریب ملتان (اچہ) میں لکھا گیا [3] مقدمہ میں مرزا محمد نے اسکی اہمیت پر بحث کی ہے، ملاحظہ ہو ص ط [4] پروفیسر براؤن نے انگریزی مقدمہ (ج ۲ ص ۹-۱۰) میں اس حصہ کو مقدم کرنے کے جو وجوہ بیان کیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حصہ ان شعراء کے حالات پر مشتمل تھا جو بہت اہم تھے، پہلے حصہ میں صرف بادشاہوں، امیروں، وزیروں کی شاعری کا ذکر پایا جاتا ہے،

عبدالوہاب قزوینی کی شرکت میں تین سال بعد لندن ہی سے شائع کی، مگر تذکرۂ مذکور کے نسخوں کی قلت اور زیر استعمال نسخوں کے نقائص کی بنا پر مطبوعہ نسخے میں کافی جگہیں خالی پڑی رہ گئی ہیں، پروفیسر براؤن کو بڑی تلاش کے بعد لباب الالباب کے صرف دو نسخوں کا پتہ چل سکا، ان ہی کی مدد سے انھوں نے اپنا ٹکسٹ تیار کیا، ان نسخوں کا مختصر تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،

(۱) نسخۂ مملوکۂ جے، بی، الیٹ (Elliot) حجم ۴۰۰ صفحہ، سائز ۱۱×۲۵×۹×۱۵ اسینٹی میٹر ۱۹ سطری، خط عمدہ صاف ہندوستانی نستعلیق سنہ کتابت ندارد، بظاہر سولھویں یا ستر ہویں صدی عیسوی کا ترقیمہ اور جگہ جگہ تصحیح کیا ہوا ہے، کچھ حصہ قدیم خط میں ہے، اوراق کرم خوردہ اور چند نسخے درج حاشیہ ہیں، بعض جگہ پوری سطر یا اس کا زیادہ حصہ بیاض ہے جس سے اس نسخے کے منقول عنہ کا نقص ظاہر ہوتا ہے، حاشیہ کے خراب ہو جانے کی وجہ سے جو نسخے حاشیہ میں درج کیے تھے، ان میں سے بیشتر ضائع ہو چکے ہیں،

یہ نسخہ فروری ۱۸۴۸ء کے قبل مسٹر نتانیل بلنڈ (Nathaniel Bland) کے مطالعہ میں آیا، انھوں نے ایک مضمون بعنوان "قدیم ترین تذکرۂ شعراے فارسی تالیف محمد عوفی و بعضے تالیف دیگر از قبیل تذکرۃ الشعراء" رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل (لندن) کی نویں جلد (ص ۱۱۳-۱۲۶) میں شائع کیا، بظاہر مسٹر بلنڈ نے یہ نسخہ مسٹر الیٹ کو واپس نہیں کیا، چنانچہ ان کی ناگہانی موت پر ان کی اور کتابوں کے ساتھ یہ بھی بک گیا، لارڈ کرافورڈ (Crowford) نے ان تمام کتابوں کی ایک فہرست تیار کی جس میں لباب الالباب کا ذکر مخطوطہ نمبری ۳۰۸ (ص ۲۲۶) کے ذیل میں ملتا ہے، فروری ۱۸۹۸ء میں پروفیسر براؤن کو اس نسخے کا علم ہوا، انھوں نے لارڈ کرافورڈ کے توسط سے کتاب خانے کے مہتمم مسٹر جے، پی، اڈمنڈ (Edmond) سے خط وکتابت کی اور ایک ماہ کے اندر ہی یہ نسخہ پروفیسر براؤن کے مطالعہ میں آگیا اور تین سال سے زیادہ ان کے پاس رہا، اس درمیان میں انھوں نے تقریباً پوری کتاب

کی نقل کر لی، صرف درمیان کے ۱۴۰ صفحے نقل کرنا باقی تھے کہ دفعۃً وہ نسخہ واپس کر دینا پڑا جو لارڈ کرافورڈ کے پورے کتاب خانے کے ساتھ مانچسٹر کی مسز رلنڈس (Mrs Rylands) کے ہاتھوں بک گیا، اور اب وہ ان ہی کی ملکیت میں ہے،

(۲) نسخۂ کتاب خانۂ شاہانِ اودھ، حجم ۱۸۶ صفحہ، سائز ۵، ۲۶ × ۲، ۱۷ اسینٹی میٹر، ۲۱ سطری ناقص الاول و الآخر، خاتمہ کی عبارت نہیں ہے، اس لیے نہ کاتب کا پتہ ہے اور نہ سنہ کا، البتہ خط سی جو عمدہ نستعلیق ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے نسخہ سے قدیم ہوگا،

اس نسخہ کا تعارف اسپرنگر نے اودھ کیٹیلاگ جلد اول (ص ۱-۶) میں کرایا ہے، اب یہ نسخہ برلن کی رائل لائبریری میں منتقل ہوگیا ہے، اور اس کا ذکر[1] مسٹر (Berthk) نے Bibliothekazn Berlin کے صفحہ ۵۹۶-۵۹۷ پر کیا ہے، پروفیسر براؤن کو یہ نسخہ ۱۹۰۱ء میں ملا، انھوں نے الیٹ کے نسخے سے جتنا حصہ نقل کیا تھا، اس کا اس سے مقابلہ کرلیا، اور جو صفحے نقل سے رہ گئے تھے، ان کی بھی نقل حاصل کر لی،

رضا قلی خاں ہدایت نے مجمع الفصحا میں لباب الالباب سے کافی استفادہ کیا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس تذکرہ کا ایک نسخہ زمانہ قریب[2] تک ایران میں موجود تھا، مرزا محمد قزوینی نے آقاے ذکاء الملک رئیس دار الترجمہ ہمایونی سے جن کو رضا قلی کے خاندان سے خصوصیت تھی، استدعا کی کہ یہ نسخہ کہیں سے فراہم کیا جائے، مگر ذکاء الملک کی عدم حصول یابی کے جواب پر مرزا محمد لکھتے ہیں[3]:

امید کہ ایں جواب فقط عذر باشد براے بیروں نہ دادن کتاب واگر خدا اے نخواستہ

حقیقت باشد و اصل کتاب از دست اینان بیروں رفتہ است تاسف براں نہایت ندارد"

---

[1] مقدمہ انگریزی نوشتہ پروفیسر براؤن ج ۲ ص ۱۰، [2] یہ کتاب طہران میں ۱۲۸۸ھ میں شائع ہوئی [3] مقدمہ فارسی صفحہ "د"

اس تلاش و جستجو کے دوران میں مرزا محمد کو برٹش میوزیم لندن میں ایک تذکرہ شعراء موسوم بہ بزم آرا ملا، جس کے مولف سید علی بن محمود الحسینی نے قدیم زمانے سے لے کر ۱۰۰۰ ہجری تک کے فارسی شعراء کے حالات اس میں درج کیے تھے، یہ تذکرہ عہد اکبری میں ہندوستان میں مرتب ہوا تھا، اس میں مولف نے پورا لباب الالباب شامل کر لیا تھا، مگر یہ اس مولف کی انتہائی بد دیانتی ہے کہ اس نے لباب الالباب کا نام کہیں بھی نہیں لکھا، مرزا محمد لکھتے ہیں[1]،

تقریباً تمام لباب الالباب عوفی را بہ کم و زیاد استنساخ نمودہ مگر در بعضے موارد کہ اندکے متن عوفی را اختصار نمودہ چنیں می نمایاند کہ اصلاً از وجود کتاب در دنیا بہ اسم لباب الالباب اطلاع نہ داشتہ است چہ در دیباچہ کتاب تذکرہائے کہ پیش از بزم آرا تالیف شدہ است یکے تذکرۂ دولت شاہ را می شمرد....... اصلاً از لباب الالباب بیچارہ عوفی کر از اول تا آخر حتی دیباچہ و مقدمہ را استنساخ نمودہ اسمے نمی برد،

اس تذکرہ کی دریافت سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ گویا لباب الالباب کے تین نسخے پروفیسر براؤن کے پیش نظر ہو گئے، مگر مرزا محمد قزوینی کا قیاس یہ ہے کہ لباب الالباب کا جو نسخہ صاحب بزم آرا کے زیر استعمال تھا[2]، وہ ان دو یورپی نسخوں میں سے یا ان کا منقول عنہ تھا، یا ان کا منقول تھا، کیونکہ جو غلطیاں اور خامیاں ان نسخوں میں پائی جاتی ہیں وہی بعینہ بزم آرا میں بھی موجود ہیں،

اس تفصیل سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ لباب الالباب کے نسخے بیحد کمیاب ہیں، خوش قسمتی سے اس کا ایک عمدہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں موجود ہے، اس کا تعارف ذیل کے اوراق میں پیش کیا جاتا ہے،

حجم ۲۱۰ ورق، تعداد ورق ۱۱۰ تک ہندسوں میں، ۱۱۱ سے آخر تک رقموں میں درج ہے

[1] مقدمہ فارسی ج ۱ ص "ط" [2] ایضاً

مگر خط بعد کا معلوم ہوتا ہے، گو وہ بھی پرانا ہی ہے، خط نسخ، کاتب نامعلوم، سنہ کتابت ندارد، آخری صفحہ موجود ہے، لیکن کاتب نے عمداً نہ اپنا نام لکھا اور نہ سنہ کتابت ہی درج کیا ہے، ۲۱ سطری، عنوان سرخ روشنائی میں ہیں،

اس کے اوراق اول کا دوسرا صفحہ اصل کاتب کے خط میں ہے لیکن پہلے صفحے کے ابتدائی گیارہ سطروں کے بعد کسی نے صفحہ پورا کر دیا ہے، مگر خط شکست ہے، اس سے اس نسخے کے منقول عنہ کے نقص کا صحیح پتہ چلتا ہے، نیز ۱۲۷ میں ساتویں سطر کے آگے کی سطریں ورق ۲۶۹ کے بعد کی ہیں، ان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس جگہ منقول عنہ کے اوراق بے ترتیب تھے، کاتب کو اسکا احساس نہیں ہوا، اس لیے اس کے یہاں بے ترتیبی دوسری شکل میں ظاہر ہوئی،

لکھنؤ یونیورسٹی کے نسخے میں کافی نقائص ہیں، جو زیادہ تو منقول عنہ کے ناقص ہونے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں، چنانچہ اکثر جگہیں خالی پڑی ہیں خصوصاً نسخہ کے دوسرے حصے میں، اور نہ صرف برائون کے تمام نقائص اس میں موجود ہیں، بلکہ اس سے زیادہ جگہیں بیاض ہیں جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان تمام نسخوں کا منقول عنہ ایک ہی تھا جس میں زیادہ نقائص پیدا ہونے کی وجہ سے بعد کے نقل کیے ہوئے نسخوں میں اور زیادہ نقائص پیدا ہو گئے، نقائص کا اتحاد صاف پتہ دے رہا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اس کتاب کا صرف ایک ناقص نسخہ موجود تھا جس سے بعد میں متعدد نقلیں ہوئیں،

نسخہ مذکور میں چوٹ بندی بھی ہوئی ہے، اور بہت سی جگہوں کے الفاظ و فقرات پڑھے نہیں جا سکتے، ذیل میں اس نسخے کے تمام نقائص درج کر دیے جاتے ہیں :

جلد اول ورق ۱ - ۱۲۴ ب[1]

---

[1] یہ الفاظ خاتمہ کے ہیں: - "تم النصف الاول من کتاب ... اللہ و توفیقہ، اس کے بعد بغیر جگہ چھوڑے (باقی حاشیہ ۲۱۷ پر)

ورق ۴۱۔ب ، آخری ۴ سطریں کٹ گئی ہیں، کچھ ابتدائی حصہ باقی ہے۔

" ۵ " " " " "

ورق ۱۳۲، ۱۳۳ پر عنوان "ہم او راست" اسکے تحت صرف ایک بیت درج ہے براؤن ج ۱ ص ۰ ، پر اس کا عنوان 'رباعی' ہے اور ایک سطر خالی چھوٹی ہے، جس سے ایک بیت کی کمی ظاہر ہوتی ہے، بہرحال دونوں نسخوں کا نقص یکساں ہے،

ورق ۲۴ب ۔ صاحب ترجمہ کا نام درج نہیں، یہی نقص براؤن ص ۹۳ پر ہے، مگر خطی لکھنؤ میں جگہ خالی نہیں رکھی گئی ہے " " " " " " ص ۹۴ "

ورق ۷۱ب ، ۷۲ ، قطعہ میں تین شعر درج ہیں، مگر براؤن (ص ۱۹۲) پر چار شعر بتائے گئے ہیں، جن میں تیسرے کا دوسرا مصرع اور چوتھے کا پہلا غائب بتایا گیا ہے، مخطوطہ کا تیسرا شعر براؤن کے نزدیک تیسرے کا پہلا مصرع اور چوتھے کا دوسرا ہے،

ورق ۱۲۴، صاحب ترجمہ کا نام درج نہیں، مگر اس کے لیے جگہ نہیں چھوڑی ہے، براؤن ص ۲۸۷ پر یہی نقص موجود ہے، مگر اس کے لیے جگہ چھوڑی ہے،

جلد دوم ۱۲۴ب - ۲۷۰ب

ورق ۱۴۷ پر "بن احمد البدری" کا نام 'حسنو' لکھا ہے، مگر براؤن کے یہاں ص ۶۷، نمبر ۵۹ اس کے لیے جگہ چھوڑی ہے،

ورق ۱۴۷ب پر براؤن کے اعتبار سے ۵۴ سطریں غائب ہیں (ملاحظہ ہو ص ۶۸ تا ۷۰) وستہ (ص ۷۰، س ۲) سے پھر شروع ہوتا ہے، مگر ابتدا میں یعنی ایشان آمد (براؤن ص ۶۸ س ۳)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۷) "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے بعد ایک مختصر دیباچے کے بعد "باب ہشتم در ذکر لطائف اشعار" شروع ہوجاتا ہے، نصف اول جو ستا ابواب پر مشتمل ہے، جو اشعار سلاطین و ملوک و امرا و وزرا و کفاۃ و علما و سدہ آذاق پر حاوی ہے

کے بعد "وزمانہ مطواع وچرخ" زیادہ ہیں، حاشیہ پر مصحح کے قلم سے یہ نوٹ ہے "ہشت سطر نماند"
سپرنگر کے نسخہ میں بھی اتنا ہی حصہ بیاض ہے (ملاحظہ ہو براؤن ج ۲، مقدمہ انگریزی ص ۲۶ س ۹)
ورق ۱۸۳ ا پر الحکیم تاج الشعراء محمد بن علی سوزنی کا نام دہرایا گیا ہے، اور یہی دونوں یورپی نسخوں میں بھی ہوا ہے (ملاحظہ ہو براؤن ج ۲، مقدمہ انگریزی ص ۴۳ معلق بر ص ۱۹۸)

ورق ۲۰۹ ب (براؤن ۲۶۶) ہر دو ناقص۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۵۲)

ورق ۲۱۵ ا ۵ شعر غائب ہیں، (براؤن ص ۲۸۱، آخری تین سطریں و ص ۲۸۲ پہلی دو سطریں)۔ اور یہی ابیات سپرنگر میں بھی محذوف ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۴۵ معلق ص ۲۸۱)

ورق ۲۲۳ ب (براؤن ص ۳۰۸ س ۵ ناقص) پر پورا مصرع ہے "گلگون عیش راپس ازیں تنگ تنگ دار، یعنی دونوں یورپی نسخوں میں تنگ محذوف ہے، براؤن نے قیاسی اضافہ اسی لفظ کا کیا تھا، ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۵۸)

ورق ۲۳۳ ب عنوان غائب مثل براؤن نمبر ۱۲۱ ص ۳۴۶

" ۲۳۴ ب چوتھا شعر دوسرا مصرعہ ناقص براؤن پورا

" ۲۳۵ ا دوسرا شعر دوسرا مصرع ناقص براؤن پورا

" ۲۳۹ ب ۱۶ ویں، ۱۷ ویں کے دوسرے مصرعے ناقص

" ۲۴۰ ا تیرہویں شعر کے دونوں مصرعے نامکمل

" ۲۴۱ ب (براؤن نمبر ۱۴۵) سرخی ناقص بعد میں اضافہ وہ بھی ناقص، رباعی (جس میں ۶ مصرعے ہیں) کا پہلا اور تیسرا مصرعہ شل اسپرنگر (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۶۷)

ورق ۲۴۲ ا سولہواں شعر یعنی مطلع قصیدہ ناقص (صرف دوسرا مصرعہ) یہ مصرعہ اسپرنگر میں بھی نہیں ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ ص ۶۹ معلق ص ۳۵۹)

ورق ۲۴۲ ب قطعہ کا مطلع ناقص، مثل سپرنگر (مقدمہ ص ۱۴ متعلق ص ۳۶۱)

" ۲۴۳ ا قطعہ کے آخری دو شعر کے آخری دونوں مصرعے ناقص

ب ۶-۸ شعروں کے پہلے مصرعے ناقص

" ۲۴۴ ا چوتھا اور چھٹا ناقص مصرع ثانیہ، چوتھا دوسرے قلم سے پورا کر دیا گیا،

ب دوسرے، تیسرے، چوتھے کے پہلے مصرعے ناقص

" ۲۴۴ ب-۲۴۵ ا قطعہ کے پہلے تین شعر بالکل ناقص، ۲۴۵ ا میں آخری کے پہلے دو کے دو اول مصرعے ناقص،

ورق ۲۴۵ ب اسی کے آخری تین شعر کے آخری مصرعے غائب

" ۲۴۶ ا قصیدے ۵-۷ کے پہلے مصرعے ناقص (ب) ۱۱، ۱۲، ۱۳ تقریباً دونوں مصرعے غائب،

" ۲۴۷ ا " ۷-۸ پہلے مصرعے ناقص (ب) ۶-۷ دوسرے مصرعے غائب

" ۲۴۸ ا آخری تین کے پہلے مصرعے ناقص (ب) پہلے تین کے آخری مصرعے غائب آخری دو کے پہلے مصرعے ناقص

ورق ۲۴۹ ا پہلے کا پہلا اور آخری بیت سے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ناقص، دوسرے بالکل غائب

ورق ۲۴۹ ب ۱۵واں کا پہلا مصرعہ اور ۱۷واں پہلا مصرع ناقص

" ۲۵۰ ا دوسری رباعی کا دوسرا اور چوتھا مصرعہ غائب

" ب تیسری رباعی کا تیسرا اور کا پہلا مصرعہ ناقص،

" ۲۵۱ ا آٹھویں، نویں اور دسویں سطریں ناقص (ب) آخری دو سطریں ناقص،

" ۲۵۲ ا پہلی سطر ناقص (ب) ۱۴-۱۵ کے آخری مصرعے غائب اور ۱۶-۱۷ پہلے ناقص اور دوسرے غائب

غائب،
ورق ۲۵۳ الف غزل کے پہلے دو شعر کے پہلے مصرعے ناقص (ب) ۸ - ۱۱ کے پہلے مصرعے ناقص دوسرے

" ۲۵۴ الف غزل کے پہلے شعر کا پہلا مصرعہ ناقص (ب) قطعہ کا دوسرا شعر اور صفحہ کی تیسری سطر ناقص۔ دوسرے قطعہ کا دوسرا مصرعہ ناقص

ورق ۲۵۵ الف کی پہلی چار سطریں اور آخر سے پہلے سطریں (نظم ونثر) ناقص (ب) قصیدہ ۷، ۸ کے پہلے مصرعے ناقص،

ورق ۲۵۶ الف بارہویں سطر (دوسرا مصرعہ۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ) ناقص، تیرہویں تا پندرہویں ناقص و نامکمل، ۱۴ کا پہلا مصرعہ ہے،

ورق ۲۵۶ ب ۴، ۵ شعر پہلا مصرعہ ناقص، ۶ پورا شعر محذوف، ۷ پہلا مصرعہ ناقص، ۸ پہلا مصرع (ایک لفظ غائب) مرثیہ کی دوسری بیت کا پہلا مصرعہ ناقص،

ورق ۲۵۷ الف قصیدے کی ۳، ۴، ۵ بیت ناقص (ب) ۵ کا پہلا، ۷ کا پہلا اور دوسرا ناقص ۶ کا صرف دوسرا ناقص،

ورق ۲۵۸ الف قصیدہ کی ۳ - ۵ ناقص (ب) پہلی تین بیت ناقص، اور آخری تین سطریں نظم ونثر ناقص

" ۲۵۹ الف ۱۴ - ۱۵ ناقص، ۱۷ ویں سطر کے چند لفظ غائب (ب) ۱۱، ۱۲، ۱۳ سطریں (نظم) ناقص

" ۲۶۰ الف ۹ - ۱۲ سطریں (نظم ونثر) ناقص (ب) ۶ - ۹ سطریں (نظم ونثر) ناقص

" ۲۶۱ الف دوسری تیسری سطریں ناقص۔ پہلا مصرعہ کا نقص مخطوطے میں ظاہر ہے، مگر کاتب نے دوسرے مصرعہ کا نقص ظاہر نہیں کیا، آخری دو بیت ناقص (مثل براؤن ص ۷، ۴، و نیز مقدمہ ص ۶۷)

ورق ۲۶۱ ب۔ براؤن کی طرح اول دو سطریں ناقص، پہلے مصرعوں کے اسی قدر لفظ ملتے ہیں جتنے براؤن میں ہیں، آخری تین سطریں ناقص مثل براؤن، پہلے مصرعوں کے دیئے ہوئے

الفاظ مثل براؤن، ان سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ یا تو یہ یورپی نسخوں سے منقول ہے یا ان کے منقول عنہ سے ہے، (براؤن ص ۴۰۸)

ورق ۲۶۲ الف کے پہلے شعر کے ابتدائی چند لفظ چپٹ بندی میں محذوف اور براؤن میں پورے ہیں۔ ۱۷ تا ۱۸ سطریں (شعر) نامکمل ہو بہو مثل براؤن،

ورق ۲۶۲ ب۔ وہی چپٹ بندی۔ پہلی ۵ سطروں کے آخری، ۷ تا ۹ کے ابتدائی الفاظ محذوف (براؤن میں پورے) اسی صفحہ کی غزل کی تیسری بیت کے پہلے مصرعے میں ایک آدھ لفظ محذوف مثل براؤن؛ دوسرا مصرعہ ناقص (گو کاتب نے جگہ نہیں چھوڑی) مثل براؤن، تیسری کا پہلا مصرعہ ناقص مثل براؤن (ص ۱۱۴) مگر براؤن میں ایک بیت زیادہ جس کا پہلا مصرعہ ناقص، مگر وہ مخطوطے میں نہیں،

ورق ۲۶۳ الف قطعہ کا آخری شعر ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۲) اسی ورق پر عنوان کے ساتھ ۴ سطریں ناقص (مثل براؤن) بعد میں دوسرے قلم سے اضافہ ہوئی ہیں،

ورق ۲۶۳ ب۔ ۱۰-۱۱ سطریں ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۳)

" ۲۶۴ الف - ۷ - ۱۰ بیت ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۳) ۱۱-۲۱ ابتدائی سطریں ناقص چپٹ بندی میں؛ براؤن میں پوری ہیں،

ورق ۲۶۴ ب ۵ - ۷ بیت ناقص مثل براؤن (ص ۴۱۴) آخری دس سطروں کے آخری لفظ ناقص چپٹ بندی میں؛ براؤن میں پوری ہیں،

ورق ۲۶۵ الف رباعی اول و دوم ناقص مثل براؤن (۴۱۵-۴۱۶) قطعہ کی آخری بیت کا پہلا مصرعہ ناقص مثل براؤن (۴۱۷)

ورق ۲۶۵ ب پہلی رباعی ناقص مثل براؤن (۴۱۷) ۱۸-۲۰ ناقص مثل براؤن بعد میں پوری کی گئی ہیں

" ۲۶۶ الف ۱۵-۱۹ سطریں ناقص مثل براؤن (۴۱۸)

ورق ۲۲۶ ب ۸ - ۱۱ سطریں (شعر) ناقص براؤن میں پوری ہیں،

" ۱۲۲۶، ۵ - ۷ سطریں ناقص، اس صفحہ کے آگے کی سطروں کی ترتیب الٹی ہے، یہ سطریں ورق ۱۲۲۹ کی پانچویں سطر سے پہلے کی ہیں، گویا ۱۲۲۶ (۷ ویں سطر کے بعد) ورق ۱۲۲۹ ب کے بعد (۹ ویں سطریں بعد) ہوگا۔ اس صفحہ کے صاحب ترجمہ کا نام مخطوطے اور براؤن میں محذوف ہے، بعد میں کچھ دوسرے قلم سے پورا ہوا ہے، آخری سطر ناقص مثل براؤن (۲۲۴)

ورق ۲۲۶ ب، ابتدائی تین سطر ناقص مثل براؤن بعد میں اضافہ، آخری ۳ سطر ناقص مثل براؤن، ۱۲۲۸، پہلی سطر ناقص مثل براؤن (ص ۲۲۵) اسی پر صاحب ترجمہ کیا تھ چھ سطریں ناقص مثل براؤن،

اگرچہ زیر بحث مخطوطہ کافی ناقص ہے لیکن جیسا کہ بار بار اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ اس نسخہ کا نقص نہیں، بلکہ اس کے منقول عنہ کا نقص ہے، اس میں یہ سب جگہیں خالی پڑی ہیں، باوجود اس نقص کے اسکی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، چونکہ اس میں براؤن سے زیادہ خالی جگہیں ہیں، اس سے اس قیاس کو پوری تقویت پہنچتی ہے کہ یہ نسخہ اس نسخے سے منقول ہے جو ان یورپی نسخوں سے یا تو بعد میں نقل ہوا ہے یا خود ان کے منقول عنہ سے بعد میں نقل ہوا، نقائص کا اتحاد صاف بتا رہا ہے کہ اصلاً ایک ہی نسخہ ناقص تھا، اور اسی سے دوسرے تمام نسخے منقول ہوئے، لکھنؤ مخطوطہ کے بیشتر نقائص اسپرنگر کے مخطوطے کے مشابہ ہیں،

اس نسخے پر اول سے آخر تک کسی نے دوسرے نسخہ کی مدد سے نظر ثانی کی ہے، کہیں کہیں اضافہ بھی کیا ہے، مگر اس اضافہ و تصحیح سے براؤن کی مرتب کی ہوئی ٹکسٹ کی ایک آدھ خالی جگہیں پر ہو سکتی ہیں، مگر بیشتر ویسی ہی ہیں، اس سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ مصحح کے پیش نظر بھی ناقص ہی نسخہ تھا، زیر بحث نسخہ کا صفحہ اول مصحح ہی کے قلم کا اضافہ ہے جس میں ۱۱ سطریں کم ہیں، اس سے بھی مصحح کے زیر استعمال نسخے کا نامکمل ہونا واضح ہے،

بہرحال اس نسخہ کی دریافت اہل علم کی خوشی کا موجب ہوگی،

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوبِ سلیمانی

بنام نواب سید امیر حسن خانصاحب

Royal Court Hotel
Sloane Square
London, S.W.1

A. Wild
of Cairo

عزیز مکرم

سلام علیکم، آپ کا کارڈ مورخہ ۲۶ر فروری یہاں ۱۸ر مارچ کو پہنچا، آپ لکھتے ہیں کہ ابتک ہمارے پہنچنے کی اطلاع ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی جس دن آپ خط لکھ رہے تھے عین اسی د ہمارا جہاز رود بار لندن میں لنگر انداز ہوا،

................[1] ممبران ہاؤس آف لارڈس اور ہاؤس آف کامنس سے ملاقاتیں یہ سب کچھ ہوا مگر اصل مقصود کا پتہ نہیں، کوئی ہمارے نقطۂ نظر سے واقعات پر نظر ڈالنے کو آمادہ نہیں، ہندوستان میں یورپ کی بے تعصبی کی داستانیں بہت سنا کرتے تھے، مگر یہاں آکر وہ عقیدہ بدعقیدگی سے بدل گیا، یہاں کے مشرقی ارباب علم کی بے تعصبی او ر مشرق پرستی کی بڑی دھوم تھی، وہ دل تہی ثابت ہوئی، پروفیسر مارگولیوتھ مصنف لائف آف محمد ترکوں کے سب سے بڑے علمی دشمن

---

[1] الفاظ مٹ گئے ہیں،

ڈاکٹر آرنلڈ مصنف پریچنگ آف اسلام سابق پرفیسر علی گڈھ کالج جن کی تعریف سے ہمارے استاد مولانا شبلی مرحوم نہیں تھکتے تھے، وہ بخاری کے حوالہ سے ثابت کرتے ہیں کہ سلطان خلیفہ نہیں،

غرض یہاں کے وزرا کو تو بہرحال پیام پہنچ گیا، وزیر ہند کی ملاقات کا حال آپ پڑھ چکے ہوں گے، اب وزیر اعظم کی ملاقات کا حال پڑھیے گا، ہمارے سوال اور ان کے جواب میں وہی نسبت ہے جو آسمان اور ریسمان میں، بھئی! اصلی چیز طاقت ہے، یورپ صرف اسی کو مانتا ہے۔

آجکل یہاں اسکوتھ اور لائڈ جارج صاحب کی کشتی کی بڑی گرم بازاری ہے، لائڈ جارج صاحب سوشلزم یا اس کے ہیبتناک لفظ بولشویزم سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک نئی لبرل جماعت قائم کرنا چاہتے ہیں، مسٹر اسکوتھ اس کے مخالف ہیں،

ووکنگ مشن کو دیکھا، انگریز و میم نومسلموں سے ملاقات ہوئی، لندن میں ہر جمعہ کو اور ووکنگ میں اتوار کو اجتماع ہوتا ہے، کام کی صداقت میں کلام نہیں، مگر اس سے زیادہ روپیہ اور محنت درکار ہے، ایک دو دفعہ میں نے بھی نماز پڑھائی،

جناب نواب صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام مسنون، اچھے صاحب کہاں ہیں،

پتہ کوک کمپنی کا رہے۔ والسلام

سید سلیمان

۲۴ فروری سنہ ۲۰ء

مکاتیب شبلی

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے،

ادبیات

اے ربّ کائنات

از جناب شہ زور کاشمیری

ایقان ہو رہا ہے شکار توہمات — اے رب کائنات!
ایماں پہ ہے تسلط رعب منات ولات — اے رب کائنات!

حاجات نے بدل دیا معیار زشت و خوب — اگلے صفات ہو گئے اب داخل عیوب
اخلاق کا بھی مہر منور ہوا غروب — دنیائے دل پہ چھا رہی ہے معصیت کی رات

اے ربّ کائنات!

مرجھا گئے ہیں گلشن روحانیت کے پھول — اور ہے بہار صبر و توکل بھی دل ملول
انسان کو بھی صورت تسکیں نہیں قبول — بیکار اب جہان میں ہے صوم اور صلوٰت

اے رب کائنات!

صد ہا حقیقتوں کو ہے اک جھوٹ کا ہراس — لا تقنطوا کی روح ہوئی ہے اسیر یاس
فطرت بھی ہے اداس، خدائی بھی ہے اداس — جاری یقیں کی آنکھ سے ہے دجلہ و فرات

اے رب کائنات!

باقی نہیں تمدن و تہذیب کے قیود — پامال ہیں شرافت و اخلاق کے حدود

ہے سرکشی کے اوج پہ انسان کی نمود — توڑنا ہی چاہتا ہے نظام تعینات

اے ربِّ کائنات!

اب منتہائے مقصدِ انساں ہے اقتدار — وہ اقتدار جس میں ہو الفاظ کا مزار

انسانیت ہو مردہ، شرافت ہو سوگوار — انساں کا اب خدا ہے یہی اقتدارِ ذات

اے ربِّ کائنات!

جو شام سے ہوں تا بہ سحر محوِ نا و نوش — جنکے دماغ و دل ہوں حسد کیش و بغض کوش

جنکی نظر میں تیری عبادت ہو نقصِ ہوش — ان پر بھلا اثر کرے کیونکر کسی کی بات

اے ربِّ کائنات!

انساں نفاق و بغض و عداوت میں ہے اسیر — رہنِ ہوس ہے اس کا دماغ و دل و ضمیر

اس کی بہار فکر ہے محبوس زہر یہ — دانستہ کھو رہا ہے یہ اپنی رہ نجات

اے ربِّ کائنات!

غزل

از جناب اشفاق علیخاں صاحب ایم اے آنرز، ال ال بی شاہجہانپور

یہ نظر کا کھیل کبتک ؟ تو سکون دے نظر کو — ترا حوصلہ اگر ہو تو اب آزما جگر کو

ہے عبث ابھی دعا میں ترا ڈھونڈنا اثر کو — ابھی ربط تیرے دل سے نہیں تری چشم تر کو

کہو اہل کارواں سے کریں فکر اپنا اپنا! — کہ سلیقہ حوادث نہیں انکے راہبر کو

یہ طلسم روز و شب ہو کہ فسونِ رنج و راحت — کوئی دے سکا نہ دھوکا مرے فکرِ معتبر کو

ترے آشیاں کے لایق وہ چمن نہیں ہے نادان — کہ خزاں کا خوف رہتا ہو جہاں کے ہر شجر کو

یہ جہاں سر نہ ہوگا ترے اشک و آہ غم سے
یہ طلسم ڈھونڈتا ہے کسی مرد باخبر کو

کیا نا امید جس نے تجھے آمدِ سحر سے
اسی شب میں دیکھتا ہوں میں سپیدۂ سحر کو

وہی اس جہاں کا راکبِ جہاں اسی کا مرکب
جو بشر نہ لائے خاطر میں کبھی کسی خطر کو

یہی راز کامرانی میں اسی سے کامراں ہوں
کبھی مرحلہ نہ مانا مرے دل نے رہ گذر کو

مری زیست جاودانی مجھے غم ہو کیوں جہاں کا
کہ محیط ہے فقط یہ مری عمر مختصر کو

مجھے پائمال کرتے ہیں جو آج اپنی ضد سے
وہ رکھیں گے کل گرامی مری خاک پہ سر کو

غزل

از زائر حرم جناب حمید صدیقی

جو یقینِ کاملِ عشق ہو، کوئی چیزِ وہم و گماں نہیں
مجھے وہ نظر بھی عزیز ہے جو مری طرف نگراں نہیں

ترا اک تبسمِ ناز ہے، رگ و پے میں خون رواں نہیں
ترے فیضِ حسن کی خیر ہو، ترا دردِ عشق کہاں نہیں

کوئی راز اس کا بتائے کیا، کوئی حال اسکا سنائے کیا
وہ مقام، فکر و نظر کا بھی کوئی دخل خاص جہاں نہیں

یہ کہاں سے لائی کہاں مجھے کہ حریفِ شوق ہے بیخودی
وہ زمیں نہیں، وہ زماں نہیں، وہ مکیں نہیں، وہ مکاں نہیں

وہ ہزار حسنِ نظر سہی، وہ ہزار جوشِ اثر سہی
یہ بڑی کمی ہے خیال کی، ترا نام وردِ زباں نہیں

مری ہر نگاہ زبان ہے، مرا ہر سکوت بیان ہے
مرا راز، پھر بھی وہ راز ہے جو عیاں بھی ہو کے عیاں نہیں

وہ جو محوِ حسنِ صفات ہے، اسے کچھ سکون سا ہو تو ہو
جو ہلاکِ جلوۂ ذات ہے، اسے خلد میں بھی اماں نہیں

غمِ ہجر کے بھی ہزار لطف، حمید تم نے اٹھا لیے
چلو پھر دیارِ حبیب میں کہ سکونِ قلب یہاں نہیں

مطبوعات جدیدۃ

بنگال میں اُردو ۔ از جناب وفا راشدی تقطیع اوسط، ضخامت ۲۹۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد صہ پتہ مکتبہ اشاعت اردو، حیدرآباد سندھ۔

ایک زمانہ میں ڈھاکہ، مرشد آباد اور کلکتہ کا مٹیا برج مسلمانوں کی تہذیب کا مرکز رہ چکے ہیں، اس لیے بنگال میں ہمیشہ سے فارسی اور اس کے بعد اردو کا چرچا رہا، اور وہاں کے اونچے طبقہ کے مسلمانوں کی علمی و ادبی اور بڑی حد تک بول چال کی زبان بھی اردو رہی ہے اور اب تک ہے، اور ہر زمانہ میں وہاں اردو کے شاعر اور ادیب پیدا ہوتے رہے، خصوصاً واجد علی شاہ اور انکے ہمراہی شعراء و ادباء کی وجہ سے اردو شاعری کو بڑا فروغ ہوا فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کو علمی و ادبی زبان بنایا بنگال ہی کی سرزمین میں تھا، ان اثرات سے بنگالی زبان اور بنگالی عوام دونوں متاثر ہوئے، چنانچہ بنگلہ میں بکثرت اردو کے الفاظ ہیں، اور بنگال میں بنگلہ کے بعد اردو ہی بولی اور سمجھی جاتی ہے، انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر جب اسلامی دور کی نشانیوں کو مٹانا شروع کیا تو بعض متعصب بنگالیوں نے بھی ان کی تقلید کی جس کی صدائے بازگشت آج تک مشرقی بنگال سے اٹھتی رہتی ہے، اس لیے لائق مصنف نے بنگال میں اردو زبان کی تاریخ پر یہ کتاب لکھی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ بنگال سے اردو زبان کا تعلق نہایت قدیم ہے، جو ہر زمانہ میں قائم رہا، کتاب کے شروع میں بنگال میں اردو زبان کی ابتداء اور اس کی ترقی کی مختصر تاریخ ہے، اس کے بعد مختلف دور قائم کرکے ہر دور کے حالات لکھے گئے ہیں، پہلے دور میں فورٹ ولیم کالج کے خدماتِ اردو کا ذکر ہے،

دوسرے میں ۱۸۲۵ء سے ۱۸۷۵ء تک اردو شاعری کی ترقی پر تبصرہ ہے، تیسرے اور چوتھے دور میں علی الترتیب ۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۱ء تک اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۲ء تک دونوں دوروں کے شعراء اور ادیبوں کے حالات اور ان کے ادبی خدمات کا حال ہے، ان میں وہ بھی ہیں جو وطناً بنگالی نہیں ہیں، مگر انھوں نے بنگال میں رہ کر کسی نہ کسی حیثیت سے اردو کی خدمت انجام دی ہے، اس کے بعد اردو و فارسی کے بنگالی ہندو شاعروں اور ادیبوں اور مسلمان اہل قلم خواتین کا ذکر ہے، آخر میں بنگال میں اردو صحافت کی مختصر تاریخ، وہاں کی ادبی مجالس کا تذکرہ اور بنگال میں اردو کی جو کتابیں طبع ہوئیں، ان کی فہرست ہے، اس طرح اس کتاب میں بنگال میں اردو کی پوری سرگذشت آگئی ہے، یہ کتاب مشرقی بنگال میں اردو کی مخالفت کا بڑا مدلل اور مفید جواب ہے، اگر ہر دور کے شروع میں اس کی خصوصیات کا بھی تذکرہ کر دیا جاتا تو کتاب اور زیادہ مکمل ہو جاتی، کتابت و طباعت کی غلطیاں بکثرت ہیں،

مکاتیب اقبال۔ شائع کردہ بزم اقبال، نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ لاہور،
قیمت عہ کاغذ نفیس، ٹائپ عمدہ، مذکورہ بالا پتہ سے ملے گی،

اقبال کے خطوط کا ایک ضخیم مجموعہ کئی سال ہوئے اقبال نامہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یہ نیا مجموعہ ہے، اس میں صرف ایک شخص خان محمد نیاز الدین خان کے نام ۹۷ خطوط ہیں جن میں دو کے علاوہ سب غیر مطبوعہ ہیں، خان مرحوم ضلع جالندھر کے ایک صاحب علم رئیس تھے، فارسی میں فکر سخن کرتے تھے، اور اقبال سے اصلاح لیتے تھے، ان مکاتیب میں ذاتی حالات اور شعر و ادب کے علاوہ علمی و مذہبی، قومی و ملی مختلف قسم کے مسائل کا ذکر بھی جابجا آگیا ہے، جس سے اقبال کے بعض افکار و خیالات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے عام ناظرین کے ذوق اور دلچسپی کا بھی ان میں سامان ہے، اقبال کی ایمانی حرارت، دینی حمیت، گہری مذہبیت اور اسلام اور مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ بیشتر خطوط میں نمایاں ہے، حب رسول کی بعض کیفیات نہایت مؤثر ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں"

"میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں، مگر زندگی تنہائی میں بسر کرتا ہوں، مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالم تخیل میں قرون اولیٰ کی سیر خیالی کیجئے کہ جس زمانہ کا تخیل اتنا حسین و جمیل اور روح افزا ہو وہ زمانہ خود کیسا ہوگا،

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اس کا خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا"

ایک دوسرے خط میں تحریر کرتے ہیں "میں نے نبی کریم کو مخاطب کرکے ایک قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے۔۔۔۔ ابھی چند اشعار لکھے ہیں، مگر ان کے لکھنے وقت قلب کی جو حالت ہوئی ہو ایسی حالت عمر بھر نہ ہوئی تھی، دو شعر لکھتا ہوں

مہر نہ بر آستانت از عجم آوردہ ام سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من الخ

ان خطوط سے اقبال کے اخلاق و سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے، ظرافت کی چاشنی بھی ہے، اس لیے وہ مختلف حیثیتوں سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں،

تبلیغی دورے۔ از مولانا سید داؤد الحی صاحب ندوی تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۰ صفحات، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ (۱) زکریا مسجد اسٹریٹ چھلا مالا بمبئی نمبر ۹ (۲) نفیس دواخانہ پیر جلیل، لکھنؤ۔

لائق مصنف ایک عرصہ سے بمبئی میں مذہبی و تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں اور اس سے متعلق ان کے مضامین اور چھوٹے چھوٹے رسالے برابر نکلتے رہتے ہیں، اسی سلسلہ میں انھوں نے مشرقی افریقہ کا بھی دورہ کیا تھا، مشرقی افریقہ میں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے، زنجبار میں تو ان کی تعداد ۹۹ فیصدی تک ہے، اور انگریزوں کے زیر سیادت برائے نام ایک سلطان بھی حکمراں ہیں، مصنف نے اس علاقہ کے شہروں اور آبادیوں کا دورہ کرکے دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا، یہ کتاب اسی کا روزنامچہ ہے، اس میں تبلیغی اجتماعات کی روداد اور اس کی تقریروں کے علاوہ وہاں کے دینی و تعلیمی اداروں، ممتاز اشخاص اور مختلف

مقامی حالات کا بھی ذکر ہے، جس سے یہ سفرنامہ بہت مفید اور دلچسپ بن گیا ہے،

نسیم عرفان۔ از جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحات،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ے، پتہ: آدرش کتاب گھر، بلی ماران، دہلی،

بھگوت گیتا کے اردو میں کئی منظوم ترجمے ہو چکے ہیں، اردو زبان کے مشہور کہنہ مشق شاعر جناب منور لکھنوی نے بھی عرصہ ہوا ایک ترجمہ کیا تھا، نظر ثانی کے بعد اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے، ایک تخئیل نظم کہنے کے مقابلہ میں کسی نظم یا نثر کا منظوم کرنا بہت مشکل ہے، اور گیتا جیسی دقیق فلسفیانہ اور عارفانہ کتاب کا ترجمہ تو اور بھی دشوار ہے، مگر لائق مترجم اردو زبان کے رمز شناس اور قادر الکلام شاعر ہیں، سنسکرت سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، اور متعدد کتابوں کے کامیاب منظوم ترجمے کر چکے ہیں، اس لیے انھوں نے گیتا کو اس خوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ نظم ترجمہ نہیں معلوم ہوتی اور معنی و مفہوم کی صحت کے ساتھ شاعرانہ محاسن سے بھی آراستہ ہے، زبان نہایت صاف، سلیس اور شگفتہ ہے، الفاظ و معنی میں کہیں ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے، اور کتاب کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، حاشیہ میں جابجا تشریح طلب امور کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے، گیتا میں جو نام آئے ہیں، اگر ان کا مختصر تعارف بھی کرا دیا جاتا تو پڑھنے والوں کو اور زیادہ سہولت ہوتی،

کف گلفروش۔ از جناب غلام احمد صاحب فرقت کاکوروی، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۳۲ صفحات،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ے، پتہ (۱) ادارہ فروغ اردو، امین آباد پارک، لکھنؤ،

مصنف اردو کے ممتاز ظرافت نگار ہیں، ان کی کتاب مداوا ادبی حلقہ میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے، کف گلفروش ان کے سولہ ظریفانہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے، مصنف میں طنز و ظرافت کا ملکہ فطری ہے، خصوصاً مضحک خاکہ اڑانے میں ان کو بڑا کمال ہے، اور لکھنؤ کی زبان اور اس کے ٹکسالی محاوروں پر اتنا عبور حاصل ہے کہ غیر لکھنوی میں اس کی مثالیں کم ملیں گی، گو مصنف بھی آدھے لکھنوی ہیں،

جب وہ اس زبان میں بولتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے ننھے نواب، منھے آغا، دلارے مرزا یا مدک کا کوئی افیمچی بول رہا ہے، اس مجموعہ کا کوئی مضمون بھی دلچسپ طنز و ظرافت سے خالی نہیں ہے، اور اس میں ہر رنگ کے بڑے دلکش نمونے موجود ہیں، عالم برزخ میں مرزا غالب کا مطب، ترقی پسند خواتین کا مشاعرہ، جشن آزادی کی دوپہر اور بورڈنگ ہاؤس خصوصیت کے ساتھ زیادہ دلچسپ ہیں،

صاحبزادیاں - از جناب مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۶ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ بلا جلد ۱۲ر، پتہ: ادارہ اشاعت دینیات حضرت نظام الدین دہلی

اردو میں سیرت و سوانح نبوی پر اتنی کتابیں لکھی جا چکی ہیں کہ ان کی مدد سے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر آسانی سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جا سکتے ہیں، یہ رسالہ بھی اسی قسم کا ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بنات طاہرات بلکہ اولاد امجاد کے حالات ہیں، حضرت زینبؓ، رقیہؓ اور ام کلثومؓ کے حالات مختصر اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے کسی قدر تفصیلی ہیں اور انکی زندگی کے سبق آموز اخلاقی واقعات بھی تحریر کیے گئے ہیں، حضرت ابراہیم کا بھی مختصر ذکر ہے، کتاب کے آخر میں چند نظمیں عورتوں کے پڑھنے کی بعض دعائیں، مفید نصائح اور متفرق کام کی باتیں لکھ دی ہیں، کتاب مسلمان بچیوں کے پڑھنے کے لائق ہے،

قصص ابن السبیل - تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۲ صفحات، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، مکتبہ پرویں الہ آباد نمبر ۳

اس کتاب کے گمنام مصنف پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں جنگی ملازمت کے سلسلہ میں عراق میں متعین تھے، مگر افشائے راز کے خیال سے انھوں نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے، عراق و کردستان کی سرزمین حسن و عشق کی رنگینیوں کیلئے مشہور ہے، قصص ابن السبیل میں اس قسم کی بعض رنگین داستانوں کو جن میں وہ خود بھی مبتلا ہوئے تھے، اور وہاں کے دوسرے دلچسپ واقعات کو افسانے کی شکل میں لکھا ہے، افسانے دلچسپ ہیں۔

"م"

مکتبہ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخِ اسلام (حصۂ اول) عہدِ رسالتؐ و خلافتِ راشدہ یعنی آغازِ اسلام سے لیکر خلافتِ راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت سے

تاریخِ اسلام (حصۂ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت، سے

تاریخِ اسلام (جلد سوم) (خلافتِ عباسیہ) یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ ۷۵۰ء سے ابو اسحاق متقی اللہ ۳۳۳ھ ۹۴۴ء تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت: معہ

تاریخِ اسلام (جلد چہارم) (خلافتِ عباسیہ دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافتِ عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیون کے تمدنی کارنامون پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد پہلے ایڈیشن سے کہین زیادہ ضخیم اور مکمل ہو گئی ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: ۶ سے

نئی کتابین

تاریخ سندھ سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی تاریخ:۔ قیمت: سے (چھ روپیے)

اقبالِ کامل ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل، سے

بزمِ تیموریہ تیموری بادشاہون شاہزادون اور شاہزادیون کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء و شعراء اور فضلا کے مختصر تذکرہ کے ساتھ اُن کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت عہ

امام رازیؒ امام فخرالدین رازی کے سوانح و حالات انکی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت سے

بزمِ صوفیہ عہد تیموریہ سے پہلے کے صاحبِ تصنیفات صوفیۂ کرام مثلاً شیخ ہجویری خواجہ معین الدین چشتیؒ خواجہ نظام الدین اولیاؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت سے

تاریخِ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ کیساتھ اندلس کی و تمدنی تاریخ، قیمت معہ

اہل کتاب آنحضرتؐ کے عہد میں یہود و نصاریٰ اہل کتاب صحابہ و تابعین کا تذکرہ عہ

کتب خانہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

[illegible] کی نئی مطبوعات

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزم تیموریہ کے نام سے شائع ہو چکی ہے، ان سے پہلے کے مسلمان حکمران خانوادوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و تہذیبی کارناموں اور ان کے درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین، امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے، لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی، اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ، عمید سنامی، شمس دبیر، امیر خسرو، امیر حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء، فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے ممتاز و سرآمد روزگار شعراء دریغ، شہاب اور عمید کو پردہ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے، ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے قیمت [illegible]

مآل و مشیت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی عنصر مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انھی دونوں موضوع پر سلسلہ وار [illegible] دفتروں میں بحث کی گئی ہے، آخر میں چند صفحوں پر پوری بحث پر تبصرہ ہے۔ (صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم [illegible])

قیمت [illegible]

([illegible] و ناشر [illegible])

رجسٹرڈ نمبر ا ۵۲۰ے
اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

(۱) جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی — صدر

(۲) جناب مولینا سید مناظر احسن صاحب گیلانی، — رکن

(۳) جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی، — "

(۴) جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی — "

(۵) شاہ معین الدین احمد ندوی — مرتب

(۶) سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے — شریک مرتب

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطیٰ کی یورپ [illegible] کیا گیا ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت [illegible]

حکمائے اسلام جلد اول

دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے فلسفے سے مذہب کی تخریب کی کوشش کی کے بجائے زیادہ تر اس کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)

قیمت [illegible]

جلد ۷۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۵ء عدد ۴

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و تاریخیہ

ادبیات

شذرات

انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اسلامی ہند کی جو تاریخیں لکھیں ان کو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر بہت مسخ کیا اور ہندو مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لیے عموماً اس دور کے واقعات اور مسلمان حکمرانوں کی نہایت غلط تصویر پیش کی، اس کی تقلید بعض ناعاقبت اندیش ہندو مورخین نے بھی کی، یہی تاریخیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں، اسلیے ان کا زہر نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، مگر ہندوستان کے عاقبت اندیش اور صاحب نظر بہی خواہوں نے جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، اسی زمانہ میں اس فتنہ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے انسداد کی بھی کوشش کی، چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ خود منصف مزاج ہندو مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں اسلامی دور کی بہت سی خوبیوں اور ہندوستان سے متعلق مسلمانوں کے سیاسی، علمی اور تمدنی خدمات کا بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کیا،

مولانا شبلی مرحوم نے ۱۹۱۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تاریخی اغلاط کی تصحیح کا ایک خاص شعبہ قائم کیا جو کئی سال تک اس کام کو انجام دیتا رہا، مگر پھر اسکی باگ ایسے ہاتھوں میں چلی گئی، جو اسکو نہ چلا سکے، مگر مولانا مرحوم آخر عمر تک اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں اور مسلمان حکمرانوں کے متعلق غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کی تصحیح و تردید اور ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے، اور اس سلسلہ میں بڑے اہم مضامین لکھے، ان کے بعد حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے جنکو تاریخ ہند سے خاص ذوق تھا ہمیشہ اس مقصد کو پیش نظر رکھا اور اس نقطۂ نظر سے تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر برابر مضامین لکھتے رہے، انکی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" بھی درحقیقت اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور اس کام کو زیادہ وسعت و تنظیم کے ساتھ انجام دینے کیلیے اسلامی دور کی

ایک مکمل اور صحیح تاریخ لکھنے کی تجویز پیش کی اور اسکا پورا خاکہ دسمبر ۱۹۴۳ء کے معارف میں شائع کیا جس میں تاریخ کی ترتیب کے علاوہ اسکی قدیم اہم اور نادر قلمی کتابوں کی نقل، مطبوعہ اور کمیاب کتابوں کا حصول، مغلیہ عہد سے متعلق قدیم یورپین سیاحوں کے بیانات اور ہندوستان کی تاریخ پر انگریزی میں جو قابل ذکر کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی فراہمی، مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے زمانہ میں اس کے متعلق جو تاریخی مواد پیدا کیا، اسکی جمع و ترتیب، ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کتبخانوں میں جو نادر قلمی کتابیں ہیں، ان سے استفادہ وغیرہ بھی شامل تھا۔

اس تجویز کو اہل علم نے بہت پسند کیا، اور اس کے بارہ میں مفید مشورے دیے، جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں، اور اس تجویز کے ساتھ اس کام کو دارالمصنفین میں شروع بھی کر دیا اور اس سلسلہ میں تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند، بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ وغیرہ مرتب ہو کر شائع ہوئیں، بعض کے مسودے موجود ہیں جن کی اشاعت ابھی نہیں ہو سکی ہے، اور بعض زیر تالیف ہیں، لیکن اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ اور جس سر و سامان کی ضرورت تھی وہ مہیا نہ ہو سکا، اس لیے پروگرام کے مطابق انجام نہ پا سکا،

ہندوستان کی آزادی کے بعد قومی نقطۂ نظر سے ایسی تاریخ کی اہمیت اور ضرورت اور بڑھ گئی ہے اور تاریخ ہند کے سلسلہ میں بعض اور کام بھی کرنے کے ہیں، مثلاً اسکی اہم قلمی کتابوں کی تصحیح و اشاعت، جو پرانی مطبوعہ کتابیں نایاب ہو گئی ہیں انکی دوبارہ طباعت، ایلیٹ نے اپنی کتاب میں ہندوستان کی تاریخ کے عربی ماخذوں کو بھی نقل کر دیا ہے، مگر بعض کتابوں پر اسکی دسترس نہ ہو سکی تھی، جو اب چھپ گئی ہیں، ان میں ہندوستان کے متعلق جو معلومات ہیں، انکو جمع کرنے کی ضرورت ہے، اس سے اس دور کے متعلق بعض نئے معلومات سامنے آجائینگے اور بھی اس قسم کے متفرق کام ہیں، مگر یہ سب کام تنہا دارالمصنفین کے بس کے نہیں ہیں، اس کے لیے بڑے سرمایہ کی، دوسرے اہل علم کی مدد کی بھی ضرورت ہوگی جس کا بظاہر کوئی سامان نہیں ہے، تاہم جس حد تک دارالمصنفین کے بس میں ہے وہ اس کو کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات زبان قلم پر آگئی، انگریزوں نے ہندو مسلمانوں میں منافرت کا جو بیج بویا وہ تو

انکے سیاسی مصالح کے مطابق تھا، مگر اب اسکی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ بعض تنگ نظر اور متعصب مصنفین نے ابتک اسکا سلسلہ قائم رکھا ہے، بلکہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے، انگریز تاریخ کے ذریعہ تو بہت زہر پھیلاتے تھے، مگر اپنی حکومت کے خاطر مسلمانوں کے مذہب پر حملہ نہیں کرتے تھے، اور اس زمانہ میں مذاہب کی توہین کی سزا بھی ہوتی تھی، اسلیے دوسرے لوگ بھی احتیاط کرتے تھے، وہ دفعہ تو اب بھی ہے، مگر مسلمانوں کے معاملہ میں بے اثر ہوگئی ہے، اسلیے اور بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے، اور نہ صرف مسلمان حکمرانوں بلکہ مذہب اسلام، اسکے پیغمبر اور اسکی مقدس کتاب کے متعلق نہایت غلط اور دل آزار باتیں تحریر کیجاتی ہیں اور نصاب کی بعض کتابوں تک میں بلاتکلف انکو لکھا جاتا ہے جسکو مسلمان طلبہ بھی پڑھتے ہیں، چنانچہ حال ہی میں صوبہ بہار کی اسی قسم کی ایک کتاب پر اخبارات میں احتجاج ہوچکا ہے، تعجب ہے کہ نصاب کی کمیٹی ایسی لغو کتابوں کو نصاب میں شامل کرنے کی کیسے اجازت دیتی ہے، یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی حیثیت سے نہایت نازیبا بلکہ حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے، اگر حکومت ایک دو مصنفین کو سزا دیدے تو پھر کسی کو اسکی جرأت نہ ہو، مگر مسلمانوں کے معاملہ میں وہ کیوں ایسا کرنے لگی، اگر ہندو مذہب کے بارہ میں اس قسم کا جرم کسی مسلمان سے سرزد ہوتا تو پھر دیکھئے، اس کا انجام کیا ہوتا،

گذشتہ مہینہ انجمن ترقی اردو اترپردیش کے وفد نے وزیر اعظم کے سامنے اردو کے بارہ میں جو شکایتیں پیش کی تھیں، انھوں نے انکے دور کرنے کا وعدہ کیا ہے، مگر اس قسم کے وعدے تو بارہا کیے جاچکے ہیں جن کے پورے ہونے کی نوبت کبھی نہیں آئی، اور پھر ہمارے وزیر اعظم جیسے اردو نواز کا وعدہ! اسلیے محض وعدوں کی کوئی قیمت نہیں، اگر اردو کے معاملہ میں حکومت کی نیت صاف ہو تو جسطرح وہ اپنے دوسرے احکام کی تعمیل کراتی ہے، اسیطرح اس نے اردو کو جو حقوق دیے ہیں اور انکے متعلق جو احکام و ہدایات صادر کرتی ہے اسکی تعمیل کی ذمہ داری بھی لے، ورنہ اس شکوہ و شکایت اور وعدہ وعید کا سلسلہ آخر کب تک جاری رہیگا، اردو پر تو ہر طرف سے یورش ہے اور اسکی حالت "ان کماؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ" کی ہورہی ہے، اسکے حامی کس کس سمت کے حملہ سے اسے بچا سکینگے، یہ بھی عجیب اندھیر ہے کہ ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی زبانوں کو جنکی اردو کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں ہے، جو حقوق حاصل ہیں، اردو اس سے بھی محروم ہے، اسکے حامیوں میں وہ قوت نہیں کہ جنوبی ہند کی زبانوں کی طرح اردو کے حقوق بھی منوا سکیں، لے دیکر ایک محترم صدر جمہوریہ سے انصاف کی توقع تھی، مگر انھوں نے اس معاملہ میں "خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید" کا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے، اور اترپردیش کی حکومت اس پر معنی خاموشی کے مفہوم کی تفسیر اپنے رجحان کے مطابق کرتی ہے۔

مقالات

سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب محمد اشرف خانصاحب ایم اے لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور

(۲)

اسی طرح دینی دعوت و تبلیغ کی اہمیت و ضرورت اور اس میں انتہائی اہتمام و شغف کے باوجود حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دعوت کی صحیح ترتیب کی صورت یہ تھی کہ پہلے اپنی اصلاح کی فکر کیجائے، اسکے بعد دوسروں کی، یہ نہ ہو کہ اپنی اصلاح سے غفلت تام ہو، اور دوسروں کی اصلاح کے غم میں گھلنا شروع کر دے، اس سے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اپنی اصلاح ہوتی ہے، جو خود مجسم تاریکی ہو، وہ دوسروں کو کیا روشن کر سکتا ہے، دلوں کی زندگی زندہ قلوب کی تاثیر سے میسر آتی ہے، مردہ دل کسی کی کیا مسیحائی کریں گے، الفاظ کی رنگینی، زبان کی روانی اور قلم کی جولانی سے دلوں کی ہدایت نہیں ہوتی، یہ نور خداوندی عطیۂ الٰہی اور زندہ دل بزرگوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے، قلبی ہدایت کے بغیر منبر اور سٹیج کی تقریروں یا کتب و رسائل کی تحریروں سے ذہنی جوش و تاثر تو پیدا ہو سکتا ہے، علم میں بھی ایک گونہ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن روح و قلب کی دنیا شاذ ہی ان سے بدلتی ہے، آرام باغ کراچی میں ایک جلسہ منعقد ہونے والا تھا، داعی جلسہ نے حضرت شیخ سے درخواست کی کہ آپ تقریر فرما دیں، ہماری اصلاح ہو جائیگی، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے انتہائی بلیغ انداز میں جواب دیا" اصلاح آرام باغ میں نہیں حجرہ میں

ہوتی ہے" سچ ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ایک طالب نے لکھا "اصلاح خلق کا خیال چھایا ہوا ہے، اور اپنی طبیعت دیکھ کر کڑھتی ہے، دل چاہتا ہے کہ اللہ اپنے دین کے پھیلاؤ کا ذریعہ اور سبب بنائیں" سیدی قدس سرہٗ نے جواباً لکھا "جی ہاں اصلاح خلق اس طرح سے مقصود ہیں پر وہ اپنی اصلاح ہونی چاہیے، ورنہ جو خود پاک نہیں وہ دوسروں کو پاک نہیں بنا سکتا"

ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:-

"دوسروں کے افادہ پر نظر رکھنے سے پہلے اگر اپنے استفادہ پر نظر نہ رہے تو افادہ مؤثر بھی نہیں ہوتا، اپنے نفس کا حق دوسروں کے حقوق سے اہم و اقدم ہے۔ ولنفسك عليك حقا۔ اس لیے پہلے اپنی ہی خواہی کیجیے، پھر دوسروں کی، استادی تک پہنچنے سے پہلے استاد بننے کی غلطی سے محفوظ رہیے، آپ جماعت[1] کے ساتھ کام تو کریں اگر نظر اپنے اوپر ہو اور اپنی درستی کی نیت ہو"

اسی طالب نے حضرت سیدی قدس سرہٗ کو لکھا کہ "اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب طبیعت اپنے کو بھلا کر دوسروں کی فکر میں سرگرداں نہیں رہتی" جواباً ارقام فرمایا:

"بالفعل یہ کیفیت اچھی ہے، ایک وقت آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ جب فذکر ان نفعت الذکریٰ کی تعمیل ہوگی، مگر فطری ترتیب یوں ہی ہے کہ اول خویش بعدہٗ درویش"

اس زمانے میں یہ مرض عام ہے کہ مسلمان عموماً اپنی اصلاح کی فکر سے بے نیاز ملت کی زبوں حالی اور تباہی کا رونا روتے ہیں، گو کچھ لوگوں کا جذبہ حسن نیت پر مبنی ہوتا ہے، مگر مرض کا ازالہ مرثیہ خوانی اور کف افسوس ملنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کا صحیح علاج پہلے اپنی اس کے بعد دوسروں کی اصلاح ہے۔

محمد داؤد جان مرحوم سرحدی ایک صالح اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمان تھے، انھوں نے

---

[1] مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت

حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کو ملت کی زبوں حالی کی پراثر داستان لکھ بھیجی، اسکا جو جواب مرحمت فرمایا وہ ملت کی اصلاح کا درد رکھنے والے ہر سچے مسلمان کے لیے سرمۂ بصیرت ہے، پورا خط درج ذیل ہے:

انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم و محترم۔ دنفعکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا عنایت نامہ ملا، آپکے مذہبی ولولوں کی بڑی قدر ہوئی، اللہ تعالیٰ آپکو صراط مستقیم پر رکھکر اپنی اصلاح اور تزکیہ کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔

آپ کا کہنا سب سچ ہے لیکن اصلاح کی تدبیر کیا ہے، وہ لوگوں پر یا مسلمانوں پر ماتم نہیں ہے، بلکہ سب سے پہلے خود اپنی حالت پر ماتم ہے، اور جب اپنی اصلاح سے فراغت ہو جائے، تو دوسروں کی فکر ہو، صرف دوسروں کی فکر صرف زبان سے کرنا اور اپنے سے غافل رہنا لیڈرانہ شان ہے، میری مخلصانہ خواہش ہے کہ ہم لوگ سب سے پہلے اپنے اپنے احوال پر نظر کریں، اپنی صحت، روحانی و اخلاقی و دینی کی فکر کریں، اسکے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان کی خبرگیری کریں، اور ان کی اصلاح کی فکر میں لگیں، انشاء اللہ اگر ہم اس طرف متوجہ ہوں گے تو سارے مسلمانوں کی حالت بدل جائے گی، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کے ہم مستحق ہوں گے، کیا آپ اس نکتہ پر غور فرمائیں گے۔ والسلام سید سلیمان - ۲ مئی ۱۹۵۱ء "

اسی طرح ایک دوسرے طالب کو ارقام فرمایا:

" بے شبہ امت مرحومہ کی پریشان حالی اور پراگندگی کی کیفیت آپ کو متاثر کرتی ہوگی، مگر غور کیجئے کہ اس کا علاج آپکے ہاتھ میں ہے، جب آپ کی استطاعت سے وہ چیز خارج ہے تو اس کی فکر میں پڑکر اپنا وقت آپ کیوں ضائع کرتے ہیں، یہ تو لیڈرانہ قسم کا ایک مرض ہے، آپ کو اختیار اپنے اوپر اور اپنے اہل و عیال اور متبعین کے اوپر ہے، آپ اپنی اور ان کی اصلاح کی فکر فرمائیں کہ یہ آپ کی استطاعت میں ہے، آپ کی شدت احساس سے متاثر ہوا، خدا کرے کہ یہ احساس صحیح موقع پر صرف ہو۔"

اس کی مزید تشریح دوسرے مکتوب گرامی میں اس طرح فرمائی ہے:

"میرا مقصد یہ تھا کہ انسان کو پہلے اپنی پاکی کی کوشش چاہیے، اس کے بعد دوسرے کی فکر چاہیے، ایسا نہ ہو کہ موجودہ سیاسی لیڈروں کی طرح دوسروں کی فکر تو ہو، مگر خود اپنی فکر سے غفلت تام ہو، اس سے نہ اپنا ہی بھلا ہوتا ہے نہ دوسروں کا"

اسی قسم کی ایک اور تحریر کے جواب میں ارقام فرمایا:

"آپ کا خط پاکر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے دل میں دین کا درد ہے، جو اس زمانے کے مسلمان نوجوانوں میں کم ہے، آپ نے جو تجویز سوچی ہے، وہ سردست ناممکن العمل ہے، آپ ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں، خیالات کی وسعت میں سرگرداں ہیں، بہتر یہ ہے کہ آپ دوسروں کو چھوڑ کر پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر کریں، آپ ماشاء اللہ سعادتمند ہیں،

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جان دوست تر دارند جوانان سعادتمند پند پیر دانا را"

ایک اور طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"دوسروں کو اس خیر کی دعوت دینا جس پر گو آپ کا ابتک عمل نہ ہو، مگر نیت میں ہو، برا نہیں، کیا عجب آپ کے لیے وہ محرک بن جائے، جو کہتے ہو کرتے نہیں کے یہ معنی نہیں کہ جو خود تم نہ کرو، وہ دوسرے سے نہ کہو، بلکہ یہ معنی ہیں کہ جو نہیں کرتے اس کا دعویٰ نہ کرو، غرض اس کا دعویٰ کرنا منع ہے، دعوت کرنا منع نہیں"

حضرت والا کو ایک طالب نے تحریر کیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دین کی خدمت اور عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے طریقۂ زندگی کی ترویج کا ذریعہ بنائے، حضرت سیدؒ نے جواب میں تحریر فرمایا" دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے یہ کام لیں، اور آپ کو پہلے اپنا بنائیں اور پھر دین کی خدمت کا ذریعہ آپکو بنائیں اور بنائیں"

اس مختصر دعا میں صحیح دینی دعوت کا خلاصہ ہے کہ دعوت کی کامیابی کی پہلی شرط اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کا قرب و تعلق ہے، جو اصلاح ظاہر و باطن کا حاصل اور طاعت الٰہی، اتباع نبوی اور ذکر

غالب کا ثمرہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کا تعلق ہے جو داعیان حق کی ہر حالت میں دستگیری و رہنمائی کرتا ہے، اور عالم میں ہدایت کے ان چراغوں کی روشنی اسی تعلق سے عبارت ہوتی ہے، یہ تعلق جتنا قوی ہوگا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا پرتو اس داعی کے ذریعے منعکس ہوکر دلوں اور روحوں کی ہدایت کے نور سے معمور کرتا رہے گا۔

تعلق مع اللہ کے ساتھ دین کی خدمت کا صحیح طریقہ بھی عنداللہ صحیح ہونا ضروری ہے۔ ورنہ انسان بعض اوقات اپنے زعم میں ایک کام دینی خدمت سمجھ کر کرتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ دین کو نقصان پہنچا دیتا ہے۔ اس لیے دعوت کا علیٰ منہاج النبوۃ ہونا ضروری ہے، ایک مرتبہ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے دو مخلص خادم حاضر ہوئے، اور دعوت پر گفتگو شروع ہوئی، ہمارے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مولانا الیاس تو مامور من اللہ تھے، ورنہ کہاں بنگلہ والی مسجد اور کہاں اللہ تعالیٰ کا حرم اور بدر کا میدان" (اشارہ تبلیغی کام کے ان مقامات تک پہنچنے کی طرف تھا) ان حضرات میں سے ایک صاحب (مخدومی محمد شفیع قریشی صاحب) نے عرض کیا، مولانا (الیاسؒ) فرماتے تھے کہ "یہ کام تو ہمیں نظر آرہا ہے کہ ہوکر رہے گا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اصول کے مطابق ہو"، فرمایا "جی ہاں، اصولوں کی پابندی ضروری ہے، پھر فقیر سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ "مولانا الیاس کی سوانح کا مقدمہ جو میں نے لکھا ہے، آپ نے پڑھا ہے"۔ میں نے اثبات میں جواب دیا، فرمایا اس کی شرح لکھ سکتے ہو، مقدمہ گو مختصر ہے، لیکن قرآن و حدیث سے مطابقت دیکر اسکو بڑھایا جاسکتا ہے"، اس واقعہ کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت والاؒ تبلیغی دعوت کا دینی اصولوں کے مطابق ہونا نہایت ضروری سمجھتے تھے، ورنہ وہ سراسر فتنہ بن سکتی ہے۔ ایک مرتبہ راقم سے فرمایا "لوگوں کو سختی سے دین کی طرف نہیں بلانا چاہیے، انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا منشا شفقت تھی، لوگوں کو اپنی ہمدردی کا یقین دلائیے، پھر پیار سے دین کی طرف بلائیے"۔

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

ایک صاحب کو جنھوں نے اپنے متعلق جرأت حق کی کمی اور مداہنت کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، ارقام فرمایا "جرأت حق نام حق کو خوبی اور نرمی کے ساتھ ظاہر کردینا ہے سختی اور سخت کلامی کی ضرورت نہیں کہ وہ تو کام کو اور خراب کر دیتی ہے" ادعوالیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ ایک دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں "حق گوئی ہو مگر اس طرح کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام دیکھیں تو اس موقع پر حق گوئی مفید ہے، جب لوگ آپ کی بات سننے کو آمادہ ہوں، ورنہ قلب سے اس کو برا سمجھیں"

اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے متوسلین کو دعوت و تبلیغ سے منع فرماتے تھے، بلکہ حضرت کا یہ منشا تھا کہ دعوت سے پہلے اپنی اصلاح اور دعوت کا صحیح اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے، ورنہ دعوت و تبلیغ کا جو جذبہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھا، اسکی مثالیں کم ملیں گی، ایک مرتبہ نہایت درد سے فرمایا "آج سب دعوتیں موجود ہیں، لیکن دین کی دعوت جیسی ہونی چاہیے موجود نہیں، تمام نظام و مجلسیں دعوت کے زور سے قائم ہیں، سوشلزم ہو یا جمہوریت، لیگ ہو یا کانگریس ہر چیز دعوت سے قائم ہے، یہ اسلام کی کرامت ہے کہ اندر باہر سے اس قدر مار اور زد پڑنے کے باوجود کچھ لوگ اب بھی اسلام پر قائم ہیں، اخبارات ہوں یا ریڈیو، سینما ہوں کہ مخالفین کے پروپیگنڈے ہر چیز مخالف جارہی ہے، اسلام کے نام پر اسلام کو زک پہنچائی جارہی ہے، اسلام کو سب آواز دیتے ہیں مگر اسلام کی آواز پر کوئی نہیں جاتا"

ایک مرتبہ دین سے مسلمانوں کی غفلت اور دینی تعلیم و تبلیغ سے لاپروائی اور صاحب بصیرت وعزیمت علماء اور خادمانِ دین کی کمی کا تذکرہ کرتے ہوئے حسرت سے فرمایا:-

"جہاں ہزاروں کالج اور اسکول ہیں وہاں عربی کے مدارس کتنے ہیں، پھر ان کی مالی حالت

کیا ہے، جب اس کا رواج تھا، ہزاروں پڑھتے تھے اور امانت و دیانت کی بناپر پچاسوں کام کے نکلتے تھے اب ان مدارس میں جاتے ہی کتنے ہیں، تمام بڑے بڑے خاندان جن میں صلاحیت ہے، انگریزی پڑھ رہے ہیں، اور دینی تعلیم سے پوری غفلت برت رہے ہیں، عام طور سے لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی منصب اور ملازمت بنا رکھا ہے، غیر اقوام میں مالدار خاندانوں کے لوگ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد مشنری کا کام شروع کر دیتے ہیں، اور اسے تبلیغ مسیحیت کا ذریعہ بناتے ہیں، کوئی مسلمان ڈاکٹر ہے جو ملت کی سربنری کے لیے اپنے کو صرف کر رہا ہے، ہمیں تو ایسے اشخاص کی ضرورت ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود دین کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کرسکیں"

ایک سفر کے دوران میں کچھ اٹالین مشنری ہم سفر ہو گئے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ان سے رومن کیتھولک عقائد کے متعلق بات چیت کرتے رہے، بعد میں مجھ سے فرمایا" یہ مشنری روما سے پنجاب میں مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لیے آئے ہیں، اور پنجابی زبان سیکھی ہے، ہم میں سے کوئی ہے کہ اطالوی زبان سیکھی ہو اور وہاں اسلام کی دعوت دینے کے لیے گیا ہو"

حضرت والا قدس سرہٗ کے ایک خادم کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کچھ وقت تبلیغ و دعوت میں صرف کرنے اور پیدل سفر کرنے کی سعادت بخشی، حضرت کو معلوم ہوا تو گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:

"مبارک ہو کہ آپ نے دین کی خدمت کے لیے اپنے پاؤں کو گرد آلود کیا"

ایک جا رہتے ہیں عاشقِ بدنام کہیں   دن کہیں، رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

دوسرے موقع پر فرمایا" جوان ہوتا تو میں بھی ان پیدل سفروں میں شریک ہوتا، پیدل کے دینی قافلوں کی مشابہت و نسبت صحابۂ کرام سے ہے" (او کما قال)

یہی صاحب جب ایک دوسری جماعت کو رخصت کرنے گئے، جو حج کے لیے پیدل جا رہی تھی،

اور خدمت اقدس میں دیر سے آنے کی وجہ اس جماعت کی مشایعت بیان کی تو ارشاد فرمایا "میرا ایک شعر ہے

کچھ تو سہ رنگیٔ مستاں بھی ہے حاصل لیکن   جوششِ و لغزشِ رفتار کہاں سے لاؤں

اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے، جو قدم اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے اٹھائے جاتے ہیں، ان پر ثواب ہے، حدیث میں ثواب آیا ہے، ان کا ماخذ قرآن میں ہے۔ ما کان لاھل المدینۃ ... الی ..... ولا ینفقون نفقۃ صغیرۃ ولا کبیرۃ ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون (التوبہ-۱۵) اور من یخرج من بیتہ مھاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ (نساء-۱۴)

حضرت سید الملۃؒ کی تمام عمر دینی خدمت میں گذری، اس شہید علم و دین کے تبلیغی جذبہ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ بیمار تھے تنفس کا شدید عارضہ تھا، ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کی ممانعت کر رکھی تھی، اسی دوران میں تبلیغی حضرات کا ایک اجتماع لائلپور میں منعقد ہونے والا تھا، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تبلیغی حضرات نے راقم کے ذریعے اجتماع میں شرکت کی درخواست کی، فرمایا، آپ کو معلوم ہے، میں تو بیمار ہوں، اس بنا پر انھیں میری معذوری کی اطلاع کر دیجئے، لیکن کچھ دیر بعد خود ہی برادرم سلمان سلمہ کو فرمایا کہ میرے سفر کا سامان درست کر دو، اور راقم سے مخاطب ہو کر فرمایا" وہ اپنے لیے تھوڑا ہی بلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت ہے۔ اس لیے انکار نہیں کر سکتا، اور اسی بیماری اور ضعف کی حالت میں اسلام کا یہ جوانمرد سپاہی دین کی خدمت کے لیے آمادۂ سفر ہو گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس سفر کے دوران میں تبلیغی جماعتوں کو خطاب کرتے وقت آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

"اے اللہ جس طرح تو نے اس امت کے پہلے حصہ سے (دین کی خدمت کا) کام لیا اس پچھلے حصہ سے بھی کام لے لے، اور ہمیں ضائع نہ فرما۔"

کراچی سے ایک تبلیغی جماعت تبلیغ و حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے پیدل روانہ ہوئی حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ان "غرباء" کے قافلہ کو بڑی رقت آمیز دعا کے ساتھ رخصت فرمایا اور بعد میں ان کے امیر جماعت کو یہ خط لکھا:

کراچی - ۵

۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء

بخدمت مکرمی جناب میانجی عادل صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ آپ لوگوں کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے رفقاء کو اتباع مرضیات کی توفیق عنایت فرماویں، اور بخیریت منزل مقصود تک پہنچائیں، آپ لوگ اس وقت بفضلہ تعالیٰ ایک بڑے مقصد کے لیے سفر کر رہے ہیں، اس راہ کا توشہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور مسلمانوں پر شفقت ہے، آپ لوگ اس وقت اسلام کے پیغامبر اور قاصد اور اللہ تعالیٰ کے داعی ہو کر نکلے ہیں، سلامتی اور محبت کا یہ پیغام مسلمانوں میں پھیلاتے ہوئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے مسلمانوں کا دل بڑھاتے اپنے راستہ کو طے کریں، ذکر و شکر الٰہی ہر وقت جاری رہے، میری اور سب کی طرف سے سب کو سلام مسنون پہنچائیں، والسلام

سید سلیمان ندوی

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت میں اپنے متوسلین کی شرکت مستحسن سمجھتے تھے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے لکھا "الحمد للہ تبلیغی جماعت میں کچھ وقت گزارا

اس کے جواب میں ارقام فرمایا "نیک لوگوں کی صحبت بہت مفید ہے"۔ ایک دوسرے طالب نے لکھا کہ "نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور اپنی اصلاح کی نیت سے مولانا الیاسؒ کاندھلوی کی مبلغین کی جماعتوں کے ساتھ جاتا ہوں"۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ "اس صحبت کو جاری رکھیے"۔ ایک دوسرے خط میں ان ہی کو ارقام فرمایا "آپ جماعت کے ساتھ کام تو کریں، مگر نظر اپنے اوپر ہو اور اپنی درستی کی نیت ہو"۔

ان مباحث سے "سلوک سلیمانی" کی جامعیت اور ہمہ گیری کا ایک حد تک اندازہ ہوگیا ہوگا۔

اب خاص فن کے متعلق حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے،

ضرورت شیخ | اس طریق میں شیخ کی اہمیت و ضرورت محتاج تعارف نہیں کہ بغیر شیخ کامل کی رہنمائی و دستگیری اور اس کی محبت و اطاعت کے اس راستے میں ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہے ؎

جو موسیٰ بھی ہو تو اتباعِ خضر لازم ہو | ہدایت منحصر ہے اتباعِ شیخ کامل میں

شیخ ہی وہ ذریعہ ہے جس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ اپنے گوناگوں فیضان و برکات سے طالب کو نوازتے ہیں،

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے | چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا | اب جو میرا شعر ہے الہام ہو

اس کی صحبت "اکسیر اعظم اور کبریت احمر ہوتی ہے، یہ فیض صحبت ہی تھا جس نے صحابہ کی زندگی کے رخ کو یکسر بدل دیا اور ان کو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل نمونہ بنا دیا، اور ان سے آیندہ ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا، یہ الٰہی سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرح دائمی ہے، ہمارے حضرت والا فرماتے تھے "قرن اول میں جماعت سے جماعت متاثر ہوتی تھی، پھر جب اسلامی معاشرہ میں اضمحلال آیا تو جماعت کے بجائے افراد کاملین پیدا ہونے لگے، اور افراد سے افراد متاثر ہونے لگے ...... دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی ہے، ہمارے آپ کے دل خالی ہو جائیں، لیکن ابھی اللہ تعالیٰ کے بندے موجود ہیں، جیسے چراغ کو چراغ جلاتا ہے، اسی طرح جن کے دل میلے ہو چکے ہیں پھر ان کو روشن قلوب سے ملادو وہ صاف

اور روشن ہو جائیں گے۔ قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سراجاً منیراً (روشن چراغ) کہا گیا ہے، اب تک جو صلحا موجود ہیں، ان کے دل اسی چراغ (سراجا منیرا) سے روشن ہوئے ہیں، شجرہ میں ان چراغ جلے ہوؤں کے نام لکھے ہیں، جیسے محدثین اپنی سندیں ملاتے ہیں، اسی طرح یہ چراغ جلے ہوئے اپنا سلسلہ شجرہ میں ملاتے ہیں۔" ایک مرتبہ ارشاد فرمایا" زمین و آسمان کی روشنی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، اللہ نور السمٰوٰت والارض۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو چھوڑ دیا جائے تو نور کہاں رہ جاتا ہے ظلمت ہی ظلمت رہ جاتی ہے۔ نور تو اللہ تعالیٰ ہیں، یہ چیز پروپیگنڈے سے ہاتھ نہیں آتی، زندہ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کیجئے، جیسے دیے سے دیا روشن ہوتا جاتا ہے صحبت سے دل روشن ہو جاتے ہیں۔"

انسان فطرۃً دوسرے کی صحبت سے متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً اہل اللہ کی صحبت تو سراپا شعلۂ طور ہے، جو ماسوا کے تعلقات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، یہ حکمت الٰہی اور عادت خداوندی ہے کہ اپنے نور ہدایت و فیضان کو شیخ کے ذریعہ طالبین کے دلوں میں منتقل کر دیتا ہے، اور دلوں کی کھیتی شیخ کی آبیاری سے ہری ہوتی ہے۔

تیرے اک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں　　سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزار دل

صحبت کے اثر سے زندگی خود بخود بدل جاتی ہے اور اہل دل کی کیمیا اثر نگاہ مس خام کو زر خالص بنا دیتی ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

تری نظر میں ہے تاثیر مستی صہبا　　تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے
تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں　　وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس راہ میں ہر وقت کی دھن اور دھیان سے ہی کام چلتا ہے، بغیر فکر باطن کے رسوخ حاصل نہیں ہوتا، جو صحبت کا ثمرہ اور شیخ کا فیض ہوتی ہے، یہ قلبی فکر و تقاضا، دھن اور دھیان، سوز و طلب ہی حصول مدعا کا ذریعہ ہے، اس لیے ایک نعمت ہے ؎

تراوش سے خونِ جگر کی نہ ڈر کہ مرہم سراپا یہ ناسور ہے

اور عشق کی بے تابیاں اور مہجوریاں بھی قرب و وصل سے کم نہیں،

یہ عالم ہے دل کا غمِ عشق میں کہ مغموم ہو کر بھی مسرور ہے

غرض خاصانِ خدا کی صحبت محبت الٰہی کا سرچشمہ ہے، جن قلوب کو کتابوں کے سیاہ نقوش اور علمائے علم کی سیاہی سے زنگ آلود کر دیتے ہیں، صحبت کا نور انھیں یکسر چمکا دیتا ہے، ایک ڈاکٹر اور شہرۂ آفاق مصنف سے جنھوں نے استنبول میں ایک پرانی کتاب کے ملنے کی خبر دی تھی، احقر کی موجودگی میں ارشاد فرمایا "ڈاکٹر صاحب کتنی کتابیں پڑھیےگا" حضرت شیخ کا مقصود یہ تھا کہ

سد کتاب صد ورق در نار کن جان و دل را جانب دلدار کن

اسی مضمون کا حضرت شیخ کا ایک شعر ہے

مرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں لگا دے برق ایمن! آگ تو اس میں حاصل ہیں

ایک مرتبہ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کسی اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے، راقم قلب قدس کی طرف متوجہ تھا کہ ناگاہ دل میں یہ خطرہ گذرا کاش حضرت کچھ ارشاد فرماتے، اس خطرہ کے گذرتے ہی مسکرا کر فرمایا "لوگ کہتے ہیں کچھ کہیے، اور اکبر کہتے ہیں ۔ ع

"تاثیر دکھا تقریر نہ کر"

حضرت شیخ قدس سرہٗ کے ہاں گو معروف توجہ کا دستور و اہتمام نہ تھا لیکن صحبت کی تاثیر کے ضمن میں ایک واقعہ بیان کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں میری آخری حاضری ۲ جولائی ۱۹۵۳ء سے ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء تک رہی، میرا قیام دوسری جگہ تھا، مگر روزانہ حاضری ہوتی تھی، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت عموماً علیل و کمزور رہتی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت کو وقت موعود کے قریب آنے کا گمان غالب ہو چلا تھا، اور اشارے تصریح کی حد تک واضح تھے،

چنانچہ بارہا ارشاد فرمایا کہ " اپنے آخری ایام میں شبلی مرحوم کہا کرتے تھے ع

چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک "

جس سے حضرت والاؒ کی اپنی ذات مراد ہوتی تھی، ایک مرتبہ ایک حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر کہا " تیرہ بار نبض چل کر ٹھہر جاتی ہے "، فرمایا " اتنی عمر چلتی رہی ہے آخر آرام بھی کرے گی "۔ بہرحال حضرت سیدی قدس سرہٗ کو گویا یقین تھا کہ یہ اس بدنصیب کی آخری حاضری ہے۔ اس لیے لطف وکرم کا دریا جوش پر تھا، راقم نے عرض بھی کیا تھا

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہو

اشرف فقیراست وگدا افتادہ در شہر شما شاید کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

میری واپسی کے قریب پوچھا " کب روانگی ہے؟ " جب دو دن رہ گئے تو ایک دن تنہائی میں اس فقیر کے حال پر توجہ فرمائی، تھم تھم کر ملفوظات سے سرفراز فرماتے رہے، اس دوران میں راقم کو توجہ باطنی کا ایسا شدید احساس ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ قلب بیٹھ جائے گا، اس تاثیر کی یاد آج تک تازہ ہے،

خدا جانے مجھے کیا دے کے ساقی نے پلایا ہے وہ کب کا جا چکا پھر بھی نظر آتا ہے محفل میں،

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

حیات نو مجھے ان کی نگاہ ناز نے بخشی بھرا ہے آب حیواں کاسۂ زہر ہلاہل میں

حضرت سیدی قدس سرہٗ اپنے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں سرشار تھے، اور بڑی عظمت وعقیدت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے، ان کے فنافی الشیخ ہونے کی کیفیت ان کے اشعار واقوال سے ظاہر ہے، فرماتے تھے " میری شاعری حضرتؒ کے تعلق کے ساتھ شروع ہوئی اور حضرت کے وصال پر ختم ہوگئی "، یہ اشعار رسمی شاعری نہیں بلکہ عشق ومحبت کا بادۂ سرجوش ہیں، ان سب کو نقل کرنا اگرچہ طوالت ہے، لیکن امید ہے کہ ناظرین بھی اس سے لطف اندوز ہوں گے،

اس لیے کچھ منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

مجھ پہ جادو یہ چلایا کس نے   مجھکو دیوانہ بنایا کس نے
میں تھا آسودۂ خوابِ غفلت   مجھکو سوتے سے جگایا کس نے
اپنا ہر داغ نظر میں آیا   ایسا آئینہ دکھایا کس نے
عشق کی راہ یقیں کی منزل   مجھکو یہ راز بتایا کس نے
کھو گئی عقل و خرد کی دنیا   جامِ سرشار پلایا کس نے
اب کچھ آباد ہے دل کی بستی   اس خرابہ کو بسایا کس نے
دل تھا مردہ لحدِ سینہ میں   اس کو قُم کہہ کے جلایا کس نے
جس کو تھا آٹھ پہر کا رونا   ایسے روتے کو ہنسایا کس نے

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے   چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

قیل و قالِ مدرسہ کو چھوڑ کر   شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا
آج ہی پایا مزہ ایمان کا   جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا
ایسے کچھ انداز سے تقریر کی   پھر نہ پیدا شبہۂ باطل ہوا
گھول کر کیا جانیے کیا دیدیا   حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا   جو نگاہِ ناز کے قابل ہوا
قید پا ہے حلقۂ پیر مغاں   پھر نہ اٹھا جو یہاں داخل ہوا

اگر ساقی تری چشم فسونگر کام کر جائے   بدل جائے نظامِ دل بدل جائے جہانِ دل
تری ساقی کرامت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی   زباں میری لگی اک گھونٹ میں کرنے بیانِ دل

آواز دیکے کوئی ادھر سے ابھی گیا   ہر سو تلاشِ نقشِ قدم کر رہا ہوں میں

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز ہر رگِ جاں سازِ الاّ اللہ ہے

ذرہ ذرہ عالمِ محسوس کا خاموش ہو یار ہے گرمِ سخن محفل سراپا گوش ہے
حبذا پیرِ مغاں دریا دل و دریا نوال جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے

اے مسیحِ دردِ دل چارہ گرِ آزارِ دل پا رہا ہے تیرے درماں سے شفا بیمارِ دل
دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خارِ دل

اے ساقیِ مدہوش کر دے مجھے بیہوش کیسے ہو نشہ پیدا لبِ بادۂ پر جوش

یاد آیا چشمِ ساقی کا کرم پھر چھلکتے جام کی امید ہے
دید اس کی مایۂ عیش و نشاط ابروے ساقی ہلالِ عید ہے
اس سے پایا ہے ملت نے فروغ ختم اس پر دورۂ تجدید ہے

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں
حیاتِ نو مجھے ان کی نگاہِ ناز نے بخشی بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہرِ ہلاہل میں
جو موسیٰ بھی ہوں تو اتباعِ خضر لازم ہے ہدایت منحصر ہے اتباعِ شیخِ کامل میں

سازگار اب گردشِ ایام ہے دور میں ہشتاد سالہ جام ہے
اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار آج ہی آغاز کا انجام ہے
اب درِ پیرِ مغاں چھوٹے نہیں اس کی مٹی میں بھی کیفِ جام ہے
فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

آتا ہے خدا ابھی ترے صدقے میں مجھے یاد گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھکو دوریِ مسافت کا گلا بھول گیا ہوں
سجدہ طرفِ کعبہ ہے دل تیری طرف ہو اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں

اے خضر مرا قافلہ کس سمت چلا ہے تمیز صدا ہائے درا بھول گیا ہوں

دور سے آیا ہوں ساقی دیر سے آیا ہوں میں ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہو

بادۂ عرفان کے اس دور کو ایک قطعہ پر ختم کرتا ہوں۔

اے خوشا جوشِ محبت لے خوشا تاثیر عشق گاہے گاہے ان کو میری یاد اب آنے لگی

نامۂ عرضِ محبت شوق سے پڑھنے لگے خط سے کیا دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

میری وارستہ طبیعت مدح کے قابل ہوئی اب مرے جوشِ جنوں کی بھی ادا بھانے لگی

جب سے اے دل اپنے عیبوں پر نظر اپنی پڑی اپنے دعوائے ہنر سے شرم سی آنے لگی

شیخ کی محبت کے سلسلہ میں بعض واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

ایک مرتبہ مختلف موضوعات اور سیاست پر گفتگو کے بعد مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "بزرگوں کی مجالس میں ان چیزوں کا نام تک نہ تھا، گویا اس زمانے میں وہ تھے ہی نہیں۔"

ایک مجلس میں مہاجرین کے مال و جائداد کے بھارت میں رہ جانے کا ذکر تھا، فرمایا "اللہ میاں آجکل زبردستی صوفی بنا رہے ہیں، صوفیہ اسباب کی کثرت سے مشوش ہوتے تھے، ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ہر سال اپنے سامان کا جائزہ لیتے تھے، اور گرمی اور سردی کے دو دو جوڑوں کے سوا سب اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیدیتے تھے۔"

ایک صاحب کے استفسار پر تحریر فرمایا "یہ خاکسار صرف لفظاً پیر ہے، اللہ تعالیٰ معنیً بھی بنا دیں، آپ نے ان کا جو پڑھا ہے وہ صحیح ہے کہ مجھے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقِ خدمت ہے، اللہ ان کی تعلیمات کی برکت سے بہرہ مند فرمائیں۔"

شیخ کی اتنی محبت و عقیدت کے باوجود حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک محقق صوفی کی حیثیت سے

شیخ کو محض ایک آلہ اور ذریعہ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو معطی حقیقی سمجھتے تھے کہ شیخ کی حیثیت حدیث انا قاسم واللہ معطی کے مطابق اسی قدر ہے۔ اور ہمیشہ تلقین فرماتے تھے کہ نظر صرف اللہ تعالیٰ پر ہونی چاہیے، ایک طالب کی اس تحریر کا کہ "ہر وقت نظر کرم کا طالب ہوں" ان الفاظ میں جواب دیا:

"نظر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر چاہیے۔ انسان کے بس میں کیا ہے، جو کسی انسان کو دے سکے۔"

اسی قسم کی ایک دوسری تحریر پر ارقام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے خود دیتے ہیں، شیخ صرف واسطہ ہوتا ہے، جیسے سیرابی پانی سے ہوتی ہے مگر پانی کسی ظرف سے پیا جاتا ہے تو ظرف کو بجز واسطہ کے کوئی دخل نہیں، تو معطی اللہ تعالیٰ ہیں"

ایک طالب نے اپنے عریضہ میں حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے فیض واحسانات کا تذکرہ کیا، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"میری نسبت آپ جو کچھ تحریر کرتے ہیں وہ صرف آپ کا حسن ظن ہے، باقی ہیچ ہے، ممکن ہے آپ کی طلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ مجھے واسطہ محض بنا کر آپ کو میش از بیش عطا فرمائیں"

ایک طالب نے لکھا کہ "سننے میں آیا ہے کہ کبھی یار اللہ کے بندوں نے اپنی توجہ سے ناکاروں کو کام کا بنا دیا، اگر یہ حقیقت ہے تو یہ نابکار اس کرم کا سب سے زیادہ محتاج ہے۔" جواب میں ارقام فرمایا " بھائی یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت خصوصی ہے، جو وہ بھی شفقت سے کسی پر کرتے ہیں، ورنہ سنت اللہ جو جاری ہے ہم کو اس کے راستے ان تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے   پر تجھکو چاہیے کہ تگ ودو لگی رہے"

حضرت والا تکلف کے ساتھ تصور شیخ کو منع فرماتے تھے، اور اگر خود بخود آجائے تو اسے برا نہیں سمجھتے تھے، ایک طالب کو لکھتے ہیں "میرا تصور بغیر تکلف کے آجائے تو کوئی حرج نہیں کہ یہ بہ تقاضائے محبت ہے، مگر تکلف کے ساتھ تصور میں لانے کی کوشش نہ کریں" ایک دوسرے طالب کو جن پر حضرت شیخ کا دھیان مستولی ہو گیا تھا، تحریر فرمایا، "یہ صرف آپ کی محبت کا کرشمہ ہے"

اپنے اختیار و ارادہ سے تصور جمانا غلط ہے، اگر از خود ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، یہ ایک حال ہے جسکا ذکر میرے ایک شعر میں بھی ہے۔

سجدہ طرف کعبہ ہے دل تیری طرف ہے   اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں"

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شیخ کے حقوق کی ادائیگی کے معنی یہ تھے کہ اسکی جو ہدایات شرع کے مطابق ہوں انکو بجالایا جائے، ایک گرامی نامے میں ارقام فرماتے ہیں،

"اس کے (یعنی شیخ کے) حقوق کی ادائیگی یہی ہے کہ اس کے ہدایات کو جو تحت شرع ہوں، بجا لانے کی کوشش میں لگا رہے۔"

بیعت | حضرت سیدی قدس سرہٗ بیعت کے رسمی طریقہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ سلوک میں اصل مقصود تربیت ہے، بیعت صرف اس کا ایک ظاہری نشان ہے، مقصد کے حصول میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں، شیخ اگر بیعت کو مناسب سمجھے اور وہ استحسان کے درجے میں ہو تو بہتر ہے، ورنہ اگر شیخ تربیت میں اور سالک اس کی تعلیمات کی پیروی میں کوتاہی نہ کرے، تو بغیر بیعت کے بھی فیض حاصل ہو سکتا ہے، اور عدم بیعت سے کوئی نقصان نہ ہوگا، مولانا مسعود عالم ندویؒ کو تحریر فرماتے ہیں "بیعت کا رسمی طریقہ غیر ضروری ہے، یہ میں نہیں کہتا، بلکہ ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے۔"

راقم سے ایک مرتبہ فرمایا "مقصود تو تعلیم ہے، لوگوں میں بیعت کی جتنی اہمیت ہے، تعلیم کی اتنی نہیں" ایک گرامی نامے میں تحریر فرمایا "بیعت ضروری شے نہیں، تاہم اگر انکو اصرار ہو تو خط کے ذریعے ہو سکتی ہے۔"

درحقیقت بیعت شیخ و مرید کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ شیخ اسکی اصلاح دین و خیر خواہی میں کمی نہ کریگا اور مرید شیخ کی جو ہدایات شریعت کے خلاف نہونگی، ان کی پوری پابندی کرے گا، اس معاہدہ یا بیعت سے پیشتر صحبت یا خط و کتابت کے ذریعے دونوں میں مناسبت پیدا ہونا ضروری ہے کہ نفع کا مدار مناسبت پر ہے، اس لیے جبتک یہ مناسبت پیدا نہ ہو، شیخ کی ہدایات پر عمل کرتا رہے، اور بیعت میں

عجلت نہ کرے، یہ شیخ کی صوابدید پر ہے کہ جب مناسب سمجھے بیعت کرلے، حضرت شیخ قدس اللہ اسرارہ ایک طالب کو اسی کی تلقین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"بیعت شیخ و مرید کے باہمی معاہدہ کا نام ہے، وہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر ہوگا، یہ سب اسی کے لیے تیاری ہے"۔

دوسرے گرامی نامے میں اسی کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ اپنے معمولات میں مصروف رہیں، پھر بیعت کی خواہش کریں، چنانچہ جب آپ کو اپنے معمولات کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو ایک خط میں یہ خواہش ظاہر کریں کہ میں آپکے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہتا ہوں، تو پھر میں بیعت انشاء اللہ تعالیٰ لے لونگا"۔

بیعت کے لیے مناسبت شیخ سے محبت اور اپنی اصلاح کی عزیمت ضروری ہے، حضرت اقدسؒ ارقام فرماتے ہیں:

"بیعت کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ اپنی اصلاح کی عزیمت دل میں پیدا ہو، اور جس سے تعلق رکھتا ہو، اس سے محبت ہو"۔

جب یہ شرائط پوری ہو جائیں تو بیعت غائبانہ خط کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے، حضرت والاؒ تحریر فرماتے ہیں:

"بیعت کے لیے حاضری چنداں ضروری نہیں، غائبانہ بھی ہو سکتی ہے"۔

دوسرے گرامی نامے میں ہے "بیعت خط سے بھی ہو سکتی ہے"،

ایک طالب کو لکھتے ہیں "بیعت ضروری شے نہیں، تاہم اگر ان کو اصرار ہو تو خط کے ذریعے ہو سکتی ہے"۔

حضرت والاؒ عزیزوں کی بیعت میں زیادہ تاخیر نہیں فرماتے تھے، اور ان کی طلب پر جلد ہی بیعت سے سرفراز فرما دیتے تھے، اسی طرح شادی شدہ عورتوں کو ان کے خاوند کی اجازت کے بعد جلد بیعت فرما لیتے تھے، لیکن ناکتخدا لڑکیوں کی تربیت بغیر بیعت کے فرماتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا "عورتوں کی بیعت بڑا مشکل ہے، نہ معلوم آگے چل کر ان کی شادی کس سے ہو، وہ پسند کرے یا نہ کرے، شادی شدہ عورتوں کے خط پر خاوند کے اور لڑکیوں کے خط پر باپ یا بھائی کے دستخط ضروری سمجھتے تھے، ایک طالبہ کو لکھتے ہیں:

"آپ کے خط پانے سے خوشی ہوئی، آپ کو چاہیے کہ اپنے اس خط پر اپنے بھائی صاحب کے دستخط کرا لیتیں، یا اپنا تعارف کرا دیتیں، گو زبانی ...... آپ کا حال معلوم ہو گیا، دوسرے یہ کہ آپ اپنا نام نہ لکھیں، اسکی جگہ ہمشیرہ فلاں لکھ دیا کریں۔"

لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اور امراء کی بیعت میں بہت احتیاط فرماتے تھے، اور جب تک ان سے پوری طرح مناسبت اور ان کی اصلاح کا ظن غالب نہ ہو جاتا تھا بیعت نہیں لیتے تھے، راولپنڈی کے ایک سفر میں حضرت والا بیمار ہو گئے، کچھ دنوں تک کرنل ... کے زیر علاج رہے، قیام ڈی، ایم ملک اور محمد شفیع قریشی کی کوٹھی میں تھا، دوران قیام میں ایک میجر (ڈاکٹر) صاحب نے میرے سامنے بیعت پر انتہائی اصرار کیا، حضرت والا نے پہلے ان سے قصد السبیل کے خاص خاص مقامات پڑھوائے پھر بیعت کی ذمہ داریاں سمجھائیں لیکن وہ بیعت ہی پر مصر رہے، حضرت نے پوچھا آپ کا بیعت سے مدعا کیا ہے، ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "اتنے بڑے عالم کا مرید ہو جاؤں گا" حضرت والا بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر خاموش رہے، اور وہ اسی طرح اصرار کرتے رہے، اس وقت مجھے کسی کام کی وجہ سے چلا جانا پڑا، واپسی پر رات کو حضرت والا سے پوچھا کیا میجر صاحب بیعت ہو گئے ہیں، ارشاد فرمایا "ہم مریدین کے شکار کے پیچھے نہیں پھرتے" اور پھر فرمایا "آپ نے ان کی بات سنی تھی، ان کی نیت اپنی اصلاح کی نہ تھی۔"

اسکے بالمقابل ایک فوجی سپاہی کے خلوص اور طلب کو دیکھکر وہیں فوراً بیعت فرما لیا،

ایک طالب کو جن کی بیعت خط کے ذریعہ ہوئی تھی، حضرت نے بیعت کے جو الفاظ تحریر فرمائے تھے، ان سے بیعت کے متعلق بعض چیزوں کی وضاحت ہوتی ہے، اس لیے نقل کیا جاتا ہے:

"میں آپ کو بیعت میں لینے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائیں، آپ کو جب یہ خط ملے تو بعد نماز مغرب یا جس وقت آپ کو طمانیت ہو، اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز تنہائی میں نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں، اور پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں، اس کے بعد یہ کلمات اپنی زبان

سے ادا کریں، اور پھر مجھے اپنا پورا حال لکھیں کہ کیا ہوا، اور کیسے ہوا،

کلمات یہ ہیں : اے اللہ میں تیری طلب میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کا ہاتھ انکے مجاز سلیمان ندوی کے واسطے سے پکڑتا ہوں اور اپنے کو سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں ان کے ذریعے داخل کرتا ہوں، اے پروردگار مجھے اس راہ پر قائم رکھ اور صراط مستقیم پر لے چل اور بھٹکنے نہ دے، اے اللہ! اپنے احکام کا تابع بنا اور اپنے رسول کا متبع کر، اور اپنی محبت اور خشیت میرے دل میں ڈال اور اے پروردگار اس سلسلے کی برکات سے مجھے مستفید فرما۔

اول و آخر نماز ورنہ درود پڑھ کر ختم کریں، سلسلۂ چشتیہ صابریہ کا شجرہ مناجات مقبول میں موجود ہے، ورد و اور قل ہو اللہ احد اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس اور الحمد پڑھ کر اس کا ثواب حضرت مولانا اشرف علی اور بزرگان سلسلہ کو بخشیں۔"

ان ہدایات کی تعمیل کے بعد طالب نے اس کی اطلاع دی تو تحریر فرمایا:

"آپ نے وقت بیعت کا جو حال لکھا ہے وہ محمود ہے ...... میں نے آپ کو چشتیہ صابریہ میں حضرت مرشدی مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے داخل کرلیا، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو ہم دونوں کے لیے فائدہ مند بنائیں۔

آپ نے خدا کا ہاتھ محسوس فرمایا، بیعت کی یہی حقیقت مثالی ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے ان الذین یبایعونک یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم (الآیۃ)"

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ تربیت و ارادت کے اس تعلق کو جانبین کے نفع کا ذریعہ سمجھتے تھے، متعدد خطوط میں اس قسم کی تحریریں ملتی ہیں، جن کے بعض اقتباسات یہ ہیں :

"میں بیعت میں آپ کو لینے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائیں۔"

"اللہ تعالیٰ طرفین کے لیے موجب سعادت بنائیں۔"

"یہ سب محبت کے آثار ہیں، اللہ تعالیٰ طرفین کو اس سے فائدہ پہنچائیں"۔

طالبین پر شفقت حضرت سیدی و مرشدی قدس سرہ اپنے خدام و مسترشدین کے ساتھ انتہائی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رافت و رحمت کا پورا عکس حضرت والاؒ کی ہر ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ طالبین کی تربیت و فیض رسانی جس لطف و کرم اور تواضع و شفقت سے فرماتے تھے، اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ ایک طالب نے لکھا "آنجناب کو روز تکلیف دیتے ڈرتا ہوں"۔ اس کے جواب میں غایت لطف سے تحریر فرمایا: "آپ اس کا کچھ لحاظ نہ کریں، آپ کی ہر خدمت دینی ثواب ہے جس کا یہ بندۂ قاصر محتاج ہے"۔

ایک طالب نے لکھا "تحریر خط کے لیے کشمکش رہتی ہے، دل شرف مکاتبت کے لیے بیتاب ہوتا ہے، لیکن ادب ہاتھ روکتا ہے"۔ شفیق شیخ نے یہ شفقت آمیز اور تسلی بخش جواب دیا "حسن ادب کا مانع مکاتبت نہیں ہے، خصوصاً جبکہ مکاتبت از دیاد فوائد کا باعث ہو"۔

ایک طالب کو لکھتے ہیں "ظاہری ملاقات کی محرومی سے ناشاد نہ ہوں، اصلی ملاقات دلی و روحانی ملاقات ہے، جو حب فی اللہ کے ذریعہ ہر وقت حاصل ہے"۔

یہ ناکارہ جب اپنی آخری حاضری کے بعد واپس آنے لگا تو کس محبت و شفقت سے رخصت فرمایا، دعائیں دیں۔ معانقہ فرمایا، مصافحہ کے وقت دعائے ماثورہ استودع اللّٰہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم عجب پر تاثیر انداز میں پڑھی، ان الفاظ پر ہی اکتفا نہ فرمایا، یہ گنہگار جب رخصت ہو کر باہر آگیا تو حضرت والاؒ برہنہ پا رخصت کرنے کے لیے باہر نکل آئے، یہ دیکھ کر دل کی عجیب کیفیت ہوئی، دعائی درخواست کے بعد عرض کیا، حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے، اب آرام فرمائیں، آہ کیا معلوم تھا یہ رخصتی دائمی ہے۔ محبت و شفقت کا یہ بے مثل منظر شیخ کی رخصتی نظر و مصافحہ اور فقیر کی اشکبار آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ختم ہوا، کاش جانتا کہ یہ آخری دید ہے تو

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز ‏ ‏ پھر یہ جمال نور دکھایا نہ جائے گا

ایک مرتبہ ایک جلسہ کے سلسلہ میں پنڈی تشریف لائے، ایک عقیدت مند کے یہاں قیام تھا، راقم بھی ملاقات کی غرض سے حاضر خدمت ہوگیا، انتہائی مسرور ہوئے اور فرمایا "اللہ تعالیٰ ہر جگہ کوئی نہ کوئی خدمت کا بندوبست فرما دیتے ہیں"، رات کو میں نے اجازت چاہی کہ کسی ہوٹل میں قیام کر لوں، فرمایا "آپ فقیر آدمی ہیں یہیں پڑے رہیے"

اسی طرح ایک مرتبہ کراچی جا رہا تھا، حضرت والاؒ لاہور پنجاب یونیورسٹی کمیشن کی میٹنگ کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے، مجھے علم نہ تھا، لاہور ریلوے اسٹیشن پر میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا، پلٹ کر دیکھا تو حضرت شیخ کا پر نور چہرہ اور متبسم نگاہیں نظر آئیں، اس وقت مجذوبؒ کے اس شعر کا منظر نگاہ کے سامنے آگیا،

چمکتی ہیں آنکھیں دمکتا ہے چہرہ ‏ ‏ جوان آج پیر مغاں ہو رہا ہے

پھر بحمد اللہ تعالیٰ کراچی تک کی ہمسفری کی سعادت نصیب ہوئی،

مکاتیب | حضرت والاؒ کے مکاتیب بھی محبت و شفقت، رافت و رحمت کا گنجینہ ہوتے تھے، اور انکا ہر ہر لفظ لطف و مرحمت اور طالبین کے درد دل کیلئے مرہم شفا ہوتا تھا، حضرتؒ کے مکاتیب کی شان ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے، جو انھوں نے اپنے شیخ کے مکاتیب کی ثنا و صفت میں لکھے تھے،

آج آیا ہے پیارے کا پیارا مکتوب ‏ ‏ دلکش و دلبر و دلچسپ و دلآرا مکتوب
قوتِ جان، قوتِ دل، سرمۂ بینش تحریر ‏ ‏ روح افزا و دل آویز و دلارا مکتوب
روشنائی نظر آئے گی سواد خط میں ‏ ‏ دیدۂ کور بھی دیکھے جو تمھارا مکتوب
پڑھ لے کوئی تو معطر ہو مشام دل و جاں ‏ ‏ نافۂ مشک ہے یا عنبر سارا مکتوب
سر بسر شوق و ہمہ درد ہماری تحریر ‏ ‏ سر بسر مایۂ تسکین ہے تمھارا مکتوب
نامۂ یار کے دیدار میں عالم یہ ہے ‏ ‏ ہمہ تن آنکھ ہوں اور آنکھ کا تارا مکتوب

سالکین کی تربیت بڑا دقیق فن ہے، حضرت والاؒ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس فن میں اتنی مہارت، بصیرت، دقت نظر، تاثیر اور برکت عطا فرمائی تھی کہ سالک نے اپنا کوئی حال لکھا اور حضرت شیخ کی جوابی تحریر نے اس حال کو بہتر حال سے بدل دیا

نسخۂ اکسیر و دارو ئے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

اس تاثیر پر ایک طالب نے لکھا "حضرت والا کے خطوط بندہ کے حق میں شفا و مرہم کا حکم رکھتے ہیں ...... ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوتی ہے، اور اکثر دیکھا ہے کہ ایک حالت کا غلبہ تھا اور حضرت کے جواب پڑھنے سے وہ حالت بہتری کی طرف فوراً منتقل ہوگئی"، متواضع شیخ نے اسکے جواب میں لکھا:

"یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور آپ کی محبت ہے۔"

حکمت و عرفانِ سلیمانی کا بڑا ذخیرہ حضرتؒ کے مکاتیب و ملفوظات سلیمانی میں بکھرا ہوا ہے[1] کاش متوسلین اس قیمتی ذخیرہ کو جمع کرکے اس کا فیض عام کرتے۔

حضرت شیخؒ کے نزدیک شیخ و مرید کی مثال معالج و مریض کی ہے، طالبین اپنے امراض تحریر کرتے ہیں، اور شیخ اسکا علاج بتلاتا ہے۔ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں: "لیکن اپنی کمیوں اور نقائص کے متعلق مجمل و مبہم بیان علاج کے لیے کافی نہیں ہے۔ آپ اپنے نفس کے متعلق غور کیجئے، اور متعین کیجئے کہ وہ نقائص کیا ہیں، تاکہ ان کا علاج کیا جا سکے جس طرح طبیب سے صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں بیمار ہوں، جب تک یہ نہ بتایئے کہ کیا کیا بیماریاں اور تکلیفیں ہیں، کھانسی ہے، درد سر ہے، ضعف معدہ ہے بے خوابی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک طالب کو تحریر فرمایا کہ "اپنے عیوب و نقائص جاننے کا طریقہ یہ ہے:

یک زمانے در کمیں خویش باش

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ

(باقی)

[1] راقم کا خیال ہے کہ اگر حضرتؒ کے خادمین تعاون کریں تو اس مجموعہ کو اکٹھا کر دیا جائے، وما توفیقی الا باللہ اس سلسلہ میں کوئی چاہے تو فقیر سے خط و کتابت کر سکتا ہے، احسان ہوگا۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج

میں

سواروں کے کارنامے

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۳)

قندھار کی مہم اورنگ زیب نے اپنی سپہ سالاری اور سپہگری کا جوہر قندھار جاکر بھی دکھایا، ۱۰۵۹ھ میں قندھار کی تسخیر کے لیے شاہجہاں نے جب سعد اللہ خاں اور اورنگ زیب کو بھیجا تو ان کے ساتھ پچاس سے ساٹھ ہزار تک فوج تھی، اس مہم میں جتنے سوار اور لشکری شریک ہوئے ان کو تنخواہ کے علاوہ سو روپے زیادہ دیے گئے، پھر منصبداروں اور عہدیداروں کو تین تین مہینہ کی تنخواہ پیشگی دی گئی اور فوج بھیرہ، بنگش، کوہاٹ، جمرود، جلال آباد، کابل، غزنین، قلات، اور غلزئی کے دشوار گذار راستوں سے گذر کر قندھار پہنچی، پہلے تو ایرانیوں نے قلعہ کے اندر محصور ہوکر ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کیا، لیکن جب بالا حصار کے پاس شاہ میر میں دونوں فوجوں کا مقابلہ میدان میں ہوا تو ہندوستانی لشکر کے سواروں اور ہاتھیوں نے مل کر غنیم کے چھکے چھڑا دیے، ایرانیوں کی فوج میں تیس ہزار قزلباش سوار تھے لیکن ہندوستانی سواروں کی تعداد کل دس ہزار تھی، دونوں جانب توپچیوں کے علیحدہ علیحدہ دستے تھے، البتہ ہندوستانیوں کے پاس جو جنگی ہاتھی تھے وہ ایرانیوں کے لشکر میں نہ تھے، گو رسالے

اور بان پھینک پھینک کر جنگ شروع ہوئی، اور جب لڑائی میں گرمی پیدا ہوئی تو دونوں طرف کے سوار آگے بڑھے، قزلباش سواروں نے گھوم گھوم کر ہندوستانی فوجوں کو اپنی گود میں لے لینا چاہا، لیکن ہندوستانی فوج کے سوار اس طریقۂ جنگ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے سواروں میں سے سادات، افغان، مغل اور راجپوتوں نے گھوڑے بڑھا کر ان کی یورش روکی، گو وہ تعداد میں کم تھے لیکن اپنی شجاعت اور نبرد آزمائی کے زعم میں ان کا مقابلہ کرتے رہے، قزلباشوں نے شجاعت کا پورا جوہر دکھایا، دونوں طرف سے سواروں کی "چپقلش مردانہ" کا حال یہ تھا کہ

"از گرد و غبار سم اسپاں ہر دو طرف جہاں در چشم دل باختگان سیاہ و تیرہ گردید"[۱]

ہندوستانی فوج خون جگر بہا رہی تھی کہ اورنگ زیب کا ایک سردار رستم خاں اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اپنے سواروں کی مدد کو پہنچا، اس کے ساتھ دوسرے سردار بھی تھے، رستم خاں مارتا کاٹتا دشمن کے قلب میں گھس گیا، اس یورش میں بہت سے ہندوستانی فوجی سردار ہلاک ضرور ہوئے لیکن دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان جنگ میں ٹک نہ سکے، اور جب اس فتح کا مژدہ شاہجہاں کے پاس پہنچا تو ہندوستان کے دار السلطنت میں تین دن تک شادیانے بجائے گئے۔[۲]

اورنگ زیب کو بدخشاں، بلخ اور قندھار میں کامیابی تو ہوئی لیکن یہ علاقے شاہجہانی عہد ہی میں ہندوستان سے کٹ گئے، جہاں تک ہندوستانی سواروں کی نبرد آزمائی کا تعلق تھا، وہ بدخشاں، بلخ اور قندھار کے سواروں سے زیادہ بہادر، شجاع اور تربیت یافتہ ثابت ہوئے، اسی لیے انکا مقابلہ میدانی لڑائیوں میں کم کیا گیا لیکن ہندوستانی گوریلا اور قزاقانہ جنگ کے عادی نہ تھے، اس لیے ایسی لڑائیوں میں وہ اپنے غنیم پر ضرب کاری نہ لگا سکے، اس کے علاوہ محاصرہ کی جنگ میں ہندوستانی توپیں زیادہ کارگر اور موثر ثابت نہ ہوئیں کیونکہ ان کے غنیم خصوصاً ایرانیوں کی توپیں ان سے زیادہ بہتر اور اچھی تھیں، پھر ان علاقوں میں ہندوستانی فوجوں کے لیے خاطر خواہ رسد بھی نہیں ملی، اس لیے

---

[۱] خافی خاں ص ۷۰۹ [۲] ایضاً

ان کے کیمپ کو برابر قحط کا سامنا کرنا پڑا، پھر ہندوستانی فوجیں برفانی علاقوں میں رہنے کی عادی نہ تھیں، اس لیے جب جب وہ برفانی علاقوں سے گذریں تو بے شمار جانیں تلف ہوئیں، بلخ کی واپسی میں شاہی لشکر دریائے سرخاب اور کوہ ہندوکش سے گذرا تو دس ہزار لشکری، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور دوسرے جانور برف کے تودوں میں دفن ہو کر رہ گئے، دارا اور اورنگ زیب کی چشمک اور فوجی سرداروں کی رقابتوں سے بھی ان علاقوں کی مہم کو نقصان پہنچا، اورنگ زیب ان علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا ضرور جاتا، لیکن اس کو اختیارات زیادہ نہیں دیے جاتے تھے، اور جب وہ اپنی خواہش کے مطابق کوئی جنگی کارروائی کرنا چاہتا تو اس کو روک دیا جاتا، یا واپس بلا لیا جاتا، اس میں بہت کچھ داراشکوہ کو دخل رہتا، ان علاقوں کی فوج کشی میں شاہی خزانہ پر بڑا بار پڑا، اس لیے آخر میں شاہجہاں ان پر حکومت کرنے کے خیال سے دست بردار ہو گیا، لیکن ہندوستانی فوجوں نے یہاں سے باہر نکل کر اپنی بہادری، شجاعت اور جانبازی کے جو جوہر دکھائے وہ اس کی تاریخ میں ایک زریں مثال ہے،

راجپوت سوار قندھار، بلخ اور بدخشاں کی مہم میں راجپوت سواروں نے بھی اپنی سپہگری کے جوہر دکھائے، وہ تیموری بادشاہوں کے لشکر کا ضروری جزبن گئے تھے، اور ہر چھوٹی بڑی مہم میں ضرور شریک رہتے تھے، گو کچھ راجپوت ایسے ضرور تھے جو برابر مغل سلطنت پر ضرب کاری لگانے کی فکر میں لگے رہے لیکن مغل حکمرانوں نے ایسے راجپوتوں کی معاندانہ اور مخالفانہ روش کو ہمیشہ نظرانداز کیا، اور اپنی غیر معمولی رواداری، وسعتِ قلب، بلند حوصلگی اور سیاسی فیاضی کا ثبوت دے کر راجپوتوں کو ہر زمانہ میں اپنانے کی کوشش کی، کنواہا کے میدان میں رانا سانگا تمام راجپوتوں کو جمع کر کے بابر کے خلاف اس لیے صف آرا ہوا کہ وہ راجپوتوں کی حکومت کا خواب پھر دیکھنے لگا تھا، لیکن وہ بری طرح پسپا ہوا، اس کی پسپائی کے بعد بابر نے اس کے لڑکے کرماجیت اور اسکی بیوی

پدماوتی کو ستر لاکھ کی جاگیر واگذاشت کی، اور ایک دوسرے لڑکے کو شمس آباد عطا کیا۔[1]

۹۳۷ھ (۱۵۳۱ء) میں ہمایوں نے چندیل راجپوتوں کے راجہ کے خلاف کالنجر پر حملہ کیا، مگر اس قلعہ کی تسخیر کے بعد راجہ کو اپنے خیرخواہوں اور امراء کے زمرہ میں داخل کر لیا، طبقات اکبری میں ہے:

"راجہ آنجا (کالنجر) از راہ انقیاد و عبودیت پیش آمدہ، داخل دولت خواہان شد" (ج ۲ ص)

اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح تسخیر کیا، وہ تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے، راجہ بہارا مل کچھواہا اکبر کی محبت و الفت کا دم اتنا بھرتا تھا کہ اس کو اپنی لڑکی دے کر اس سے قرابت بھی قائم کر لی، اس رشتہ سے کچھواہہ کے بہت سے افراد اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے، خود اکبر راجہ بہارا مل کا بڑا لحاظ رکھتا تھا، ۹۸۰ھ میں جب وہ گجرات کی مہم پر گیا تو فتح پور میں راجہ بہارا مل ہی کو وکیل مطلق بنا کر چھوڑ گیا۔[2]

راجہ بہارا مل کا لڑکا راجہ بھگوان داس تو ترقی کر کے اکبر کا پنجہزاری پنجہزار سوار منصبدار بن گیا تھا، وہ آخر وقت تک اکبر کے دام اخلاص و محبت کا اسیر رہا، اکبر کے ساتھ رانا میواڑ کے خلاف جنگ کر کے اپنے قلبی تعلق کا ثبوت دیا، چتوڑ کے محاصرہ میں راجہ بھگوان داس کے ساتھ رائے پتر داس اور راجہ ٹوڈرمل بھی تھے، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس مہم کے آغاز میں رانا اودے سنگھ کا لڑکا سکت سنگھ بھی اکبر کے ہمرکاب رہا، لیکن بعد میں وفادار ثابت نہ ہوا۔[3]

۹۷۹ھ میں جب اکبر گجرات کی مہم پر گیا تو راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ بھی اس کے ساتھ تھے، لڑائی کے موقع پر اکبر اپنے خاص گھوڑے نور بیضا پر سوار ہو کر میدان جنگ جانے لگا تو گھوڑا یکایک بیٹھ گیا، سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہیں ہوا، لیکن راجہ بھگوان داس نے فراست سے کام لیا اور آگے بڑھ کر اکبر سے مخاطب ہو کر بولا، "فتح مبارک ہو" اکبر نے سنکر کہا

۱؎ بدایونی ج ۱ ص ۳۳۳ ۲؎ مآثر الامراء ج ۲ ص ۱۳ ۳؎ اکبر نامہ ج ۲ ص ۳۲۳-۳۱۶-۳۰۲

سلامت باشید، یہ کیوں، راجہ نے جواب دیا کہ ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو، اور سیناپتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے تو فتح اسی کی ہو گی، یہ سنکر تمام لشکریوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، جب جنگ شروع ہوئی تو اکبر، راجہ بھگوان داس کے ساتھ ایک ٹیلہ پر کھڑا ہو کر جنگ کا معائنہ کر رہا تھا کہ راجہ بھگوان داس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہراول پر دباؤ زیادہ ہے، طور بے طور ہوا چاہتا ہے، اپنی فوج تھوڑی اور غنیم کا ہجوم زیادہ ہے، چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پیچھے سے مشت کا صدمہ زیادہ پڑتا ہے، یہ کہکر دونوں نے گھوڑوں کی باگ اٹھائی، اور ان کا یہ دھاوا کامیاب رہا،

اسی جنگ میں اکبر ایک مقام پر کھڑے ہو کر دشمنوں پر تیر چلا رہا تھا، اور راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ اس کے پاس تھے کہ دشمن کے تین لشکری آگے بڑھے، ایک راجہ بھگوان داس کی طرف لپکا اور دو اکبر پر حملہ آور ہوئے، راجہ بھگوان داس نے اپنا گھوڑا بڑھایا، دشمن نے گھوڑے پر سے راجہ پر تیر چلایا لیکن راجہ نے وار بچا کر برچھا مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگا، راجہ مان سنگھ اکبر کی مدد کے لیے پہنچنا ہی چاہتا تھا کہ اکبر نے للکارا کہ وہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے، اور خود اپنا گھوڑا اڑا کر دونوں دشمنوں کو نرغے میں لینا چاہا، راجہ بھگوان داس نے چلا کر راجہ مان سنگھ سے کہا کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہو، آگے بڑھو، راجہ مان سنگھ نے کہا مہابلی خفا ہوتے ہیں، راجہ نے جھلا کر کہا یہ وقت خفگی دیکھنے کا نہیں ہے، اس عرصہ میں اکبر نے دونوں دشمنوں کو مار بھگایا،

اسی لڑائی میں راجہ بھگوان داس کے بھائی[1] نے اکبر کو دشمنوں کے نرغے سے بچانے میں بہادری کا ایسا کارنامہ دکھایا کہ فرشتہ کا بیان ہے کہ رستم و اسفندیار کی ساری داستان بھلا دی گئی، اور آخر کار خود بھی کام آیا[2]،

اسی لڑائی میں جب اکبر اپنی فوج کی صفیں درست کر رہا تھا تو دیکھا کہ راجہ بہارا مل کا بھتیجا

---

[1] بدایونی کا بیان ہے کہ راجہ بھگوان داس (بھگونت داس) کا لڑکا بھوپت، رائے تھا (ج ۲ ص ۱۴۴)
[2] فرشتہ ج ۱ ص ۲۵۹

راجہ جے مل کچھواہا ایک وزنی بکتر پہنے ہوئے ہے، اکبر نے وہ بکتر اتروا لیا اور اپنی خاصہ کی زرہ پہنوا دی، راجہ جے مل اس رعایت خصوصی سے بہت مسرور ہوا، تھوڑی دیر کے بعد اکبر نے راجہ مالدیو (جودھ پور) کے پوتے راجہ کرن کو دیکھا کہ اس کے پاس نہ زرہ ہے نہ بکتر، اس نے راجہ جے مل کا بکتر اس کو پہنا دیا، راجہ جے مل کا باپ روپ سی بھی لڑائی میں شریک تھا، اس کو یہ ناگوار گذرا، کیونکہ راجہ کرن کے خاندان سے اس کی پشتینی عداوت چلی آرہی تھی، اس نے اکبر کو کہلا بھیجا کہ وہ بکتر میرے بزرگوں کی یادگار ہے اور بڑا مبارک ہے، اس لیے مجھکو واپس کر دیا جائے' اکبر معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا، اور روپ سی کے پاس کہلا بھیجا کہ خاصہ کی زرہ اور بھی مبارک ہے لیکن راجہ روپ سی کا غصہ فرونہ ہوا، اور اس نے اشتعال میں اسلحہ جنگ اتار کر پھینک دیے اور کہا کہ میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا، اکبر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنی زرہ بھی اتارنے کا ارادہ کر لیا کہ جب میرے لشکری برہنہ ہو کر لڑیں گے تو میں کیونکر زرہ بکتر میں چھپکر میدان جنگ میں جا سکتا ہوں، راجہ بھگوان داس کو اس کی خبر ملی تو فوراً گھوڑا بڑھا کر جے مل اور روپ سی کے پاس پہنچا، اور دونوں کو سمجھا کر، ہتھیار لگوا کر اکبر کے پاس لایا، اور عرض کیا کہ روپ سی نے آج بھنگ زیادہ پی لی تھی، اسی کی لہر کی ترنگ میں تھا یہ سنکر اکبر کا تردد جاتا رہا۔[1]

اکبر کی دلداری اور خاطرداری کے سبب سے راجہ مان سنگھ اور اس کے لڑکے راجہ ہمت سنگھ اور راجہ جگت سنگھ نے جو جنگی کارنامے انجام دیے ہیں، وہ تیموریوں کی تاریخ کی نمایاں چیز ہے، راجہ مان سنگھ کو اکبر غایت محبت میں مرزا راجہ کہا کرتا تھا، اسی کی نگرانی میں شاہی فوج راجپوتانہ میں رانا پرتاب کے اور بہار میں پورن مل اور راجہ سنگرام اور اڑیسہ میں پوری کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی، پھر کابل زابلستان، بہار، اور مشرقی بنگال میں جا کر اکبری اقبال کا پرچم لہرایا، اکبر نے جب اس کو ہفت ہزاری

---

[1] مآثر الامراء جلد ۲ ص ۱۱۱

منصبدار کا اعزاز عطا کیا ہے تو اس وقت تک یہ اعزاز کسی مسلمان منصبدار کو بھی نہیں ملا تھا،[1] راجہ مان سنگھ سے پہلے کبھی کوئی فوج کسی ہندو فوجی سردار کی نگرانی میں کہیں نہیں بھیجی گئی تھی، اور نہ کسی ہندو فوجی سردار نے مسلمانوں کے خلاف اپنی رہنمائی میں لشکر کشی کی تھی، لیکن اکبر نے مان سنگھ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا کر مسلمانوں کا سارا رعب ہندوؤں کے دلوں سے نکال دیا،

اکبر کے طلسم محبت میں گرفتار ہونے والوں میں جودھپور کے راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف موٹہ راجہ کا نام بھی نمایاں ہے، اس نے اپنی لڑکی مان متی عرف جگت گسائیں کا بیاہ شہزادہ سلیم سے کرکے اکبر سے اپنی قلبی محبت کا اظہار کیا، یہ راجپوت شہزادی جودھ بائی کے نام سے تاریخوں میں مشہور ہے، اس قرابت کے بعد راجہ اودے سنگھ نے اکبر کی بہت سی مہموں میں فوجوں کی رہنمائی کی، بندیلہ کے راجہ مدھکر اور سروہی کے راجہ کی تادیب بھی اسی کی نگرانی میں کی گئی،[2]

اکبر کے جاں نثاروں میں رائے رائے سنگھ بیکانیری بھی تھا، اس نے بھی اپنی ایک لڑکی شہزادہ سلیم کے عقد میں دی، اور تمام عمر اکبر کی خدمت میں گزاری، ۱۹ جلوس میں مالدیو کے راجہ چندر سین کی سرکوبی کے لیے مامور ہوا، جالور اور سروہی کے راجہ کے مقابلہ کے لیے بھی وہی بھیجا گیا، ۲۱ جلوس میں رانا پرتاب کے خلاف جو مہم بھیجی گئی اس میں بھی رانا کے خلاف رائے سنگھ کی تلوار نیام سے باہر ہوئی تھی، اکبر نے اس کو چار ہزاری کا اعزاز بخشا تھا، اور جہانگیر نے منصب پنجہزاری پر سر بلند کیا،[3]

راجہ ٹوڈرمل بھی اکبر کا بڑا خیر خواہ تھا، گو تاریخوں میں اس کا نام ایک ماہر مالیات کی حیثیت سے آتا ہے لیکن اس نے میدان جنگ میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے،

۹۸۲ھ میں اکبری فوج بنگال کے داؤد خاں کے خلاف صف آرا ہوئی تو ہراول کا رہبر

---

[1] ماثر الامرا، ج ۲ ص ۱۷۰ - ۱۹۰ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۱۵۴ - ۱۶۸

راجہ ٹوڈرمل بھی دوسرے فوجی سرداروں کیساتھ تھے جب لڑائی زوروں سے ہو رہی تھی تو داؤد خاں کے لشکر کے مقابلہ میں شاہی فوج کے قلب اور برانغار کمزور پڑنے لگے، اور پسپائی کے آثار ظاہر ہونے لگے، کچھ لشکریوں نے یہ خبر راجہ ٹوڈرمل کے بازو تک پہنچائی، ٹوڈرمل نے بڑھ کر اپنے لشکریوں کو للکارا:

"شاہنشاہ کے اقبال کا سایہ ہمارے بہادر لشکریوں کی پیشانی پر پڑ رہا ہے، اگر کسی کا قدم ڈگمگا گیا ہے تو سلطنت کے دوسرے بہادروں کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے، لغو بات سننے اور کہنے کا یہ موقع نہیں، ہماری فتح لکھی ہوئی ہے اور کامرانی کے آثار سامنے ہیں"

یہ کہکر خود میدان کارزار میں کود پڑا، اور اس کے پیچھے دوسرے بہادر سردار اور لشکری بھی بڑھے، اور جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا، اور اکبری فوج اپنے دشمن پر غالب رہی، اس جنگ میں بابا کلابی، مقصود علی، میر یوسف آب بارانی، حسین بیگ گرد جیسے فوجی سرداروں نے ٹوڈرمل کی سرداری و قیادت قبول کرنے میں مطلق تامل نہیں کیا۔[1] گجرات، بہار اور بنگال میں کئی لڑائیاں اسی کی نگرانی میں لڑی گئیں۔ وہ اکبر کے چہار ہزاری منصب داروں میں تھا،

ہندوؤں کے رانا پرتاب سنگھ نے اکبر کی سلطنت کو اکھاڑ پھینکنے میں جو کوشش کی وہ ایک افسانہ بن گیا ہے۔ جیمز کرنل ٹاڈ نے اپنی مشہور و معروف تاریخ Annals and antiquities of Rajasthan میں اس کی حب الوطنی، قومی غیرت اور مسلم دشمنی کا جو راگ الاپا ہے اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں محض افتراق اور نفاق پیدا کرنا ہے، ٹاڈ کا بیان ہے کہ رانا پرتاب کو انتہائی دکھ تھا کہ راجستھان میں ترکوں کے قوانین رائج ہو گئے،[2] وہ راجپوتوں کی حمیت ابھار کر پیروان اسلام سے ہندوستان کی حکومت چھیننا چاہتا تھا،[3] وہ راجہ مان سنگھ سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ اس نے ایک ترک کو اپنی بہن دی، اور ایک ترک کے ساتھ کھانا کھایا۔

---

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۲۰۵، [2] ٹاڈ ج ۱ ص ۲۵۰ [3] ایضاً

اودے ساگر میں راجہ مان سنگھ نے رانا پرتاپ سے ملنے کی کوشش کی تھی، لیکن رانا اس سے نہیں ملا، اور جب راجہ مان سنگھ چلا گیا تو اس زمین کو گنگا جل سے دھو کر پوتر کیا گیا اور وہاں کے لوگوں نے اشنان کر کے اپنے کو پاک کیا، اور یہ اس لیے کہ راجہ مان سنگھ ترکوں کا دوست تھا،[1] ٹاڈ کی من گھڑت داستانوں نے رانا پرتاپ کے کیرکٹر میں ایک افسانوی و رومانی رنگ ضرور پیدا کر دیا ہے، لیکن اس کو حقیقت سے بہت کم علاقہ ہے، اور اگر ٹاڈ کے بیانات کو صحیح مان لیا جائے، تو یہ ماننا پڑے گا کہ رانا پرتاپ نے گو راجپوتوں کو اکبر کے خلاف ابھارنے کی پوری کوشش کی، مگر اکبر کی رواداری، ہر دلعزیزی، صلح جوئی، محبت اور اخلاص کے مقابلہ میں وہ اپنے مشن میں ناکام رہا، خود ٹاڈ کا بیان ہے کہ مارواڑ، امبر، بیکانیر، بندی کے راجپوت راجاؤں اور خود رانا پرتاپ کے بھائی ساگر جی نے اس کو چھوڑ کر اکبر کا ساتھ دیا،[2] اور جب ہلدی گھاٹ میں رانا پرتاپ اور اکبر کی فوجوں میں تصادم ہوا تو اکبر کی فوج کی کمان راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، ٹاڈ نے اس جنگ کا ذکر بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر کیا ہے، حالانکہ تیموری دور کے مورخین نے اس جنگ کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے،[3] پھر ٹاڈ نے اس لڑائی کی تفصیل لکھنے میں بہت سی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اکبری فوج کی رہنمائی شہزادہ سلیم نے کی، حالانکہ اس مہم کے وقت اس کی عمر کل سات سال کی تھی، وہ ۹۷۷ھ میں پیدا ہوا، اور یہ لڑائی ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء میں ہوئی، اور جب شہزادہ سلیم کی شرکت کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تو پھر ٹاڈ کا یہ لکھنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ رانا پرتاپ سلیم کے ہاتھی کی طرف برچھا لے کر بڑھا، اور قریب تھا کہ اکبر کو اس کے وارث سے محروم کرے کہ شہزادہ کا ہاتھی سراسیمہ ہو کر بھاگا، جس کے بعد اکبری فوج نے شہزادہ کو بچانے میں پوری جنگ کی، ٹاڈ کا بیان ہے کہ رانا پرتاپ کے جسم پر سات زخم لگے اور اس کے بعد وہ میدان چھوڑ کر اپنے گھوڑے چیتک پر بھاگا، اکبر کے بعض سواروں نے اس کا پیچھا کیا،

۱؎ ٹاڈ ج ۱ ص ۲۶۱ ۲؎ ایضاً ص ۲۵۰ ۳؎ دیکھو اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۷۵-۱۷۴

جس میں اس کا بھائی شکت بھی تھا، مگر شکت نے جب بھائی کو اس طرح جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو اس کی برادرانہ محبت جوش میں آگئی، اس لیے اپنے ہمراہی سواروں کو راستہ میں برچھے سے ہلاک کر دیا، اور بھائی کے گلے سے جا کر لپٹ گیا لیکن وہ شہزادہ سلیم کی رکاب میں تھا، اس لیے بھائی کو چھوڑ کر پھر سلیم کے پاس چلا آیا اور غلط بیانی سے کام لے کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہا، سلیم نے اس کو معاف تو کر دیا، مگر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیا، مگر جب شہزادہ سلیم جنگ میں شریک ہی نہیں ہوا تو یہ ساری داستان من گھڑت ہی ہے جس کا تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ٹاڈ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رانا پرتاب کے ساتھ ۲۲ ہزار راجپوت تھے، جو دشوار گذار پہاڑی وادیوں اور دروں میں چھپ چھپ کر آگرہ کی فوج کا مقابلہ کرنے آتے تھے، جو تعداد میں بہت کم تھی، لیکن اس جنگ میں چودہ ہزار راجپوت مارے گئے، اور صرف رانا پرتاب اپنے وفادار گھوڑے چیتک کی تیز گامی کی بدولت بچ نکلا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس جنگ میں اکبری فوج کے کل ۱۵۰ آدمی مارے گئے جن میں انتہائی بہادری سے لڑ کر جان دینے والوں میں راجہ رام ساہ، سال بہان، بھان سنگھ اور پرتاب سنگھ بھی تھے، اس جنگ میں کنور مان سنگھ نے جو جوہر دکھائے، ابوالفضل نے خاص طور پر اس کی تعریف کی ہے، مان سنگھ کے علاوہ اس لڑائی میں اکبری فوج کے دوسرے راجپوت سردار کے نام یہ تھے، رائے لون کرن، جگناتھ، مادھو سنگھ[1]

رانا پرتاب کی موت اس ذہنی خلجان میں ہوئی کہ وہ اکبر سے انتقام لیکر اپنے غیظ و غضب کو ٹھنڈا نہ کر سکا، لیکن اکبر اطمینان اور سکون کی موت مرا کہ اس نے راجپوتوں اور ہندوؤں کے دلوں کو موہ کر اپنی حکومت کے ذریعہ ہندوستان کو ایک مرکزیت دی، بکھرے ہوئے جغرافیائی علاقوں کو متحد کیا اور ایک مرکزی نظام کی یکسانیت عطا کی، ہندو اور خصوصاً راجپوت اس کو اپنے قلوب کا فاتح اور اس کی

---

[1] اکبرنامہ ج ۳ ص ۱۷۳

سلطنت کو اپنی ہی سلطنت سمجھتے رہے، ۹۸۲ھ میں راجہ ٹوڈرمل جب داؤد خاں کے خلاف میدان جنگ میں لڑ رہا تھا تو اپنے ساتھیوں کو یہ کہکر ابھارتا تھا کہ سلطنت ہماری ہے، اسکی فتح ہماری فتح ہے۔[1]

اکبر نے راجپوتوں کے لیے فراخ حوصلگی اور دلداری کی جو روایت قائم کی، اس کو اس کے جانشینوں نے بھی برابر برقرار رکھنے کی کوشش کی، جہانگیر کی رگوں میں تو راجپوت کا خون آ ہی چکا تھا، اسلیے راجپوتوں کی خاطر داری میں اکبر سے بھی کچھ آگے بڑھا ہوا تھا، اور اس کے سارے لشکریوں میں بھی راجپوتوں سے دوستی اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اور جب کبھی ان کی دل شکنی ہوتی تو تمام ارباب حل و عقد ان کے قلوب کی تالیف میں پوری ہوشمندی اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے، جہانگیر کے اٹھارہویں سنہ جلوس میں شاہی فوج مہابت خاں کی کمان میں دکن میں مقیم تھی، سادات بارہہ میں سے سید کبیر کے ایک بھائی نے اپنی تلوار ایک صیقل گر کو صیقل کرنے کو دی، صیقل گر کی دوکان لشکر کے ایک دوسرے فوجی سردار کچھواہا کی قیام گاہ کے پاس تھی، صیقل کی اجرت میں صیقل گر اور سید کبیر کے بھائی میں جھگڑا ہونے لگا، سید کے ملازموں نے غصہ میں آکر صیقل گر کو دو تین لکڑیاں ماردیں، راجہ گردھر کے راجپوت سپاہیوں نے صیقل گر کی حمایت کی، اور سید کے نوکروں کو زد و کوب کیا، اور یہاں تک بات بڑھ گئی کہ فریقین میں تلواریں چلنے لگیں، سید کبیر کو معلوم ہوا تو کچھ سواروں کا دستہ لیکر پہنچ گئے، اور راجہ گردھر کی قیام گاہ کو گھیر لیا، اور غصہ میں اندر گھس کر تلوار چلانے لگے، راجہ گردھر نے بھی اپنی تلوار سونت لی، لیکن وہ چھبیس راجپوتوں کے ساتھ ہلاک ہوا، سید کبیر کی طرف بھی چار سید مارے گئے، یہ خبر پھیلی تو لشکر کے راجپوت ایک طرف جمع ہو گئے، اور دوسری طرف سادات بارہہ اکٹھا ہوئے، اور قریب تھا کہ دونوں میں کشت و خون ہو جائے کہ مہابت خاں کو خبر ہو گئی، وہ موقع واردات پر پہنچا اور اپنی حکمت عملی سے دونوں کے اشتعال کو فرو کیا، پھر راجہ گردھر کی قیامگاہ پر جا کر اس کے لڑکوں سے

---

[1] آئین اکبری انگریزی ترجمہ ا ص ۳۷۶

جس میں اس کا بھائی شکت بھی تھا، مگر سکت نے جب بھائی کو اس طرح جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو اس کی برادرانہ محبت جوش میں آگئی، اس لیے اپنے ہمراہی سواروں کو راستہ میں برچھے سے ہلاک کر دیا، اور بھائی کے گلے سے جا کر لپٹ گیا، لیکن وہ شہزادہ سلیم کی رکاب میں تھا، اس لیے بھائی کو چھوڑ کر پھر سلیم کے پاس چلا آیا اور غلط بیانی سے کام لے کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہا، سلیم نے اس کو معاف تو کر دیا، مگر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیا، مگر جب شہزادہ سلیم جنگ میں شریک ہی نہیں ہوا تو یہ ساری داستان من گھڑت ہی ہے جس کا تاریخی حقایق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ٹاڈ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رانا پرتاب کے ساتھ ۲۲ ہزار راجپوت تھے، جو دشوار گذار پہاڑی راستوں اور دروں میں چھپ چھپ کر آگرہ کی فوج کا مقابلہ کرنے آتے تھے، جو تعداد میں بہت کم تھی، لیکن اس جنگ میں چودہ ہزار راجپوت مارے گئے، اور حضرت رانا پرتاب اپنے وفادار گھوڑے چیتک کی تیزگامی کے بدولت بچ نکلا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس جنگ میں اکبری فوج کے کل ۱۵۰ آدمی مارے گئے، جن میں انتہائی بہادری سے لڑ کر جان دینے والوں میں راجہ رام ساہ، سال بھان، بھان سنگھ اور پرتاب سنگھ بھی تھے، اس جنگ میں کنور مان سنگھ نے جو جوہر دکھائے ابوالفضل نے خاص طور پر اس کی تعریف کی ہے، مان سنگھ کے علاوہ اس لڑائی میں اکبری فوج کے دوسرے راجپوت سرداروں کے نام یہ تھے، رائے لون کرن، جگناتھ، مادھو سنگھ[1]

رانا پرتاب کی موت اس ذہنی خلفشار میں ہوئی کہ وہ اکبر سے انتقام لیکر اپنے غیظ و غضب کو ٹھنڈا نہ کر سکا، لیکن اکبر اطمینان اور سکون کی موت مرا کہ اس نے راجپوتوں اور ہندوؤں کے دلوں کو موہ کر اپنی حکومت کے ذریعہ ہندوستان کو ایک مرکزیت دی، بکھرے ہوئے جغرافیائی علاقوں کو متحد کیا اور ایک مرکزی نظام کی یکجہتی عطا کی، ہندو اور خصوصاً راجپوت اس کو اپنے قلوب کا فاتح اور اسکی

---

[1] اکبرنامہ ج ۳ ص ۴۷، ۱۹

سلطنت کو اپنی ہی سلطنت سمجھتے رہے۔ ۹۸۲ھ میں راجہ ٹوڈرمل جب داؤد خاں کے خلاف میدان جنگ میں لڑ رہا تھا تو اپنے ساتھیوں کو یہ کہکر ابھارتا تھا کہ سلطنت ہماری ہے، اسکی فتح ہماری فتح ہے۔[۱]

اکبر نے راجپوتوں کے لیے فراخ حوصلگی اور دلداری کی جو روایت قائم کی، اس کو اس کے جانشینوں نے بھی برابر برقرار رکھنے کی کوشش کی، جہانگیر کی رگوں میں تو راجپوت کا خون آ ہی چکا تھا، اسلیے راجپوتوں کی خاطرداری میں اکبر سے بھی کچھ آگے بڑھا ہوا تھا، اور اس کے سارے لشکریوں میں بھی راجپوتوں سے دوستی اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، اور جب کبھی ان کی دلشکنی ہوتی تو تمام ارباب حل و عقد ان کے قلوب کی تالیف میں پوری ہوشمندی اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے، جہانگیر کے اٹھارہویں سنہ جلوس میں شاہی فوج مہابت خاں کی کمان میں دکن میں مقیم تھی، سادات بارہہ میں سے سید کبیر کے ایک بھائی نے اپنی تلوار ایک صیقل گر کو صیقل کرنے کو دی، صیقل گر کی دوکان لشکر کے ایک دوسرے فوجی سردار گردھر کی قیام گاہ کے پاس تھی، صیقل کی اجرت میں صیقل گر اور سید کبیر کے بھائی میں جھگڑا ہونے لگا، سید کے ملازموں نے غصہ میں آکر صیقل گر کو دو تین لکڑیاں مار دیں، راجہ گردھر کے راجپوت سپاہیوں نے صیقل گر کی حمایت کی، اور سید کے نوکروں کو زدوکوب کیا، اور یہانتک بات بڑھ گئی کہ فریقین میں تلواریں چلنے لگیں، سید کبیر کو معلوم ہوا تو کچھ سواروں کا دستہ لیکر پہنچ گئے، اور راجہ گردھر کی قیام گاہ کو گھیر لیا، اور غصہ میں اندر گھس کر تلوار چلانے لگے، راجہ گردھر نے بھی اپنی تلوار سونت لی، لیکن وہ چھبیس راجپوتوں کے ساتھ ہلاک ہوا، سید کبیر کی طرف بھی چار سید مارے گئے، یہ خبر پھیلی تو لشکر کے راجپوت ایک طرف جمع ہو گئے، اور دوسری طرف سادات بارہہ اکٹھا ہوئے، اور قریب تھا کہ دونوں میں کشت و خون ہو جائے کہ مہابت خاں کو خبر ہو گئی، وہ موقع واردات پر پہنچا اور اپنی حکمت عملی سے دونوں کے اشتعال کو فرو کیا، پھر راجہ گردھر کی قیامگاہ پر جا کر اس کے لڑکوں سے

---

[۱] آئین اکبری انگریزی ترجمہ ا ص ۳۷۶

تعزیت کی، بعد میں سید کبیر گرفتار ہوئے، اور محض راجہ گردھر کے لڑکوں اور راجپوتوں کی تسلی کی خاطر سید کبیر قصاص میں قتل کر دیے گئے،[1]

سادات بارہہ فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ان کے بہادرانہ کارناموں سے تیموریوں کی پوری تاریخ معمور ہے لیکن راجپوتوں کی خاطر سادات بارہہ کی خفگی کا خیال مطلق نہیں کیا گیا اور ان کے ایک بہادر فرد کو محض راجپوتوں کی دلجوئی کے لیے تہ تیغ کر دیا گیا،

اکبر اور جہانگیر کی، رواداری، فراخ حوصلگی اور ہندو نوازی اور راجپوتوں کی دوستی، وفاداری اور یگانگت سے ہندوستان میں جو ایک سیکولر حکومت قائم ہو گئی تھی اس کے خلاف رانا پرتاب کے خاندان والوں نے اپنی معاندانہ سازشیں اور تخریبی کارروائیاں برابر جاری رکھیں، جہانگیر نے بھی انکی سرکوبی کے لیے سیکولر طریقے اختیار کیے، چنانچہ اپنی جانشینی کے پہلے سال رانا امر سنگھ کے خلاف جو لشکر بھیجا، اس کے فوجی سرداروں میں راجہ بہار ال کالڑکا [illegible] راجہ بکرماجیت، خود راجہ امر سنگھ کا چچا رانا ساگر، راجہ مان سنگھ کا بھتیجا [illegible] سنگھ اور [illegible] سنگھ اور راجہ منوہر سنگھ کچھواہا بھی تھے، اس مہم میں بیس ہزار سوار تھے، راجپوت سرداروں [illegible] زیادہ تر راجپوت سوار تھے، رانا امر سنگھ اس لشکر جرار کی [illegible] لا سکا، تو [illegible] کے لیے بھیجا لیکن یہ صلح رانا امر سنگھ کے معاندانہ رویے کی وجہ سے زیادہ دنوں تک [illegible] جہانگیر کو اپنے تیسرے سال جلوس میں مہابت خاں کی نگرانی میں پھر ایک فوج بھیجنی [illegible] جس میں توپچیوں، ہاتھیوں، احدیوں کے علاوہ بیس ہزار مسلح سوار بھی تھے جن راجپوت [illegible] فوجیوں کے ساتھ اس مہم میں شرکت کی، ان کے نام یہ ہیں: راجہ نرسنگھ دیو [illegible] راجہ کشن سنگھ راٹھور، معزالملک کرنے

[1] تزک جہانگیری ص ۳۰۲ و ۳۰۳ ایضاً ص ۔ [illegible] ساگر کے بیان [illegible] رانا امر سنگھ کا چچا زاد بھائی بتایا گیا ہے لیکن موجودہ تحقیق سے اس کو امر سنگھ کا چچا [illegible] گیا ہے۔

اس معرکہ میں اپنی شجاعت اور بہادری کے اعلیٰ جوہر دکھائے، وہ دلیرانہ طور پر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اور مردانہ وار لڑکر رانا کے بتیس سرداروں کو تہ تیغ کیا، اور تین ہزار راجپوت سواروں اور سرداروں کو قید کرکے لایا، جہانگیر نے اس کی بہادری سے خوش ہوکر اس کو منصب دو ہزاری ذات ہزار سوار عطا کیا،[۱] اور رفتہ رفتہ وہ منصب سہ ہزاری ذات ہزار و پانصد سوار تک ترقی کرتا گیا، رانا امر سنگھ اپنے باپ رانا پرتاب سنگھ کی طرح پہاڑی دروں اور وادیوں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کا مقابلہ کرتا رہا، اس لیے جب مہابت خاں کو اس کے لشکر کی سرکوبی میں تاخیر ہوئی تو جہانگیر نے اس کو واپس بلواکر اپنے ایک دوسرے جری اور بہادر سوار عبد اللہ خاں کو وہاں بھیجا،[۲] عبد اللہ نے اس مہم میں اپنی بہادری کا ایسا سکہ جمایا کہ جہانگیر نے اس کو پنجہزاری منصب کے علاوہ فیروز جنگ کا خطاب دیا، عبد اللہ خاں نے رانا امر سنگھ کا عرصۂ حیات تنگ کردیا، اور اس کے اکثر و بیشتر نامی راجپوت سردار عبد اللہ کی یورش سے مارے گئے، جن میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں ارزاتن داس، سورج مل سسودیہ، ہری داس راٹھور، بھوپت جھالا کبیر داس کچھواہا، کیشو داس چوہان وغیرہ، عبد اللہ رانا کی مہم کو ابھی ختم نہ کرسکا تھا کہ وہ گجرات بھیجدیا گیا، اس کے بعد مہم کی کمان راجہ باسو کو دی گئی لیکن رانا امر سنگھ کی پسپائی شہزادہ خرم کے ہاتھوں لکھی تھی جہانگیری فوج کی پیہم اور متواتر یلغار و یورش کی وہ تاب نہ لاسکا، اور آٹھ نو سال کی تخریبی سرگرمیوں کے بعد سپر ڈالدی، اور جہانگیر کے اقتدار اعلیٰ کو قبول کرکے اس کا باجگذار بن گیا، اس کی پسپائی کی خوشخبری جن دو پیامبروں نے جہانگیر تک پہنچائی، ان میں ایک سندر داس بھی تھا، جو بعد میں رائے رایاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، رانا امر سنگھ پہلے تو شہزادہ خرم سے آکر ملا اور سر تسلیم خم کرکے درباری آداب کے مطابق سجدہ کیا، پھر اپنے لڑکے رانا کرن سنگھ کو جہانگیر کے پاس اجمیر بھیجا، رانا کرن سنگھ دربار میں آتے ہی سجدہ بجالایا، اور جہانگیر کے اشارہ سے دست راست کے امرا کی صف میں کھڑا ہوا، جہانگیر

۱؎ تزک جہانگیری ص ۷۳-۷۱، ۲؎ ایضاً ص ۷۶، ۳؎ ایضاً ص ۱۳۵

کا دل راجپوتوں کی محبت و الفت میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا، اسلیے رانا کے خاندان والوں نے اس کی حکومت کے خلاف مخاصمت اور دشمنی کی جو آگ ایک عرصہ تک بھڑکا رکھی تھی، اس کو بالکل بھول گیا، اور رانا کرن کی دلداری اور خاطرداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، خود لکھتا ہے،

"کرن کی طبیعت میں وحشت تھی، مجلسوں کا عادی نہ تھا، پہاڑوں میں زندگی بسر ہوئی، اس کو رام کرنے کے لیے میں نے روزانہ نئی نئی عنایتوں سے نوازا، دوسرے دن خنجر مرصع تیسرے دن زین مرصع کے ساتھ عراقی گھوڑا اپنی طرف سے بھیجا، اور پھر دربار جاکر نورجہاں بیگم کی طرف سے خلعت، ذخرہ، شمشیر مرصع، اسپ بازین اور ہاتھی مرحمت کیا، اس کے بعد نہایت قیمتی مروارید کی تسبیح عطا کی، اس کے دوسرے دن ایک ہاتھی بھیجا، میرے دل میں یہ بات تھی کہ اسکو ہر قسم کی چیزیں دی جائیں، اس کے بعد تین باز، تین جرے، ایک قبضہ شمشیر، ایک بکتر، ایک جوشن اور دو انگوٹھیاں بھی بھیجیں، جن میں سے ایک میں لعل کا اور دوسری میں زمرد کا نگینہ تھا، اور آخر مہینہ میں ہر قسم کے کپڑے، ہر قسم کی خوشبوئیں، طرح طرح کے طلائی ظروف سو خوانوں میں چن کر اہدیوں کے کندھوں پر دیوان خاص و عام میں منگوائے، اور سب کرن کو عطا کیے ......"[۱]

ان ہی الطاف و اکرام کی بنا پر تمام راجپوت سردار تیموری سلاطین کے طلسم محبت میں گرفتار رہ کر ان کے جان نثار بن گئے تھے، اور ان کی خاطر سر بکف ہوکر میدان جنگ میں لڑتے تھے۔

شاہجہاں نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح تسخیر کیا، وہ اکبر و جہانگیر ہی کی روایت کے مطابق تھا، اس نے راجپوتوں سے رشتے تو قائم نہیں کیے، لیکن ان کی دلجوئی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی، اس کے دربار اور فوج میں حسب ذیل بڑے ہندو سردار اور امراء تھے:

---

۱ تزک جہانگیری ص ۱۳۱

(۱) راجہ جسونت سنگھ پنجہزاری پنج ہزار سوار دو ہزار دو پانصد سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۲) راجہ جے سنگھ پنجہزاری پنجہزار سوار دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۳) راجہ گجسنگھ پنجہزاری پنجہزار سوار (۴) راجہ جگت سنگھ پنجہزاری پنجہزار سوار (۵) راجہ بیٹھل داس گو پنجہزاری پنج ہزار سوار (۶) مالوجی دکنی پنجہزاری پنجہزار سوار (۷) راو امر سنگھ چار ہزاری سہ ہزاری سوار (۸) راجہ رائے سنگھ سیسودیہ چار ہزاری دو ہزار سوار (۹) راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ سہ ہزاری سہ ہزار سوار دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۱۰) راو ستر سال ہاڈا سہ ہزاری سہ ہزار سوار (۱۱) مادھو سنگھ ہاڈا سہ ہزاری سہ ہزار سوار (۱۲) مہیش داس راٹھور سہ ہزاری دو ہزار سوار و پانصد سوار (۱۳) نظر بہادر خویشگی سہ ہزاری دو ہزار و پانصد سوار (۱۴) راجہ جگت سنگھ سہ ہزاری دو ہزار سوار (۱۵) اودا جی رام دکنی سہ ہزاری دو ہزار سوار (۱۶) پرسوجی بھونسلہ سہ ہزاری دو پانصد سوار (۱۷) جادون رائے دکنی سہ ہزاری و ہزار و پانصد سوار (۱۸) منگوجی نبالکر سہ ہزاری ہزار و پانصد سوار (۱۹) راجہ دیبی سنگھ بندیلہ دو ہزار و پانصدی (۲۰) راجہ راج روپ دو ہزاری دو ہزار سوار (۲۱) روپ سنگھ راٹھور (۲۲) رام سنگھ راٹھور (۲۳) سبل سنگھ دو ہزاری ہزار و پانصد سوار (۲۴) رائے ٹوڈرمل ہزار و پانصدی ہزار و پانصد سوار (۲۵) رتن راٹھور ہزار و پانصدی ہزار و پانصد سوار وغیرہ وغیرہ۔[1]

یہ راجپوت فوجی سردار اپنے منصب کے مطابق راجپوت سوار فراہم کرتے، جو ہر چھوٹی بڑی لڑائی میں بڑے فخر و غرور کے ساتھ شریک ہوتے، بلخ، بدخشاں اور ایران جو فوجیں بھیجی گئیں، ان میں مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ راجپوت سردار مثلاً راجہ جسونت سنگھ، راجہ دیبی سنگھ، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ، راجہ پہاڑ سنگھ، وبیٹھل داس، راؤ ستر سال ہاڈا وغیرہ تھے، پورا لشکر سیکولر طریقہ پر مرتب کیا گیا تھا، جہاں مسلمان فوجی امرا، اپنے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۵۲ - ۷۱۷

کوچ کر کے آگے بڑھتے تھے، وہاں راجپوت سردار اپنے راجپوت سواروں اور لشکریوں کو لے کر ہندوستانی پرچم لہراتے، گھوڑوں کو بل کھلاتے اور اینڈتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش دشوار گذار راستے طے کرتے چلے جاتے تھے، ایسا بھی ہوتا کہ مسلمان فوجی امرا کی نگرانی میں راجپوت سوار ہوتے، اور راجپوت سرداروں کی نگہبانی میں مسلمان سوار ہوتے، اور یہ مغل سلاطین کے عمل تسخیر کا نتیجہ تھا،

راجپوتوں کی پوری تاریخ ان کے باہمی جنگ و جدل سے بھری ہوئی ہے، ایک راجپوت راجہ دوسرے راجپوت راجہ کی نگرانی یا قیادت میں لڑنا کسر شان سمجھتا تھا، چنانچہ بندی کے راجہ نے اکبر کے سامنے ہتھیار ڈالا تو اکبر سے اس کی منجملہ درخواستوں میں ایک یہ بھی تھی کہ کسی ہندو راجہ کی رہنمائی میں اس سے کوئی فوجی خدمت نہ لی جائے لیکن مغل حکمرانوں نے اپنی رواداری، دوستی اور مآل اندیشی سے راجپوتوں کا بکھرا ہوا شیرازہ جوڑا اور انہیں یکجہتی، یکسانیت اور یگانگت پیدا کی، اور جب ان کو متحد کر کے اپنی فوج کا ضروری حصہ بنا لیا تو ان راجپوتوں نے بھی ان کی فوج کی ترتیب و تنظیم کو بڑی رغبت سے اختیار کیا، خود جدوناتھ سرکار کا بیان ہے کہ ہندوؤں کو جنگ میں ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا، لیکن مسلمانوں نے سواروں کے دستے کے طریقۂ جنگ کو ہندوستان میں بڑی ترقی دی[1]، راجپوت سواروں نے اس ترقی سے پورا فائدہ اٹھایا اور وہ رفتہ رفتہ مغل بادشاہوں کے لشکر اور دربار میں اسقدر چھا گئے کہ شاہجہاں کے آخری دور میں ان ہی کا غلبہ اور استیلا نظر آتا تھا،

(باقی)

---

[1] اسلام ان انڈیا، از جدوناتھ سرکار

رام پور کا اسکول شاعری

از جناب کلب علی خاں فایق رامپوری

۱۱۱۸ھ میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا، اور مغلیہ حکومت کا شاندار دور ختم ہو گیا، صوبے خود مختار ہونے لگے، امرا پر بادشاہ کا اقتدار نہ رہا، جب شاہی خاندان میں بھائی بھائی سے دست و گریباں ہوں تو امرا کیوں نہ جھگڑتے، ہر ایک عروج کا متلاشی تھا، بہادر شاہ نے بھائیوں کو کھو کر سلطنت پائی لیکن کمزور ہاتھ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے، سکھوں نے فوجی حیثیت اختیار کر لی، صوبۂ لاہور و کشمیر مرکز سے دور ہونے کے باعث پامال ہوتا رہا، اور بادشاہ دیکھتے رہے، راجپوتانہ کے راجاؤں نے بھی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اطاعت سے انحراف کیا، لیکن جوڑ توڑ سے کچھ دنوں اس گرتی ہوئی عمارت کو روکنے کی کوشش کی گئی، شیعہ سنی سوال پہلی بار مغلیہ حکومت میں اٹھا، لیکن راجاؤں کے انتشار اور بہادر شاہ کی کمزوری سے یہ مسئلہ بھی سرد پڑ گیا، ۱۱۲۴ھ میں بہادر شاہ کا انتقال ہو گیا، اس کے بیٹوں میں جنگ ہوئی اور کامیابی جہاندار شاہ کو نصیب ہوئی، اس کا خاتمہ فرخ سیر کے ہاتھوں ہوا، مگر یہ سودا مہنگا پڑا، سادات بارہہ کو امور سلطنت میں کامل اقتدار سونپ دینا پڑا، فرخ سیر کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، بالآخر فرخ سیر کو بھی جان دینی پڑی اور سادات بارہہ نے چند تبدیلیوں کے بعد محمد شاہ کو تخت نشین کیا، اس عہد میں محمد شاہ نے دیگر امرا کی مدد سے عبداللہ خاں قطب الملک اور حسین علی خاں امیر الامرا کی قید سے نجات پا کر آزادی کی فضا میں سانس لی، اور داد عیش دل کھول کر دی، یہانتک کہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کی فوجوں نے آدبایا، اور بغیر لڑے بھڑے عظیم ہند کی فوجوں نے صرف

امیر الامراء اور برہان الملک کی معمولی جھڑپ میں زخمی ہوکر ایرانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالدیے، نادر شاہ نے دہلی میں بقرعید ۔ ۳۰ ہزار ہندوستانیوں کے قتل عام سے منائی اور کروروں روپیہ لوٹ کر واپس گیا، ۱۱۶۱ھ میں محمد شاہ کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں لاہور میں مغلیہ فوجوں سے برسرپیکار تھیں، اس کشمکش کے دور میں ۱۱۱۸ھ میں داؤد خاں نے روہیل کھنڈ میں آکر جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی مثل کو آزمایا اور اس میں کامیابی ہوئی، ۱۱۳۹ھ میں داؤد خاں کے مارے جانے پر نواب علی محمد خاں روہیلوں کے سردار قرار پائے، انھوں نے اپنی دانشمندی اور زور دستی سے شاہی خالصہ اور امرا کی جاگیروں پر قبضہ کرلیا، اور بالآخر ۱۱۵۸ھ میں محمد شاہ کو ابھار کر کم ہمت امرا نواب علی محمد خاں کے مقابل میں لائے، مگر جب مغلیہ فوجوں سے کچھ نہ ہوسکا تو محمد شاہ کو خلیفہ بناکر علماء سے فتویٰ شائع کرایا گیا کہ خلیفہ سے بغاوت حرام ہے، بھولے بھالے روہیلے جو تلوار کی کاٹ ہی جانتے تھے، اس حیلہ کی کاٹ نہ کرسکے، ایک بڑی جماعت لشکر سے الگ ہوگئی، آخر نواب علی محمد خاں کو ہار ماننا پڑی، اور محمد شاہ کے دربار میں حاضر ہوگئے، روہیلوں کو اس علاقہ سے نکال دیا گیا، کچھ دنوں کے بعد نواب علی محمد خاں کو سرہند کا فوجدار مقرر کیا گیا، وہاں ان کی دھاک بیٹھ گئی، سرکش علاقہ مطیع ہوگیا، ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر مشہور ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ حکومت دہلی نے انھیں احتیاطاً وہاں سے بلالیا، مگر بعض کا بیان ہے کہ یہ خود حالات کا اندازہ کرکے سرہند سے روانہ ہوگئے، اور آندھی کی طرح کوچ کرتے ہوئے پورے سابقہ علاقہ پر قابض ہوگئے، وزیر، امیر الامراء اور دوسرے امرا منھ دیکھتے رہ گئے، کچھ مدت بعد ۱۱۶۲ھ میں ان کا انتقال ہوگیا، ان کی حکومت موجودہ حدود کمشنری روہیل کھنڈ سے کچھ زائد تھی، ان کے بعد حافظ رحمت خاں نے نواب سعد اللہ خاں کو جو خورد سال تھے تخت پر بٹھایا، ۱۱۶۳ھ میں فرخ آباد والوں سے جنگ کرنی پڑی، نواب قائم خاں مع بھائیوں کے مارے گئے، اور فرخ آبادی فوج تباہ ہوگئی، نواب عبداللہ خاں اور نواب فیض اللہ خاں اس وقت احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھے،

جنھیں وہ ۱۱۶۱ھ میں سرہند سے اپنے ساتھ افغانستان لیتا گیا تھا، ۱۱۶۵ھ میں یہ دونوں بھائی ہندوستان آئے، اور یہاں ملک کا بٹوارہ ہوا، ۱۱۶۷ھ میں نواب فیض اللہ خاں کے حصے میں ضلع رامپور اور ضلع بریلی کا کچھ حصہ آیا، ۱۱۸۸ھ میں حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ والی اودھ کے درمیان جنگ ہوئی، حافظ رحمت خاں شہید ہوئے، اور نواب فیض اللہ خاں شکست خوردہ فوج کو ساتھ لے کر لال ڈانگ چلے گئے، رجب ۱۱۸۸ھ میں اس پر مصالحت ہوئی کہ مزید علاقہ مرادآباد شامل کرکے نواب فیض اللہ خاں کو دیدیا گیا، بقیہ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں ضبط ہوگئیں، اب نواب فیض اللہ خاں کو امن وسکون ملا، انھوں نے شاہ آباد کی سکونت جو غالباً ۱۱۶۸ھ سے تھی ترک کردی اور رامپور کو پایۂ تخت قرار دیا،

روہیلوں کا جو گروہ نواب صاحب کے ساتھ تھا یہ یا تو وہ تھا جو عالمگیر کے انتقال کے بعد ہی داؤد خاں کے ساتھ ہوگیا تھا، یا ان کی اولاد اور ان کے خاندانی لوگ تھے، رامپور میں قبیلہ وار آبادی قائم ہوئی اور ہر سردار کے نام سے محلے موسوم ہوئے، مقامی لوگوں میں وہ ارباب علم وہنر تھے، جو ریاست وامارت کو دیکھ کر ان کے ساتھ ہوگئے تھے، دہلی میں جو انقلاب آرہا تھا، اس سے سبھی متاثر تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ ۱۱۷۰ھ میں دلی کی جو تباہی ہوئی، اس سے دہلی کے تمام طبقات متاثر تھے، راجہ جوگل کشور کے پسر سورج مل جاٹ والی بھرت پور کے یہاں جا بسے تھے، دہلی کی بہت بڑی آبادی ان ہی جیسے امرا، کے ساتھ بھرت پور میں مقیم ہوگئی تھی، کچھ اودھ کی نوزائیدہ حکومت کے دامن میں پناہ لے چکے تھے، اشرف علی خاں فغاں، سراج الدین علی خاں اس سے کچھ قبل فیض آباد پہنچ چکے تھے، غرض کوئی ڈھاکہ گیا کوئی پٹنہ، کوئی فرخ آباد اور بنارس، کچھ روہیل کھنڈ میں آرہے، فارسی کا مذاق پھیکا پڑ گیا تھا اور اس کی جگہ اردو نے حاصل کرلی تھی، مقامی اصحاب بہ تغیر لہجہ اردو یا ہندوستانی سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے تھے، مگر روہیلوں کی مادری زبان پشتو اور ان کی معاشرت افغانی تھی، مگر یوپی کی آب وہوا نے ان کے عادات میں حیرت انگیز تبدیلی کردی، اور انھوں نے غارت گری چھوڑ کر جہاں بانی اور حکمرانی کے اصول اس طرح برت کر دکھائے کہ

انگریز مورخین بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے، ان کی اولاد نے یک لخت پشتو ترک کر دی اور اردو ہی کو اپنی زبان قرار دیا، چنانچہ نواب عنایت خاں اور نواب محبت خاں محبت وغیرہ ابنائے حافظ رحمت خاں اردو کے شاعر تھے، جرأت نواب محبت خاں کے دربار سے وابستہ رہ چکے ہیں، نواب محمد یار خاں امیر اور حکیم کبیر علی کبیر (انصاری) نے ۱۱۸۴ھ میں سودا اور میر سوز کو فرخ آباد سے نواب کی استادی کے سلسلہ میں طلب کرایا لیکن فرخ آباد کی وسیع ریاست کی شان وشوکت ان دونوں کی نظروں میں ایسی بھاگئی تھی کہ انھوں نے آنے سے انکار کر دیا، شیخ محمد قائم قائم جو قصبہ چاند پور ضلع بجنور کے باشندے تھے، دہلی کے انقلاب سے متاثر ہوکر بسولی آکر مقیم ہو چکے تھے، وہ ٹانڈہ (ضلع بدایوں) آگئے، اس صحبت میں نو شاعر جمع تھے، جن کا مرقع نواب نے اپنے درباری مصور سے بنوایا تھا، جو نایاب ہے، مصحفی بھی اس صحبت میں شامل تھے، نجیب آباد پر مرہٹوں کا حملہ شاہ عالم ثانی کی سرپرستی میں ہوا تھا، اس حملہ سے روہیل کھنڈ بھی متاثر ہوا، مصحفی اودھ چلے گئے، محمد نعیم نعیم کا انتقال روہیل کھنڈ ہی میں ہو گیا، فدوی لاہوری کا بھی اسی سال انتقال مرادآباد میں آکر ہو گیا، اس طرح محمد یار خاں کو امن واطمینان سے بیٹھنے کا موقع نہ مل سکا، اس لیے حافظ رحمت خاں کی شکست کے بعد وہ مع مصاحبین رام پور چلے گئے، اور یہیں ۱۱۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا، محلہ مدرسہ کہنہ میں ان کا مقبرہ ہے، وہ پہلا شاعر ہے جس نے رام پور کی زمین میں آرام کیا،

قائم جو سودا اور میر درد کے شاگرد ہیں، رام پور ہی رہے اور کبھی نواب احمد یار خاں سے متوسل ہوئے، کبھی نواب نصیر اللہ خاں سے، اور آخر ۱۲۰۸ھ میں رام پور ہی میں انتقال کیا اور اپنے شاگرد امیر کے قریب دفن ہوئے، یہ قائم وہی ہیں جن کے حلقۂ ارادت میں شعراء کا بہت بڑا گروہ داخل ہے، میر محمدی مائل ان کے شاگرد تھے، ان سے شاہ نصیر کو شرف تلمذ حاصل ہوا، شاہ نصیر کے سلسلہ میں ذوق، ذہن، حیا وغیرہ تھے، رام پور میں ان کے شاگردوں میں نواب محمد یار خاں امیر

کے علاوہ عباس خاں عباس، عنبر شاہ خاں آشفتہ، احمد یار خاں افسر اور مولوی قدرت اللہ شوق ہیں۔

مولوی قدرت اللہ شوق علوم معقول و منقول میں مولوی غلام طیب بہاری کے شاگرد و ملا کمال الدین اور مولوی وہاج الدین گوپا موی کے شاگرد تھے، ان کی تصانیف میں تذکرہ شعرائے اردو طبقات الشعراء (۱۱۸۸ھ)، جام جہاں نما (۱۱۹۹ھ) اور تکملۃ الشعراء (۱۲۰۹ھ تذکرہ شعرائے فارسی) ہیں، اگرچہ انھوں نے طبقات الشعراء میں اپنی شاگردی کا اظہار نہیں کیا ہے، لیکن صاحب مجموعہ نغز نے ان کی حیات میں ان کو قائم کا شاگرد لکھا ہے، شوق کے سلسلہ میں حسب ذیل شاعر داخل ہیں:

(۱) عزیز خاں بے جان	ولادت	۱۱۶۱ھ	وفات	
(۲) احمد خاں احمد	〃	۱۱۹۶ھ	〃	۱۲۲۱ھ
(۳) غلام محمد خاں ناہر	〃	۱۲۰۳ھ	〃	۱۲۲۵ھ
(۴) کریم اللہ خاں کرم	〃	۱۱۸۲ھ	〃	۱۲۵۳ھ
(۵) حافظ اللہ داد عرف شبراتی طالب	〃	۱۱۸۵ھ	〃	۱۲۷۵ھ
(۶) میر محب علی مفلس	〃	۱۱۵۱ھ	〃	۱۲۲۳ھ
(۷) کریم الدین صنعت	〃	۱۱۹۰ھ	〃	۱۲۶۵ھ
(۸) مولوی غلام قادر مسکین	〃	۱۱۴۱ھ	〃	۱۲۱۹ھ
(۹) مولوی غلام جیلانی رفعت و بیدم	〃	۱۱۴۸ھ	〃	۱۲۳۴ھ
(۱۰) محمد معظم عباسی	〃	۱۱۶۸ھ	〃	۱۲۰۹ھ
(۱۱) مولوی شیخ غلام علی حرفت	〃	۱۱۹۷ھ	〃	۱۲۴۴ھ
(۱۲) ناصر خاں ناصر	〃	۱۱۹۹ھ	〃	۱۲۵۹ھ
(۱۳) مستقیم خاں وسعت	〃	۱۱۷۸ھ	〃	۱۲۴۹ھ

(۱۴) اخوندزادہ احمد خاں غفلتؔ ولادت ۱۱۹۵ھ وفات ۱۲۵۹ھ

(۱۵) حکیم احمد خاں فاخرؔ " ۱۱۹۸ھ " ۱۲۹۰ھ

(۱۶) محمد بلاقی خاکسار

قائمؔ کے علاوہ ایک دوسرا سلسلہ بھی رامپور میں پایا جاتا ہے، جو جعفر علی حسرتؔ کے شاگردون جراَتؔ و محبتؔ سے جاری ہوا،

جراَتؔ کے شاگرد شاہ رؤف احمد رافتؔ (۱۲۴۹ھ) اور رافتؔ کے شاگرد اور داماد حافظ اکرام الدین ضیغمؔ تھے جو بنگال میں مقیم ہوگئے تھے، ان کے شاگرد مولوی رشید النبی وحشتؔ اور ان کے شاگرد مولوی عبدالغفور خاں نساخؔ تھے، جن سے بنگال میں اردو شاعری کا رواج ہوا، اسی سلسلہ کو آج سید رضا علی وحشتؔ کلکتوی بنگال میں زندہ کیے ہوئے ہیں۔

نواب محبت خاں محبتؔ کے شاگرد حکیم میر ضیاء الدین عبرتؔ (صاحب مثنوی پدماوت) تھے، ان کے بیٹے سید رفیع الدرجات نزہتؔ باپ کے شاگرد بھی تھے، نزہتؔ کے شاگرد سید جمال شاہ مظلوم اور سید منصور علی منصورؔ وغلی تھے، جو صوفیانہ شاعری میں اضافہ کر رہے تھے۔

مصحفیؔ کے سلسلہ میں نام بنام چند اشخاص داخل ہیں، مثلاً رافتؔ نے لکھنؤ پہنچ کر ان کو کلام دکھایا، اور بقول جراَتؔ مصحفیؔ کے شاگرد ہوگئے۔ نواب فصیح اللہ خاں مفتونؔ خلف نواب نصر اللہ خاں لکھنؤ گئے، اور غفلتؔ کی ہدایت کے مطابق مصحفیؔ سے اصلاح حاصل کی (۱۲۳۰ھ تا ۱۲۳۴ھ) حکیم صغیر علی مروتؔ خلف حکیم کبیر علی انصاری کبیرؔ نجو خاں صاحب کے ملازم تھے، انھوں نے ابتدا میں میر حسن سے اصلاح لی اور پھر جراَتؔ سے، لیکن کسی کی شاگردی کے مقر نہ تھے، مثنوی میر حسن کے جواب میں مثنوی لکھی تھی، اور میر حسن کو دکھانا چاہتے تھے کہ انتقال ہوگیا (۱۲۰۱ھ)

میر غلام علی عشرتؔ سوداؔ کے شاگرد لطفؔ سے تلمذ رکھتے تھے (انھوں نے ۱۲۱۱ھ میں

میر ضیاء الدین عبرت کی ناتمام مثنوی پدماوت کو پورا کیا،

حکیم عطاء اللہ غمگین و انتظار، حافظ عبد الحبیب شیفتہ (۱۲۱۹ھ) شیخ الاسلام اوہم حکیم صدر الدین آزردہ دہلوی اخوند زادہ ہمت خاں ہمت، نواب نصر اللہ خاں سلطان وغیرہ کسی سلسلہ میں منسلک نظر نہیں آتے، یہ سب باہم مل کر داد سخن دیتے، حکیم صدر الدین خاں دہلوی غالباً ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۰۴ھ میں اپنے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد کرتے تھے، ۱۲ ر جمادی الثانی ۱۲۰۳ھ کو پہلا مشاعرہ ہوا، اس طرح ماہ قمری کی ۱۲ تاریخ کو برابر مشاعرہ منعقد ہوتا رہا، ۱۲۱۱ھ میں مولوی قدرت اللہ شوق کے مکان پر بعد نماز جمعہ ہر ہفتہ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا،

اگرچہ اردو شاعری کا انحطاط ۱۱۶۱ھ سے شروع ہو چکا تھا، کہاں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاں کی رہنمائی اور کہاں ان کے متبعین کی قیادت، اسی لیے نہ کوئی ثانی میر بن سکا، نہ سودا و میر درد، نہ سوز کا رنگ پیدا کرسکا، نہ قائم کا لہجہ، اودھ میں جاکر جب پورب اور پچھم کا مقابلہ ہوا تو وقتی طور پر پچھم کو میدان چھوڑنا پڑا، سودا اور میر کی قیادت کسی نے تسلیم نہیں کی، اور وہاں حسرت و جرأت کا سہل سلیس اور شگفتہ طرز بیان پسند کیا گیا، مصحفی نے تہذیب و متانت کا دامن تھامنے کی کوشش کی لیکن ان کی کوشش بھی رائگاں گئی، میر ایک شعر پر داد لیکر پھولے نہ سمائے، جرأت اس سے بھی محروم رہے، انشاء نے اس جھوٹی تہذیب و متانت کو خیرباد کہہ اور رنگین کو ابھار کر ایک نئی طرز ریختہ میں ریختی نکالی، مصحفی کی رسوائی میں دقیقہ نہ اٹھا رکھا، اور جب اس میدان میں بھی تنگی پائی تو دریائے لطافت لکھ کر لکھنؤ اسکول کی شاعری کا سامان نوجوان شعرا کے لیے مہیا کیا، اور دہلی قابل سند نہ رہا،

چنانچہ ناسخ نے شاعری میں محبوب کے داخلی اوصاف، صنائع بدائع اور بلند معانی کو داخل کرکے مذاق شاعری بگاڑ دیا اور دہلی سے بغاوت کی جو تحریک انشاء نے پھیلائی تھی اس پر پورا پورا

عمل کیا گیا، اور تہذیب و معاشرت میں ہر وہ سکہ مسترد کر دیا گیا جس کا تعلق دہلی سے تھا،

دہلی کی حکومت قلعہ معلیٰ کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، اودھ کے حدود ریاست کافی وسیع اور اس کے ذرائع آمدنی لامحدود تھے، اس بنا پر اردو شاعری میں لکھنوی مذاق سخن رائج ہونے لگا۔ گو مصحفی کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ مذاق سخن قائم رہا، مگر ان کے شاگرد اسکو باقی نہ رکھ سکے،

دہلی کی بگڑی ہوئی حالت بھی لکھنو کے سونگھاروں سے بہتر تھی، قائم چاند پوری مولد اور رامپوری مسکن و مدفن (۱۲۰۶ھ) کے شاگرد میر قمر الدین منت تھے، ان کے بیٹے میر نظام الدین ممنون (متوفی) نے جو منت ہی کے شاگرد تھے، شاعری میں ایک نئی طرز ایجاد کی جس میں تخیل کی انتہائی بلند پروازی کے ساتھ سوز و گداز اور سلاست و شگفتگی بھی کمال درجہ کی تھی، عوام اگرچہ اس رنگ کے مداح نہ تھے لیکن خواص نے اس کو پسند کیا، مفتی صدر الدین آزردہ ان ہی ممنون کے شاگرد رشید تھے، آزردہ کی محفل علما، و ادبا، و شعرا سے معمور رہتی تھی، شیفتہ و مومن و غالب ان کے دوست اور ہم صحبت تھے، شاہ نصیر کے بگڑے ہوئے مذاق سخن کو ان لوگوں نے سنبھالا، قلعہ معلیٰ میں حافظ عبد الرحمٰن احسان چھائے ہوئے تھے، ذوق اور مومن نے شاہ نصیر سے تلمذ حاصل کیا لیکن انکا رنگ نہ پا سکے، غالب، آزردہ مومن و شیفتہ و ذوق وغیرہ نے گرتے ہوئے مذاق سخن کو بلند کیا اور دہلی کا نام باقی رکھا، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس شمع کا اجالا دہلی میں تھا یعنی سلسلہ قائم وہی شمع رامپور میں روشن ہوئی مولوی قدرت اللہ شوق کا کلام ضائع ہو گیا، البتہ ان کے شاگردوں کے بیشتر دیوان سرکاری کتاب خانے میں محفوظ ہیں،

رام پور چھوٹی سی ریاست رہ گئی تھی، اس لیے اس کی آواز اپنی چار دیواری میں محدود تھی، اودھ کے جاہ و جلال اور دہلی کے باقی ماندہ اثرات کے سامنے رام پور کی آواز کون سنتا، سوائے انکے جن کو تعلق تھا، اس طرح رام پور کی شاعری نے مقامی خصوصیات اور دہلی کے اتباع کا لحاظ کرتے ہوئے ایک علیحدہ طرز سخن پیدا کیا، جو مقامی فضا میں چھایا رہا لیکن باہر اس کا اثر محسوس نہیں کیا گیا۔

لیکن نواب محمد سعید خاں کے عہد ۱۸۴۶ء تا مارچ ۱۸۶۵ء سے جب بیرونی ارباب علم یہاں بسلسلۂ تحصیل معاش آئے تو اس رنگ شاعری سے متاثر ہوئے، اور اپنا رنگ تبدیل کیا،

اب ہم شوق اور ان کے چند شاگردوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں، جن سے رامپوری اسکول شاعری کو سمجھنے میں مدد ملے گی،

شوق ۱۲۲۲ھ
دین و دل صبر و قرار و خرد و تاب و تواں — گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا
اے خدا یوں بھی کبھی تیری خدائی ہوگی — کہ مجھے اس کی جدائی سے جدائی ہوگی
کیا دل کا فرمرا مردود دیر و کعبہ ہے — نے بتوں سے ربط اسکو نے خدا سے آشنا
کیا عشق ہی ہوتا ہے الٰہی مرض الموت — جس رنج کو سنتے ہیں نہ دارو نہ دوا کا
مغفرت ہاتھ باندھ کر آئی — دیکھ میرے گناہ کی قسمت

غفلت وفات ۱۲۱۰ھ
ہم تو کعبہ کے تئیں سمجھے تھے ٹھکانا اس کا — پر جو دیکھا تو ہر اک جا ہے ٹھکانا اس کا
لوہو کے چند قطرے پھر آنکھوں میں آگئے — سمجھا تھا میں کہ زخم مرے دل کا بھر چلا
صیاد کب وہ طائر زیرک اسیر ہو — جو آشیاں کو دام سمجھ پر فشاں رہا
وہ چشم و لب نظر آئے ہیں جب سے اپنے تئیں — نہ ہوش مرگ رہا ہے نہ زندگی کی خبر
اہل دنیا کی کہاں پروا رکھیں افتادہ گاں — گوش شاہاں تک بھلا کب گوہر شبنم گیا
غفلت یہ ابتدائے محبت ہوئی تمام — آغاز کو بھی آہ وہ انجام کر چلے
پار ہو جاتی ہے سینہ سے وہ برگشتہ مژہ — تو ذرا کم کرتا ہے ورنہ ہو کچھ جس تیر میں

کرم ۱۲۵۳ھ
مریض ناتواں آہیں جو بھرتا ہے تو بھرنے دو — کسی کے دل میں یہ راہیں جو کرتا ہے تو کرنے دو
لکھتا ہوں خط اور پیہم اشکوں سے بھگوتا ہوں — دھو دھو کے میں لکھتا ہوں لکھ لکھ کے میں دھوتا ہوں
وہ بھولی بھولی سی اسکی صورت بسی ہے آکر جو چشم تر میں — قلق گذرتا ہے دل پہ ہر دم، اٹھے ہیں ہوکیں مرے جگر میں

مرتے تو ہیں پر ایک نظر دیکھ لیں اسکو — اے زندگی ہم سے کوئی دم اور وفا کر

شب اسکے غم سے زیک جا میں تا سحر بیٹھا — درونِ خانہ کبھی گہ بیرونِ در بیٹھا

کم نصیبی نہ اسے کہیے تو پھر کیا کہیے — یار جب بر میں ہو اور طاقتِ گفتار نہ ہو

غالب ۱۲۷۵ھ | بت خانہ و کعبہ ہمیں یکساں نظر آیا — جو یہاں نظر آیا وہی وہاں نظر آیا

کرانہ کی بھی رخصت تم اب نہیں ملتی — ستم یہ ہم پہ نیا آج مہرباں ہوا

کیا خلل شادی و غم و درد میں بیٹھوں — ہنسنا نہیں آتا مجھے رونا نہیں آتا

اے ہمصفیر کر نہ قفس میں چمن کی بات — جب بے وطن ہوئے تو سنیں کیا وطن کی بات

بیٹھے ہیں ہاتھ جھاڑ کے کون و مکاں سے ہم — کس بات کی ہوس کریں پھر آسماں سے ہم

دل لگایا تھا دل لگی کے لیے — ہم تو ناخوش ہوئے خوشی کے لیے

نفسِ عیسوی نہ کر ممنون — مجھکو دو دن کی زندگی کے لیے

تصانیف اشعری

از جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار رام پوری

امام ابوالحسن اشعری کی تصانیف کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان میں سے اکثر کتابوں کے نام تک نہیں معلوم ہیں، مگر مختلف کتابوں میں ان کی مختلف تصانیف کا ذکر ہے، اس مضمون میں ان سب کو یکجا کر دیا گیا ہے، اور اتنی کتابوں کا ذکر کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا، بعض کتابوں کے موضوع کی بھی تصریح ہے، یا کم سے کم ان کے ناموں سے اس کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے جس سے امام ابوالحسن اشعری کے متکلمانہ خدمات کی وسعت، اہمیت اور اس کے تنوع و کثرت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے دسمبر ۱۹۴۳ء کے معارف میں امام ابوالحسن اشعری پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ان کی صرف چند تصانیف کا تذکرہ تھا، اس مضمون کو اس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ (م)

مورخین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصانیف کی تعداد تین سو تک لکھی ہے، ممکن ہے اسمیں کچھ مبالغہ ہو لیکن ان کے کثیر التصنیف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں، چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب العمد میں اپنی ستر تصانیف کے نام لکھے ہیں، جو انھوں نے ۳۲۰ھ تک لکھی تھیں، ابن عساکر اور ابن فورک نے ان کی جو فہرست لکھی ہے وہ خود کتاب العمد سے ماخوذ ہے، لیکن اس میں کچھ مزید نام بھی ہیں اور اس طریقہ سے ان کی ان تصانیف کی تعداد جن کے نام معلوم نہیں سو سے اوپر پہنچ جاتی ہے؛ ۱۹۵۳ء میں "الاشعری کی دینیات" کے نام سے کیتھولک مطبع سے ... ایک کتاب کا وہی

کی کتاب انگریزی میں شائع ہوئی ہے، اس میں کتاب اللمع فی الرد علی اہل الزیغ والبدع اور رسالہ فی استحسان الخوض فی علم الکلام کا انگریزی ترجمہ مع عربی متن کے شامل ہے، اور چار ضمیمے انگریزی میں ہیں (۱) ترجمۂ اشعری از خطیب بغدادی (۲) خلاصۂ تبئین کذب المفتری فی ما نسب الی الامام ابوالحسن الاشعری (۳) فہرست تصانیف اشعری (۴) مقالات الاسلامیین اور "ابانہ عن اصول الدیانہ"

کتاب اللمع کے علاوہ اس کتاب کا ہر حصہ شائع شدہ چیزوں کی نقل یا ترجمہ ہے، کتاب اللمع پہلی مرتبہ امریکی یونیورسٹی بیروت کے قلمی نسخہ کی مدد سے شائع کی گئی ہے، اشعریؒ کے مطالعہ کے لیے کتاب اللمع سے زیادہ اچھی کتاب اب تک منظر عام پر نہیں آئی، اس پر تفصیلی بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے، اس لیے ضمیموں سے صرف اشعریؒ کی تصانیف کی فہرست نقل کیجاتی ہے، یہ فہرست اتنی مکمل شکل میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے، اس میں بیشتر کتابوں کے صرف نام معلوم ہیں، تاہم ان ناموں سے انکے علم کلام کی وسعت اور وسعت کا ہلکا سا اندازہ ہو جاتا ہے، یہی اس فہرست کی اہمیت ہے، یہ زیادہ تر ابن عساکر سے ماخوذ ہے، جسے ابن عساکر نے ابن فورک کی روایت سے بیان کیا ہے اور خود ابن فورک نے اشعریؒ کی کتاب العمد سے اخذ کیا ہے، العمد میں اشعریؒ نے اپنی ان تمام کتابوں کے نام دیے ہیں جو ۳۲۰ھ تک لکھی جا چکی تھیں، ابن فورک نے ان کتابوں کے نام بھی بڑھائے ہیں، جو ۳۲۰ھ اور ۳۲۴ھ یعنی امام اشعریؒ کے سال وفات تک تصنیف ہوئیں، اس کے علاوہ چند کتابوں کے نام رٹر وغیرہ مستشرقین کی تحقیق کا نتیجہ ہیں، کل تعداد ۱۰۶ تک پہنچتی ہے، جن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں شامل ہیں:-

یہ فہرست اور اس کی تشریحات کتاب العمد سے ماخوذ ہیں، اس لیے یہ تشریحات خود امام ابوالحسن اشعریؒ کی ہیں،

(۱) "الفصول": ملاحدہ، فلاسفہ، مادیین، حلولیین اور ان لوگوں کے رد میں جو

عالم کو ازلی مانتے ہیں، اس میں یہود، مجوس، براہمنہ اور نصاریٰ کا بھی رد ہے، یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس میں ۲ اکتابیں ہیں، ان میں ابن راوندی کی "کتاب التاج" کی تردید بھی شامل ہے،

(۲) کتاب الموجز :۔ ۱۲ حصوں میں ہے، آخری حصہ "کتاب الامامت" ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت کی حمایت اور "امام نا فرد" اور "ہر عہد میں ایک امام معصوم کے وجود" کے عقیدہ کی تردید کی گئی ہے،

(۳) کتاب فی خلق الاعمال :۔ معتزلہ اور قدریہ کے عقیدہ خلق اعمال کے رد میں۔

(۴) کتاب کبیر فی الاستطاعت ; اس میں استطاعت کے بارہ میں معتزلہ کے دلائل رد کیے گئے ہیں۔

(۵) کتاب کبیر فی الصفات :۔ معتزلہ، جہمیہ اور دوسرے مخالفین کے رد میں ہے، علم، قدرا اور دوسری صفاتِ الٰہی کے سلسلے میں، ابوالہذیل، معمر، نظام اور فوطی کے رد میں، اور عالم کو ازلی ماننے والوں کے رد میں، اور اس بحث میں کہ خدا کا چہرہ ہے، اس کے ہاتھ ہیں، اور وہ کرسی عرش پر قائم ہے، لمعنا ماسی اور اس کے عقیدۂ اسماء وصفات کی تردید بھی اس میں شامل ہے۔

(۶) "کتاب فی الجواز رویت اللہ بالابصار :۔ اس میں معتزلہ کے انکار رویت کے تمام دلائل رد کیے ہیں،

(۷) "کتاب کبیر ذکرنا فیہ اختلاف الناس فی الاسماء والاحکام والخاص والعام

گناہ کبیرہ کے مرتکب کے سلسلہ میں اسماء اور احکام

(۸) کتاب فی الرد علی المجسمہ ۔ اس میں مجسمہ کا رد ہے۔

(۹) "کتاب اخرفی الجسم :۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہمارے مقابلہ میں معتزلہ جہمیہ کے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکتے۔ اس میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جہمیہ کے دلائل

معتزلہ کے اصولوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہیں۔

(۱۰) کتاب ایضاح البرہان فی الرد علی اہل الزیغ والطغیان:۔۔۔ الموجز کے تعارف کے طور پر۔

(۱۱) "کتاب لطیف سمیناہ" کتاب اللُّمَع فی اہل الزیغ والبدع

(۱۲) اللُّمَع الکبیر۔ (۱۳) اللُّمَع الصغیر۔

(۱۴) کتاب الشرح والتفصیل فی الرد علی اہل الافک والتضلیل: "کتاب اللمع" کے تعارف کے طور پر تمہیدی کتاب ہے۔

(۱۵) کتاب مختصر۔ (۱۶) کتاب کبیر: الاصول کے رد میں۔ محمد بن عبدالوہاب الجبائی کے رد میں معتزلہ کے عقائد کے بیان اور اس کے رد میں، معتزلہ کے ہر اس مسئلہ کے رد میں جس میں ہمارا ان کا اختلاف ہے۔

(۱۷) کتاب کبیر:۔ نقد تاویل الادلہ کے رد میں، بلخی کے رد میں معتزلہ کے اصول

(۱۸) کتاب فی مقالات المسلمین: تمام اختلافات اور نظریات کے بیان میں (یہ کتاب غالباً مقالات الاسلامیین ہی ہے)

(۱۹) کتاب جمل المقالات: ملاحدہ اور نام نہاد "اہل التوحید" کے رد میں،

(۲۰) کتاب الجوابات فی الصفات عن مسائل اہل الزیغ والشبہات: یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو ہم نے خود اپنی کتاب کے رد میں لکھی ہے، جو کبھی معتزلہ کی حمایت میں لکھی تھی، معتزلہ کی حمایت میں اب تک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مگر اب خدا نے ہمیں صحیح راستہ دکھایا اور ہمیں اسکی تردید کے قابل کیا،

(۲۱) کتاب علی ابن الراوندی: صفات اور قرآن کے موضوع پر،

(۲۲) ایک کتاب جس میں ہم نے خالدی کی اس کتاب کا رد کیا، جو اس نے قرآن اور صفات الٰہی

کے بارے میں لکھی ہے، یہ کتاب اس نے اپنی کتاب "الملخّص" سے پہلے لکھی تھی،

(۲۳) القامع لکتاب الخالدی فی الارادۃ: خالدی کی کتاب کے رد میں جس میں اس نے لکھا ہے کہ آغاز تو خدا کے ہاتھ میں ہے، مگر بہت سی چیزیں خدا کے ارادے کے خلاف ہوتی ہیں اور اکثر نہیں ہوتیں۔

(۲۴) الدافع للمهذب: خالدی کی "مہذب" کے رد میں،

(۲۵) خالدی کی ایک کتاب کے رد میں جس میں اس نے "رویت سعیدہ" سے انکار کیا ہے،

(۲۶) بلخی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے ابن راوندی کی غلطیاں دکھائی ہیں۔

(۲۷) خالدی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے اس سے انکار کیا ہے کہ ارادہ اور عمل خدا کی طرف سے ہیں،

(۲۸) کتاب الاستشهاد: جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم، قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں۔

(۲۹) کتاب المختصر فی التوحید والقدر: کلام کے مختلف ابواب پر ہے، جس میں رویت، صفات، ارادۂ الٰہی کی ہمہ گیری، علت ثانی یا تولد اور خدا کی جانب عدل وجور کی نسبت کے مباحث ہیں، اس کتاب میں ہم نے معتزلہ سے چند سوالات بھی کیے ہیں، جنکے جواب دینے سے وہ قاصر ہیں۔

(۳۰) کتاب فی شرح ادب الجدل۔ (۳۱) کتاب الطبریین (۳۲) جواب الخراسانیه (۳۳) کتاب الارجانیین (۳۴) جواب السیرافیین (۳۵) جواب العمانیین (۳۶) جواب الجرجانیین (۳۷) جواب الدمشقیین (۳۸) جواب الواسطیین (۳۹) جواب الرامهرمزیین: رامہرمز کے ایک معتزلی نے چند سوالات مجھ سے کیے تھے، یہ ان کے جواب میں ہے۔ (۴۰) المسائل المنثورات البغدادیة: وہ مناظرے جو ہمارے اور بڑے بڑے معتزلیین کے درمیان ہوئے

---

(۴۱) "المنتحل فی المسائل المنثورات البصریات" (۴۲) کتاب العنون: ملاحدہ کے رد میں۔
(۴۳) "کتاب النوادر فی دقایق الکلام": (۴۴) کتاب الادراک (۴۵) اسکافی کی لطیف" کی تردید میں۔ (۴۶) عباد بن سلیمان کے کلام کے رد میں (۴۷) علی ابن عیسیٰ کی کتاب کے رد میں (۴۸) المختزن: کلام کے مختلف مسائل کے بارے میں اور مخالفین کے رد میں۔
(۴۹) شیٔ پر ایک کتاب۔ اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہر حال اشیاء ہیں چاہے وہ معدوم ہوں۔ (۵۰) فی اجتھاد الاحکام۔
(۵۱) "فی ان القیاس یخص ظاھر القرآن"۔ (۵۲) "فی المعارف"
(۵۳) "کتاب فی الاخبار وتخصیصھا۔" (۵۴) "کتاب العنون" مسائل کلام پر۔
(۵۵) "جواب المصریین" (۵۶) "کتاب المسائل علیٰ اھل التثنیۃ" (۵۷) اس مسئلہ پر کہ کسی چیز کا کر سکنا، اس کے مقابل نہ کر سکنے سے بالکل الگ چیز ہے۔
(۵۸) "الاستقصاء لجامع اعتراض الدھریین وسائر اصناف الملحدین"۔
(۵۹) مادیین کے رد میں، جو اجسام کے قدم کے قائل ہیں۔ (۶۰) داؤد بن علی الاصبہانی کے رد میں، اعتقاد کے بعض مسائل کے رد میں (۶۱) "تفسیر القرآن والرد علی من خلق البیان من اھل الافک البرھان":۔ اس میں ہم نے جبائی اور بلخی کی وہ غلطیاں دکھائی ہیں جو ان سے قرآن کی تاویل میں ہوئیں، (۶۲) "زیادات النوادر"۔ (۶۳) "جوابات اہل فارس"۔ (۶۴) ان لوگوں کے رد میں جن کا قول ہے کہ مادہ بالطبع حرکت کرتا ہے۔
(۶۵) رویت سعیدہ پر: اس میں ہم نے جبائی کے اقوال کی تردید کی ہے جو محمد بن عمر الصیمری نے جمع کیے۔ (۶۶) "الجواھر فی الرد علی اھل الزیغ والمنکر"۔ (۶۷) جبائی کے سوالوں کے جواب میں (۶۸) ادب الجدل" (۶۹) "کتاب فی الرد علی الفلاسفہ": اس میں

تین مقالے ہیں : ابن قیس حنفی کے رد میں، ہیولیٰ اور طبائع پر یقین رکھنے والوں کے رد میں اور ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں۔

ابن فورک کے اضافے یعنی تصانیف ۳۲۰ تا ۳۲۴ھ | (۷۱) اسکافی کی کتاب المضاہات کے رد میں، قدر کے عقیدہ کے سلسلہ میں (۷۲) کتاب العمد فی الرویت۔ (۷۳) کتاب فی معلومات الله ومقدوراته۔ (۷۴) حارث الوراق کے رد میں، صفات الٰہی کے سلسلے میں اور ابن راوندی کے رد میں، (۷۵) اہل تناسخ کی تردید میں (۷۶) ابوالہذیل کے رد میں، 'حرکت' کے سلسلے میں (۷۷) اہل منطق کے رد میں (۷۸) 'اسماء' اور 'احکام' پر چند سوالات جو جبائی سے کیے گئے (۷۹) 'خبرواحد' پر مناظرہ (۸۰) قیاس کے سلسلے میں۔ (۸۱) "کتاب فی افعال النبیؐ (۸۲) کتاب فی الوقوف والعموم (۸۳) کتاب فی متشابہ القرآن : اس میں اشعریؒ نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی زمرے میں شمار کرکے ان کا رد کیا ہے، اور ابن راوندی کی کتاب التاج کا بھی رد ہے۔ (۸۴) "عیسائیوں کے عقائد پر" (۸۵) "امامت پر" (۸۶) عیسائیوں کے رد میں، اس میں ان ہی کی ان کتابوں سے دلائل دیے گئے ہیں، جن کو وہ تسلیم کرتے ہیں، (۸۷) ابن راوندی کے رد میں، اس کے "تواتر" کی تردید کے رد میں (۸۸) مجسمہ کے عقائد اور دلائل پر" (۸۹) کتاب نقد شرح الکتاب (۹۰) ابوالفرج مالکی اور اشعریؒ کے درمیان علت الخمر پر مباحثہ (۹۱) ارسطو کی کتاب "آثار العلویہ" کے رد میں۔ (۹۲) ابوہاشم کے سوالات کے جواب میں۔ یہ کتاب ابی صالح الطبری کی درخواست پر لکھی گئی (۹۳) کتاب الاحتجاج (۹۴) کتاب الاخبار (۹۵) نبوت کی نشانیوں پر (۹۶) "امامت پر"

ابن عساکر کے اضافے | (۹۷) رسالۃ الحث البحث (۹۸) ایک رسالہ عقائد پر، اس بارے میں کہ

آیا "خلق" کا استعمال صحیح ہے (۹۹) سرحد کے آدمیوں سے کچھ سوال کیے گئے تھے، ان کے جواب تیں، اہل الحق کے عقائد کے سلسلے میں۔

ابن ندیم کی فہرست میں ایک مزید کتاب | (۱۰۰) "کتاب التبیین عن اصول الدین" (ہو سکتا ہے کہ یہ "ابانہ" ہو)

بر وغیرہ مستشرقین کے یہاں کچھ اور کتابوں کے حوالے ہیں جن میں بعض چھپ گئی ہیں:

(۱۰۱) رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۳ھ و ۱۳۴۴ھ)

(۱۰۲) قول جملۃ اصحاب الحدیث واہل السنۃ فی الاعتقاد

(۱۰۳) "رسالہ کتب بہا الیٰ اہل الثغر بباب الابواب"۔ (اس کو قوام الدین نے ترکی میں مرتب کرکے شائع کیا ہے)

(۱۰۴) "کتاب الامامۃ"

(۱۰۵) کتاب الابانہ عن اصول الدیانۃ (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ)

(۱۰۶) کتاب کشف الاسرار وھتک الاستار (شاید یہ ان کتابوں میں موجود ہو جو اوپر بغیر کسی عنوان کے درج ہیں)

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

سید عبدالحکیم صاحب دسنوی

بائی کلہ، پالن جی ہوٹل

بمبئی

عم محترم! تسلیم

میں نے پہلے خط میں آپ کو اطلاع دی تھی کہ مدراس محمڈن کانفرنس کی شرکت کے لیے مدراس جارہا ہوں، ۲۵ر جولائی کو یہاں سے روانہ ہوا، اور ۸ر اگست کو واپس آیا،

یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ مفید و پراز معلومات رہا، ۲۵ر کو روانہ ہوا، ۲۶ر کو گنڈکل پہنچا جہاں سے بنگلور (مقام کانفرنس) کو گاڑی جاتی تھی، اتفاق سے جس درجہ میں میں تھا اسی میں مسٹر شوکت علی بھی تھے، کانفرنس، یونیورسٹی، کالج اور اشاعت اسلام پر متفرق گفتگوئیں ہوئیں، کانفرنس کے متعلق ہمارے اکثر اعتراضات کو انھوں نے تسلیم کیا، یونیورسٹی کے متعلق یقین دلایا کہ گورنمنٹ کو مجبوراً یونیورسٹی کو حقِ الحاق دینا پڑیگا، طرابلس و ایران و مراکو کے حالاتِ بد سے جیسا ہر مسلمان متاثر ہے وہ بھی تھے، صبح کو گاڑی بنگلور پہنچی، اسٹیشن پر والنیٹر موجود تھے،

بنگلور | ریاست میسور کا بہترین شہر ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے تمام جنوبی ہندوستان میں مشہور، آجکل وہاں اچھا خاصا جاڑا تھا، اور موسم گرما میں بھی وہاں سردی و گرمی کا اعتدال رہتا ہے، غرض یہ کہ وہاں

گرمی کبھی نہیں ہوتی، اس شہر کا ایک حصہ لشکرگاہ انگریزی ہے، اور یہی کانفرنس کا مقام تھا، یہ رزیڈنسی ہے، دوسرا حصہ شہر ہے جو ریاست کے ماتحت ہے۔

عمارتیں دور دور، پست، کھپریل، مگر صاف ستھری ہیں، انتظام عمدہ ہے، پولیس اچھی ہے، نباتات کا ایک عالم یہاں ہے، زمین کا رنگ عموماً سرخ ہے، اور نہایت زرخیز اور عمدہ ہے، سرد جسکے ایک ذرہ کا وجود بھی ہمارے باغوں کے لیے باعثِ سربلندی ہے، یہاں اس کا جنگل ہے، میوہ ہر قسم کا پیدا ہوتا ہے، انار میں نے یہاں بہت بڑے بڑے دیکھے، مدراس میں انگور کے درخت دیکھے، سپاری کا درخت دیکھا، کھجور کے درخت نہایت کثرت سے ہیں،

کانفرنس | کانفرنس تین دن رہی جسٹس عبدالرحیم پریسیڈنٹ تھے، ہندوستان سے تین آدمی شریک تھے، میں، خواجہ کمال الدین اور مسٹر شوکت علی، کانفرنس کا مقصد جنوبی ہندوستان میں اشاعت تعلیم ہے، کانفرنس اپنا کام انجام دے رہی ہے، اس سے زیادہ جتنا آل انڈیا کانفرنس انجام دیتی ہے۔

کانفرنس کے روح رواں بلکہ جنوبی ہندوستان کی تمام تحریکات کے روح رواں صرف دو شخص ہیں، نواب غلام احمد اور مسٹر قریشی بی اے، نواب غلام احمد ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لبریز ہے، قومی کاموں سے ان کو اس سے زیادہ دلچسپی ہے جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے ہے، قومی مصائب پر ان کا دل اسی قدر جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر، ہر سال اپنے ہزاروں روپیے قوم کے لیے نذر کرتے ہیں، آجکل بیمار تھے، شریک کانفرنس نہ ہوئے، مسٹر قریشی، مدراس کا عبدالحکیم ہے، بی اے بی ٹی ہے، گورنمنٹ نوکر تھا، مگر سب چھوڑ چھاڑ کر، مدراس کے قومی ہی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے، انگریزی زبان پر بلا کا قابو رکھتا ہے، مدراس کے اکثر روزانہ و ہفتہ وار انگریزی اخبارات میں اس کے مضامین چھپتے رہتے ہیں،

کانفرنس کا اجلاس تین دن رہا، مختلف تعلیمی ضرورتوں پر لکچر ہوئے، تعلیمی تجاویز منظور ہوئیں میں نے دو تقریریں کیں، ایک تعلیم نسواں پر جس نے حاضرین پر اثر کیا اور پسند کی گئی، اس تقریر میں ایک یورپین

خاتون کے مخفی اعتراضات کا جواب بھی تھا، جس نے مجھ سے پہلے اسی موضوع پر انگریزی میں تقریر کی تھی، دوسری تقریر شب کو مذہبی تھی جس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا،

ختم اجلاس پر میں نے احباب کے ساتھ جس میں خصوصیت کے ساتھ میں دو کا نام ضرور لوں گا، مسٹر قریشی اور مسٹر اسد اللہ بی لے، حیدرآباد میں رجسٹرار ہیں، وطن مدراس ہے، اور قومی درد رکھتے ہیں، بنگلور کا مشہور عجائب خانہ دیکھا جس میں میں نے دو اسلامی چیزیں دیکھیں، ایک پتھر پر ایک کتبہ جو سلطان ٹیپو کی کسی عمارت پر تھا، دوسرا ایک سنگی نقشہ جو حیدر علی کے تیار کردہ قلعہ و عمارات واقع سرنگ پٹن پایہ تخت سلاطین میسور کا تھا، محبت سے میں نے انکو دیکھا، دل میں ایک درد اٹھا، بے اختیار ہوگیا، اور جی چاہا کہ اس افق کو دیکھتا جہاں ہندوستان کا آخری ستارہ طلوع ہوا اور ڈوبا،

راستہ میں دوستوں سے ذکر کیا، اسد اللہ خاں معیت کے لیے تیار ہوگئے، وہ بھی مدت سے اس کے آرزومند تھے، قرار یہ پایا کہ میں پہلے صبح کو مسٹر قریشی کے ساتھ کولار جاؤں جہاں نواب غلام احمد خاں مقیم تھے، اور انکی عیادت کروں، شام کو واپس بنگلور آؤں، یہاں اسد اللہ خاں اسٹیشن پر طیار ملیں گے، ان کے ساتھ سرنگاپٹن کا ارادہ کروں۔

حسب قرارداد کولار روانہ ہوا، یہاں سے ۲ ½ گھنٹہ کا راستہ تھا، نواب غلام احمد اور انکے برادر بزرگ دونوں کو صدر خلیق اور خاکسار پایا، ملکر نہایت خوش ہوا کہ ہندوستان کی اسلامی خاکستر میں ابتک بی دبائی چنگاریاں باقی ہیں۔

یہاں سب سے قابل سیر چیز سونے کی کانیں ہیں جو ریاست میسور کی مملوکہ ہیں، ۲ بجے اسکو دیکھنے چلا، اس کے لیے پہلے ریاست کے عہدہ دار سے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے، اس اجازت نامہ کی وساطت سے انگریزی کمپنی سے جو کان کی ٹھیکہ دار ہے، دوسرا اجازت نامہ ملتا ہے، ریاست اور کمپنی دونوں کے سپاہی ساتھ ہوتے ہیں پھر کان کی سیر نصیب ہوتی ہے، بہرحال ان مراحل کو طے کرکے کانوں کے کارخانہ تک پہنچا، کانیں میلوں تک ہیں، نیچے نیچے کھودی جاتی ہیں اور اوپر معمولی مسطح زمین نظر آتی ہے، میں نیچے نہیں اترا، نیچے اترنا عام آدمیوں کیلیے خطرناک ہے، صرف اوپر کی سیر کی، ایک کارخانۂ قدرت نظر آیا، ہر قدم پر انسان کی قوت کمال عقلی اور خدا کی صنعت فیاضی کے مناظر نظر آئے، وہ جگہ دیکھی جہاں مشین کی مدد سے

ذریعہ، مزدور نیچے اترتے ہیں، ڈیڑھ دو ہزار فٹ نیچے کان ہے، لیکن صرف ایک منٹ میں زینے سے نیچے آتے، اور اوپر جاتے ہیں، زینوں کے نیچے اوپر جانے کے لیے الگ ایک مشین کا مستقل کارخانہ اور عملہ ہے، اندر روشنی اور ہوا پہنچانے کا الگ کارخانہ اور عملہ ہے۔ وہ جگہ دیکھی جہاں کانوں سے توڑ توڑ کر اوپر سونے کے پتھر لاتے ہیں وہ جگہ دیکھی جہاں وہ پتھر توڑے جاتے ہیں، وہ مشین دیکھی جو ان پتھروں کو چورہ کرتی ہے، وہاں گیا، جہاں سونے اور ذرات خاکی الگ ہوتے ہیں، پھر یہ خاک دوسری جگہ پانی کے ساتھ مل کر جاتی ہے، وہاں پر صاف کی جاتی ہے، یہی خاک پھر دوسری بار صاف کی جاتی ہے، تیسری بار خاک ہوائی اڑن کھٹولوں پر روانہ کی جاتی ہے، جس کو میں نے حیرت سے دیکھا، یعنی ایک پست مقام سے بلند مقام پر تار پر آہنی صندوق بلا مدد آتے جاتے ہیں، اوپر سے نیچے نشیب میں آنا معلوم، لیکن من دو من کی خاک سے لدے ہوئے آہنی صندوقوں کا آہنی تاروں پر بلندی کی طرف دوڑ کر جانا میرے لیے طلسم ہوش ربا کا ایک منظر معلوم ہوتا تھا، بہرحال یہاں کے عجائبات دیکھ کر یہ سمجھ میں آیا کہ ہندوستان کو ترقی کے کس معیار تک پہنچنا ہے۔

میسور | کان سے واپس آکر شام کی گاڑی سے بنگلور واپس آیا، اسد اللہ خان اسٹیشن پر موجود تھے، میسور کی راہ لی، صبح سات بجے ہم میسور پہنچے، شہر دیکھا، راجہ کا خاص محل دیکھا، اتفاق سے محل کے سامنے ریاست کی کچھ فوج مصروف ورزش تھی، اس کا نظارہ کیا، شہر شہری حیثیت سے پست ہے۔ پست و بدصورت مکانات، گندہ سڑک، بہیئت دکانیں پایۂ تخت میسور کی سرمایۂ ناز چیزیں ہیں، بعض عمارات اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر وہ خال خال ہیں، راجہ کا محل عالیشان اور خوبصورت ہے، مگر میری آنکھیں فلک نما کو ڈھونڈھتی تھیں،

بہرحال اس شہر کا گشت لگاتے ہوئے ہم سرنگا پٹن کو چل کھڑے ہوئے جو یہاں سے بارہ میل ہے، درمیان کے مقامات میں جابجا اسلامی عمارات کے نشانات ملتے تھے، کہیں کہیں شہداء کی قبریں نظر آتی تھیں، جو اسلام کی آخری عظمت کے خاتمہ کا قصہ سنا رہی تھیں، راستہ میں ایک پل نظر پڑا، جو کاویری ندی کی ایک شاخ پر تعمیر کیا گیا ہے، تمام انگریزی پلوں کے برخلاف اس کے ستون مخروطی مثلث کی بجائے مربع تھے، جو بالکل عجیب و غریب چیز ہے، وہ ستون بھی محض ایک سالم پتھر سے تراش کر بنائے گئے ہیں،

تھوڑی دیر میں وہ میدان، وہ دیواریں نظر آئیں جو سلطانی فوج کی ورزش گاہ تھیں، اور جہاں نشانہ کی مشق ہوتی تھی، آگے چل کر اس بدنصیب پایۂ تخت کا سواد نظر آیا جو اب بالکل ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے، ہر جگہ شہدائے اسلام اور انگریزی سپاہیوں کی قبریں ہندوستان کے آخری فیصلۂ قسمت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں،

سب سے پہلے ہم نے سلطان کے مزار کا قصد کیا، ایک وسیع باغ کے اندر خود سلطان کا بنا کردہ قبرستان ہے جہاں اکثر خاندانِ سلطانی کے ارکان مدفون ہیں، صدر دروازہ کی سقف پر اب تک نوبت و نقارہ بج رہا ہے جسکی مہیب آوازیں ہمارے کانوں میں الفاظ ماتم و تعزیت بنکر آرہی تھیں، وسط میں سلطانی مقبرہ تھا جس پر ایک عظیم الشان گنبد تھا، گنبد کے دروازہ پر چند کتبے تھے، جن کو میں نے لکھ لیا ہے، ایک دروازہ کے اوپر، ایک دروازہ کی داہنی طرف کی دیوار پر اور ایک بائیں طرف کی دیوار پر جس کی صورت یہ ہے۔

در شاہے کہ شَہرۂ الاسلام   باب شیرے کہ کسّرَ الاصنام

او ست سلطانِ دین و ہم دنیا   بندۂ بارگاہ او علّام

(بجانب راست)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   اللہ محمد ابوبکر عمر عثمان علی

زہے گنبد کز شکوہ بنا   فلک زیر دستش بود در علو

تو خواہی فلک خوان خورشید خواں   فلک داغ گردید از رشک او

بود شمسۂ اش نور چشم فلک   قمر یافتہ ضو بتعلیم از و

تراوش کناں بحر رحمت ز خاک   گروہے زکرو بیاں گرد او

سحر گہ پے کسبِ فیض و شرف   گذشتیم از یں خوابگاہ نکو

چوں ایں مضجع تازہ آمد بچشم   نمودم چو روحانیاں جستجو

کہ ایں شاہ آسودہ را نام چیست   چہ تاریخ رحلت نمود است او

(بجانب چپ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   رب ارحم السلطان الکریم

ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ   خون خود ریخت فی سبیل اللہ

بود ذیقعدہ بست و ہشتم آں   شدہ در روز شنبہ عصر عیاں

مہر سالش بہ نیم ماہ بگفت   نور اسلام و دین ز دنیا رفت

تاریخ کشتہ گشتن سلطان حیدری   ٹیپو بوجہ دین محمد شہید شد

جواں مرد میداں نہاں شد ز دنیا   یکے گفت تاریخ شمشیر گم شد

روح قدسی بعرش گفت کہ آہ   نسل حیدر شہید اکبر شد (سنہ ۱۲۱۳ھ)

ان اخذت مصرکما قد ذکروا   وس نجم فتن اخذت و بہا

یک زان میاں گفت تاریخ و نام   کہ حیدر علی خاں بہادر بگو

ذھب عزالروم والھند کلھا   مصیبۃ ما مثلھا ارختھا

قد ضفہ الحقیر میر حسین علی وحررہ سید عبدالقادر بالخط الجلی

عربی کا قطعہ عروض ونحو کے اعتبار سے غلط ہے، لیکن درد جانگدازی صحتِ الفاظ پر منحصر نہیں،

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ لے نہیں ہے

عربی قطعہ اس اتفاق مصائب کا اظہار کررہا ہے جو عالمِ اسلام کو سترہویں صدی عیسوی کے اواخر یا تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان ومصر میں برداشت کرنا پڑا، ادھر قاہرہ نپولین کے زیرِ قدم تھا اور ادھر سرنگاپٹن پر یونین جیک لہرانے لگا،

یہ ایک جملہ معترضہ تھا، مقبرہ میں ایک دروازہ سے داخل ہونا پڑتا ہے، جس میں سیاہ غالباً آبنوس کے کواڑ ہیں،

اندر تین قبریں برابر اس طرح تھیں	سرخ	سیاہ	سیاہ
	سلطان ٹیپو شہید	حیدر علی	حیدر علی بیگم

سلطان ٹیپو کی قبر پر سرخ چادر اور دونوں قبروں پر سیاہ چادریں چڑھی تھیں، سرخ چادر اس خونی پیرہن کی طرف اشارہ ہے جسکو پہنے سلطان سو رہا ہے، او شیرِ میسور! اٹھ! کہ اب اسلام تیری مدد کا محتاج ہے، ایک آواز تھی جو زبانِ دل سے بے اختیار نکلی اور جسکو صرف گوشِ دل نے سنا، مگر ہائے مہمان نواز، عاشقِ اسلام سلطان کے لب گور نے کوئی جواب نہ دیا، فرطِ محبت سے جی چاہا گستاخانہ قبر سے لپٹ کر ایک چیخ ماروں، لیکن خدامِ ادب نے آواز دی کہ ادب! ادب!!

آخر ہاتھ اٹھا کے اور فاتحہ کے چند پھول چڑھا کر باچشمِ نم باہر نکل آیا،

مزار کے سامنے سلطانی مسجد تھی جس میں مجاور اور مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، عمارت متوسط حیثیت کی ہے، یہیں سے نیچے اتر کر دونوں بازوؤں میں دو مسقف عمارتیں ہیں جن کو مہمان سرائے سمجھتا ہوں.

مزار پر ایک مجاور، قرآن خواں، اور نوبت ونقارہ بجانے والے ریاست کی طرف سے مقرر ہیں،

یہاں سے نکل کر ایک طرف اس دشمنِ اسلام خاندان کے ایک ممبر کا گنبد قبر ہے، جس کا ایک رکن بنگال میں میر جعفر کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا رکن میر صادق کے نام سے یہاں معروف ہے، اور جو سلطان شہیدؒ کا نمک حرام

وزیر اور اسلام کا کافر بندہ تھا، دروازہ بند تھا، میرے رفیق نے بیان کیا کہ اسکی قبر پر جوتوں کا ڈھیر رہا اور جس زائر کا وہاں گذر ہوتا ہو وہ اب تک جوتوں کی نذر اسکی قبر پر پیش کرتا ہے، دل چاہا کہ دامن چشم اس مجرم اسلام کے دیدار سے آلودہ کروں،

دریا دولت باغ پہنچا، یہ ایک باغ ہے جس کے وسط میں ایک عالیشان عمارت ہے جسمیں سلطان رہا کرتا تھا، عمارت غالباً لکڑی کی ہے یا مجھے ایسا معلوم ہوا، تمام دیواریں اور سقف مختلف خوشنما رنگوں سے رنگی تھی جس پر نہایت باریک بوٹے بنے تھے، سب سے پہلے یہاں سیاح کی جس چیز پر نظر پڑتی ہے، وہ اس عمارت کے سامنے کی دیوار ہے، تمام دیوار پر سلطان ٹیپو اور حیدر علی کے معرکوں کی تصویریں ہیں، ابتدائے معرکہ سے لیکر اخیر معرکہ تک کی تصویریں ہیں، اوپر اسکی مختلف اوقات کی تصویریں ہیں، کہیں وہ مجلس رقص و سرود میں بیٹھا نظر آتا ہے، کہیں وہ سویا ہے، کہیں اسکی گردن شہنشاہ حقیقی کے سامنے جھکی نظر آتی ہے، کہیں وہ بیٹھا قرآن مجید تلاوت کر رہا ہے، غرض عجیب منظر ہے، گھنٹوں تک حیرت نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور میں تعجب اور حسرت سے ایک ایک سپاہی، ایک ایک سوار بلکہ ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا، آخر رفیق کی آواز نے چونکا دیا اور ہم یہاں سے نکلے۔

قلعہ دیکھا جو صرف پتھروں سے بنایا گیا تھا اور جس کے چاروں طرف کاوری ندی طواف کرتی ہے، قلعہ توڑ دیا گیا ہے، کچھ کچھ آثار باقی ہیں، قلعہ کے دروازہ سے نکل کر سامنے شاہی جامع مسجد سنگی نظر آئی، نیچے مکتب یا مدرسہ کے کام کی عمارت ہے، اوپر مسجد ہے، وسیع اور عالیشان ہے، منارہ بلند ہے، تقریباً سو ڈیڑھ سو زینے ہیں، ابتدائی زینے سنگی اور آخری چوبی ہیں، مسجد میں ایک کتبہ ہے جس میں پانچ شعر ہیں، میں نے صرف دو نقل کیے ہیں

(اول) گر حضرت سلیماں اندر زمان ماضی — تعمیر مسجدے کرد نامش نہاد اقصیٰ

(آخر) مانند زر چو جستم قاری برائے تاریخ — طاعت سرائے ثابت ہاتف نمود القا
۱۲۲۵

یہاں کی سیر ختم ہو چکی تھی، اسٹیشن پہنچا، یہاں سے بنگلور روانہ ہوا، بنگلور سے وانمباڑی کی طرف روانہ ہوا،

ریاست میسور کا اب علاقہ ختم ہوا، میسور کے متعلق میری رائے حیدرآباد سے زیادہ بہتر ہے، تعلیم یہاں نہایت عام ہے، اسکول سے ہر جگہ لڑکے اور لڑکیاں آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں، اسکولوں کی تعداد نہایت کافی ہے، کالج بھی ہیں،"

ٹاٹا انسٹیٹوٹ ہے جہاں مختلف صنعت و حرفت کی تعلیم ہوتی ہے، عورتوں میں بھی تعلیم شائع ہے، پردہ نہیں ہے آزادی ہے، اس لیے لوگوں کی رائے ہے کہ اخلاقی حالت اچھی نہیں، ایک عجیب بات یہاں کی نسبت سنی کہ یہاں ہندوستانی محبوب یوریشین و یوریشین عاشق اور یورپین اور یوریشین معشوق اور ہندوستانی عاشق نہایت کثرت سے ہیں،

مسلمانوں میں یہاں بھی وہی رونا ہے جو ہر جگہ ہے یعنی جہالت، اب تعلیم پھیل رہی ہے، ایک محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کی طرف سے کچھ نائٹ اسکول قائم ہیں، کچھ واعظ ہیں جو مسلمان قیدیوں میں وعظ کہتے ہیں، چندہ طرابلس میں یہاں کے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا اور تقریباً ۲ ہزار کا چندہ ہوا، یونیورسٹی میں ۳۰ ہزار کا فنڈ وصول ہوا، ایک فری ریڈنگ روم قائم ہے اور بھی قومی تحریکیں مثلاً مسلم ہائی تعلیمی وظائف اور انتظام اوقاف اسلامیہ جاری ہیں، مگر ان تمام تحریکات کا نفس ناطقہ کون ہے؟ نواب غلام احمد

وانمباڑی، دامن کوہ میں ایک متوسط اسلامی آبادی ہے، باشندے زیادہ تر مسلمان ہیں اور خوشحال تاجر ہیں، قومی تخیل یہاں سے قابل تعریف ہے، مسلمانان مدراس کا قومی ہائی اسکول یہیں قائم ہے، یہاں تقریباً دس بارہ مسلمانوں کے ابتدائی مدارس وزنانہ مدرسہ و کلب، دو عربی مدرسے اس ہائی اسکول کے سوا اور موجود ہیں، ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر قریشی ہیں،

اس شہر میں میری دو تقریریں ہوئیں، ایک ہائی اسکول میں طلبہ اور ماسٹروں کے سامنے، موضوع بحث "تعلیم" تھا، دوسری اسی شام کو بعد مغرب جامع مسجد میں حب رسول پر وعظ کہا،

وانمباڑی سے ۱۲-۱۴ میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی مقام گرام بور ہے، یہیں وہ میدان ہے جہاں چاند خاں اور انورالدین خاں میں حکومت کرناٹک کیلئے فیصلہ کن لڑائی ہوئی، دونوں مدعی تھے، چاند خاں کے طرفدار فرانسیسی تھے اور انورالدین خاں کے انگریز، انورالدین خاں کو مار گیا لیکن فتح انگریزوں کو ہوئی، یہیں وہ پہاڑ واقع ہے جس پر ایک نہایت مضبوط قلعہ تعمیر تھا، اسی پہاڑ کے سلسلہ میں حیدر علی اور ٹیپو نے اپنی وہ جنگی سڑک طیار کی تھی جس پر میسور سے چلکر چھپا چھپا تا ساحل ملیبار تک پہنچ جاتا تھا اور انگریزوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی، اس قدیم سڑک کا نشان اب تک باقی ہے، یہیں والی کرناٹک کا ایک مستحکم قلعہ میدان میں تھا جس کی کچھ دیواریں اور دروازہ ... باقی ہے جو کار روان گذشتہ کا گویا ایک صرف نقش قدم ہے، میں احباب کے ساتھ گرام بور گیا، ایک ایک چیز دیکھی، پہاڑ پر چڑھا، میدان میں پھرا، انورالدین خاں کے مقام شہادت پر ایک چبوترہ بنا ہے، قبر یہاں نہیں ہے، مگر مجاور ہیں، نجاورتی کا کچھ رقم ہے،

پہاڑ پر ایک دو کمینگاہ ابتک موجود ہیں، یہاں میدان میں ایک معمولی سی مسجد اور گنبد قبر ہے جو زمانہ جنگ سے پہلے کی تعمیر ہے، مسجد پر کتبہ لگا ہوا ہے،

میر جعفر عز شانہٗ منبع جود و کرم	ساخت مسجد بہر طاعت فی المثل بیت الحرم
گفت رضوانم بگو تاریخ ایں عالی بنا	ختم شد از فضل رب مسجد کبیت محترم ۱۱۲۰ھ
محمد قانع — کتبہ ابو تراب	باہتمام میر محمد حسین عرف سید کری

یہاں کی زیارت سے واپس آکر ایک دن کے بعد وہاں پہنچا جو میرے سفر کا منتہی تھا یعنی شہر مدراس، مدراس میں ڈیڑھ دن صرف رہا، نواب غلام احمد کا وہاں کمرشل آفس ہے، نواب صاحب کے نائب محی الدین پاشا اسٹیشن پر موجود تھے، تپاک سے ملے اور جتنی دیر تک میں رہا اخلاق و محبت سے ملتے رہے، ڈیڑھ دن کیلیے آفس کی موٹر میرے لیے وقف کر دی، اتنی مدت میں جو کچھ دیکھ سکا دیکھا، یہاں کی مشہور چیزیں، مچھلیوں کا عجائب خانہ، ہائیکورٹ کی عمارت، لا کالج، کرسچین کالج، کا فورٹ سینٹ جارج، ساحل مرینا وغیرہ ہیں، یہ تمام چیزیں دیکھیں،

مچھلیوں کا عجائب خانہ یہاں کی مشہور اور مخصوص چیز ہے، سمندر کے کنارہ ایک مختصر عمارت ہے جسکے چاروں طرف شیشہ کی الماریاں ہیں جن میں پانی بھرا ہے، پانی اور مچھلیوں کی اصلی قوت قائم رکھنے کیلیے برقی تار اس میں دوڑائے ہیں، ان مختلف الاشکال مختلف الالوان مچھلیوں کو دیکھ کر خدا کی قدرت نظر آئی، کوئی شکل کوئی رنگ ایسا نہ ہوگا جسکی مچھلی نہ ہو، عجائب المخلوقات کے مصنف کہتے ہیں جس طرح اٹھارہ ہزار مخلوق عالم میں خدا نے پیدا کی ہے اسی طرح اٹھارہ ہزار عالم بحر میں بھی ہے، اس عجائب خانہ کو دیکھکر میں اس مسئلہ پر ایمان لے آیا،

یہاں کا مردہ عجائب خانہ دیکھا مگر عجائب خانہ کلکتہ کے سیاح کیلیے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں، البتہ اسلحہ خانہ میں کچھ دلچسپی ہے مگر میں نے صرف ایک چیز یہاں دیکھی اور وہ گویا میری سیر کا حاصل تھی، یعنی دو قلمی تصویریں سلطان حیدر علی اور ٹیپو کی فوجی نقل و حرکت کی، بیچ میں سلطان کا ہاتھی جس پر سلطان سوار ہے، امرا گھوڑوں پر آگے پیچھے ہیں، توپوں کا سلسلہ ایکطرف سے سوار دو خط مستقیم میں منقسم ہوکر داہنے بائیں آگے پیچھے پیدل ہیں، اونٹوں پر خیمے لدے ہیں، سب کے آگے ہاتھی پر سرخ پرچم لہرا رہا ہے، اور اسی قواعد کے ساتھ فوج کوچ کر رہی ہے، عجیب سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا، میرا جسم اس وقت گو بیسویں صدی میں تھا لیکن میری روح ڈیڑھ صدی پیچھے کے مناظر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، ایک کتبخانہ بھی وسیع ہے، انگریزی کتابوں کا انبار، مشرقی شاخ کی نسبت دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ یہاں یہ شاخ نہیں، تعجب ہے ٹیپو حکومت کرناٹک کا کتبخانہ کہاں گیا، ہائیکورٹ کی عمارت اسلامی طرز کی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی

اسلامی عمارت تھی جسکو قطع وبرید کے بعد ہائیکورٹ بنایا گیا،

یہ سب چیزیں دیکھیں مگر میری آنکھ اس چند بالشت زمین کی زیارت کی مشتاق تھی، جہاں اسلامی علوم وفنون کے بحر زخار کی ہمہ تن موجیں سمٹ کر سما گئی ہیں، یعنی بحر العلوم کی تربت پاک، نواب والاجاہ والی کرناٹک کی بنوائی ہوئی یہاں پتھر کی ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے، اسی کے ایک پہلو میں بعض شاہان ارکاٹ کا مقبرہ ہے، بحر العلوم کی قبر بھی ان ہی سلاطین کے پہلو بہ پہلو ہے، علم کے تاجدار کا رتبہ دولت و مملکت کے تاجدار سے کم نہیں، مرقد مبارک کے سامنے کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھا، افسوس قبر پر کوئی کتبہ نہیں، جاہل قرآن خواں متقرر ہیں جو ایصال ثواب کیلیے ہر روز وہاں بیٹھکر قرآن پڑھا کرتے ہیں، ان سے اس شہر خاموش کے بعض باشندوں کے نام وحالات پوچھے تو وہ انتہائے جہالت کی وجہ سے اتنا بھی نہیں بتا سکے کہ ان گمنام نامورونکے نام کیا ہیں،

یہاں ایک ہمارا ہم وطن بھی سو رہا ہے جسکی قبر پر پتھر کا ایک کتبہ ہے جس پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ ہے، نام وجیہ الدین ابن محبب اللہ باشندہ عظیم آباد کندہ ہے، تاریخ وفات سنہ ۱۲۲۹ھ لکھی ہے،

جامع مسجد وسیع اور عالیشان، مادۂ تاریخ شعرا نے اچھا نکالا ہے،

امیر ہند والاجاہ فرمود　　بنا ایں مسجد فرخندہ منظر

ز دل از بہر تاریخ بنایش　　ندا آمد کہ ذکرہ اللہ اکبر

ساخت طاعتگہ اسلام شہ دین پرور　　آنکہ فرماں برآں ہست زمہ تا ماہی

بہر تاریخ بنایش بخرد ہاتف گفت　　نام فرخندۂ وے مسجد والا شاہی

اسی روز رات کو ۱۰ بجے کی گاڑی سے مدراس سے بمبئی روانہ ہوا، راستہ میں دو شہروں کے دیکھنے کو دل چلا، گلبرگہ اور پونہ، مگر آئندہ کے وعدہ پر سمجھایا تو بارے مان گیا،

جسٹس عبد الرحیم سے مدراس میں ملنے کا وعدہ تھا، مگر افسوس قلت فرصت کی وجہ سے نہ مل سکا، جسٹس موصوف متواضع اور خاکسار ہیں، اور متاثر دل رکھتے ہیں، مجھ سے نہایت خلوص سے بار بار ملے۔

والسلام
سید سلیمان
۱۵ اگست سنہ ۱۹۱۲ء

ادبیات

غزل

از جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری ایک ہونہار نوجوان شاعر ہیں، شاعری کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کے کلام میں کہنہ مشقی کی پختگی ہے لیکن مشاعروں اور صحافتی دنیا سے کم تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے کلام کی وہ شہرت نہ ہو سکی جس کا وہ مستحق ہے اور ایسے "جوہر قابل" کی حوصلہ افزائی ایک ادبی فریضہ ہے۔ اس لیے ان کے جواہر پارے ناظرین کی ضیافت کیلیے وقتاً فوقتاً پیش ہوتے رہینگے۔ (م)

کھل سکے گا نہ کوئی رازِ نہاں میرے بعد * کون سمجھے گا محبت کی زباں میرے بعد

چشمک برق تھی بس میرے نشیمن کے لیے * صحنِ گلشن سے اٹھا پھر نہ دھواں میرے بعد

دشتِ غربت میں لٹا آہ مرا رختِ حیات * منزلیں ہوگئیں بے نام و نشاں میرے بعد

وہ فسانہ جسے چھیڑا تھا ازل میں میں نے * کون جانے کہ ہوا ختم کہاں میرے بعد

کچھ تو پہلے ہی سے دھندلے تھے محبت کے نقوش * اور مبہم ہوئی تصویرِ جہاں میرے بعد

میں نے اک آہ میں کل شرحِ محبت کر دی * لوگ کرتے رہے تفسیرِ فغاں میرے بعد

میرے دم تک ہے زمانے میں تغیر جوہر
ختم ہو جائے گا سب کارِ جہاں میرے بعد

غزل

از جناب رشید کوثر خیرآبادی

جیسے نغمہ ختم ہو جانے سے کچھ پہلے کی بات ہائے وہ امید بر آنے سے کچھ پہلے کی بات
راہ رو منزل کا پہلے فیصلہ کر تو سہی! جس طرح عنواں ہے افسانے سے کچھ پہلے کی بات
ہر تمنا خاک میں مل مل کے پاتی ہے نمو سبزہ کہتا ہے نکھر آنے سے کچھ پہلے کی بات
امنِ ساحل کے تجسس میں پلٹتی ہیں کشتیاں یہ ہے ٹکرا کر الٹ جانے سے کچھ پہلے کی بات
وہ جہانِ ہوش تھا یا دوزخِ جنت نما ناصحو! چھیڑو نہ دیوانے سے کچھ پہلے کی بات
فاصلہ چنداں نہیں، تخریب سے تعمیر تک بتکدہ کیا ہے خدا خانے سے کچھ پہلے کی بات
رازِ دل تھا صورتِ غنچہ حجاب اندر حجاب وہ یقین کا پھول کھل جانے سے کچھ پہلے کی بات
عالمِ تخئیل کی رنگین خاموشی نہ پوچھ! کیف میں ڈوبی وہ کہہ جانے سے کچھ پہلے کی بات
تیری ان باتوں سے کوثر بدگماں ہو جائیگا یاد کر لے دوست چندرانے سے کچھ پہلے کی بات

تاثرات

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمٰن اختر کاکوی

بادِ بہار ہائے یہ کیا چال چل گئی مرغانِ خوش نوا کی بھی نیت بدل گئی
تدبیرِ باغباں پہ بھی اک داغ لگ گیا گلہائے خوشنما کی جو صورت بدل گئی
رسوائی چمن کی یہی ہو گی اک دلیل اپنی جگہ سے ایک کلی بھی جو ٹل گئی
صحرا سے کیا، چمن سے اٹھی وہ ہوائے تند چن چن کے ایک ایک کلی کو مسل گئی
کیا باغباں کی اس سے نہ رسوائیاں ہوئیں؟ مانا کہ حسرتِ دلِ گلچیں نکل گئی
قمری و عندلیب کی ہلکی سی چھیڑ سے دیکھا تو گلستاں ہی کی رنگت بدل گئی
آئی صدا کہ یہ دل کی ہے یہ نوا جب بزمِ ناز میں مری اختر غزل گئی

مطبوعات جدیدہ

اردو کی نثری داستانیں۔ از ڈاکٹر گیان چند، صدر شعبۂ اردو حمیدیہ کالج بھوپال، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت لعہ، پتہ: انجمن ترقی اردو، پاکستان، اردو روڈ کراچی۔

لایق مؤلف نے ڈاکٹریٹ کے لیے یہ مقالہ لکھا تھا جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے، اس میں ابتدا سے لیکر انیسویں صدی تک کی اردو کی داستانوں اور قصوں کی تحقیقی وتنقیدی تاریخ تحریر کی گئی ہے، ادب اردو کی تاریخ کی تقریباً تمام کتابوں میں ضمناً اردو کی مشہور داستانوں کا بھی مختصر ذکر ہے، مگر اس تفصیل وتحقیق کے ساتھ پہلی مرتبہ ان کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں مطلق داستانوں کی تاریخ، ان کی پیدایش کے اسباب، ان کے ماخذوں کی بحث، اردو کی داستانوں کی سرگذشت، ان کا مفصل تجزیہ، ان کی تنقید، ان کے مصنفین، طباعت کی تاریخ اور مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخوں وغیرہ تمام پہلوؤں کی پوری تفصیل ہے، یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں مختلف ملکوں اور زبانوں میں داستانوں کی ابتدا اور ان کے ارتقاء کا ذکر ہے، دوسرے میں اردو کی مشہور داستانوں کی تاریخ، ان کے مصنفین، ان کے ماخذوں اور ان کے مختلف نسخوں پر بحث وتنقید ہے، تیسرے میں ان داستانوں کی خصوصیات کا تجزیہ ہے، چوتھے میں دو مشہور طویل داستانوں یعنی داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال پر مفصل نقد وتبصرہ ہے، پانچویں میں مختصر قصوں مثلاً آرایش محفل، باغ وبہار اور فسانۂ عجائب وغیرہ کا ذکر اور ان پر بحث وتبصرہ ہے،

چھٹے میں اسی طرز سے کہانیوں کے مجموعوں مثلاً کلیلہ و دمنہ، الف لیلہ اور بیتال پچیسی وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، ساتویں میں داستانوں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں، پہلے میں شمالی ہند کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ قصوں کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف ہے، دوسرے میں بعض خاص غیر مطبوعہ قصوں کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ہے، اور تیسرے میں ان سب کے مختلف نسخوں اور ان کے ترجموں کا ذکر ہے، یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس میں داستانوں کے مختلف پہلوؤں پر جو دقیق بحثیں ہیں اور مصنف نے ان میں جس تلاش و تحقیق اور نقد و تبصرہ میں جس دقتِ نظر اور حسن مذاق سے کام لیا ہے، اس کا پورا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، پوری کتاب ان کی محنت، تلاش و تحقیق، وسعتِ نگاہ و دقتِ نظر کی آئینہ دار ہے، اردو ادب پر ایسی بلند پایہ کتابیں کم لکھی گئی ہیں، اس میں مصنف نے متعدد ایسی داستانوں اور ان کے ماخذوں کا انکشاف کیا ہے جن سے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ تک ناواقف تھے، ادبی پہلو سے بھی یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے، مصنف کا انداز بیان نہایت ادیبانہ، شگفتہ اور سلیس ہے، اس کتاب سے اردو ادب میں محققانہ اور بیش قیمت کتاب کا اضافہ ہوا، یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستان سے اردو کو مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، دوسری طرف اردو کی ایسی بلند پایہ کتاب ایک ہندو کے قلم سے نکلتی ہے، اس طرح گویا ہر زمانہ میں کعبہ کو صنم خانے سے پاسبان ملتے رہتے ہیں۔

تعارف القرآن - از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی، استاذ شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عمر مصنف اور کتابستان الہ آباد سے ملے گی۔

مسلمانوں نے جن جن پہلوؤں سے کلام مجید کی خدمت کی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس متعلقات پر بہت سے علوم پیدا ہو گئے، اور کلام مجید کے ہر ہر پہلو پر اس کثرت سے کتابیں

لکھی گئیں کہ اس کا کوئی گوشہ بھی تشنہ باقی نہیں ہے، ان کتابوں میں امام سیوطی کی اتقان فی علوم القرآن اپنی جامعیت میں نہایت ممتاز ہے جس میں کلام مجید کے متعلق ہر قسم کے معلومات ہیں، لائق مولف نے اسی طرز پر اردو میں یہ رسالہ لکھا ہے، بلکہ وہ زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہے، مصنف نے کہیں کہیں نئے اضافے بھی کیے ہیں، مگر اس کو اتقان کی جامعیت سے کوئی نسبت نہیں ہے، تاہم اس میں کلام مجید کے متعلق بہت سے مفید معلومات یکجا کر دیے گئے ہیں اس موضوع پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس لیے یہ کتاب بھی غنیمت ہے اس زمانہ میں کلام مجید پر لکھنے والوں کو ایک خاص پہلو کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کلام مجید سے متعلق بہت سے مسائل تو ایسے ہیں، جن میں قدیم و جدید کا کوئی سوال نہیں، وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں گے لیکن اب تعلیم یافتہ طبقہ کا ذوق اور رجحان بہت بدل گیا ہے، بہت سے پرانے مسائل ان کے لیے بیکار ہیں، بحث و نظر کے بعض نئے پہلو پیدا ہو گئے ہیں، اسلیے بعض ایسی چیزوں کو جن کا عقیدے اور مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے، لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، بعض کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے، بعض نئے مسائل پر لکھنے کی ضرورت ہے، مصنف خود ان امور سے واقف ہیں، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، امید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں اس کا لحاظ رکھیں گے، مگر اس سے کتاب کی افادیت میں فرق نہیں آتا، وہ اپنی جگہ پر نہایت مفید ہے۔

انوار حدیث۔ از مولانا محمد ہاشم صاحب فاضل شمسی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۱۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے، اندرون کھنٹا ڈ مارکٹ، نیو نہام روڈ، کراچی۔

مغربی پاکستان میں انکار حدیث کے فتنہ کی جتنی گرم بازاری ہے، اس نسبت سے اس کے انسداد کا سامان بھی مہیا ہوتا رہتا ہے اور اسکی تردید میں برابر کتابیں نکلتی رہتی ہیں، "انوار حدیث" بھی اسی سلسلہ کی نئی کتاب ہے، اسمیں منکرین حدیث کے مشہور اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے، مگر اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مشکل ہی سے اسکا کوئی جواب طلب پہلو باقی رہ گیا ہوگا، چنانچہ اس کتاب میں زیادہ تر ان ہی پرانے جوابات کو نئے طرز سے

دہرادیا گیا ہے، البتہ روایت حدیث کے متعلق اس کی تاریخی حیثیت اور فہم حدیث کے اصول و شرائط وغیرہ کی نئی بحثیں نئی ہیں، جو فائدہ سے خالی نہیں ہیں۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ مؤلفہ مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر پتہ: کتبخانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی۔

اس کتاب میں غیر مسلم مصنفین و مورخین کی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، کتاب کے شروع میں دکھلایا گیا ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، اس نے کبھی جنگ و قتال میں پیش قدمی نہیں کی، اور جب کبھی اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے مجبور ہوا تو کامیاب ہونے کے بعد ان دشمنوں کے ساتھ بھی فیاضی اور رواداری برتی جو اس کی ہستی کو مٹانا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں جہاد کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی اور یہ دکھلایا گیا ہے کہ اسلام میں جبری تبلیغ، دوسرے مذاہب کی توہین اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے، اس سلسلہ میں اورنگزیب پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں، ہند و مورخین کے بیانات سے ان کی تردید کی گئی ہے، اور آخر میں اس خیال کی تردید میں کہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا" غیر مسلم علماء و مورخین کے جن میں یورپین اور ہندو دونوں فضلاء شامل ہیں، بیانات نقل کیے گئے ہیں، ایک زمانہ میں اس اعتراض کا بڑا شہرہ تھا، مگر اب اس کی حقیقت اتنی واضح ہو چکی ہے کہ اب اس کی مزید تردید کی ضرورت باقی نہیں ہے، تاہم جن لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے شبہات ہوں ان کے لیے یہ رسالہ مفید ہے۔

تب و تاب۔ از جناب مولوی محمد یحییٰ تنہا، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۷۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: علمی ادارہ نمبر ۳ راج گڈھ روڈ، لاہور۔

صاحب سیر المصنفین مولوی محمد یحییٰ کا تخلص ان کے نام کا جزو لاینفک ہے، جس سے قیاس ہوتا تھا کہ وہ شاعر ہیں، مگر ان کا کلام پہلی مرتبہ ان کی تصنیف مرآۃ الشعراء میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، اب انھوں نے

اس کا مجموعہ شائع کیا ہے، اس کا بیشتر حصہ قومی وملی اور تاریخی نظموں پر مشتمل ہے، چند غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں، اگرچہ مصنف کی شاعری کی عمر نصف صدی کے قریب ہے، مگر کلام کی کمیت وکیفیت دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض تفنناً شاعری کرتے ہیں، اس لیے ان کے کلام میں شاعرانہ تب و تاب تو نہیں ہے لیکن کہنہ مشق ادیب ہیں اس لیے کلام میں پختگی، سادگی اور واقعیت کا جوہر پوری طرح موجود ہے، اور یہ مجموعہ انکے شعری تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

رباعیات الہام - از ڈاکٹر رگھو نندن راج صاحب سکسینہ الہام، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۶ صفحات، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: سب رس کتاب گھر دفتر ادبیات اردو خیریت آباد حیدر آباد دکن۔

مصنف حیدرآباد کے ممتاز رباعی گو شاعر ہیں، رباعیات الہام انکی رباعیوں کا مجموعہ ہے، اسکے ظاہری اور معنوی محاسن مصنف کی کہنہ مشقی کے شاہد ہیں، بیشتر رباعیاں اخلاقی، حکیمانہ اور عارفانہ خیالات پر مشتمل ہیں، زبان نہایت صاف اور سلیس ہے، شاعر کی کمال کی سند کے لیے یہ کافی ہے کہ اس فن کے استاذ حکیم الشعراء امجد حیدرآبادی نے ان رباعیوں کی داد دی ہے، جو اس کتاب کے مجموعہ میں شامل ہے، اور ڈاکٹر زور جیسے نقاد ادیب نے اس پر دیباچہ لکھا ہے اور اس کی تحسین کی ہے۔

فکر و نظر - مرتبہ جناب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۸ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت ؎ سالانہ، علاوہ محصول ڈاک، پتہ آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی۔

فکر و نظر ادارۂ ادب اردو علیگڈھ کا چار ماہی رسالہ ہے، اسکا پہلا نمبر کئی مہینے ہوے ریویو کیلئے آیا تھا، مگر اب اسکی نوبت آسکی، اس زمانہ میں کسی زبان کا ادب زمانہ کے حالات، نئے افکار و نظریات اور زندگی کے مسائل سے الگ نہیں رہ سکتا، اس لیے اردو ادب کا بھی اس سے متاثر ہونا ناگزیر تھا جس سے نیا ترقی پسند ادب پیدا ہوا، مگر ہر نئی تحریک کی طرح ابتدا میں اسمیں بھی بڑی بے اعتدالی رہی اور ہر قسم کے خرافات کو ترقی پسند ادب کا نام دیدیا گیا، مگر اب رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہو رہا ہے اور ترقی پسند ادب صحیح راستہ پر آرہے ہیں، محض پرانے ادب سے بغاوت، کسی خاص ادب کی نقالی اور ہر نئے

خیال کو خواہ ہمارے قومی و ملّی مزاج کے مخالف ہی ہو قبول کرنے کا نام ترقی پسندی نہیں ہے، بلکہ صحیح ترقی پسند ادب وہی ہے جسمیں دونوں ادب کے اچھے عناصر اسطرح ہم آہنگ ہوں کہ قدیم ادب کی قابل قدر روایات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور جدید تقاضوں کا بھی پورا لحاظ ہو، اسمیں قدیم ادب کا حسن اور پاکیزگی بھی ہو اور جدید ادب کی مقصدیت اور افادیت بھی، فکر و نظر اسی صحیح ترقی پسند ادب کا ترجمان اور مبلغ ہے اور اسکا پہلا نمبر اس ادبی سنگم کا اچھا نمونہ ہے، اسمیں بڑے اعتدال و توازن کیساتھ اس ادب کی ترجمانی کی گئی ہے، قاضی عبد الغفار صاحب نے افتتاحیہ میں اس ادب کی ضرورت کیطرف توجہ دلائی ہے، اور رسالہ کے اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں، پروفیسر رشید احمد صاحب نے جدید غزل کے حسن و رعنائی اور اسکی لطافتوں اور نزاکتوں کو اس خوبی سے دکھایا ہے کہ اسکو عروس تغزل کی مشاطگری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ غزل کی تہذیبی اور کلچری حیثیت کی بحث میں جس لطیف حقیقت کیطرف اشارہ کیا ہے وہ اگرچہ نئی نہیں ہے لیکن اسکی جانب بہت کم نظر جاتی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے غزل کے جدید رجحانات کا جائزہ لیا ہے، یہ مضمون محض غزل کی وکالت نہیں ہے بلکہ اسکے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر یہی ہے، غزل کی اصلی حقیقت پر اس سے بہتر مضمون ابتک نہیں لکھا گیا، اور وہ رشید صاحب کے شاہکار مضامین میں ہے، آل احمد صاحب سرور نے جدید اور قدیم ادب کی مشترک قدروں پر روشنی ڈالی ہے، اور قدیم ادب کی بھی اچھی قدروں کو دکھایا ہے، سرور صاحب اگرچہ ترقی پسند ادیب ہیں، لیکن وہ قدیم ادب کے ادا اور ادب شناس ہیں، اس لیے نئی شراب کے نشہ میں پرانے بادۂ گلفام کی لذت نہیں بھولے ہیں، اور پرانے اور نئے ادب کے اچھے عناصر کو ہم آہنگ کرنے کی یہی صورت بھی ہے، خلیل الرحمٰن اعظمی نے جوش کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کا صحیح تجزیہ کرکے اس کا اصلی مقام واضح کیا ہے، ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے مارکسی نقطۂ نظر سے ادب پر روشنی ڈالی ہے، جس سے بعض نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کی بے راہ روی کی اصلاح ہو جاتی ہے، اسکے علاوہ ڈاکٹر مسعود حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کے مضامین تخلیق شعر اور جدید اردو شاعری بھی مفید مضامین ہیں، آخر الذکر مضمون کا انداز تحریر اردو زبان کے لیے کچھ اجنبی سا ہے، ان مضامین کے علاوہ متعدد نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، بغرض مجموعی حیثیت سے رسالہ ترقی پسند ادب کا ستھرا ترجمان ہے۔ "م"

مکتبہ دار المصنفین

سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام (حصہ اول) عہد رسالت و خلافت راشدہ یعنی آغاز اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ، قیمت

تاریخ اسلام (حصہ دوم) (بنی امیہ) یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی، اور علمی تاریخ کی تفصیل قیمت،

تاریخ اسلام (جلد سوم) (خلافت عباسیہ) یعنی ابو العباس سفاح سنہ ۱۳۲ھ سے ابو اسحاق متقی اللہ سنہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت

تاریخ اسلام (جلد چہارم) (خلافت عباسیہ دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ ہے، اور آخر میں ایک مستقل باب میں عباسیوں کے تمدنی کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح سے یہ جلد اپنے سلسلے کی آخری کڑی ہے، ختم ہو کر مکمل ہو گئی ہے۔

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت :

نئی کتابیں

تاریخ سندھ، سندھ کی مفصل سیاسی، نظامی، علمی، و تمدنی تاریخ :- قیمت : [illegible] (چھ روپیہ)

اقبال کامل، ڈاکٹر اقبال کے سوانح حیات کے علاوہ انکے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل،

بزم تیموریہ، تیموری بادشاہوں شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امرا، و شعرا، اور فضلا کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی و ادبی کمالات کی تفصیل، قیمت

امام رازی، امام فخر الدین رازی کے سوانح و حالات انکی تصنیفات کی تفصیل اور فلسفہ و علم کلام و تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح قیمت

بزم صوفیہ، عہد تیموریہ سے پہلے کے صاحب تصنیفات صوفیہ کرام مثلاً شیخ ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ نظام الدین اولیاء وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات، قیمت

تاریخ اندلس (جلد اول) اندلس کے عہد بعہد کی مفصل سیاسی تاریخ کیساتھ اندلس کی تمدنی تاریخ، قیمت

[illegible] کا تذکرہ

سنہ ۹۵ء کی نئی کتاب

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزم تیموریہ کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے، ان سے پہلے کے مسلمان حکمران خاندانوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں نیز ان کے درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء و شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے، لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی، اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ بدایونی، شامی، شمس دبیر، امیر خسرو، امیر حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے تمام نامور مگر گمنام شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پہلی دفعہ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظر عام پر لایا گیا ہے، ان کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمال فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے، قیمت ۴ ر

مآل و مشیت

اس میں حیات انسانی کے دو بنیادی مقصدوں مآل و مشیت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد ان دونوں موضوع پر سلسلہ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحوں میں پوری بحث پر تبصرہ ہے، (از صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالات روسو)

قیمت [illegible]

([illegible])

رجسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰ نومبر ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۷۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات

ادھر کئی مہینوں سے علم و ادب کے اکابر کی موت کا ایسا سلسلہ قائم ہو کہ کوئی مہینہ ناغہ نہیں جاتا جسمیں کسی نہ کسی صاحبِ علم کا ماتم نہ کرنا پڑتا ہو، ان میں سب سے بڑا حادثہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی وفات کا ہے، اگرچہ انکی عمر نوے سال سے زیادہ ہو چکی تھی، مگر وہ ہماری مشترک تہذیب کی بڑی اہم یادگار تھے، اور انکی موت سے اس کا ایک بڑا ستون گر گیا، ان کی ذات میں اس تہذیب کی تمام خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں، اردو زبان سے ان کو عشق تھا، اور اس کے وہ بڑے ماہر و محقق تھے، اور اس کی باریکیوں پر انکی بڑی گہری نظر تھی جس پر ان کی نثر و نظم کی تصانیف شاہد ہیں، اس لیے ان کی موت ایک بڑا ادبی و تہذیبی حادثہ ہے۔

وہ نصف صدی سے زیادہ اپنے قلم و زبان سے اردو کی خدمت کرتے رہے۔ اور سرد و گرم کسی دور میں بھی ان کا قدم پیچھے نہ ہٹا حتی کہ اس دور میں بھی جبکہ فرقہ پرستی نے اردو کی حمایت کو ایک قومی جرم بنا دیا ہے، اور ہندوؤں میں جو لوگ اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور دل سے اس کے حامی ہیں، وہ بھی بہت کم اسکے اظہار کی جرأت کر سکتے ہیں، اردو کی وفاداری پر جو لوگ قائم رہ گئے ہیں، ان میں پنڈت کیفی سب میں نمایاں تھے، وہ برابر اسکے لیے سینہ سپر رہے، اور جبتک ان میں لکھنے پڑھنے اور چلنے پھرنے کی سکت باقی رہی اسکی وکالت کرتے رہے، انجمن ترقی اردو ہند کے نائب صدر تھے مگر ادھر چند سال سے ضعف پیری نے بالکل معذور کر دیا تھا، انکی پوری زندگی علمی و ادبی مشاغل میں گذری، اور اردو زبان اور اسکے شعر و ادب کے متعلق بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، اخلاق و سیرت میں قدیم شرافت و وضعداری کا نمونہ تھے، اسلیے انکی موت تنہا علمی و ادبی نہیں بلکہ تہذیبی اور قومی حادثہ بھی ہے، جدید ہندوستانی قومیت کی تعمیر جن عناصر سے ہو رہی ہے اس میں ایسے نمونوں کی پیدا ہونے کی قطعاً امید نہیں،

یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ سن رکھو تم، فسانہ تھے یہ لوگ

دوسرا حادثہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی وفات ہے، وہ حضرت شاہ پیر محمد عطا سلونوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھے، اور موجودہ سجادہ نشین شاہ نعیم عطا صاحب کے چھوٹے بھائی تھے

یہ خاندان علم و عرفان دونوں کا جامع رہا ہے، شاہ حلیم عطا صاحب بڑے وسیع النظر عالم اور اسلامی علوم کا زندہ کتبخانہ تھے خصوصاً حدیث اور اس کے متعلقہ فنون پر انکی نظر اتنی گہری اور وسیع تھی کہ اس دور کے علما میں اس کی مثالیں کم ملیں گی، حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کے علم کی تھاہ نہیں ملتی، اور اس علم و فضل کے ساتھ ایسے خاکسار اور متواضع، سادہ مزاج اور بھولے بھالے تھے کہ انکو دیکھکر کوئی شخص مشکل سے ان کے لکھے پڑھے ہونے کا بھی گمان کر سکتا تھا، اپنے سے کمتر علم والوں کی باتیں اس شوق اور توجہ سے سنتے کہ معلوم ہوتا خود استفادہ کر رہے ہیں، حافظہ حیرت انگیز تھا، کتابوں کے صفحوں کے صفحے زبانی یاد تھے، مگر ان کمالات کے ساتھ قوتِ گویائی اور قوتِ تحریر نہ تھی، اس سے بھی زیادہ انکی تواضع اور استغنا نے انکو نام و نمود سے بے نیاز کر دیا تھا، اس لئے ایک محدود حلقہ کے سوا علمی دنیا بھی ان کے کمالات سے واقف نہ ہو سکی، تقریباً دس پندرہ سال سے دار العلوم ندوۃ العلما میں حدیث نبوی کا درس دیتے تھے، اور اسی مبارک شغل میں چند دنوں فالج میں مبتلا رہ کر انتقال کیا، انتقال کے وقت ۵۰ سال کی عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ اس پیکرِ علم و اخلاق کو اس کے پاک شغل کے طفیل میں عالم آخرت کی سربلندی عطا فرمائے۔

ابھی یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ علیگڈھ کی نامور اور صاحب کمال شخصیت مولوی اقبال احمد خانصاحب سہیل نے وفات پائی، وہ علامہ شبلی مرحوم کے خاص تلامذہ میں تھے، اپنے زمانہ کے نامور علیگ، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ماہر تھے، قوتِ حافظہ اور ذہانت و ذکاوت میں بے مثال، اردو کے نکتہ سنج ادیب اور اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، قصیدہ گوئی اور نعت و منقبت نگاری میں اس زمانہ میں ان کا جواب نہ تھا، ان کا فارسی کلام ایران کے قدیم اساتذہ کے کلام کی ہمسری کرتا تھا، علمی قابلیت اور ذہانت کے لحاظ سے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، مگر وکالت کے پیشہ نے ان کے جوہروں کو چمکنے نہ دیا، اگر وہ کسی علمی شعبہ میں ہوتے تو ہندوستان کے مشاہیر اہل علم میں ان کا شمار ہوتا، دار المصنفین سے ان کے تعلقات بڑے گوناگوں اور گہرے تھے۔ اللہ تعالےٰ اس مداح رسول اور منقبت نگار صحابہ کو آخرت کے انعام سے سرفراز فرمائے، ان محدود صفحات میں ان کے تفصیلی حالات کی گنجایش نہیں ہے، انشاء اللہ آیندہ ان پر مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

صوبوں کی حد بندی کے کمیشن کی رپورٹ شائع ہوگئی، اس میں صوبائی اور مقامی زبانوں اور لسانی اقلیتوں کی حیثیت اور ان کے حقوق کا سوال آنا ناگزیر تھا، چنانچہ کمیشن نے ان کے حقوق کے متعلق چند

اصول بنائے ہیں، اور ان کے مطابق حقوق کی سفارش کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ اتر پردیش میں اردو کے حق کا تھا، جو ہندوستان کے دستور میں ہندوستان کی چودہ زبانوں میں ایک زبان مانی گئی ہے، مگر اس کے باوجود اس کا کوئی علاقہ تک متعین نہیں ہے، کمیشن نے بھی اس بارہ میں سکوت سے کام لیا ہے، اور اردو کا نام تک نہیں آنے پایا ہے، حالانکہ کمیشن کے صدر جسٹس فضل علی اور اس کے ایک رکن پنڈت ہردے ناتھ کنزرو اس صوبہ میں اردو کی حیثیت سے پوری طرح واقف ہیں، اور کنزرو صاحب تو اس وفد کے بھی رکن تھے جس نے صدر جمہوریہ کی خدمت میں اردو علاقائی زبان کا بیس لاکھ دستخطوں کا میمورنڈم پیش کیا تھا، مگر اردو کا کوئی اشارہ تک نہیں ہے کمیشن نے جن اصولوں کی بنیاد پر لسانی اقلیتوں کے حقوق کی سفارش کی ہے، اس سے بھی اردو کو مشکل ہی سے فائدہ پہنچ سکے گا، اس کا حال تو شروع سے یہ رہا ہے کہ

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب بیدرد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

چنانچہ اس صوبہ میں اردو کی جڑ کاٹنے کے لیے مدتوں پہلے سے اہتمام کیا گیا تھا۔ اور گذشتہ مردم شماری میں زبان کے اندراجات نہایت غلط کیے گئے تھے اور اردو بولنے والوں کی تعداد گھٹانے کے لیے اردو اور ہندی کے علاوہ ایک تیسری زبان ہندوستانی کھڑی کی گئی جس سے اس صوبہ میں اردو بولنے والوں کی تعداد اور بھی کم ہوگئی، اس مردم شماری کے اعداد کی صحت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی رو سے لکھنؤ جیسے اردو کے مرکز میں اردو بولنے والوں کی تعداد کل ۱۵ فیصدی ہے، ایسی حالت میں کمیشن نے جو سفارشیں کی ہیں اس سے بھی شاید ہی کسی ضلع میں اردو کو کوئی فائدہ پہنچ سکے۔

درحقیقت اردو کے بارہ میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے کہ جو لوگ اردو کے واجبی حقوق کے معترف بھی ہیں وہ بھی علانیہ اس کا اظہار نہیں کر سکتے، اور اتر پردیش کی حکومت تو اردو کو قطعاً کسی طرح بھی پنپنے دینا نہیں چاہتی، تاہم قانونی اور اصولی حد تک تو بہرحال اس کے حقوق کے لیے جد وجہد کرنا ہے، حکومت ہند نے ہندی کے متعلق تحقیقات کا جو کمیشن مقرر کیا ہے، اس میں اردو کے متعلق بھی گفتگو کی گنجائش نکلتی ہے اسلیے ضرورت ہے کہ اردو کے تمام مرکزی ادارے اور اس کی علمی و ادبی مجالس اس کے سامنے اس صوبہ میں اردو کی حیثیت اور اس کے حقوق کے بارہ میں مفصل بیانات دیں،

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو سیلاب کے اثرات کے مشاہدہ کے سلسلہ میں ۵ نومبر کو اعظم گڈھ آئے تھے، وہ ہماری مشترک تہذیب کے باقیات صالحات میں ہیں، اس لیے دار المصنفین بھی تشریف لائے تھے اور اسکے کتبخانہ کو دیکھکر بہت متاثر ہوئے، افسوس ہے کہ انکا قیام مختصر رہا۔

مقالات

سلوک سلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب محمد اشرف خان صاحب ایم اے لیکچرار عربی، اسلامیہ کالج پشاور

(۳)

ہمت و عزیمت اس طریق کے ہر راہی اور اصلاح کے ہر طالب کے لیے ضروری ہے کہ اصلاح نفس کے لیے ہمت و عزیمت سے کام لے، اختیاری امور میں بے ہمتی و کسل اور کوتاہی کو دخل نہ دے، اور غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑے، جو شخص ہمت و عزیمت سے کام میں لگا رہے گا وہ انشاء اللہ العزیز ایک نہ ایک دن ضرور مقصد میں کامیاب ہوگا۔

آہی جائیگا کبھی اُس تک بھی ساقی دورِ جام   منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے

حضرت والاؒ ایک طالب کو لکھتے ہیں: "اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دیں، انشاء اللہ آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائے گا، اصلاح کا سارا کام عزیمت پر موقوف ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہیگا، اور اس سے سارا کام بن جائے گا۔"

ایک دوسرے صاحب کو تحریر فرمایا: "احساس کا پہلا قدم اپنی گذشتہ غلطی و تقصیر کا اعتراف اور ندامت اور آیندہ اس کی اصلاح کا عزم بالجزم ہے۔"

ایک اور طالب کے جواب میں جنھوں نے سوسائٹی کے برے اثرات کی شکایت کی تھی، تحریر فرمایا:

"بری صحبت سے پرہیز کیجئے، اور بزرگوں کے تذکرے پڑھیے، سوسائٹی خدا نہیں کہ اس سے ڈرا جائے اگر کسی آبادی میں وبا پیدا ہو جائے، تو کیا کثرتِ آبادی کا لحاظ کرکے آپ اپنی بیماری کا علاج چھوڑ دینگے، آجکل سوسائٹی حقیقت میں وبا رسیدہ ہے، آپ سوسائٹی کو جو خدا تعالیٰ سے غافل ہے، قابلِ رحم سمجھیے، کیا اندھے ننگوں کی صحبت میں کوئی آنکھ والا اپنے لیے برہنگی کو پسند کرے گا، آپ چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں آپ ہیں، وہ جلیل القدر ہے، یہ خیال غلط ہے۔ جو خدا اور رسول کے خلاف ہو وہ کبھی جلیل القدر نہیں، اور جو جلیل القدر نہیں، وہ لحاظ کے قابل نہیں"

ایک طالب نے عمل میں ارادہ کی کمزوری کی شکایت کی، اس کے جواب میں ارقام فرمایا:

"پختہ ارادہ عزیمت سے پیدا ہوتا ہے، عزیمت کیجئے، جس طرح آپ کو کہیں ریل میں جانا ہوتا ہے تو کیسے جاتے ہیں، صرف تمنا سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، عمل کیجئے، فرائض پر عامل ہوں، اور نوافل کو بھی ادا کرنے کی کوشش اور تہجد کا اہتمام کیجئے"

ایک دوسرے صاحب کی اسی قسم کی شکایت پر تحریر فرمایا:

"سستی کا علاج تو بقول حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ چستی ہے۔ جب تک دل میں وہ ہمت اور عزیمت پیدا نہ کرینگے، جو دنیاوی کاموں کے کرنے میں دیکھی جاتی ہے، دین کے کام انجام نہیں پا سکتے، بلا وجہ سستی کوئی شرعی عذر نہیں، اس محرومی کی اہمیت کو محسوس کیجئے جو جماعت کی محرومی سے ہوتی ہے"

ایک دوسرے گرامی نامے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کو جب اپنی اصلاح کی فکر لاحق ہوئی ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی حالت روز بروز درست ہو جائے گی، وقت کی پابندی کے بغیر استقامت حاصل نہیں ہوتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نماز اور روزہ اور زکوۃ و حج کے اوقات مقرر فرمائے ہیں، پابندی کے بغیر مداومت اور استقامت نصیب نہیں ہوتی، جس طرح بیمار جب تک پابندی کے ساتھ دوا نہیں پیتا عموماً تندرست نہیں ہوتا...... اللہ تعالیٰ

اپنے فضل و کرم سے آپ کو توفیق اور ہمت عطا کریں، سب سے پہلے بندہ آمادگی ظاہر کرے تو اللہ تعالیٰ نصرت فرماتے ہیں، بے ہاتھ اٹھائے تو لقمہ بھی منہ تک نہیں پہنچتا، اپنی جیسی کوشش عزیمت کے ساتھ کیجئے، پھر تائید الٰہی انشاء اللہ تعالیٰ شامل حال ہوگی۔"

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرمایا: "آپ کے حالات معلوم ہوئے، امور خیر کی تعمیل اور گناہوں سے بچنا، انسان کے اختیار میں ہیں، بس آپ سب وسوسوں اور خیالات کو چھوڑ دیں، اور دل سے یہ طے کرلیں کہ آج سے اللہ تعالیٰ کے کسی چھوٹے یا بڑے حکم کے خلاف نہیں کریں گے، معمولات کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہیے، وقت کی پابندی کے بغیر معمولات ناغہ ہوتے ہیں، اس لیے وقت کی پابندی کی ضرورت ہے۔"

بہرحال گذشتہ پر ندامت بھی توبہ کا ایک جزء ہے لیکن صرف یہ ندامت کافی نہیں، ضرورت ہے کہ آئندہ ان لغزشوں سے بچنے کا عزم راسخ ہو جائے۔"

ایک صاحب نے لکھا "باتیں اور ارادے کرتا ہوں لیکن عمل کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ نیک عمل کی دولت سے نوازیں۔"

حضرت شیخ نے جواب میں تحریر فرمایا: "عمل کی عزیمت اور پختہ ارادہ اور مستقل ہمت اور دعا کے سوا کوئی تدبیر نہیں ...... نفع کے لیے مداومت شرط ہے، اگر کسی عذر شرعی سے ناغہ ہو جائے تو کچھ حرج نہیں، مگر اہتمام یہ ہو کہ ناغہ نہ ہونے پائے۔"

استقامت | استقامت جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "الاستقامة فوق الکرامة"۔ وہ بھی عزیمت سے حاصل ہوتا ہے، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں: "استقامت عزیمت سے حاصل ہوتی ہے، اور دعا سے۔"

دوسرے گرامی نامے میں ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ دین میں عزیمت عطا فرمائیں، یہ بڑی نعمت ہے۔ اس کے بغیر استقامت مشکل ہے۔"

ایک خط میں ارقام فرمایا: "حالات میں کوئی تغیر بجانب زوال بحمد اللہ کہ نہیں ہوا، یہی بہت بڑی نعمت ہے، باقی تغیر بجانب کمال تو وہ اس استقامت طریق سے ان شاء اللہ تعالیٰ حاصل ہوگا"۔

حضرت والا استقامت و عزیمت کے جس بلند مقام پر فائز تھے، اس کا بیان بھی اس عاجز کی قوت سے باہر ہے، یہاں مثالاً استقامت کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے، حضرت سیدیؒ بڈھی میں قلب کے شدید عارضہ میں مبتلا تھے، ضعف حد سے سوا تھا مگر اس حالت میں بھی معمولات اور نماز با جماعت میں فرق نہ آیا، ایک دن ظہر کے بعد حسب معمول قرآن کریم اور مناجات مقبول پڑھنے کے لیے پلنگ پر بیٹھے لیکن قوت نے جواب دیدیا، اور نڈھال ہوکر تکیہ پر سر رکھدیا، اور قرآن کریم چھاتی پر پڑا رہا، پھر ہمت کرکے اٹھے اور پورے عزم سے جتنی تلاوت کرنا تھی اور مناجات مقبول کا جتنا حصہ پڑھنا تھا، پڑھا، اس کے بعد پھر ضعف کی وجہ سے پلنگ پر لیٹ گئے اور راقم سے فرمایا "جب حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ (مولانا تھانویؒ) کا وصال ہوا، تو مجذوب صاحب نے حضرت کی پیشانی کو بوسہ دیکر فرمایا تھا، "واہ میرے شیخ کیا زندگی گذار گئے"، اس سے مقصد یہ تھا کہ کیا استقامت کے ساتھ زندگی گذار گئے کہ آخری وقت تک ہر بات کو نبھاگئے، ہمارے حضرت نے فرمایا، اصل چیز تو استقامت ہے کہ آخری سانس تک تراش خراش جاری ہے، حضرت مولانا تھانویؒ اسی لیے یہ شعر بکثرت پڑھتے تھے:

اندریں رہ می تراش و می خراش ‏ ‏ ‏ تا دمے آخر دمے غافل مباش

بس آخری سانس تک کوشش جاری رہے کہ شیطان دھوکہ نہ دے"۔

ایک خط میں تحریر فرمایا: "اللہ تعالیٰ استقامت نصیب فرمائیں، لیکن ہر وقت اندیشہ لگا رہنا ایک نعمت ہے، اسی سے خوف و رجا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جو عین ایمان ہے"۔

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں: "آپ کے حالات معلوم ہوکر خوشی ہوئی، اسی طرح چلے چلیے، نفس کے فریب سے بچتے ہوئے کہ اس کا فریب اچھے اچھوں کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے، حدیث شریف

میں ہے الحزم سوء الظن : تجربہ کاری سوءظن کا نام ہے،

ایک والانامہ میں یہ حدیث مجھے لکھی تو اس کے ساتھ بنفسہٖ کا لفظ بڑھا دیا، یعنی تجربہ کاری اپنے نفس کے ساتھ سوءظن کا نام ہے ......"

ایک والانامہ میں تحریر فرمایا: "جب تک اخیر سانس نہ آئے دغدغہ ہمیشہ لگا رہے"

غرض استقامت ایک بڑی نعمت ہے، اور اسی کی برکت سے طریق کی گھاٹیاں پار ہوتی جاتی ہیں،

توحید | سلوک کا مقصد اعظم اور مدعائے اصلی توحید کاملہ کا ایسا حصول وایقان ہے کہ توحید محض قولی و نظری نہ رہے بلکہ حال بن جائے کہ "توحید افعالی کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی" جب توحید الٰہی کی حقیقت سالک پر منکشف ہوتی ہے تو سب سے کٹ کر صرف اپنے ایک آقا ہی کا ہو جاتا ہے، اپنا نفع وضرر خیروشر، عزت وذلت سب کچھ اسی کی ذات سے وابستہ کرلیتا ہے کہ اسکے ماسوا بالکل ہیچ ہے۔

کارفرما ایک آتا ہے نظر   منکشف اب رازِ اِلَّا اللّٰہ ہے

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے فاعل حقیقی ہونے کا اذعان توحید افعالی ہے جس کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی، سلوک کے احوال ومقامات اسی توحید کاملہ کی سعی وحصول کا ثمرہ ونتیجہ ہوتے ہیں، جس قدر سالک کا قدم اس توحید کی طرف بڑھتا چلا جائیگا صبغۃ اللہ کے رنگ میں نکھرتا چلا جائے گا، صفاتِ الٰہیہ کا انعکاس اسے فضائل واخلاق سے متجلی اور رذائل سے پاک بنا دے گا، خشیت ومحبت الٰہی کا رسوخ اسے معاصی سے مجتنب، اوامر الٰہی کا پابند اور یاد الٰہی میں مشغول بنا دے گا، غرض من یعتصم باللّٰہ فقد ھدی الٰی صراطٍ مستقیم کی نص صریح کی حقیقت اسی توحید کامل کے حصول سے ہاتھ آئے گی کہ اس طریق کا ہر راہی توحید کی ہی مختلف گھاٹیوں ومنازل کا جادہ پیما ہوتا ہے،

اس تجلی گاہ کا ہر نازنیں   کشتۂ اندازِ الا اللّٰہ ہے   (سیدالملۃ)

فنائے تام و عبدیت کاملہ جو طریق کی غایت قصویٰ ہے، اور جس کے متعلق ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو پہلا درس[1] اپنے شیخ کی بارگاہ سے ان الفاظ میں ملا تھا کہ "ہم نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے اس کا مقصد اپنے کو مٹانا ہی سمجھا ہے۔ وہ بھی اسی توحید کاملہ کا ثمرہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ کی جلالت و عظمت چھائی ہے تو اپنی ہستی کے گمان سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے، اپنے ہیچ در ہیچ اور محتاج و لاچار ہونے کا ایقان اور ہر خوبی و وجود کا ان ہی کی ذات سے ہونے کا یقین غالب و مستحضر ہو جاتا ہے، نگاہوں میں وہی سما جاتا ہے۔ دل اسی کے جلووں سے مسرور اور اس کی رضا و لقا کے جذبات سے معمور ہو کر مخلوقات کو گم کر دیتا ہے۔ اس وقت بندہ اسی کی قوت سے دیکھتا ہے، اسی سے چلتا ہے، اسی سے سنتا ہے، اسی سے بولتا ہے، اور کائنات کے ذرے ذرے میں اسے جمال ازلی اور نور سرمدی کا پرتو نظر آتا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ اپنے کو مٹانے کی تشریح ان الفاظ میں ارقام فرمائی تھی:

"اپنے کو مٹانا یہی ہے کہ اپنے کسی کمال کو اپنا ذاتی نہ سمجھا جائے، بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا بلا استحقاق بندہ سمجھا جائے۔ اور اپنے کسی عمل کو موثر مستقل نہ سمجھا جائے، دل میں کبر و نخوت و عجب باقی نہ رہے اور یہ حاصل ہوتا ہے اپنے ضعف اور بیچارگی کے تصور اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے استحضار سے۔"

---

[1] حضرت مفتی محمد حسن صاحب مدظلہ نے راقم سے تذکرہ کیا تھا کہ جب سیدی و مولائی حضرت شیخ پہلی مرتبہ مولانا تھانویؒ کی خدمت اقدس میں تشریف لے گئے تو رخصتی کے وقت سید صاحب نے فرمایا حضرت کچھ نصیحت کیجئے، مولانا نے فرمایا میں اتنے بڑے عالم و فاضل کو کیا نصیحت کر سکتا ہوں، سید صاحب کا نرم و پاکیزہ دل یہ الفاظ سنکر گداز ہو گیا اور آبدیدہ ہو گئے، حضرت مولانا تھانویؒ پر بھی سید صاحب کے اس تاثر سے رقت طاری ہو گئی، بعد ارشاد فرمایا "ہم نے جو کچھ دیکھا، پڑھا اور سنا ہے اسکا مطلب فنا و عبدیت ہی سمجھا ہے"۔ میں نے حضرت شیخ (سید صاحب) سے ایک مرتبہ استفسار کیا تھا کہ آپ کی پہلی ملاقات مولانا تھانویؒ سے کس طرح ہوئی تھی۔ فرمایا "بڑی مدت سے خدمت میں حاضری کا خیال تھا، مگر بعض احباب اسکو پسند نہیں کرتے تھے، ایک سفر میں لاہور کی واپسی کے بعد بغیر اطلاع کے میں حضرت والا رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، رخصتی کے وقت حضرت والا (مولانا تھانوی) نے ارشاد فرمایا "ہم نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے، اس کا مقصد اپنے کو مٹانا ہی ہے"۔
(اشرف)

ایک خط میں تحریر فرمایا " تواضع کی کیفیت کی کمی اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے مراقبہ سے دور ہوگی"

ایک طالب نے اپنے ارادہ کو ذاتِ حق کے ارادے میں فنا کر دینے کا ذکر کرکے پوچھا کہ یہ اخلاص کے منافی تو نہیں، حضرت سید ی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ارقام فرمایا " ارادہ کی یہ فنائیت اخلاص کے خلاف نہیں ہے، ارادہ کی فنائیت یہ ہے کہ بندہ اپنے ارادہ کو مؤثر نہ جانے بلکہ موثر صرف مشیتِ الٰہی کو سمجھے، باقی ارادہ تو فنا نہیں ہوتا جب تک انسان ارادہ نہ کرے کوئی فعل ہی نہیں ہو سکتا"

ایک والا نامہ میں لکھتے ہیں: " آپ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر جو حالات لکھے ہیں، وہ سب محمود ہیں، اور ان پر حق تعالیٰ کا جو محسن حقیقی ہے، اکثر شکریہ ادا کیجئے، ورنہ ذرا سا غرور و تکبر اور اپنے نفس کی طرف نظر رکھنے سے سارا کیا کرایا خاک میں مل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو ان شرور سے محفوظ رکھیں، ہمیشہ تواضع، صغرِ نفس اور فنا کا حال غالب رہے، اور ہر وقت یہ سمجھے کہ جو کچھ ہے وہ اس بے استحقاق پر محض ان کا کرم ہے، ورنہ کچھ نہیں ہے"

ایک طالب کے سوال کا جواب ان الفاظ میں تحریر فرمایا: " بے شبہہ یہی بات ہے، ہمارے اعمال پوست ہی پوست ہیں، انسان جس قدر ترقی کرتا ہے، اپنے احوال و اعمال متوقع مراتب سے کم نظر آتے ہیں، اور یہی صحیح حال ہے،

ایک مرتبہ فرمایا " احساسِ نقص نقصان کی بات نہیں، احساسِ کمال نقصان کی بات ہے، بلکہ احساسِ نقص تو ترقی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے"

ایک گرامی نامے میں ارقام فرماتے ہیں: " اصلاح کامل تو کسی زمانہ میں بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ جیسے جیسے کمال کی طرف آدمی بڑھتا ہے، اس کے نقائص اور زیادہ اس پر واضح ہو جاتے ہیں، مگر بندہ کو چاہیے کہ اپنی کوشش میں لگا رہے"

حضرت شیخ کا ایک شعر ہے،

جب سے اے دل اپنے عیبوں پر نظر اپنی پڑی اپنے دعوائے ہنر سے شرم سی آنے لگی

اس شعر کے متعلق فرمایا تھا کہ یہ شعر اہل علم اور مولوی حضرات کے لیے ہے"۔

ایک مرتبہ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سنایا کہ ایک دن نماز کے بعد مولانا نے مقتدیوں کی طرف منہ کرکے ارشاد فرمایا۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے میری اس دعوت کو فروغ دیا ہے، مجھے اپنے اوپر استدراج کا خطرہ ہے، اس لیے میں سب بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے لیے دعا فرمائیں ہمارے حضرت نے یہ قصہ نقل کرنے کے بعد فرمایا" ہمارے بزرگ بڑا بننے کو ابتلا سمجھتے تھے کہ کہیں پول نہ کھل جائے"۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ پر فنا و عبدیت کا جس قدر غلبہ تھا، اس کا کچھ ہلکا اندازہ شاید مندرجہ ذیل واقعات سے ہوسکے۔

راقم نے حضرت شیخ قدس سرہٗ سے ایک مرتبہ تنہائی میں پوچھا کہ حضرت بزرگوں سے فیض کس طرح حاصل کیا جاتا ہے، میرے سوال کا منشا حضرت شیخؒ نے یہ سمجھا کہ میں بزرگی کی نسبت انکی طرف کر رہا ہوں جس سے چہرۂ اقدس کا رنگ متغیر ہوگیا، اور بے اختیار زبانِ مبارک سے نکلا "یہ تو انانیت ہے، لا الہ الا اللہ استغفر اللہ" اور ارشاد فرمایا" آپ کا کیا مطلب ہے، میں نے پھر عرض کیا، فرمایا، جو بزرگ ہوں، ان سے فیض حاصل کرنے کے متعلق حضرت والا مولانا تھانوی رحمۃ اللہ نے یہ طریقہ بتایا تھا، پھر اس کی تصریح فرمائی۔ اس طرح گویا اپنے متعلق بزرگی کے ادنے گمان تک کو برداشت نہیں فرمایا، فقیر سے فرماتے تھے" جس کے خیال میں اپنی بڑائی کا گمان آئے، وہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کے دائرے سے خارج ہے، (اللھم اعذنا من شرور انفسنا) پھر یہ آیت پڑھی انّ اللہ لا یحب من کان مختالاً فخوراً اور فرمایا مختال سے یہی مطلب ذہن میں آتا ہے"۔

راقم نے ایک مرتبہ اپنی دوری و مہجوری کا ذکر کرکے عرض کیا کہ حضرت یہ خادم کی غرض بھی وہی ہے

جو اپنے شیخ کے سامنے پیش کی تھی کہ

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے

ارشاد فرمایا" یہاں کیا رکھا ہے، اللہ ہی اللہ ہے، یہاں خود پیغمبری وقت پڑا ہوا ہے"۔

حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ پشاور تشریف لائے، راقم نے عرض کیا، حضرت کسی چیز کی تو ضرورت نہیں، ارشاد فرمایا" جی ہاں ہے۔ ایک چیز کی ضرورت ہے، عرض کیا ارشاد ہو، فرمایا نجات۔

ایک مرتبہ در دولت پر حاضری ہوئی، حضرت کمرہ میں تشریف رکھتے تھے، میں نے آنے کی اطلاع دی، آواز سن کر فرمایا آجائیے، اندر گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ حضرت والا پر ہیبت کا غلبہ ہے، رنگ زرد ہے اور زبان مبارک سے یہ کلمات نکل رہے ہیں" بڑی پٹائی ہوگی بڑی پٹائی ہوگی"۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں مجھ کو تو نہیں سنایا جارہا ہے، لیکن شیخ محاسبہ کے عالم میں تھے، اور اپنے نفس کو مخاطب کرکے کہہ رہے تھے" پوچھا جائے گا، ہم نے جو علم دیا تھا، اسے تو نے اپنے لیے استعمال کیا"

سچ ہے، جتنا علم الٰہی بڑھتا ہے، اتنی ہی خشیت بڑھتی ہے، چنانچہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ انا اعلمکم باللہ واخشاکم للہ نیز ارشاد باری ہے انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

اگر کوئی طالب حضرت کے احسانات و برکات کے متعلق کچھ لکھتا تو فوراً اپنی بے مائگی اور ہیچ میرزی کا اظہار فرما دیتے، کسی نے لکھا" ہر وقت نظر کرم کا طالب ہوں"۔ جواب میں تحریر فرمایا" نظر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر چاہیے، انسان کے بس میں کیا ہے، جو کسی انسان کو دے سکے"۔

ایک طالب نے خط میں حضرت کے فیضان کا تذکرہ کیا، اس کے جواب میں تحریر فرمایا" میری نسبت آپ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، وہ صرف آپ کا حسن ظن ہے، باقی ہیچ ہے، ممکن ہے کہ آپ کی طلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ مجھکو واسطہ محض بنا کر آپ کو میش از میش عطا فرمائیں"

فقیر نے بہت سے آستانوں میں حاضری دی، لیکن جیسی تواضع و خاکساری اور اپنے ہیچ ہونے

عملی مظاہرہ آستانۂ سلیمانی میں دیکھا۔ کہیں نظر نہ آیا۔

آفاقہا گر دیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

بارگاہ سلیمانی میں جو قدر و منزلت مساکین و فقراء کی تھی۔ وہ امراء و اغنیاء کی نہ تھی، فرماتے تھے "امراء اور وزراء سے مل کر قلب پہ جو سیاہی آتی ہے، اس کے دھونے کے لیے تالاب چاہئیں"۔ ایک صاحب کو تحریر فرمایا "گوشہ گیری اغنیاء وکبراء سے مناسب ہے، فقراء اور طالبینِ حق سے نہیں"۔

ایک غریب طالب جن کے سوالات اور باتوں سے ہم لوگ بھی تنگ آجاتے تھے، حضرت اقدس دو دو گھنٹے تک پورے انشراح سے ان کی باتوں کو سنتے۔ اور خندہ پیشانی سے انکے جوابات دیتے اور ان کی تسلی کرتے۔

لاہور کے سفر میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت ناساز تھی۔ خادم (راقم) ساتھ تھا۔ ایک صاحب نے دو صفحہ کا ایک لمبا خط جس میں دینی پریشانیاں لکھی تھیں، حضرت کو دینا چاہا، میں نے اس خیال سے کہ حضرت کی طبیعت نڈھال ہے اور ان کا منشاء صرف دعا ہے، واپس کرنا چاہا، حضرت نے دیکھا تو باوجود ضعف کے تشریف لے آئے، پورا خط پڑھا، اور ایک دعائے ماثورہ پڑھنے کے لیے لکھ دی۔

حضرت سیدی قدس سرہٗ دار منزل کے کرہ میں عموماً صوفے پر بیٹھتے تھے، باقی حضرات بھی اسی طرح صوفوں یا کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے، حضرت کے خدام میں سے ایک صاحب صوفی ادریس صاحب ہمیشہ زمین پر بیٹھتے، ایک مرتبہ میں صوفے پر اور صوفی ادریس صاحب زمین پر بیٹھے تھے کہ ایک صاحب آئے اور صوفی صاحب کو دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئے، اس لیے میں بھی صوفہ چھوڑ کر نیچے بیٹھ گیا، حضرت والا بھی ہم دونوں کو دیکھ کر نیچے بیٹھ گئے، اور مزاحاً فرمایا "آپ مجھے گروہ بنانا چاہتے ہیں"۔

حضرت والا سے تقریر کا تعلق گو ۱۹۴۳ء سے تھا، خط کے ذریعے بیعت بھی ہو چکی تھی لیکن ملاقات کی سعادت دلی کراچی تشریف آوری کے بعد ۱۹۵۰ء میں حاصل ہوئی، سینہ سے لگایا، اور فرمایا "آپ نے

خواب دیکھا تھا ہم آ ہی گئے" پھر ارشاد فرمایا "بہتر ہے کہ پہلے ملاقات نہ ہوئی، ورنہ میرے عیوب آپ پر ظاہر ہو جاتے، ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے میرے عیوب آپ سے اتنے عرصہ پوشیدہ رہے" پھر جامی کا شعر پڑھا،

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

بن دیکھے کی محبت اچھی ہوتی ہے، عیوب کا پتہ نہیں چلتا۔"

وحدت الوجود و وحدت شہود | فنا و عبدیت جس طرح توحید کامل کا ثمرہ ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی کامل معرفت حاصل ہوتی ہے تو سالک پر ایسا حال طاری ہو جاتا ہے کہ غیر نظروں سے بالکل محجوب ہو جاتا ہے، اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ اور ہر چیز کا کرشمہ اسی کی ذات نظر آتی ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے، اصطلاح میں اس حال کو "وحدت الوجود" اور "وحدت شہود" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی نو افلاطونی یا غیر اسلامی تعبیریں جو بھی ہوں، مگر اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ غلبۂ حال میں سالک کی نگاہوں سے غیر اللہ بالکل اوجھل ہو جاتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غیر معدوم ہو جاتا ہے۔

حضرت سید ی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ "وحدۃ الوجود کو تم قال سے سمجھنا چاہتے ہو، مگر یہ تو حال ہے، جو اکثر سالکین پر طاری ہوتا ہے، اس حال میں غیر معدوم نہیں، بلکہ محجوب ہو جاتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے کمال کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے، جیسے قطرہ جب اپنی ہستی کو دیکھتا ہے تو انا الماء کہنے لگتا ہے، مگر جب سمندر کو دیکھتا ہے تو سمندر کی عظمت کے سامنے اپنا نام لینے سے بھی شرماتا ہے، اور اپنی ہستی کے ہونے کے گمان تک کو گم کر دیتا ہے" اس تشریح کے بعد سعدی کا یہ شعر پڑھا:

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم گر او ہست حقا کہ من نیستم

غرض حضرت والا کے نزدیک وحدۃ الوجود کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سالکین کو کبھی ایسا حال پیش آتا ہے کہ اس کی نگاہ سے غیر اللہ محجوب ہو جاتا ہے، خود ان کا شعر ہے:

اب مسئلۂ وحدت وکثرت کو میں سمجھ
پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں

اس شعر کے متعلق راقم کے استفسار پر فرمایا "محبت کی وجہ سے عاشق کو محبوب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور ہر چیز میں وہی دکھائی دیتا ہے، یہاں بھی یہی چیز مراد ہے، ہر چیز کو اللہ سمجھنا یہ تو وحدۃ الوجود نہیں، بلکہ وحدت کو کثرت قرار دے لینا ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی کو غلبۂ حال کی وجہ سے نہ دیکھے۔ وحدۃ الوجود تو یہ ہے"۔

وحدۃ الوجود کی تشریح میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مسعود عالم کو بعض تحریریں لکھی ہیں جن سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے، اسلیے اس کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"وحدۃ الوجود کی بحثیں تمامتر فلاسفہ وحکماء کی الٰہیات میں موشگافیاں ہیں، یا یوں کہیے کہ فلاسفہ کے الٰہیات کے مقابلہ کا علم کلام ہے، شیخ اکبرؒ، صدر قونویؒ، رومیؒ، عراقیؒ، جامیؒ، امام ربانیؒ یعنی مجدد الف ثانی، افضل المحققین (یعنی شاہ ولی اللہ صاحب حسب اصطلاح صاحب طبقات) ان سب کے الگ الگ آراء ہیں یا مختلف تعبیرات ہیں، صاحب طبقات نے ان سب پر تبصرہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان سب میں صرف اصطلاح اور تعبیر کا فرق ہے، حقیقت کا نہیں اور وہی عین شریعت ثابت بالکتاب والسنت بھی ہے، چنانچہ طبقہ ۱۰ اور طبقہ ۲۰ میں اسکی تفصیل مذکور ہے۔

صراط مستقیم میں امام شہید رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الوجود کو محض شدت عشق کا نتیجہ بتایا ہے، یعنی شدت عشق و استغراق سے عاشق کو ایسا نظر آتا ہے، جو واقعہ نہیں، اس عشق کا نتیجہ ہوتا ہے فنا، یعنی غیبت و عدم شعور ماسوائے محبوب حتیٰ کہ بنفس خود (صفحہ) اس کی تفصیل ص۱۲ میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو کہا انا النار پکار اٹھے لیکن وسط کتاب میں بعبارت صوفیہ کے

مفید

"واز جملۂ بدعات ملاحدہ وجودیہ کہ درخواص وعوام اشتہار یافتہ وباقوال اکابر طریقت مشتبہ گردیدہ گفتگو ہائے توحید وجودی الحادی است کہ بگمان اتحاد خود با خدا ازاں لذتیات نفسانی میدارند وبتسویل شیطانی ومکر نفوس خبیثہ بیاں آں گفتگو را معارف وحقائق می پندارند الخ ص ۵۴" (مکاتیب سید سلیمان ندوی ص ۱۲۰-۱۲۹)

دوسرے مکتوب گرامی میں ان ہی کو تحریر فرماتے ہیں:

"وحدۃ الوجود کے باب میں آپ نے کئی دفعہ پوچھا، وحدۃ الوجود کی کئی تشریحات ہیں، اوران کے اختلاف معنی کی بنا پر حکم بدل جاتا ہے، ان ہی میں سے ایک وہ ہے جس کو جاہل صوفیہ مانتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ خالق ومخلوق میں فرق اعتباری رہ جائے، اور ہر مخلوق کو دعوائے خالقی ہو جائے، سو یہ تمام تر کفر ہے، اور اس کا ماخذ تو افلاطینیت معلوم ہوتی ہے، اور ہندوؤں کا فلسفہ بھی اسی قبیل کا ہے، ہندوستان میں یہ مسئلہ مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی روایت کے مطابق[1] آٹھویں صدی میں آیا، ورنہ حضرات چشت کے کلام میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین سنجری سے لیکر حضرت سلطان الاولیا نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ تک ملفوظات میں اس کا ذکر یاد نہیں آتا، مجدد الف ثانی، مولانا شاہ ولی اللہ صاحب، مولانا اسمٰعیل شہید وغیرہ وحدۃ الوجود یا وحدۃ شہود کی جو تشریح کرتے ہیں، اس کا مقصد مسئلۂ قیومیت کی تفصیل ہے۔ انت قیوم السمٰوات والارض ومن فیھن حدیث صحیح میں وارد ہے، اور اس کی تشریح بمذاق وحدۃ الوجود یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنے وجود وبقا میں ہر آن اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں جس طرح وہ اپنے خلق میں محتاج تھیں۔ انتم الفقراء سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری حقیقت فقر محض ہے۔ اور اللہ ھو الغنی

---

[1] نقیر کے سامنے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا، "وحدۃ الوجود کو پہلے پہل سہروردی حضرات ہندوستان لائے، حضرت زکریا ملتانی وغیرہ" واللہ اعلم (اشرف)

سے ظاہر ہے کہ وہی غنی ہے، فقر کے دوسرے معنی عدم کے ہیں، ہماری حقیقت عدم ہے جس میں وجود یا کسی صفت کی نیرنگی اسی ذات غنی کی صفات کے ظلال ہیں، ظل کی حقیقت عدم ہی ہے، عدم نور کا نام ظل ہے، تاہم کسی ظل کا وجود اصل کے بغیر نہیں ہوتا، اس لیے ظل کا وجود اپنی ذات میں ہم معنی عدم ہے، لیکن اصل کے پر تو سے وجود کا ایک وہمی نقش پالیتا ہے، یہ ان حضرات کا وحدۃ الوجود ہے، گو ہمارے نزدیک حضرت مجدد صاحب کا یہ مسلک اخیر مسلک نہیں، اخیر مسلک وہی وحدۃ تنزیہیہ ہے جس پر شرع وارد ہے، کما فی المکتوبات۔ ہمارے حضرات کے یہاں وحدۃ الوجود کا تصور ایک حالی کیفیت ہے، جن کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی محبت وعظمت وجلالت اتنی چھا جائے کہ ساری مخلوقات اس کی نگاہوں سے چھپ جائیں، جیسے آفتاب کے طلوع سے سارے ستارے چھپ جاتے ہیں، مگر معدوم نہیں ہوتے، جیسے مجنوں کا یہ قول

تمثل لی لیلی بکل سبیل

جس وحدۃ الوجود کو ہم نے فلاسفۂ افلاطونی کا خیال کہا ہے، یا ہندوؤں سے ماخوذ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ ذات الٰہی ہی پھیل کر عالم بن گئی ہے، جیسے انڈا ہی پھٹ کر چوزہ بن جاتا ہے۔ جو ایک رباعی میں خیام کی طرف منسوب ہے۔

حق جان جہان است وجہاں جملہ بدن | ارواح و ملائکہ حواس این تن
افلاک و عناصر و موالید اعضا | توحید ہمین است دگر ہا ہمہ فن

ان طویل اقتباسات سے اس مسئلہ کی حقیقت اور حضرت والا کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے،

صفات الٰہی کا استحضار اسی طرح جب سالک کو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، حکمت، خلق، ملکیت، رزاقی اور قدرت وغیرہ صفات کا یقین پختہ ہوتا ہے تو اس میں تشریعی وتکوینی امور اور اوامر الٰہیہ کی

پابندی، توکل و تفویض، صبر و شکر اور عبدیت تامہ کی صفات خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، ایک طالب نے حضرت والا کو اپنا حال لکھا کہ "بندہ کی عجیب حالت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارادے ختم کرائے جا رہے ہیں، بے قصد و ارادہ جو چاہتے ہیں کرا دیتے ہیں، اپنے اختیار میں کچھ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اگر ارادہ کرتا ہوں تو عموماً اس کے فسخ کی اضطراری صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جو چاہتے ہیں کرا دیتے ہیں، ہیچ میرز محض یونہی بے اختیار مختار کل کے ہاتھوں میں ہے"، حضرت شیخ نے اس کا جواب یوں ارقام فرمایا کہ

"جی ہاں، تسلیم و رضا کا یہی مقام ہے، خدا کرے کہ یہ حال آپ کا مقام بن جائے

کار ساز ما بساز کار ما   فکر ما در کار ما آزار ما"

مقصد یہ ہے کہ جس قدر صفات الٰہی کی معرفت کے دروازے کھلتے ہیں، انسان توحید کامل اور عبدیت تامہ کی حقیقت سے سرفراز ہوتا جاتا ہے کہ صفات الٰہی میں سے ہر صفت عارف کے لیے قوت و طاقت کا ایک بڑا خزینہ ہے جس سے ہر آن اس کی تربیت ہوتی ہے، اور اس کے ایمان و یقین کی قوت بڑھتی رہتی ہے، اور عارف کی تربیت صفات باری تعالیٰ اور ذات الٰہی کی خاص بارگاہ سے کیجاتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے یجتبی الیہ من یشاء اور یختص برحمتہ من یشاءَ صفاتِ الٰہی کا انعکاس جب بندۂ مومن کے قلب پر ہوتا ہے تو اس پر معرفت الٰہی اپنی ہیچ میرزی اور فقر و احتیاج کی حقیقت کھل جاتی ہے، اور اسے عبدیت کاملہ اور فقر تامہ سے سرفراز کر دیتی ہے،

اللہ تعالیٰ کی صفات کا یقین و مشاہدہ جس طرح بندۂ مومن کی زندگی کو متاثر کرتا ہے، اس کا اندازہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوب سے ہو سکتا ہے، جس میں صفت بصیر کے مراقبہ کے اثر کی تشریح فرمائی گئی ہے، یہ خط گو طویل ہے لیکن اس سلسلہ میں اس کو نقل کرنا مفید ہوگا۔

مسلمانوں کے عقیدہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، کوئی دیکھے یا نہ دیکھے اللہ تعالیٰ

ہر حال میں دیکھتے ہیں۔ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار یعنی دنیا میں کوئی شخص خدا کو نہیں دیکھ سکتا لیکن اللہ تعالیٰ سب آنکھوں کو دیکھ رہے ہیں، ارشاد ہے الم یعلم بان اللہ یری ان آیتوں اور بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو دیکھ رہے ہیں، کوئی شخص کتنی ہی رات کے اندھیرے میں ہو، کوئی اسے نہ دیکھ رہا ہو مگر اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے چھپ جانا ممکن نہیں، جس مسلمان سے پوچھو یہی عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر آن اور ہر جگہ ہے، لیکن بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ حال بن کر ہم پر طاری نہیں ہوا، اگر یہ حال ہو جائے تو کوئی گنہگار گناہ نہیں کر سکتا، جیسے پولیس کی موجودگی کے وقت جرم کی ہمت نہیں ہوتی، اگر یہ عقیدہ ہمارا حال بن جائے تو ہم سے کوئی برائی سرزد نہ ہو، اگر ہم یہ سمجھیں کہ لوگوں سے بچکر چھپ کر گناہ کریں اور ان کے دیکھنے اور شہادت سے بچ جائیں اور اس طرح سزا سے اپنی مامون ہو جائیں تو یہ غلط ہے، ہم لوگوں سے تو چھپ اور بچ سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں بچ سکتے کہ وہ ہر آن و ہر جگہ موجود اور ہمیں دیکھ رہا ہے، انسان اگر اس چیز کو اپنے اندر پیدا کر لے تو تمام برائیوں کا سد باب ہو جائے پس معلوم ہوا کہ ہر قسم کی برائیوں سے بچنا ہو تو اس عقیدہ کو دل کے اندر جما لیا جائے۔

نیت کے بغیر نہ نماز نماز ہے، نہ روزہ روزہ، نیت کے استحضار سے عبادت عبادت بنتی ہے، پس انسان ہر عمل کی نیت کرتے وقت یوں سمجھ لے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، اور کڑی نگرانی فرما رہے ہیں، اسی طرح اگر اندھیری رات میں چٹان کے نیچے چیونٹی چل رہی ہے تو اسے بھی جانتے ہیں۔ اگر یہ حال پختہ ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ گناہ کا صدور نہ ہو سکے گا۔

انسان کے شہوات یا جذبات جب ایمان پر غالب آ جاتے ہیں تو جرم ہوتا ہے اسلئے ضرورت ہو کہ اس عقیدہ کو اس قدر مستحضر کر لیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا دھیان اس طرح غالب ہو جائے کہ شہوات و جذبات کی بنا پر گناہ سرزد ہونے نہ پائے، تمام مسلمان نماز کی نیت کرتے ہوئے اس کے بغیر

کو مستحضر کرلیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں، اور وہ ہمارے قلب کو دیکھ رہے ہیں، یہ استحضار اسی طرح نمازوں میں بڑھتا جائے گا، اور ایک دن اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا ہو جائے گا تو پھر نہیں جائے گا، اور اس حاضر و ناظر ہونے کے یقین کی بنا پر انسان برائی نہیں کر سکے گا، اسی لیے قرآن نے کہا ہے ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ نماز اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے دھیان کو حاصل کرنے کا بڑا وسیلہ ہے،

جو لوگ اس سے زیادہ کی ہمت رکھتے ہوں، بزرگوں نے ان کے لیے اور کئی طریقے بتائے ہیں، جن میں ذکر اور مراقبہ بھی ہے، کچھ دیر آنکھیں بند کرلے اور سوچے اور تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ میرے دل کو دیکھ رہے ہیں تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کی ساری زندگی پر اس کا اثر پڑے گا، مراقبہ کا مطلب نگرانی ہے۔ اِنّ اللّٰہ کان علیکم رقیبا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کو جب نگران سمجھکر دھیان کیا جائے گا تو ہر وقت اللہ تعالےٰ سامنے رہیں گے۔ اور یہ تصور اس قدر غالب آجائے گا کہ برائی کا صدور جاتا رہے گا، ایسے تو ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، عیاں اور پوشیدہ اس سے چھپ نہیں سکتے، قرآن میں ہے، دو سرگوشی کرنے والوں میں تیسرا وہ ہوتا ہے۔ وھو معکم اینما کنتم، جب اللہ تبارک و تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں تو اس عقیدہ کا حال اپنے اوپر کیوں نہ طاری کرلیا جائے، اگر اس عقیدہ کو پختہ کرلیا جائے تو انسان گناہوں سے بری ہو جائے گا، عقیدہ کو عقیدہ کی حد تک نہ رکھیں، بلکہ اپنے پر اسے طاری کرلیں، نماز بے التفاتی سے نہ پڑھیے، بلکہ یہ تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، رکوع و سجود و تلاوت کے وقت یہی دھیان ہو،

الحمد للہ رب العالمین کے وقت یہ تصور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں، انکی تعریف کر رہے ہیں۔ گناہوں کا ارتکاب اس لیے ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ مستحضر نہیں رہتا، صحابہ کے حال میں لکھا ہے کہ انھیں اکیلے میں بھی برہنہ نہاتے ہوئے حیا آتی تھی، جبکہ انسان برہنہ ہو سکتا ہے۔ مگر اللہ تبارک

کا دھیان کر کے ان کو اس سے شرم آتی تھی، صحابہ کا یہ حال اسی بنا پر تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا دھیان اسقدر غالب و مستولی ہو گیا تھا کہ تنہائیوں میں بھی اپنے لیے برہنگی پسند نہیں کرتے تھے،

اللہ تبارک و تعالیٰ ہر شخص کے گناہوں کو جانتے ہیں لیکن اس پر فرشتوں کی شہادت قیامت میں پیش کریں گے، جن اعضاء کے لیے ہم گناہ کرتے ہیں، وہی ہم پر گواہی دیں گے اور یوں کہیں گے: "انطقنا اللہ الذی انطق کل شیئ" پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ شراب خانہ کی طرف گیا تھا۔ بری نگاہ کی آنکھ گواہی دے گی، آج ہم آنکھ کی لذت کے لیے گناہ کر رہے ہیں مگر کل وہی آنکھ ہمارے خلاف گواہی دے گی، ہاتھ سے پرایا مال چرایا، ہاتھ اس کی گواہی دیگا، غرض جسم کا ایک ایک عضو جسکی خواہش اور لذت کے لیے ہم گناہ کر رہے ہیں، ہمارے خلاف شہادت دے گا، اللہ تعالیٰ تو دیکھ ہی رہے ہیں لیکن یہ ہاتھ پاؤں بھی تو ہمیں نہیں چھوڑتے، ان کو تو چھوڑ کر ہم عمل بھی نہیں کر سکتے، ہمارا ظاہر و باطن تمام اللہ تعالیٰ کی خفیہ پولیس ہے، اور کل وہ ہمارے مخالف گواہ ہوں گے، سو افسوس ہے اس احمق پر جو ان کو خوش کرنے کے لیے گناہ کرے اور وہ اس کے خلاف پھر گواہی دیں۔ اس لئے گناہوں سے بچنا چاہیے، اور اس عقیدہ کو حال بنا چاہیے تاکہ گناہ سرزد نہ ہو سکیں۔"

اس تشریح سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی صرف ایک صفت بصیر کا عملی دھیان و مراقبہ اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور حال بنجائے تو تنہا یہ حال انسانی زندگی کو برائیوں سے روکنے کی کتنی عظیم تاثیر رکھتا ہے، یہی حال دوسری صفات الٰہیہ کا ہے۔ صفت بصیر کے متعلق چند اور فوائد لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے مراقبے کی بہت تاکید فرماتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا "ہر وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کو حاضر و ناظر جانیں"۔

ایک طالب کو ایک والا نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

آپ کو ان اوقات میں سے جو آپ کی تعلیم سے فارغ ہوں، تھوڑا وقت مقرر کر کے ہر روز

خواہ پندرہ ہی منٹ ہوں، آنکھیں بند کرکے اپنے آپ کو خدا کے سامنے حاضر سمجھ کر گویا ہم دیکھ رہے ہیں، تصور کیجئے کہ ہم خدا کے سامنے ہیں۔"

دوسرے گرامی نامہ میں اسی کی مزید تشریح فرماتے ہیں:

"اس مراقبہ سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا جو ایمان ہے وہ عملاً نمایاں ہو، اب آپ آگے بڑھیں، اب یہ کوشش کیجئے کہ نمازوں میں یہ خیال قائم ہو، کہ آپ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہیں، اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ نیت کرتے وقت دل میں یہ توجہ کیجئے کہ بندہ اب بارگاہ الٰہی میں حاضر ہے۔"

اسی طالب نے ایک مرتبہ لکھا کہ اللہ تعالیٰ کی قربت، تو اس مراقبہ کی وجہ سے سانس سے بھی زیادہ نزدیک معلوم ہوتی ہے لیکن بعض کوتاہیاں ہو جاتی ہیں، تو تحریر فرمایا:

"جب انسان اللہ تعالیٰ کو ایسا حاضر و ناظر یقین کرتا ہے تو اس سے ضروری اعمال صالحہ کی بجا آوری میں سستی کیونکر ہو سکتی ہے، وہ جب یقین کرے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور ہم سے قریب ہیں تو اس کو شرمندہ ہونا چاہیے کہ اس حالت اور اس عنایت کے باوجود اعمال صالحہ میں کوتاہی کیوں ہو، اگر پھر بھی حالت نہ بدلے تو موت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ ایک دن خدا کے سامنے حاضر ہونا اور ایک ایک بات کا جواب دینا ہے۔ اس وقت بندہ اپنی کوتاہی کا کیا جواب دے گا اور پھر دنیا کی دولت و ثروت جس کی محبت میں انسان گرفتار ہے کیا کام آئے گی۔ اس وقت صرف اعمال صالحہ کام دیں گے، اس سے خدا کا خوف پیدا ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ۔"

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم کو تحریر فرماتے ہیں:

"کسی وقت کو مقرر کرکے الم یعلم بان اللہ یریٰ کے مضمون کو سوچا کیجئے۔ یہی تفکر کا اصطلاحی نام مراقبہ ہے، اس تصور کا اثر اعمال پر پڑے گا، اور ہر عمل پر اس حیثیت سے زد پڑنے لگے گی کہ

سب کچھ اس کے سامنے ہے، اب حق و باطل، صحیح و غلط اور جائز و ناجائز پر غور کرنے کا رخ بدل جائیگا، اور ہر عمل کے وقت دل کو ٹٹولنے لگیں گے کہ میرے اس عمل کا قلبی مقصد کیا ہے، اس سے حسن نیت پیدا ہوگا، اور حدیث شریف کی یہ حکمت کھل جائے گی الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ۔ کیا یہ بدعت ہے؟ غور کیجئے، اور ہو سکے تو عمل کیجئے۔"

ایک طالب نے پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے اور ان کی ذات عالی پر یقین اور حسن ظن کی کیفیت میں کس طرح روز افزوں قوت بڑھے گی" حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جواب میں ارقام فرمایا: "اس طرح کہ آپ ہر روز کسی خاص سکون کے وقت میں تھوڑی دیر اس کا مراقبہ کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں اور ہر وقت ہم کو دیکھ رہے ہیں"۔

کیفیت احسان وحضور: اللہ تبارک و تعالیٰ کے حاضر و ناظر جاننے کے دائمی دھیان کا نتیجہ احسان و حضور کی وہ کیفیت بھی ہے جو خاصان الٰہی کا سرمایۂ تسکین ہے۔

قرب بے غیبت نماز عاشقاں — فی صلوٰۃ دائمونم آرزوست
خوش نمی آید سجود بے حضور — فی صلوٰۃ خاشعونم آرزوست
می برد بے تابی دل کو بکو — بر درت صبر و سکونم آرزوست
بسکہ دزدیدہ نگہ بر من فگن — نشتر زخم درونم آرزوست

حضرت شیخؒ ہی کا ایک اور شعر ہے

حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی — آ دل میں مرے چھپ جائے صورت جانانہ

جب اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا مراقبہ پختہ ہو جاتا ہے اور ذات باری تعالیٰ کا دھیان [illegible] حاصل کر لیتا ہے تو خود بخود حضور و احسان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور تحسین عمل کے

جذبہ سے اعمال میں حسن و خوبی اور صدق و کمال پیدا ہو جاتے ہیں۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

مرتبہ احسان | "مرتبہ احسان یہ ہے کہ اعمال اس طرح ادا ہوں جیسے مزدور مالک کے حضور میں کام کرتے ہیں" یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین اس طرح چھا جائے کہ گویا وہ بالکل سامنے ہیں اور ہمارے کام کو غور سے دیکھ رہے ہیں، کہ ہم اس کی بجا آوری میں کوتاہی تو نہیں کرتے۔ اس اذعان کا اثر یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے دھیان کی دولت نصیب ہوگی، دوسرے اعمال کو سنوار کر ادا کرنے کی کوشش کیجائے گی کہ مالک کے سامنے مزدور کام کو نہیں بگاڑا کرتا۔ اس لیے کیفیت احسان ایک نعمت ہے، حضرت شیخؒ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ کیفیتِ احسان گاہے گاہے بھی میسر آئے تو نعمت ہے، اس پر شکر کیجئے، اور ترقی کی دعا مانگا کیجئے۔"

اسی طرح حضور کی کیفیت کا دوام بھی کم خوش قسمتوں کو نصیب ہوتا ہے، حضرت والاؒ نے ایک صاحب کو لکھا "جسقدر بھی حضور نصیب ہو وہ شکر کے قابل ہے، دوام حضور کم کسی کو نصیب ہوتا ہے۔"

لیکن اس کمی سے سالک کو ہمت پست نہ کرنا چاہیے اور استقامت سے اپنے کام میں لگا رہنا چاہیے، جو کچھ عطا ہو اس پر شکر ادا کرنا چاہیے لیکن بعض بندگان خاص ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں قرب و حضور کی دائمی دولت نصیب ہوتی ہے، حضرت شیخؒ قدس سرہٗ ایک گرامی نامے میں کسی طالب کو ارقام فرماتے ہیں:

"دائم حضوری بھی انشاء اللہ تعالیٰ کبھی حاصل ہوگی لیکن اس وقت بھی جو کچھ حاصل ہو جاتی ہے شکر ہی کے قابل ہے، شکر سے نعمت کی زیادتی ہوتی ہے۔"

یہی احسان و حضور کی کیفیت راسخ ہو کر عارف کو قرب و معیتِ الٰہی کے دھیان سے

ہر عبادت نذر بتخانہ ہوئی دل میں گر میحاؔبت خود کام ہے

علم و دولت جاہ و عزت ہیچ ہیں گر مجھے حاصل ترا انعام ہے

جب مرا مطلوب ہے تیری رضا تب مجھے اوروں سے اب کیا کام ہے

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ریا دکھلاوے کے عمل کا نام ہے، ہمارے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ دکھلانے کے لیے عمل ریا بھی ہے اور شرک بھی، مگر کسی کے دیکھنے سے بچنے کے لیے نیک عمل کو ترک کرنا بھی ریا ہے کہ مخلوق کا خوف ترک عمل کا سبب بنا، اس لیے "غیر اللہ کے خاطر کسی نیک عمل کا ترک بھی ریا ہے، (میں نے شیخؒ کا مفہوم و منشا لکھا ہے) اور ریا کا یہ مادہ اس وقت تک نہیں جا سکتا جب تک ما سوائے تعلق اور اس کی محبت دل سے نہ نکل جائے۔ جب غیر کا دھیان جاتا رہے گا تو ریا و سمعہ کا جذبہ خود بخود ماند پڑ جائے گا، جب تک دوئی باقی ہے، دوسرے کا دھیان آہی جاتا ہے، کامل خلوص کامل فنا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ حضرت شیخؒ فرماتے ہیں:

سما جا مرے دل میں ارمان ہوکر دوئی دور کر دے مری جان ہوکر

بتوں کا ہے بندہ خدا کا نہیں خدا کا نہ ہو جو مسلمان ہوکر

(باقی)

حکیم الامت

حکیم الامت، شیخ وقت علامہ اشرف علی تھانویؒ کے آخری ۱۵ سالہ حصۂ زندگی کا ایک نرالا مرقع فقہ و تفسیر، حدیث و سنت، سلوک و کلام، ادب و حکمت، صحافت و سیاست کے صدہا مضامین کا گلدستہ"

قیمت سے

(از مولانا عبد الماجد دریابادی مدیر صدق جدید مؤلف محمد علی)

مینجر

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں سواروں کا نظام

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے

(۴)

اورنگ زیب اور راجپوت سوار

شاہجہانی دربار میں راجپوتوں اور ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہجہاں کا بڑا لڑکا دارا شکوہ ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور مراسم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا، اس کی تفصیل یہاں ہمارے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے، دارا اپنے مذہبی عقائد و رجحانات کی بنا پر ہندوؤں خصوصاً راجپوتوں میں بہت مقبول ہوگیا، اور جب تخت و تاج کے لئے شاہجہاں کے لڑکوں میں جنگ شروع ہوئی تو تمام اہم اور ممتاز راجپوت فوجی سردار دارا کی حمایت میں امنڈ پڑے، دھرمادت میں راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کو آگرہ کی طرف بڑھنے سے روکا، راجہ کے ساتھ بیشمار راجپوت سردار تھے، اورنگ زیب نے راجہ کو رقعہ بھی لکھا کہ بھائیوں کا خانگی معاملہ ہے، وہ بیچ میں نہ پڑے اور جنگ سے علٰحدہ ہو کر خود بہ آرام کرے، لیکن جسونت سنگھ کو اپنے خواب رنگیں کو حقیقت بنانا تھا، اس لئے وہ دارا اور دھرمادت کے میدان میں لڑائی شروع کردی، اس نے اپنے ہراول میں دس ہزار سوار رکھے

جس میں زیادہ تر راجپوت تھے، ان کی نگرانی کرن سنگھ ہاڈا، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، امر سنگھ چند راوت، رتن راٹھور، ارجن گور، دیال داس جہال، موہن سنگھ ہاڈا، اور دوسرے نامی سرداروں کے ذمہ تھی، التمش میں ایشر داس گور، گوردھن راٹھور اور دوسرے جانباز راجپوت تھے، قول میں خود راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راجپوت سواروں اور بھیم داس ولد راجہ بیٹھل داس گور اور دوسرے سرداروں کے ساتھ تھا، میمنہ قول پر راجہ جے سنگھ سیسودیہ اپنے بہادر راجپوت سواروں کے ہمراہ تھا،

لشکر کا کیمپ مالوجی، پرسوجی اور راجہ دیبی سنگھ کی نگرانی میں تھا،[1] کچھ مسلمان فوجی سردار بھی ضرور تھے لیکن وہ انگشت بدنداں تھے کہ یہ دارا اور اورنگ زیب کی جنگ نہ تھی، بلکہ راجپوتوں اور اورنگزیب کے اقتدار کی لڑائی تھی، جنگ شروع ہوئی لیکن اورنگ زیب کی سپاہیانہ ہوشمندی اور جنگی بصیرت کے سامنے راجہ جسونت سنگھ طفل مکتب ثابت ہوا، راجہ جسونت کے ہراول کے راجپوت سوار اورنگزیب کے لشکر پر یلغار کرنے کا تہیہ کر ہی رہے تھے کہ اورنگ زیب کے برق اندازوں اور تیراندازوں نے گولیوں اور تیروں کی اتنی بارش کی کہ راجپوت سوار بے لڑے گھوڑوں کی پیٹھ پر سے گرنے لگے، راجپوتوں نے یہ صورت دیکھی تو ان کے بہادر سرداروں میں مکند سنگھ ہاڈا، رتن راٹھور، دیال داس جہالا، ارجن گور، سجان سنگھ سیسودیہ وغیرہ "رام" "رام" کے نعرے لگاتے ہوئے اورنگ زیب کے توپخانے کی طرف بڑھے، اورنگ زیب کو راجپوت سواروں کی اس قومی خصوصیت کا احساس پوری طرح تھا کہ وہ مرنا جانتے ہیں، لیکن لڑنا نہیں جانتے، اس لیے ان سواروں کو اپنی توپوں کی طرف بڑھنے کا موقع دیدیا، اورنگ زیب کے توپچیوں نے ان کی یورش کو پہلے مضبوطی سے نہیں روکا، اور راجپوت سواروں کا دل بادل اور بھی آگے بڑھتا چلا آیا، اور جب ان میں کوئی ترتیب و تنظیم نہیں رہ گئی اس وقت توپچیوں نے ان پر ضربیں لگانی شروع کیں اور وہ کٹ کٹ کر گرنے لگے لیکن

---

[1] عالمگیرنامہ ص ۶۶ - ۶۱

بہادری کے جوش میں اورنگ زیب کے ہراول تک پہنچ گئے۔ اورنگ زیب کے سارے لشکری پوری تنظیم اور ترتیب کے ساتھ تھے، راجپوت سوار جب بہت آگے بڑھ گئے تو اورنگ زیب نے اپنے لشکر کا ایک دستہ بھیجکر ان کو ان کی فوجوں کے بقیہ حصے سے بالکل منقطع کر دیا، راجہ جسونت نے ان کی مدد کو کمک بھیجنا چاہا، لیکن راستہ مسدود تھا، اورنگ زیب نے قول سے بڑھکر اپنی فوج کی ایک اور دیوار حائل کر دی، پھر قول کے میمنہ اور میسرہ کی فوج نے بھی پیش قدمی کرکے راجپوت سواروں کو گھیر لیا جو اب موت کے منہ میں جا پڑے تھے، اور ان کے لیے ہلاکت کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا، ان کے خون سے ساری سرزمین لالہ زار ہوگئی، مکند سنگھ ہاڈا اور اس کے ہمراہی سردار ایک ایک کرکے ہلاک ہوگئے، اور جسونت سنگھ ان کی مدد کو کوئی کمک نہ بھیج سکا، راجپوتوں کو اس طرح لقمۂ اجل بنتا دیکھ کر دوسرے راجپوت سردار مثلاً رائے سنگھ سیسودیہ، سجان سنگھ بندیلہ اور امر سنگھ چندراوت وغیرہ پر سراسیمگی طاری ہوئی، اور انھوں نے میدان جنگ چھوڑ کر اپنے اپنے وطن کا رخ کیا، مگر قول میں راجہ جسونت سنگھ دو ہزار راٹھور راجپوتوں کے ساتھ برابر لڑ رہا تھا لیکن مراد بخش نے اپنی سپہگری سے پہلے تو دیبی سنگھ بندیلہ کو پسپا کر دیا، پھر راجہ جسونت سنگھ کے قول کے بائیں بازو پر حملہ کرکے اس کے سواروں کو منتشر کر دیا، اس اثناء میں اورنگ زیب نے سامنے سے، مراد نے بائیں طرف سے اور صف شکن نے دائیں جانب سے بڑھکر راجہ جسونت سنگھ کے راٹھور سواروں کو اپنے حلقہ میں لے لیا لیکن اس کے ہمراہی سرداروں میں اسکرن، مہیش داس گور اور گوردھن نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس کو میدان جنگ سے باہر کر دیا، اور اس نے بہادر راجپوتوں کی لاشوں کا ایک انبار چھوڑ کر اپنے وطن جودھپور کی راہ لی،[1]

---

[1] عالمگیرنامہ ص ۷۵ ۔ ۶۶ منتخب اللباب ج ۲ ص ۱۸ - ۱۷ - ۱۶

راجپوتوں کے تمام جانباز اور بہادر سردار دارا کی محبت میں ہلاک ہوئے، اس کی تخت نشینی میں راجپوتوں نے خواب کا ایک قلعہ تیار کر لیا تھا لیکن دھرماوت کے میدان میں یہ خواب خواب ہی رہا، جس سے تمام راجپوتوں کو انتہائی اذیت پہنچی، راجہ جسونت سنگھ جب اپنے وطن پہنچا تو اس کی بیوی نے اس دکھ اور غم میں کہ وہ ایک اہم لڑائی ہار کر آیا ہے، اس کا منہ دیکھنا پسند نہ کیا۔

اس کے بعد سموگڈھ کے میدان میں دارا نے اورنگ زیب کے مقابلہ میں پھر ایک بار قسمت آزمائی کی، اور راجپوتوں نے دارا کو تخت پر بٹھا کر اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی پھر کوشش کی۔ چنانچہ ان کے جتنے آزمودہ کار اور نامور فوجی سردار تھے مثلاً چھتر سال ہاڈا، راجہ روپ سنگھ، بیرم دیو سیسودیہ، گردھر (راجہ بیٹھلداس کا بھائی) بھیم (راجہ بیٹھل داس کا لڑکا) راجہ شیو رام گور، رام سنگھ راٹھور، راجہ کشن سنگھ، پرتھی راج، جے سنگھ بھدوریہ، رام سنگھ اور کیرت سنگھ وغیرہ سب اکٹھے ہوئے، ان میں چھتر سال ہاڈا اپنی شجاعت اور نبرد آزمائی میں تمام راجپوتوں میں ضرب المثل تھا، وہ پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑ چکا تھا، اس کو اپنی اور اپنے سواروں کی جنگی کارگذاریوں پر بڑا ناز تھا، چنانچہ جنگ شروع ہوئی تو ہراول سے چھتر سال ہاڈا اپنے سواروں کو لے کر صفوں کو چیرتا ہوا شاہزادہ مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچا، ان راجپوتوں میں راجہ رام سنگھ راٹھور کو اپنی نبرد آزمائی کا بڑا پندار تھا، وہ زعفرانی رنگ کا لباس اور مروارید کا ہار پہن کر اس نشہ میں مست آیا تھا کہ وہ دارا اور اورنگ زیب کو شکست دے کر راجپوتوں کی شجاعت کا سکہ جمائے گا۔ چنانچہ غیظ و غضب میں آگے بڑھتا ہوا مراد کے ہاتھی کے پاس پہنچ گیا اور چلایا کہ "تم دارا کے مقابلہ میں بادشاہی کی ہوس رکھتا ہے" اور مراد پر برچھے کا وار کر کے مہاوت سے ہاتھی بٹھانے کو کہا لیکن مراد پر کسی قسم کا ہراس طاری نہ ہوا، اور راجہ رام سنگھ پر ایسا تیر مارا کہ وہیں ٹھنڈا

عالمگیر نامہ ص [illegible]

ہو گیا، راجپوت سواروں نے اپنے ایک نامی سردار کو اس طرح ہلاک ہوتے ہوئے دیکھ کر پورا جنگی زور صرف کر دیا، لیکن مراد ان سب پر غالب آیا، اور اس حملہ میں اتنے راجپوت کام آئے کہ ساری زمین رنگین ہو گئی، اورنگ زیب قول سے مراد کی مدد کو پہنچنا چاہتا تھا کہ تمام راجپوت اس کی طرف متوجہ ہو گئے، اور انھوں نے اورنگ زیب کو ہلاک کرنے میں جس طیش، تہور اور غیظ و غضب کا اظہار کیا، وہ ہندوستان کی تاریخ میں یادرہے گا، راجپوتوں نے پوری قوت کے ساتھ اورنگ زیب پر حملہ کیا، راجہ روپ سنگھ تو جوش غضب میں گھوڑے کی پیٹھ سے اتر پڑا اور اورنگ زیب کے ہاتھی کے پاس پہنچکر ہودج کی ڈوری کاٹ کر اورنگ زیب کو زمین پر گرانا چاہا، جوہر شناس اورنگ زیب اس کی اس جرأت اور جلادت سے بہت متاثر ہوا، اور اپنے سپاہیوں کو اسکو زندہ گرفتار کرنے کی ہدایت کی لیکن اس کی قضا آ چکی تھی، اس لیے اورنگ زیب کے ایک رکاب نے اس کو لقمۂ اجل بنا دیا، اس کے بعد راجہ ستر سال ہاڈا آگے بڑھا، لیکن اورنگ زیب کی جرأت اور پامردی کے سامنے اس کی بہادری بھی بیکار ثابت ہوئی، اور راجپوتوں کے تمام نامور سردار مثلاً ستر سال ہاڈا، بھرت سنگھ، موکم سنگھ، رام سنگھ راٹھور، بھیم سنگھ گور، شیورام گور وغیرہ ایک ایک کر کے مارے گئے،[1]

دھرمات اور سموگڈھ کی لڑائیوں میں راجپوت جس طرح اورنگ زیب کی جان کے گاہک بنکر لڑے، اس کی بنا پر راجپوتوں کے خلاف اورنگ زیب کے دل میں جتنا بھی میل بیٹھتا کم تھا، لیکن اورنگ زیب کو ہندوستان جیسے بڑے ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۳ پر ہے: "راؤ ستر سال و دیگر عمدہ ہائے راجپوتان کہ در ارتکاب این فتنہ و بیکار اعتضاد استظہار ش بآنہا بود و با اعتماد شہامت و پایداری آن جلادت کیشان جہالت منش طریق عناد و داد خواہ می پیمود .... نیز دیکھو منتخب اللباب ج ۲ ص ۲۵ - ۲۶

حکومت کرتی تھی، اس لیے اس نے راجپوتوں سے اپنا دل صاف کرنے کی عملی کوشش کی، سموگڈھ کی لڑائی کے بعد راجہ جسونت سنگھ، راجہ جے سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اس کو جو کل تک اس کا سب سے بڑا دشمن تھا، معاف کرکے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا، اور اسی زمانہ میں شہزادہ شجاع بنگال سے اپنی فوج لیکر آگرہ کی طرف کوچ کر رہا تھا، اورنگ زیب نے اپنے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کو ایک لشکر کے ساتھ شجاع کے مقابلہ کے لیے بھیجا، وہ کوڑا جہان آباد میں مقیم تھا کہ اورنگ زیب نے جسونت سنگھ کو راجپوتوں کے ایک لشکر جرار کے ساتھ اس کی مدد کے لیے روانہ کیا، اس کے بعد خود بھی پہنچا اور جب کھجوہ میں جنگ شروع ہوئی، تو اورنگ زیب کے پاس نوے ہزار سوار تھے[1]، راجہ جسونت سنگھ کو دس ہزار راجپوت سواروں کے ساتھ برانغار میں متعین کیا گیا، دوسرے راجپوت سرداروں کے نام جو اس جنگ میں مختلف بازوؤں پر تھے، یہ ہیں:

مہیش داس راٹھور، بلوے چوہان، رام سنگھ، ہررام راٹھور، کشور سنگھ ہاڈا، سبحان سنگھ، راجہ رائے سنگھ سیسودیہ، سبل سنگھ سیسودیہ، سندر داس سیسودیہ، راجہ چترمن جادون، کنور رام سنگھ ہاڈا، امر سنگھ ہاڈا، بیندر راوت، جگت سنگھ ہاڈا، سورج مل گور، فتح سنگھ کچھواہہ، راجہ اندرمن دھندیر، راجہ دیبی سنگھ بندیلہ، راجہ پرم داس سسودیہ، چتربھج، اندرمن بندیلہ، کشن سنگھ، چندراوت، بھگوت سنگھ ہاڈا، بھدریہ روپ سنگھ راٹھور، کیسری سنگھ بھورتیہ، رائے سنگھ راٹھور، رگھوناتھ سنگھ، سوبھکرن بندیلہ وغیرہ،[2]

---

[1] عالمگیر نامہ میں ان سواروں کا ذکر اس طرح ہے: "در آں روز از کثرت سپاہ و جوش لشکر آثار شور محشر ہویدا بود، و از غبار سم ستور روی فور موا کب منصور چہرۂ آسمان و روے زمین ناپید الشکری آراستہ و رنگین چون خیل سبزہ و ریاحین تو گفتی از زمین می جوشید و جیشے پر قہر و طیش مانند امواج بحر مواج از شورش کیں می خروشید زمیں با ہمہ تحمل و سخت جانی از حمل گرانی آں خیل انبوہ ستوہ بود ..... ج ۱ ص ۲۵۰ [2] عالمگیر نامہ ج ۱ ص ۲۴۸-۲۴۹

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے دل سے دھرمات اور سموگڈھ کی لڑائیوں کا اثر اور راجپوتوں سے غصہ اور عناد دل سے بالکل نکل گیا تھا، اور اس نے ان کو اپنے جسم کا ایک حصہ سمجھ کر اور ان پر پورا بھروسہ کرکے لڑائی میں شریک کر لیا، کھجوہ کے میدان میں ایک رات پہلے فوجوں کی صف آرائی ہوگئی تھی، اور سواروں کو حکم دیدیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی مقررہ جگہوں سے نہ ہٹیں، اگر آرام کرنے کے لیے اپنے گھوڑوں سے اتریں بھی تو مسلح رہیں، تمام فوجی سردار صفوں کی ترتیب اور اس کا نظام درست کرنے میں رات بھر ادھر ادھر گشت کرتے رہے، اورنگ زیب ضروری ہدایتیں دے کر تہجد پڑھ رہا تھا کہ کیمپ میں یکایک شور ہوا اور فوج میں انتشار پھیل گیا، لشکریوں کو خیال ہوا کہ غنیم گھس آیا، لیکن پتہ چلا کہ جسونت سنگھ نے غداری کی، اور شجاع سے مل کر اپنے تمام راجپوت سواروں کے ساتھ شہزادہ سلطان کے کیمپ کو لوٹ رہا ہے، اس غارتگری اور لوٹ مار میں جو بھی حائل ہوا، راجپوتوں نے اس کو تہ تیغ کر دیا، اور کیمپ کا سارا ساز و سامان مال و اسباب اور مویشیوں کو لوٹ کر بالکل جھاڑو پھیر دی، اور کیمپ کے ایک اہم حصہ کو تباہ و برباد کرکے اپنے گھوڑوں کی باگ اپنے اپنے گھروں کی طرف موڑ دی۔ راجپوتوں کو یقین تھا کہ اس کے بعد اورنگ زیب کا شکست کھانا لازمی ہے لیکن اورنگ زیب کا صبر، تحمل اور جنگی تدبر کام آیا۔

جسونت سنگھ کی غداری کی خبر اس کو مصلے پر ملی تھی، تہجد کی نماز اطمینان سے ختم کرنے کے بعد لشکر میں آکر لشکریوں کو ڈھارس دلائی کہ الحمد للہ اس واقعہ سے منافقوں اور دوستوں کی تفریق ہوگئی، اور اس کو میں مدد الٰہی سمجھتا ہوں، اور واقعی تائید ایزدی اس کے ساتھ تھی کیونکہ اس جنگ میں بھی وہ فاتح اور کامران رہا،[1] راجہ جسونت سنگھ کو اورنگ زیب کے کیمپ کی لوٹ میں جو دولت ملی اس سے راجپوتوں کی فوج تیار کرکے دارا کو اجمیر آنے کی دعوت دی، دارا شکست کھا کر ادھر اُدھر

[1] عالمگیرنامہ ص ۲۵۵-۲۵۷ خافی خاں ج ۲ ص ۵۳

بھٹک رہا تھا، اس کو یاس و ناامیدی کے اس بادل میں جسونت سنگھ کی دعوت میں امید کی کرن نظر آئی، اور وہ ۲۲ ہزار سوار لے کر جسونت سنگھ کے پاس روانہ ہوا، اب اورنگ زیب کو جسونت سنگھ کی مفسدانہ کارروائیوں کے خلاف سخت اقدام کرنا پڑا، اس نے محمد امین خاں کی نگرانی میں دس ہزار کا ایک لشکر مرواڑ بھیجا، جب یہ لشکر مرواڑ کی سرحد میں پہنچا تو جسونت سنگھ منڈور سے بھاگ کر سیوانہ کے پہاڑی قلعہ میں چھپ گیا، اس وقت راجہ مان سنگھ کے پرپوتے مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ نے اس کو ایک دوستانہ خط لکھا کہ راجپوتوں کا خون بہانے سے کیا فائدہ، تم خود بھی برباد ہو جاؤ گے اور ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکتی رہے گی، اگر اب بھی تم اپنی روش سے باز آ جاؤ تو اورنگ زیب سے تمھاری خطائیں معاف کرائی جا سکتی ہیں[۱]، جسونت سنگھ کی عقل میں بھی بات آ گئی، اس لیے وہ دارا شکوہ کی مدد سے باز آ گیا، اس سلسلہ میں جدوناتھ سرکار نے راجہ جسونت سنگھ کے بارہ میں لکھا ہے کہ

> "کسی ایسے اعلیٰ منصب اور اعلیٰ شہرت کے آدمی نے اپنے عہد کا ایفا نہیں کیا، اس جنگ جانشینی میں شریک ہونے والے تمام افراد میں جسونت سنگھ کی شہرت بہت ہی بری ہے، وہ ایسی لڑائی میں میدان چھوڑ کر بھاگا جس میں وہ ذمہ دار تھا اور غداری کر کے ایک دوست کے کیمپ پر حملہ کیا اور پھر اپنے حلیف دارا کو چھوڑا، اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا، خصوصاً جب اس کو خطرہ میں لے آیا تھا، وہ آدمی بہت ہی بدنصیب تھا جس نے مرواڑ کے راجہ اور راٹھور راجپوتوں کے سردار جسونت سنگھ پر بھروسہ کیا[۲]۔"

لیکن اورنگ زیب آخر وقت تک راجہ جسونت سنگھ پر اعتماد کرتا رہا، دارا کی موت کے بعد جسونت سنگھ کو اس کے ضمیر نے کوئی ملامت نہیں کی، اور وہ بلاتکلف اورنگ زیب کے دربار میں

---

[۱] عالمگیر نامہ ص ۳۱۰ [۲] اورنگ زیب از جدوناتھ سرکار جلد ۳ ص ۱۷۰

حاضر ہو گیا، اور اورنگ زیب نے بھی اس کی تمام خطاؤں سے چشم پوشی کی، اور اس کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن راجہ جسونت کے دل میں اپنے فراخ دل آقا کے لیے کبھی کوئی نرمی اور محبت پیدا نہیں ہوئی اس لیے جب سنہ ۶ جلوس سیواجی کے خلاف ایک مہم پر بھیجا گیا تو پھر غداری کا ثبوت دیا، اورنگزیب نے آزردہ ہو کر اس کی جگہ پر مرزا راجہ جے سنگھ کو مامور کیا، اس مہم میں راجہ جسونت سنگھ کا سالا راؤ بھاؤ سنگھ ہاڈا بھی اس کے ساتھ تھا، جسونت سنگھ نے اس کو بھی اورنگ زیب کے خلاف سازش میں شریک کرنا چاہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا، تو جسونت سنگھ نے اپنی بیوی (یعنی راؤ بھاؤ سنگھ کی بہن) کو ملا کر اس پر دباؤ ڈالنا چاہا، لیکن راؤ بھاؤ سنگھ نے اپنے دامن پر نمک حرامی کا داغ لگنے نہ دیا،[1]

مگر اس کے بعد بھی جسونت سنگھ اورنگ زیب کی نظروں سے نہیں گرا، سنہ ۹ جلوس میں شاہزادہ معظم کے ساتھ کابل بھیجا گیا، اور سنہ ۱۰ جلوس میں دکن کی مہم میں تعینات کیا گیا، اور سنہ ۱۴ جلوس میں جمرود (مضافات کابل) کی حکومت پر سرفراز کیا گیا، اور یہیں وہ مرا[2]

راجہ جسونت سنگھ نے اورنگ زیب کے ساتھ اپنی معاندانہ اور مخالفانہ روش کی جو آنکھ مچولی کھیلی اور اورنگ زیب نے رواداری اور عفو و درگذر کا جو نمونہ پیش کیا، اس کی مثال کم ملے گی، لیکن جسونت سنگھ کی روح موت کے بعد بھی اورنگ زیب کے سر پر منڈلاتی رہی، اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی، اس لیے اورنگ زیب نے راجہ جسونت سنگھ کے بھتیجے راجہ اندر سنگھ کو مرواڑ کا رانا بنایا، لیکن جیسا کہ ایسر داس نے فتوحات عالمگیری میں لکھا ہے کہ مرواڑ کے راجپوت فساد برپا کرنے کے لیے تلے ہوئے تھے، اس لیے راجہ جسونت سنگھ کی موت کے بعد راٹھور راجپوتوں نے خبر دی کہ راجہ کی دو رانیاں حاملہ ہیں، پھر دو بچوں کی ولادت کا بھی اعلان کیا، مگر اورنگ زیب جانتا تھا کہ یہ بچے فرضی ہیں،[3] پھر بھی ان کو اپنی تولیت میں لینا چاہتا تھا، لیکن راٹھور راجپوت راضی

---

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۷۰ - ۷۳ [2] ایضاً ج ۳ ص ۷۰۳ [3] جدو ناتھ سرکار نے ان بچوں کے فرضی ہونے اور نہ ہونے پر اپنی کتاب اورنگ زیب ج ۳ ص ۳۷۱ پر بحث بھی کی ہے۔

نہ ہوئے، اور اودے پور کے مہارانا نے بھی ان کی حمایت میں باغیانہ فضا پیدا کردی، اس لیے اورنگزیب کو مجبوراً ان کے خلاف لشکر کشی کرنا پڑی، اس فوج کشی میں شہزادہ اکبر کے ساتھ ہاڑا راجپوت سرداروں کے علاوہ خود راٹھور راجپوت سردار بھی شریک تھے، جس کو جدوناتھ سرکار نے بھی تسلیم کیا ہے[1]، اس مہم میں راجپوتوں نے شہزادہ اکبر کو سبز باغ دکھا کر اورنگ زیب سے توڑ لیا لیکن اورنگ زیب کا تدبر اس موقع پر بھی کام آیا، اور راجپوتوں کو پسپا ہونا پڑا، بیکانیر کے راجہ شیام سنگھ نے بیچ بچاؤ کیا، اور اودے پور کے رانا جے سنگھ کو شہزادہ محمد اعظم کی خدمت میں لاکر حاضر کیا، جب شہزادہ رانا کو لے کر اورنگ زیب کے پاس پہنچا تو اورنگ زیب نے اس کو امتیازی جگہ پر بٹھایا، اور خلعت، شمشیر مرصع، جمدھر، پھول کٹارہ، گھوڑا مع ساز طلا، ہاتھی مع ساز نقرہ عطا کرکے پنج ہزاری پنج ہزار سوار کے اعزاز سے نوازا، اور اس کے ساتھیوں کو بھی طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز کیا[2]۔

مہارانا جے سنگھ کے دو بھائی، بھیم سنگھ اور راجہ اندر سنگھ بھی اورنگ زیب کے دامن دولت سے آخر آخر وقت تک وابستہ رہے، ۳۲ھ سال جلوس میں بھیم سنگھ پنجہزاری منصب پر پہنچکر مرا، اندر سنگھ ۴۸ھ سال جلوس میں سہ ہزاری منصب پر فائز ہوا،

جودھپور اور جے پور کے راجپوتوں نے جسونت سنگھ کے فرضی لڑکے اجیت سنگھ کے لیے تو شورش برپا کی، لیکن جب اودے پور کے رانا نے اورنگ زیب سے صلح کرلی تو پھر اس کو جنگلوں اور پہاڑوں میں آوارہ گرد پھرنے کے لیے چھوڑ دیا، وہ ایک عرصۂ دراز تک غارتگری اور خونریزی کرتا رہا، عالمگیر کے بعد جب وہ بہادر شاہ کے دربار میں نادم ہو کر پہنچا، تو بہادر شاہ نے اس کو سہ ہزاری منصب سے نوازا لیکن وہ اپنی مفسدانہ سرشت سے باز نہیں آیا، اور ایک لاابالی زندگی بسر کرنے کے بعد فرخ سیر

---

[1] اورنگ زیب جلد ۳ از جدوناتھ سرکار ص ۱۴۴ [2] مآثر عالمگیری ص ۲۰۸

کے عہد میں اپنی لڑکی کا ڈولہ اس کے پاس بھیج کر پھر شاہی نوازشوں کا خواستگار ہوا، ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ کو نہایت دھوم دھام سے یہ شادی انجام پائی، یہ آخری راجپوت لڑکی تھی جو مغل حرم میں داخل ہوئی، یہ لکھ کر صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ راجپوتوں کے تعلقات مغل دربار سے آخر آخر وقت تک بہت زیادہ کشیدہ نہ رہے تھے، جیسا کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے راجپوتوں کو اپنی روش سے حکومت سے بالکل دور کر دیا تھا، یہ اور دوسری مثالوں سے بھی ثابت ہوگا۔

اجیت سنگھ کی جانشینی کا فتنہ وفساد برپا کرنے میں درگا داس راٹھور کا بڑا حصہ رہا، وہ راجہ جسونت سنگھ کے وزیر اسکرن کا لڑکا تھا، اسی نے سازش کر کے شہزادہ اکبر کو اورنگ زیب سے توڑا، اور شہزادہ اکبر کے نوزائیدہ بچے بلند اختر کو ایک عرصہ تک اپنے قبضہ میں کیے رہا تاکہ اورنگ زیب سے بڑی سے بڑی رعایتیں حاصل کرے، وہ ۴۳ سنہ سال جلوس میں نادم ہو کر شجاعت خان ناظم احمد آباد کے توسل سے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے دربار میں حاضر ہوا، یہ گویا اس کا اعتراف جرم تھا، لیکن اورنگ زیب سے اس کی یہ اہانت دیکھی نہ گئی، اور اس نے اس کے ہاتھ کھلوا دیے، اور خلعت اور جیغہ مرصع عطا کر کے منصب سہ ہزاری دو ہزار و پانصد سوار سے بھی نوازا،[1]

راٹھور راجپوتوں کے لیے اورنگ زیب کا دل بڑی نرمی اور گداز تھا، راجہ جسونت سنگھ کا خسر رام دیو سسودیہ سموگڈھ کی لڑائی میں اورنگ زیب کے خلاف تھا، لیکن جب اورنگ زیب سے آکر ملا تو اس نے اس کا پورا اعزاز و اکرام بدستور سابق قائم رکھا، اور برابر خلعت فاخرہ اور شاہی الطاف سے نوازتا رہا، وہ دکن میں متعین تھا، پھر راجہ رام سنگھ کچھواہہ کے ساتھ آسام کی مہم پر بھیجا گیا، ۱۲ سنہ سال جلوس میں متھرا کا فوجدار مقرر ہوا، اور یہیں انتقال کیا،[2]

بیان کیا جا چکا ہے کہ سموگڈھ میں راجہ روپ سنگھ راٹھور نے اپنی جان کی بازی لگا کر اورنگ زیب

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۹۵ [2] عالمگیر نامہ ص ۲۱۳، ۲۲۵، ۲۳۷، ۲۶۲، ۱۰۳۶ و مآثر عالمگیری ص ۴۴

کی جان لینے کی کوشش کی تھی، گو وہ خود ہلاک ہوا، مگر اورنگ زیب کو افسوس رہا کہ ایسا پرجوش اور جری راجپوت سردار مارا گیا، لیکن جب اس کا لڑکا مان سنگھ عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوا تو اسکو بے شمار شاہی عنایتوں سے نوازا۔ اور ہزار و پانصدی و ہفت صد سوار کا منصب عطا کیا،[۱] اور پھر ترقی کرکے سہ ہزاری منصب پر فائز ہوا۔ راجہ روپ سنگھ، مہاراجہ جسونت سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا۔ یہ خاندان عالمگیر سے اور زیادہ قریب تر ہوگیا، جب چوتھے سال جلوس میں راجہ روپ سنگھ کی ایک لڑکی شہزادہ محمد معظم سے بیاہی گئی، اور یہ شادی نہایت تزک و احتشام اور دھوم دھام سے انجام پائی جس کی پوری تفصیل عالمگیر نامہ (ص ۴۴-۶۳۹) میں درج ہے۔ شہزادہ محمد کام بخش کی شادی بھی ایک راجپوت خاندان میں ہوئی۔ یہ شہزادی منوہر پور کے راجہ امر چند کی بیٹی اور جگت سنگھ کی بہن تھی، یہ شادی عالمگیر کے چوبیسویں سال جلوس میں ہوئی،[۲]

یہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ راجہ چھتر سال ہاڈا دارا شکوہ کی معیت میں سموگڈھ کی لڑائی میں اس جذبہ کے ساتھ شریک ہوا تھا کہ اس کے نیزہ کی انی پر اورنگ زیب کا سر ہوگا، لیکن وہ خود مارا گیا، اور جب اس کا لڑکا بھاؤ سنگھ ہاڈا اورنگ زیب کے پہلے سال جلوس میں دربار میں حاضر ہوا تو اورنگ زیب نے اس کو علم و نقارہ اور خطاب راؤ کے ساتھ سہ ہزاری ذات دو ہزاری سوار کا منصب عطا کیا، اور علاقہ بوندی جاگیر میں دیا، وہ اورنگ زیب کے ساتھ شجاع کی لڑائی میں شریک رہا۔ پھر دکن میں متعین ہوا، سنہ ۳ جلوس میں چاکنہ کی مہم میں جانبازی سے لڑا، راجہ جسونت سنگھ کے ساتھ شیوا جی کے خلاف بھی معرکہ آرا ہوا، سنہ ۴ میں چاندہ کے زمیندار کی تادیب کے لیے بھی گیا، اس کے بعد اورنگ آباد میں مامور ہوا، اور یہیں اورنگزیب کے نویں سال جلوس میں وفات پائی۔[۳]

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۱۴۸ [۲] ایضاً ص ۲۰۲ [۳] مآثر الامراء ج ۲ ص ۳۰۵

مرزا راجہ جے سنگھ کچھواہہ بھی شروع میں داراشکوہ کا حلیف رہا، لیکن جب اورنگ زیب آکر ملا تو اس نے بڑے احترام سے اس کا خیر مقدم کیا، اور ایک کروڑ دام کی مالگذاری کا محال عطا کیا، سنہ جلوس میں سیواجی کے خلاف مہم پر بھیجا گیا، تو چودہ ہزار سوار اس کے ساتھ گئے اور دوسرے فوجی فوجی سردار دلیر خاں، داؤد خاں، احتشام خاں اور زبردست خاں اس کے ماتحت بنائے گئے، راجہ جے سنگھ کے ساتھ اور بھی راجپوت سوار تھے، ان میں سے بعض کے نام ہیں، راجہ سجان سنگھ بندیلہ، راجہ رائے سنگھ سسودیہ، پورن مل، کیرت سنگھ،[1] اس مہم میں راجہ جے سنگھ نے جو خدمت انجام دی اس کے صلہ میں اسکو اسکے منصب میں دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کی ترقی دے کر منصب ہفت ہزاری ذات ہفت ہزار سوار دو اسپہ پر مامور کیا گیا،[2] ششم جلوس میں راجہ بیجاپور کی مہم میں روانہ کیا گیا اور واپسی میں اورنگ آباد پہنچکر ۱۰۷۸ھ میں اس دار فانی سے کوچ کیا، اورنگ زیب کو اسکی موت کی خبر ملی تو اس کو بڑا رنج ہوا، وہ اس کے حسن تدبیر، سنجیدگی فکر، سپہگری اور فوجی قیادت کا بڑا مداح تھا، مسلمان مورخین نے بھی اس کے اوصاف کی تعریف کی ہے، ماثر الامراء میں ہے کہ

"بامزاج زمانہ شناسا و باندیشہ و وقت آشنا فراہم داشت، ازیں جاست کہ از ابتداے دولت تا انتہاے زندگی بآبرو بسر بردہ" (ج ۳ ص ۵۷۷)

اس کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اس کے بیٹے کنور رام سنگھ کو راجہ کے خطاب اور دوسری شاہانہ عنایتوں سے نوازا، گو یہ بھی سموگڈھ میں داراشکوہ کے ساتھ تھا، لیکن جب باپ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا تو خلعت و انعام سے سرفراز کیا گیا، راجہ جے سنگھ جب سیواجی کو عالمگیر کے دربار میں لایا تو اس کی قیام گاہ کی نگرانی رام سنگھ ہی کے ذمہ کی گئی، لیکن اسکی چشم پوشی کی وجہ سے شیواجی آگرہ سے فرار ہو گیا جس سے اورنگ زیب کو بڑا دکھ پہنچا اور اس کو منصب سے

[1] منتخب اللباب حصہ دوم ص ۱۷۸، [2] مآثر عالمگیری ص ۵۱

معطل کرکے دربار میں آنے کی ممانعت کردی لیکن راجہ جے سنگھ کی موت پر اورنگ زیب نے رام سنگھ کا قصور معاف کردیا، اور دربار میں بلا کر اس کو راجہ کا خطاب عطا کرتے وقت خلعت مع جمدھر مرصع شمشیر مع ساز مرصع اسپ عربی مع ساز طلا، فیل مع جل زربفت و ساز نقرہ مرحمت کیا، اور چار ہزاری ذات چہار ہزار سوار کے منصب سے سرفراز کیا، اور اس کے باپ کی کل جاگیر بھی دیدی، وہ رفتہ رفتہ ترقی کرکے پنجہزاری ذات پنجہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ تک پہنچا[1]، راجہ جے سنگھ کا چھوٹا بیٹا کیرت سنگھ بھی اورنگ زیب کے ساتھ اپنی زندگی کے آخر تک وابستہ رہا، وہ سہ ہزاری ذات، دو ہزار پانصد سوار کے منصب تک پہنچکر ۱۰۸۴ھ میں دکن میں مرگیا،

جے سنگھ کے پر پوتے سبے سنگھ کو ترقی و عروج کی شاہراہ پر گامزن کرنے میں اورنگ زیب ہی کا ہاتھ ہے، وہ راجہ بشن کا بیٹا تھا، ۴۴ سال جلوس میں اورنگ زیب نے اسکو اپنے سایہ عاطفت میں لیا، اور ہزار پانصدی ذات ہزار سوار کا منصب دے کر راجہ جے سنگھ کے خطاب سے نوازا اور وہ دھیراج راجہ جے سنگھ سوائی کے لقب سے تیموری بادشاہوں کے آخری دور میں نہایت ممتاز اور اہم ارکان سلطنت میں شمار کیا جاتا تھا، ۴۵ سال جلوس میں اورنگ زیب نے اسکو عمدۃ الملک اسد خاں کے ساتھ قلعہ کھیلنا کی تسخیر کے لیے بھیجا، تو اس نے اورنگ زیب کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اپنی نوجوانی میں بڑی جانبازی اور دلیری کا ثبوت دیا، اور قلعہ فتح ہونے کے بعد اورنگزیب نے اس کی کارگذاری کے صلہ میں اس کے منصب میں اضافہ کیا اور پھر وہ برابر ترقی کرتا گیا[2]۔

عالمگیر کے چھوٹے چھوٹے راجپوت فوجی منصبداروں کی بڑی لمبی فہرست ہے، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

راجہ اودت سنگھ (زمیندار اودتدیہہ، دو ہزاری ہزار پانصدی ہزار پانصد سوار) راجہ دیبی سنگھ

---

[1] مآثر الامراء ج ۲ ص ۳۰۱-۳۰۳ [2] ایضاً ص ۸۱ خافی خاں ص ۴۹۹

بندیلہ (دو ہزار پانصدی و پانصد سوار) بکرم سنگھ گوالیاری (دو ہزاری پانصد سوار) رام چند سنگھ (سہ ہزاری) بدھ سنگھ (چندن کرا کا زمیندار، سہ ہزاری) سوبھکرن بندیلہ دو ہزاری ہزار صد سوار بشن سنگھ (ہزاری و چار صد سوار) سروپ سنگھ (یکہزاری) رگھناتھ سنگھ راٹھور (ہزار و پانصدی ششصد سوار) راجہ کلیان سنگھ (بھدادر کا زمیندار ہفتصدی) وغیرہ[1]

اورنگ زیب راجپوتوں کو ہمیشہ حکومت اور فوج کا ضروری جزو سمجھتا رہا، اور اپنے مسلمان حریفوں کے مقابلہ میں راجپوت سرداروں کی نگرانی میں لشکر بھیجنے میں بالکل تامل نہ کرتا تھا، مآثر عالمگیری میں ہے:

"عادل خاں بیجاپوری پیش کش ادا کرنے میں سستی سے کام لیتا تھا، اور سیواجی کو مدد دینے میں کوشش کرتا تھا، ایک فرمان راجہ جے سنگھ کے نام صادر ہوا کہ سیوا کے مقبوضات اور قلعوں کا بخوبی انتظام کرکے فوراً بیجاپور پر دھاوا کردو، قلعہ کے محاصرہ میں ایام گزاری سے پرہیز کرکے جلد از جلد لشکر مخالف کو تباہ اور برباد کردو"[2]

اور خود راجپوتوں کو بھی اورنگ زیب کی حمایت میں ہندوؤں کے خلاف معرکہ آرا ہونے میں کوئی تامل نہ ہوتا تھا، آسام والوں نے ۱۰ سنہ سال جلوس میں بغاوت کی، تو اس کی سرکوبی کے لیے راجہ رام سنگھ کو بھیجا گیا، اور اس کے ساتھ دوسرے راجپوت سردار کبیر سنگھ بھورتیہ، رگھناتھ سنگھ اور بیرم دیو سنگھ سسودیہ بھی تھے، جن کے ماتحت راجپوت اور مسلمان سوار دونوں تھے، اور یہ بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ راجپوت اپنی کارگذاری کے صلہ میں عالمگیر کے آخر وقت تک شاہی انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہے، چنانچہ ۴۸ سنہ سال جلوس کے ذکر میں مآثر عالمگیری میں ہے:

---

[1] عالمگیر نامہ کے شروع میں جو انڈکس ہے، اس سے بھی عالمگیر کے راجپوت وابستگان دولت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے؛
[2] مآثر عالمگیری ص ۵۱ [3] عالمگیر نامہ

"اودے سنگھ قلعہ دار سنجر لنا سہ ہزاری دو صد سوار کا امیر تھا، اسے اضافہ مشروط و بلا شرط پانصدی سی صد سوار عطا ہوا۔"

درگا داس راٹھور کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ عالمگیر کی شاہی ملازمت چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا تھا، لیکن سنہ ۴۹ سال جلوس میں اس کے دربار میں آیا تو اس کو پھر سہ ہزاری دو ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا،

سنہ ۴۹ سال جلوس میں اورنگ زیب کی فوج نے جنجی کے مرہٹہ راجہ رام کے خلاف فوجکشی کی تو اس مہم میں راجپوت سردار بھی سرفروشی اور جانبازی سے لڑے۔ راؤ دلپت رائے بندیلہ ایک لشکر جرار کے ساتھ اس معرکہ میں شریک تھا، مآثر عالمگیری میں ہے کہ اس معرکہ میں راؤ دلپت رائے کے اکثر ہمراہیوں نے بہادرانہ جنگ کے بعد اپنی جان دی، اور زخمی ہوئے، پھر اسی معرکہ میں رام سنگھ ہاڈا راج گڈھ کے قلعہ کے اوپر جس جرأت کے ساتھ چڑھا ہے، وہ ایک اہم کارنامہ ہے، فتح کے بعد اورنگ زیب نے راؤ دلپت رائے بندیلہ اور رام سنگھ بندیلہ دونوں کو بطور انعام مناصب عطا کیے،[1]

راجپوتوں نے مرہٹوں کے خلاف بھی اورنگ زیب کی حمایت میں جنگ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ سیواجی کے خلاف راجہ جے سنگھ نے راجپوت سرداروں اور سواروں کے ساتھ قیادت کی تھی، خود مرہٹے بھی اورنگ زیب کی حکومت اور فوج کے معزز سردار ہے، سیواجی کا داماد اچلاجی سیواجی سے ٹوٹ کر اورنگ زیب کا حامی اور طرفدار بن گیا تھا، وہ سنہ ۲۲ سال جلوس میں پنجہزاری منصب پر فائز تھا، سیواجی کے لڑکے سنبھاجی کا نوکر مانکوجی بھی اورنگ زیب سے مل گیا تھا، اور سنہ ۳۱ سال جلوس میں منصب دو ہزاری سے سرفراز کیا گیا، سیواجی کا بھتیجا ارجوجی بھی اورنگ زیب کے دامن دولت سے وابستہ ہوا، اور کا نھوجی سرکیہ تو اورنگ زیب کے آخری سال حکومت میں

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۵۰۵

شش ہزاری منصبدار ہو کر اس کے دربار کا معزز امیر اور فوجی سردار ہوا،

یہ مضمون طویل ہو رہا ہے، اس لیے مرہٹے سواروں نے اورنگزیب کی فوج میں جو قابل قدر خدمت انجام دی، اس کو سردست قلم انداز کیا جاتا ہے لیکن اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے اسکا ذکر بھی ضروری ہے کہ سواروں کے لیے جو گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے، ان کی افزائش نسل اور دیکھ بھال کیلیے کیا کیا اہتمام ہوتا تھا،

عام طور سے چھ قسم کے گھوڑے فوج میں استعمال کیے جاتے (۱) عراقی (۲) ترکی (۳) یابو (۴) تازی (۵) جنگلہ (۶) مجنس، ان میں یابو کابل سے آتے تھے، تازی اور جنگلہ ہندوستانی نسل کے گھوڑے تھے، مجنس شاید ایرانی نسل کے گھوڑے ہوتے تھے، اکبر نے عراقی اور ترکی گھوڑوں کی نسل ہندوستان میں بڑھانے کے لیے پوری کوشش کی، اور جہانگیر کے بیان کے مطابق اس کو اس میں کامیابی ہوئی، اور عراقی اور ترکی گھوڑوں کی نسل ہندوستان میں خاطر خواہ طریقہ پر بڑھی،[1]

ہر منصبدار کو اپنے منصب کے لحاظ سے ہر قسم کے گھوڑوں کی ایک مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی، مثلاً دہ ہزاری منصب دار کو کم از کم ۶۸ عراقی، ۶۸ مجنس، ۱۳۶ ترکی، ۱۳۶ یابو اور ۱۳۶ جنگلہ رکھنا پڑتا تھا،[2] اس طرح دو بیستی کو ایک عراقی، دو مجنس، دو ترکی، ایک تازی اور ایک یابو رکھنا ہوتا تھا،

جنگی گھوڑے پورے اہتمام کے ساتھ آراستہ پیراستہ کیے جاتے، ان کے مختلف ساز و سامان کے نام یہ ہیں: زین، ازتک، ازتک گجم، مجمعہ بند و پائے بند، اورنگ جنیت پنبہ یال پوش، جل، رومال نشیمن، مگس ران، پشت تنگ، خرخرہ، تیزہ، نکتہ، قشقہ، گردنی، نعل وغیرہ[3]

گھوڑے کی خوراک کے لیے حسب ذیل ظروف تھے:

توبرہ، سبد، کرہ آہ، سبد ہستین سطل۔[4] ان سب کی تصویریں آئین اکبری میں دی ہوئی ہیں، جن کو دیکھ کر ان کی نوعیت معلوم ہو سکتی ہے،

---

[1] تزک جہانگیری ص ۱۰۳ [2] تفصیل کے لیے دیکھو آئین اکبری ص ۱۳۱-۱۴۴ [3] آئین اکبری ص ۷۷، ۹۱ [4] ایضاً

گھوڑوں کی تربیت، نگہداشت اور خدمت کے لیے مختلف ملازم مقرر تھے جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) آختہ بیگی۔ گھوڑوں کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، اس عہدہ پر کوئی ممتاز منصب دار مقرر کیا جاتا تھا، وہ گھوڑوں اور ان سے متعلق تمام ملازمین کی عام دیکھ بھال کیا کرتا تھا،

(۲) داروغہ۔ شاہی اصطبل کا نگراں ہوتا تھا، پنجہزاری منصب تک کے امرا اس عہدہ پر فائز کیے جاتے،

(۳) مشرف۔ گھوڑوں کے اعداد وشمار، خرید وفروخت اور ان سے متعلق تمام باتوں کا ذمہ دار ہوتا، یہ عہدہ بھی کسی معزز امیر کو دیا جاتا تھا،

(۴) دیدہ ور۔ شاہی معائنہ سے قبل گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور اسکی تفصیل مشرف کو قلمبند کراتا،

(۵) آختچی۔ سفر میں گھوڑوں کا محافظ ہوتا، اور ان کو زین آراستہ پیراستہ کرتا تھا،

(۶) چابک سوار۔ گھوڑوں کی تیز رفتاری کا اندازہ لگانے والا ہوتا تھا،

(۷) نعل‌بند۔ گھوڑے کو شاید سدھاتا تھا، اور ان کو کچھ طور طریقے بتاتا تھا، اس کام کے لیے عموماً راجپوت ہی مقرر کیے جاتے تھے

(۸) میردہہ۔ دس سائیسوں کا سردار ہوتا تھا۔

(۹) بیطار۔ یہ گھوڑوں کے مرض کا معالج ہوتا تھا۔

(۱۰) نقیب۔ ہر طویلہ کی کیفیت داروغہ اور مشرف کے پاس پہنچاتا تھا،

(۱۱) ترین دار۔ یہ شاہی گھوڑوں کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے۔

(۱۲) آبکش۔ چالیس گھوڑوں کے لیے تین آبکش اور بیس کے لیے دو آبکش ہوا کرتے تھے،

(۱۳) سائیس۔ دو گھوڑوں کی خدمت کے لیے ایک سائیس مقرر کیا جاتا تھا۔

(۱۴) ان کے علاوہ قراول، سپند سوز، خاکروب اور نعل بند ہوا کرتے تھے۔

فن سیاق پر ایک سرسری نظر

از جناب سیّد امین الحسینی صاحب، حیدرآباد

یہ مضمون عام اعتبار سے جس قدر خشک اور غیر دلچسپ ہے، اسی قدر فنی لحاظ سے ادق و اہم ہے، اور اس کے مطالعہ بغیر عہد ماضی کی دستاویزات عام ازیں کہ وہ سلاطین مغلیہ سے متعلق ہوں یا قطب شاہیہ یا عادل شاہیہ یا آصفیہ وغیرہ سے، معمہ بن کر رہ جاتی ہیں،

سیاق کے لغوی معنی "راندن" یعنی ہانکنا، اور "پاے بند باز" یعنی باز کو باندھنے کی زنجیر کے ہیں، اور سیاق کے حقیقی معنی جو اصحاب اللغات نے بتائے ہیں اس کی دو توجیہیں بیان کی ہیں۔ اول یہ کہ چونکہ حساب نویسی کے وقت زبان کی حرکت کے ساتھ ساتھ قلم کو بھی حرکت دینی پڑتی ہے، اس لیے "راندن" کہا گیا، اور دوسری یہ کہ چونکہ حساب کے لیے حساب کے قواعد کا دماغ میں محفوظ رکھنا ضروری ہے، لیکن حسابی طور و طریق دماغ سے عموماً ایسے نو ہو جاتے ہیں جس طرح "باز ہاتھ پر سے اڑ جاتا ہے، اس لیے ان حسابی قواعد و ضوابط کو ضبط تحریر میں لاکر "پاے بند باز" کی طرح جکڑ دیا جاتا ہے تاکہ جب کبھی ان ضوابط کو دیکھنے کی ضرورت لاحق ہو فوراً ان سے استفادہ کیا جا سکے، بہرحال اس پوری عبارت کا ماحصل یا سیاق کے اصطلاحی معنی یہ ہوئے کہ سیاق "ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعہ ہمیں حساب نویسی کے اصول و قوانین معلوم ہوتے ہیں" اس کا موضوع یعنی جس سے بحث کی جاتی ہے "عدد و رقم" ہے، اور اس کا واضع راجہ ٹوڈرمل ہے۔

یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس فن میں "عدد و رقم" کے علاوہ ان خاص خاص الفاظ سے بھی

بحث کی جاتی ہے جس کا تعلق نظم ونسق سلطنت سے ہے، نیز یہ کہ مملکت کے خاص خاص عہدہ داروں سے کیا خاص فرائض مختص تھے، فوج بندی کے کیا اصول تھے، کسی نودارد سپاہی کے چہرے، اسکے جانور یا ہتھیار، یا منصبدار اعلیٰ کے میانے، پالکی کے چہروں کی ترتیب کے لیے کون سے خاص امور ملحوظ رکھے جاتے تھے، اس طرح ترکی سال جو عموماً عطاء آراضی کے سلسلے میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اوزان و پیمانہ جات وعلاماتِ خاص اور الفاظ تمیز وغیرہ اس فن سے بالکل مختص ہیں۔

افسوس ہے کہ پہلے ہی سے اس علم کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے، اور اگر ملتا بھی ہے تو فارسی میں یا ایسی اردو میں جو محض چیستاں بن کر رہ گئی ہے، تاہم کتب سیاق و دیگر قدیم دستاویزات کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری پرانی حکومتوں کا نظم ونسق نہایت مستحکم و وسیع تھا، حالانکہ اس وقت ایسے وسیع ذرائع و وسائل موجود نہ تھے جو آجکل ہماری ضروریات کو سہل ترین بنا رہے ہیں، دیسی کاغذ کے یہی چھوٹے چھوٹے پرزے تھے، جن کے ذریعہ حکومتوں کے احکام کی تعمیل کی جاتی تھی، اور بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم معاملات طے پاتے تھے۔

ہر چیز کا ایک اصول اور ایک قاعدہ معین تھا جس کی تعمیل کی جاتی تھی، ضروریات سلطنت کے لحاظ سے دفاتر وعہدے بھی خاص تھے، مثلاً دفاتر دیوانی ومال واستیفا، (محاسبی) قانون گوئی (بندوبست) فوج وپولیس، قضا، واحتساب (مذہبی عدالت) بدعت (آبکاری) ڈاک چوکی، سیاہہ اور عرض مکرر (صیغۂ توثیق احکام) ان کے علاوہ سوانح نگاری، طبابت، صنعت وحرفت، نقلیات، دارالضرب اور امور خارجہ وغیرہ جیسے اہم سررشتوں سے متعلق بھی مواد ملتا ہے،

آیندہ سطور میں ہم ان مباحث کا نہایت مختصر سرسری اور اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں، جو

فن سیاق کے اہم عنوانات یا اجزاء کہے جا سکتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بتا دیا ہے کہ سیاق کا موضوع "مدو رقم" ہے، اور ان کی اس فن میں بڑی اہمیت ہے، لہذا سیاق دانوں نے بلحاظ ضرورت اس کی اقسام بھی خاص خاص وضع کی ہیں، اور بسا اوقات تو الفاظ اور اسماء ہی کی مدات قائم کر دی ہیں، مثلاً باقی و تتمہ و مقررہ، مد سیاہہ، مد جمع و خرچ، کھتا ؤنی، روزنامچہ، سقطی نامہ، فوتی نامہ، اور اسمار کی مد مثلاً قاسم، محمود، احمد، حسن، حسین وغیرہ، اور مدات کی حقیقی اقسام بہر مد، دو قلمی، چہار قلمی، ہشت قلمی، شانزدہ قلمی، مدات شکمی اور گوشوارہ ہیں، پھر ان کے خاص اصول بھی مقرر کر دیے گئے کہ کس موقع پر کونسی مدات استعمال کی جانی چاہئیں۔

مباحث بارز و حشو و ایراد قرار داد قیمت یا تنخواہ وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے کے موقع پر جس چیز کو نمایاں حیثیت اور خاص مقام دیا جاتا ہے وہ بارز ہے، اور اس کی تفصیلات جو سیدھی او بائیں جانب علی الترتیب بتائی جائیں وہ "حشو و ایراد" کہلاتی ہیں۔

الفاظ تمیز یہ بھی فن سیاق میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، یعنی کسی خاص لفظ کو بتانا مقصود ہو تو اس کے ساتھ خاص اسماء کا استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً کسی منصب دار یا سپاہی کے لیے لفظ "تو" یا "نفر" استعمال کریں گے، علیٰ ہذا گھوڑے کے لیے "راس" اور اونٹ کے لیے "مہار و نفر" اور ہاتھی کے لیے "زنجیر"، پالکی کے لیے "منزل"۔ "سامیانے" کے لیے "ظل" ہتھیار کے لیے "ضرب و قبضہ" کتاب کے لیے "جلد"۔ اشرفی اور روپیہ کے لیے "مہر و مبلغ"، ہرن کے لیے "ڈور"۔ شکرے کے لیے "دست"۔ پارچہ کے لیے "ثوب اور تھان" اور کسی جوڑ دار شے کے لیے "جفت و زوج"، شیر و پلنگ وغیرہ کے لیے "قلادہ"۔ چھوٹے جانوروں کے لیے "قطعہ"۔ مالا" وغیرہ کے لیے "سلک" زربفت و مخمل کیلیے "طاقہ" رباب چنگ کے لیے "ساز" کاغذ کیلیے "دستہ" قالین وغیرہ کیلیے "فرد" زمین اور آسمان کے لیے "طبق" طلاء و نقرہ وغیرہ کیلیے تولہ" ماشہ، رتی، رکابی کیلیے "ظرف" نان کیلیے قرص و گردہ، مروارید کیلیے دانہ، اسی طرح خاص خاص الفاظ کے لیے خاص خاص علامتیں بھی مخصوص ہیں، مثلاً علامات

ہندسہ اور عربی ٹکڑوں آنہ پائی کی علامات کے علاوہ دمڑی کے لیے علامت صاد ٹولی کے لیے ہمزہ اور صاد (ء ص) وغیرہ

مباحث سالہائے ترکی | ترکی سال کا دائرہ بارہ سال پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کا استعمال کاغذات عطیات میں خاص طور سے ہوتا ہے۔ ترکوں کے نزدیک ہر سال ایک خاص اثر رکھتا ہے۔ ان بارہ سالوں کی تفصیل یہ ہے

(۱) سیچقان ایل	سچقان یعنی چوہا اور ایل یعنی سال،	اثر نحس رکھتا ہے
(۲) اود ایل	" بیل	اثر سعد
(۳) پارس ایل	" چیتا	" نحس
(۴) توشقان ایل	" خرگوش	" "
(۵) لوی ایل	" مگر	" سعد
(۶) ایلان ایل	" سانپ	" نحس
(۷) یونت ایل	" گھوڑا	" سعد
(۸) قوی ایل	" بکری	" "
(۹) بیچی ایل	" بندر	" نحس
(۱۰) تخاقو ایل	" مرغ	" "
(۱۱) ایت ایل	" کتا	" "
(۱۲) تنگوز ایل	" مینڈک	" "

کارخانہ ہائے شاہی | اورچی خانہ، آبدار خانہ، توشک خانہ، جواہر خانہ، زرگر خانہ، قور خانہ راستہ خانہ، امراء خانہ (خرید و فروخت)، خوشبو خانہ، میوہ خانہ، کرگراق خانہ (ظروف اسلحہ

وملبوسات وغیرہ) کتاب خانہ، تنبول خانہ، اصطبل خانہ، فیل خانہ، شتر خانہ، گاؤ خانہ، توشک خانہ، (چہ یا خانہ) آہو خانہ، فراش خانہ، زرد و زخانہ، تسبیح خانہ، شربت خانہ، رکاب خانہ، نان بائی خانہ، آتش خانہ، باروت خانہ، چینی خانہ، دخوت خانہ، نقار خانہ، انبار خانہ، مشعل خانہ وغیرہ۔

مباحث چہرہ نویس | سپاہی کا چہرہ اتنا مکمل رکھا جاتا تھا جس طرح آجکل تصویر کشی کے ذریعہ کسی شخص کے خد و خال وضع کیے جاتے ہیں، مثلاً ملازم کا نام، اس کے باپ اور دادا کا نام، قومیت معہ تقسیم ذیل کہ اگر ملازم مسلمان ہے تو مغل یا پٹھان، اگر سید ہے تو حسنی یا حسینی، شیخ ہے تو صدیقی یا فاروقی وغیرہ، اسی طرح اگر ہندو ہے تو راجپوت، دکنی ہے یا اور چہرے کا رنگ مثلاً گندم گوں، سبز، سفید، سرخ، بلند قامت ہے یا پستہ قد، پیشانی کا حلیہ کشادہ یا غیر کشادہ، اور اگر اس پر خال ہے یا مسہ یا داغ ہو تو اس کی وضاحت اور ابرو کا حلیہ پیوستہ یا کشادہ آنکھ کا حلیہ آہو چشم، میش چشم، ازرق چشم، گربہ چشم، کور چشم،

اسی طرح حلیہ بینی، ورخسار، گوش وریش و بروت وغیرہ۔ ریش میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ ریش سیاہ یا سفید، تراشیدہ یا دراز، کھوسہ (جس کے داڑھی مونچھ نہ ہو) جھبو (گھنی داڑھی) اور چہرہ کے حلیے میں داغ، چیچک، خال، مسہ، زخم شمشیر، برچھی، تفنگ وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے، گھوڑوں کے چہروں میں اقسام نسل مثلاً ترکی، یابو، عراقی، مجنس، تازی وغیرہ، پھر ان کے رنگ، نیلہ بوز، نیلہ کبود، نیلہ سرخنگ، نیلہ کمی، لاکھو، ہی کمیتی، سرنگ، سرمئی، ابلق مشکی، سرنگ، سفید، سنجاب، بلور، صندلی، ایسے ہی ہاتھی کا حلیہ اور اس کی اقسام، مست، شیرگیر، سادہ، منجھولا، کربیہ، پھندرکیہ،

ضابطہ اتباع خانہ | یعنی وہ سررشتہ جو خرید و فروخت سے متعلق ہے، اس کے متعلقہ عہدہ داران مثلاً مشرف و تحویلدار وغیرہ کے فرائض کے ساتھ متعلقہ کاغذات کے نمونے بھی بتائے جاتے ہیں،

سررشتۂ بخشی گری | یعنی سررشتۂ فوج۔ اس سلسلے میں بخشی کے فرائض اور اس کے متعلقہ کاغذات سے تفصیل بتائی جاتی ہے، مثلاً اوراق چہرہ، سیاہہ، چوکی، اوارجہ تنخواہ، فہرست برطرفی و بحالی، سیاہۂ طلب تنخواہ، سیاہۂ نگہداشت، سیاہۂ برطرفی، اوارجہ مساعدت، سیاہۂ داغ و تصحیحہ سیاہۂ خزانہ، اوارجہ خزانہ، تمسکات حاضر ضامنی تصحیحہ نامہ، تعیناتیاں، سیاہۂ حضور،

نقشۂ فوج بندی | برانغار (فوج پیشین جانب راست) جرنغار (فوج پیشین جانب چپ) میمنہ (فوج عقبی جانب راست) میسرہ (فوج عقبی جانب چپ) پیشگاہ۔ دست راست دست چپ، قراول (فوج پیشین و درمیانی) ہراول (حصہ فوج مابعد قراول) غزل (حصہ فوج مابعد ہراول) چنداول (حصہ فوج مابعد غزل)

دستور العمل ضوابط منصبداران | یعنی یک بیس منصبدار سے بیس ہزار کے منصبدار تک کی سالانہ جاگیری تنخواہوں کا اسکیل، داموں میں اور ان منصبداروں کے مدارج درجۂ اول، درجہ دوم وسوم، اسی طرح منصبداران نقدی کی تنخواہوں کا اسکیل،

ضابطہ وضعات | یعنی ایسا عمل وضعات جو ہر نقدی تنخواہ دار ملازم کی تنخواہ سے لازماً کیا جاتا تھا، ابواب وضع یہ ہیں: حصۂ اجناس فی صد للعہ، ایام شمسی قمری فی صد سے ؎، ؤماہہ بلا قصور ۱۳ا، خزانہ فی صد ؎ قصور دودامی فیصد چہ قصور شاہجہانی فی صد صہ

ان ضوابط کے علاوہ چند اور قوانین بھی ہیں جو حاضری، غیر حاضری، رخصت و بیماری کتخدائی، ماتم داری و اضافۂ منصب و استعفار (محکمۂ کنٹرول جنرل حسابات) وغیرہ سے متعلق ہیں،

فرائض دیوانیان اکرام | حسب ذیل کاغذات دیوان کے سامنے پیش ہوتے تھے، اور ان پر انکے دستخط ہوتے تھے، روزنامچہ جمع و خرچ و قبولت، تمسکات حاضر ضامنی و مال ضامنی و تعہد خدمت و یادداشت واقعہ و تصدیق رسالہ بخشیاں وسائر چوکی و تصدیق حاضر ضامنی،

روزنامچہ، اوآرجہ وجمع وخرچ

تجاویز مختص بہ عہدہ داران | بعض عہدہ داروں کو بعض خاص الفاظ کے ساتھ تجاویز کرنی پڑتی تھیں، مثلاً

وکیل مطلق کی تجویز	منظور دارند
پیشدست یعنی نائب کی تجویز	علیمت علیہ
دیوان کی تجویز	ثبت نمایند
پیشدست کی	ثبت شد
دیوان بیوتات	نقل بہ ہند
پیشدست کی	واقف شد
خان سامان	قلمی نمایند
پیشدست	اطلعت علیہ
بخشی	بگذرانند
پیشدست	واقف علیہ
مستوفی الممالک (کنٹرولر جنرل حسابات)	ملاحظہ نمایند
پیشدست	مطلع شد

فرائض خدمات متفرق | اس سلسلے میں مختلف خدمتوں کے فرائض اور ان کے متعلقہ کاغذات کے نمونے بتائے گئے ہیں، مثلاً خدمت امین کے فرائض کے تحت متعلقہ افسر کو امور رفاہ عام افزایش مال زراعت تشخیص مال و تقاوی تحصیل رقوم کی تاکید کی گئی ہے۔ کاغذات کے نمونوں کے سلسلے میں پروانچہ خدمت امین کے علاوہ بیعہ وحاضر ضامنی و قبولیت۔ شرح ضبطی، سیاہہ تشخیص معہ اقسام مختلف و طور مار جمع مال و جہات و سائر جہات و پروانہ فوجداری تاکید

مچلکہ، حاضری ضامنی قبض الوصول، یاد داشت خدمت قضا، پروانہ خدمت کروری، سیاہہ آمدنی، اوارجہ مال وجہات و سائر جہات یادداشت، خدمت احتساب و واقعہ نگاری و حضورنویسی و روزنامچہ حضور و نرخ نامہ وغیرہ دیئے گئے ہیں،

پیمانہ جات | مقداری پیمانوں میں رتی، ماشہ، تولہ، سیر، من، تانک، تنگہ، بہلولی، مثقال، صاع، رطل وغیرہ، اور مسافتی پیمانوں میں درعہ، طناب، جریب، بسوہ، کروہ، بیگہ وغیرہ

شرح دام | اس بحث میں یہ بتایا گیا ہے کہ دام کی قیمت روپیہ میں کس قدر تھی، اور کس منصبدار کو کتنے لاکھ دام کی جاگیر کے لیے کتنا روپیہ دیا جاتا تھا۔

تعریفات و اصطلاحات | بعض خاص دفتری اصطلاحات کی تعریفیں بھی دی گئی ہیں، جو عموماً دفاتر میں مروج تھیں، مثلاً فرد، بند، طبلق (اصل کاغذات کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کاغذ اوپر لپیٹا جاتا ہے) قیدک (طبلق پر باندھنے کا تاگا) مثل، سیاہہ، اوارجہ، تاریخ (تختہ جات جس میں کئی اشیاء کی رقمیں ہر شے کے لیے ایک کے نیچے ایک لکھی جاتی ہیں) افزون (رقوم آمد و خرچ جو ایک پر ایک لکھی جاتی ہیں) تختہ، دفتر، تصحیحہ (معائنہ موجودہ فوج) مسودہ مبیضہ، ورق داغ (صفحات کے نشان) من ذالک (خرچ کی مد) کھتاونی (مسودہ کاغذ آمد وخرچ) یادداشت، روزنامچہ، سیاہہ، ارمسٹھ (جمع وخرچ یک ماہ زائد از یک ماہ کم از یک سال) جمع وخرچ (حساب آمد وخرچ روزانہ یا ماہانہ یا سالانہ) گوشوارہ (فہرست ابواب مجمل) فہرست، برآورد، ترک (تختہ حساب) جمع وصول باقی (حقیقت آمد وخرچ رقم موجود)

اخبار الاخیار

از جناب خواجہ احمد فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی

اردو کے قدیم اخباروں میں اخبار الاخیار کا درجہ بہت بلند ہے، جو سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے شائع ہوتا تھا، اس نے ہمیں مغربی علوم سے روشناس کرایا، اور "دیسی زبان" کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے اصول کی پرزور حمایت کی،

اخبار الاخیار نام کے کئی پرچے نکلے ہیں، لکھنؤ سے دو اخبار اسی نام کے شائع ہوئے، ایک ۱۸۷۲ء میں اور دوسرا ۱۸۸۲ء میں اجرا ہوا،[۱] دہلی سے بھی ایک اخبار اسی نام کا یکم اپریل ۱۸۸۷ء سے نکلنا شروع ہوا،[۲] لیکن یہاں اس اخبار کا ذکر مقصود ہے جو ان سب سے پہلے یعنی ۱۸۶۹ء میں، مہینہ میں دوبار، منشی فرمان علی خاں کی ادارت اور مطبع چشمۂ نور قصبہ مظفرپور ضلع ترہٹ میں سائنٹفک سوسائٹی بہار کی طرف سے شائع ہوتا تھا، ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوسائٹی ۲۴ مئی ۱۸۶۸ء کو قائم ہوئی تھی،

اختر شاہنشاہی میں لکھا ہے:

"اخبار الاخیار، متعلقہ سین ٹیفک سوسائٹی بہار، از مطبع چشمۂ نور، قصبہ مظفرپور ضلع ترہٹ، پندرہ روزہ، آٹھ ورق اوسط، سالانہ بارہ روپئے، محصول تین روپئے، میر مجلس نواب سید محمد تقی خاں صاحب بہادر آنریری مجسٹریٹ، سکریٹری مولوی سید

۱؎ اختر شاہنشاہی مطبوعہ اختر پریس لکھنؤ ص ۹ ۲؎ ایضاً

امداد علی خاں صاحب بہادر، اڈیٹر منشی قربان علی خاں[1]، اجراء ۱۸۶۸ء[2]،

یہ اخبار بائیں طرف سے بطرز انگریزی لکھا جاتا تھا، دراصل ارادہ یہ تھا کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چھاپا جائے گا،[3]

۱۵ اپریل ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں مولوی سید امداد علی سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی[4] بہار کی وہ تقریر درج ہے جو انھوں نے "بحضوری ممبران کمیٹی" کی تھی، ہم اس کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں جس سے اس اخبار اور سوسائٹی کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے:

"بانیان سوسائٹی ہذا کا مطلب دلی یہ ہے کہ علوم یورپ (جو واسطے ترقی دولت و جاہ دنیوی کے نسخۂ اکسیر اور کبریت احمر سے زیادہ مفید اور پر تاثیر ہیں) اس ہندوستان میں پھیل جاوے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ جس طرح اہل انگلستان نے کتب علمیہ میں گریک اور لاطینی اور عربی و سنسکرت کو زبان انگریزی ترجمہ کرکے اپنے ملک میں پھیلایا اور بعد تحقیقات کلی اور تجربات قرار واقعی کے ہر علوم و فنون کی تکمیل کرکے ہزار در ہزار طریقے ترقی مال و دولت اور ترفع جاہ و عزت کے ایجاد کیے ہیں، اسی طرح سے اہل ہند کتب علمیہ زبان انگریزی کے بذریعہ ترجمہ بزبان ملکی اپنے ملک میں پھیلا کر بزور ذہن و ذکا اور عقل رسا اپنے صدہا طریقے واسطے ترقی مال و جاہ کے ایجاد کریں گے، اور ہزارہا کتابیں اپنے تجربہ اور تحقیقات کی تصنیف و تالیف کرکے نہ صرف اپنے ملک کی ترقی اور سرسبزی میں کوشش کریں گے، بلکہ اپنی روشن ضمیری کے پرتوے سے دوسرے ممالک کے شائقین علوم کے دلوں کو بھی پرنور اور مسرور فرمادیں گے۔"[5]

---

[1] لندا ایلین اخبار الاخیار میں قربان علی خان ہے [2] اختر شاہنشاہی: اختر الدولہ حاجی محمد اشرف ص ۹ [3] اخبار الاخیار مظفر پور مورخہ ۱۵ اپریل ۱۸۶۹ء بشکریہ محی شاہ مقبول احمد صاحب [4] ایضاً ص ۲۲۰ - ۲۲۱

آگے لکھا ہے کہ ہم دیسی زبان کی اعلیٰ یونیورسٹی کے قیام کی کوشش بھی کر رہے ہیں،

یہاں "دیسی زبان" سے مراد اردو ہے، اس اخبار کا طلوع اس پر آشوب احول میں ہوا تھا جب اردو ہندی کی بحث چھڑ چکی تھی۔[1] بابو شیو پرشاد اور ان کے ساتھی اردو کی مخالفت کر رہے تھے، لیکن کچھ لوگ اس کی حمایت پر بھی کمربستہ تھے، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں منشی حکم چند پروفیسر قدیم دلی کالج نے ایک محققانہ اور مدلل مضمون اردو کی ابتدا، اس کی ضرورت اور اہمیت پر لکھا تھا، غرض اس نئی تحریک پر خوب گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں اور تائید و تردید میں بہت سے مضامین شائع ہو رہے تھے، اخبار الاخیار کے صفحات بھی اس بحث سے خالی نہیں ہیں،

۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں "تقریر بلاغت تنویر جناب سید وارث علی صاحب مدرس و سپرنٹنڈنٹ مدرسہ متعلقہ سینٹیفک سوسائٹی صوبہ بہار، مقام مظفر پور در بارۂ بحالی رواج اردو" مندرج ہے، یہ دراصل ان اعتراضات کا جواب ہے جو سید وارث علی کے مضمون بعنوان "بحالی رواج زبان اردو بحروف فارسی" مطبوعہ اخبار الاخیار مورخہ ۱۵ مارچ ۱۸۶۹ء پر ہوئے تھے، معترضین نے ناگری حروف کے رواج پر زور دیا تھا۔

سید وارث علی کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اردو تمام ہندوستان کی عام زبان ہے۔

(۲) اردو کا خط مثل زبان اردو کے ٹھیک ملبوس زبان مذکور کا ہے، اس لیے کہ اس رسم خط میں عہد بہ عہد نئے الفاظ کے شمول کے ساتھ تغیر ہوا ہے،

(۳) ہندی یا سنسکرت کے رواج سے عوام کا نقصان ہوگا، اس لیے کہ سنسکرت کا فائدہ از روئے اصول مذہبی صرف برہمنوں کو پہنچ سکتا ہے۔

---

[1] خطبات گارساں دتاسی ص ۵۲۳ تا ۵۲۹۔ سولھواں خطبہ: ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء۔

(۴) ناگری رسم خط ہندی کے لیے محمد شاہ کے زمانے سے رائج ہوا ہے۔

(۵) اردو آسان اور سنسکرت، ناگری خط اور ویاکرن مشکل ہے۔

اس تقریر کا بقیہ خلاصہ ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۶) "جس قدر کتابیں علوم اہل یورپ کی زبان اردو مروجہ میں جیسا کہ ان کا ہونا قرین مصلحت تھا، ترجمہ و تصنیف ہوئی ہیں، ناگری میں نہیں پائی جاتیں۔"

(۷) اردو کسی قوم کی خاص زبان نہیں ہے، بلکہ اس زبان میں ہندو مسلمان، انگریز و یہود وغیرہ جملہ سکنائے ہند شریک ہیں، اور ہر ملت و مذہب کی کتابیں اور ہر قسم کے علوم اسی زبان میں جاری و ساری ہیں، حتیٰ کہ ترجمہ چاروں وید ہنود اور توریت و انجیل اور زبور اور فرقان مجید کا مع ترجمہ کتب انگریزی بابت ہر قسم علوم و فنون کے اس زبان میں موجود ہیں۔"

اسی اشاعت میں بعنوان "کارسپانڈنس" پنڈت شیو ناتھ سکریٹری لٹریری سوسائٹی فتح پور کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، جس کے اہم نکات یہ ہیں:

(۱) اردو "درست شدہ زمانہ حال کی ہندی زبان" ہے، پس ہم اردو کا عدالتوں میں جاری رہنا مناسب تصور کرتے ہیں، اور "بجائے حروف مجاریہ حال" کے دیوناگری جاری کرنے کی بھی ہماری رائے نہیں ہے۔

(۲) اردو کا رسم خط مناسب ہے اور بہت کم جگہ گھیرتا ہے۔

(۳) اردو کی بہت ترقی و تہذیب ہو چکی ہے۔

(۴) اگر اردو و فارسی خط میں منظور نہیں تو پھر رومن کا جاری ہونا بہتر ہے۔

مرزا غالب دہلوی کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا ہے۔[1] یکم جون ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار

---

[1] رسالہ اردو، اپریل ۱۹۳۵ء ص ۲۸۷

میں "چند قطعات تاریخ وفات مرزا غالب نور اللہ مرقدہٗ از سیدنا ابو العلا حضرت شاہ محمد یحییٰ ابو العلائی" مندرج ہیں، ان دو قطعوں میں سے ایک قطعہ نقل کیا جاتا ہے:

مرزا نوشہ جناب غالب — در فنِ سخن وری یگانہ
از اہل سخن ربودہ دہا — در شعر بطرز جاودانہ
کیفیتِ نثرِ او چہ گویم — دارد انداز دلبرانہ
باشد بہ کلامِ او عجب لطف — معشوقانہ و عاشقانہ
از کشورِ ہند تا بفارس — زاکوس کمالِ خسروانہ
در وجد آرد قلوبِ پاکاں — قولش در قالب ترانہ
مستانہ کلام او بخشد — کیف و سکرِ مے شبانہ
ایں اشعارم بہ مدحتِ او — نبود گفتارِ شاعرانہ
ہر انچہ کہ گفتہ ایم یاراں — باشد قولِ محققانہ
بگذاشتہ خاکِ پاکِ دہلی — در شوقِ بہشتِ جاودانہ
سال آں بے نظیر یحییٰ — گو بود نظیریٔ زمانہ
۱۲۸۵

۱۵ر جون ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں مولوی وارث علی کی ایک کتاب "علم تعمیر و پل بندی" کا ذکر ہے کہ "اگر وہ پسندیدہ رائے ممبران سوسائٹی ہو تو گورنر ممالک مغربی و شمالی کو واسطے حاصل کرنے انعام بھیجی جائے"، اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے ایک سلکٹ کمیٹی مقرر کی گئی،

اسی پرچہ میں مندرجۂ ذیل کتابوں کا ذکر ہے، جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں:

مصنف	نام کتاب	نام علم
مولوی عبد اللہ عبیدی، پروفیسر ہگلی کالج	رسالہ تمدن	پولٹیکل اکانومی
" "	رسالہ ہیئت	اسٹرانمی
" "	مناہل جغرافیہ	جغرافیہ
رائے سوہن لال، سپرنٹنڈنٹ نارمل سکول پٹنہ	رسالہ جبر و مقابلہ	الجبرا
" "	رسالہ طبیعات	نیچرل فلاسفی
" "	رسالہ علم حیوانات	جیالوجی (کذا)
" "	رسالہ معدنیات	بوٹانی (کذا)
میر صادق علی، رڑکی کالج	رسالہ مثلث	مثلث
" "	فن عمارت	انجنیری

سوسائٹی کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اور باقی کے چھاپنے کی تیاری ہے، اس کے علاوہ مصر سے بھی نیچرل فلاسفی اور مارل فلاسفی کی وہ کتابیں خرید نے کا ارادہ ہے جو یورپی زبانوں سے عربی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ سوسائٹی نے حکومت سے درخواست کی تھی کہ "ایک مترجم واسطے ترجمہ کتب انگریزی وغیرہ کے۔ بنظر فائدہ عام اور پھیلانے علوم یورپ مقرر فرماوے اور گورنمنٹ ایک راہ ایسی نکال دے کہ جس سے اقسام علوم یورپ کا ہندوستان میں عموماً پھیل جاوے" حکومت نے اس کا جواب "چٹھی مورخہ ۲۹ جولائی ۱۸۶۸ء" میں ہمت افزا دیا ہے،

۱۵ جون ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں درج ہے کہ "عند التحقیق یہ بھی معلوم ہوا ہے اس زمانہ تک کل کتابیں انٹرنس کے درجہ تک کی زبان انگریزی سے بزبان ملکی ترجمہ ہو چکی

صرف بڑے درجہ کے علوم کی کتابوں کا ترجمہ ہونا باقی ہے۔ ان میں سے بھی چند کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں"

اسی اشاعت میں یہ اطلاع بھی ہے کہ "چھاپہ خانہ سنگی خاص طیار ہوئے، چنانچہ مبلغ ما ۱۱صہ واسطے خرید چھاپہ خانہ کے بمقام کلکتہ روانہ ہو چکا ہے۔ بعد پہنچنے اس کے، کتابیں مع اخبار بذریعہ چھاپہ خانہ خاص کے چھاپے جاویں گے۔"

سوسائٹی کی ان خبروں کے ساتھ اس کے مقاصد کی بھی وضاحت کی ہے:

"منشا اس سوسائٹی کا یہ ہے کہ بذریعہ اس سوسائٹی کے مدرسہ قائم ہوکے انواع علوم درجہ اعلیٰ، بذریعہ ترجمہ زبان ملکی کے اس میں پڑھائے جاویں اور اقسام ہنر مثل فن کشت کاری اور آہن گری اور درودگری وغیرہ بذریعہ استادان اہل یورپ اور اہل ہند کے عام اہل حرفوں کو سکھائے جاویں، اور ان کا عمل کرایا جائے۔"

۱۵ر جولائی ۱۸۶۹ء کے اخبار الاخیار میں مولوی وارث علی کی ایک تقریر درج ہے۔ جس میں انھوں نے سرسید کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے:

"مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر جج اسمال کاز کورٹ بنارس جو بتقریب شہر لندن، تشریف فرمائے شہر عدن ہوئے .... تحریر فرماتے ہیں کہ الحمدللہ اردو کی شاہنشاہی شہر عدن تک قائم و برقرار ہے، اور عدن کے باشندے اردو میں بے تکلف گفتگو کرتے ہیں۔"

اسی اخبار میں دوربین، جلوہ طور اور پائنیر کے حوالے سے وہابی تحریک کے متعلق ایک اہم خبر درج ہے:

"پائنیر میں لکھا ہے کہ وہابیوں سے اب جیل خانہ آباد ہوتا جاتا ہے، ایک پیر باشندہ دانا پور اور دو مشہور وہابی راج شاہی کے، اور ایک مشہور مولوی مالوہ کا، جنھوں نے

سرحد کے پار نو بھرتیاں اور روپیہ بھیجا تھا، اور شہادت کا خیال خام بچایا تھا۔
آہستہ آہستہ صحیح سلامت ہر ایک جیل خانہ میں پہنچا۔"

۱۵/ اگست ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اقتصادی پریشانی کا ذکر ہے کہ" روزانہ تین ہزار من غلہ بیرونجات کو بذریعہ ریل روانہ ہوتا ہے، اس لیے بارہ سیر گیہوں کا نرخ ہوا ہے۔"

یکم اگست ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں چند دلچسپ تعلیمی خبریں اور علمی مضامین" نیر اکبر" کے حوالہ سے لکھا ہے:

"پنجاب کے ڈائرکٹر بہادر نے حکم دیا ہے کہ انگریزی مدرسوں میں علوم دیسی زبان میں سکھائے جائیں۔ واقع میں یہ تجویز بہت پسندیدہ ہے، ہم کو یاد ہے کہ پرانے کالج دہلی میں بھی یہی قاعدہ عمدہ جاری تھا[1] ہمارے نزدیک اس کا اجرا ہونا سب جگہ مناسب ہے۔"

ایک مضمون کا عنوان ہے" تحریک صاحب انگلش مین دربارۂ تعلیم درجہ اعلیٰ بزبان ملکی۔" اس میں لکھا ہے:

"یہ جو مشہور مچی رکھا ہے کہ ہندوستانی یا اور کوئی زبان مروجہ ہندوستانی علوم و فنون کے قابل نہیں ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ اس سے یہی سمجھا جاوے گا کہ زبان ہی بنیاد علم ہے نہ کہ علم بنیاد زبان۔ ہر ایک زبان کی تکمیل اس وقت ہو سکتی ہے جب فوائد علمیہ اسی زبان میں حاصل کیے جاویں، اور وہ زبان استعمال میں لائی جاوے۔"

یکم اگست ۱۸۶۹ء کے پرچے میں ہے

"فرینڈ آف انڈیا کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ آج کل بھی زبان ملکی میں کسی کتاب

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرحوم دلی کالج از ڈاکٹر عبدالحق اور دلی کالج میگزین کا قدیم دلی کالج نمبر مرتبہ راقم، نومبر ۱۹۵۳ء

درسیہ کی محتاجی نہیں ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ زبان اردو میں سب درسیہ کتابیں موجود ہیں، اور ان میں سے بعض کتاب بہت عمدہ ہے ...... روڑکی انجینرنگ کالج اور آگرہ اور لاہور کے میڈیکل کالج کا ورنا کلر ڈیپارٹمنٹ اس بات کا ثبوت کامل ہے کہ اردو زبان کو یہ قابلیت حاصل ہے کہ بذریعہ اس کے تعلیم علوم یورپ کی بخوبی ہوسکتی ہے"

اس کے بعد یورپین زبانوں سے اردو میں جو تراجم آگرہ کالج، ڈاکٹر اسپرنگر اور دہلی اورنٹیل سوسائٹی کے زیر اہتمام ہوئے ہیں ان کا ذکر کیا ہے[۵]۔

۱۵ اگست ۱۸۶۹ء کے پرچہ میں ایک اور ایسا ہی مضمون "درباب تعلیم اہل ہند بزبان ملکی" درج ہے، جو انگلش مین سے نقل کیا گیا ہے، اسی اشاعت میں غبارۂ جدید کی تیاری کی بھی خبر ہے، اس قسم کی سائنسی خبریں اخبار الاخیار میں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔

۱۵ جولائی ۱۸۶۹ء کے اخبار میں علم جر ثقیل اور مروارید کے پیدا ہونے کا بیان ہے، ۱۵ مئی ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں شیشہ جوڑنے، آب نقرہ تیار کرنے "شیر آمیز" سے پانی علحدہ کرنے، برف جمانے، چیچک کے داغ دور کرنے کی ترکیبیں اور دیگر صناعات کا حال درج ہے،

سائنسی علوم کے روشناس کرانے میں قدیم دلی کالج نے بڑی خدمت انجام دی ہے، لیکن پروفیسر رام چندر کے مفید الناظرین (اجرا ۱۸۴۶ء) اور سائنٹفک سوسائٹی بہار کے اخبار الاخیار (اجرا ۱۸۶۶ء)[۲] یا سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ[۳] تک عشق کی

[۱] اخبار الاخیار مظفرپور: یکم اگست ۱۸۶۹ء ص ۳۱۳ [۲] اخبار الاخیار کس تاریخ تک نکلتا رہا یہ صحیح نہیں معلوم لیکن ۱۸۷۳ء میں سرجارج کیمبل نے بنگال کے ہندوستانی پریس کے

(بقیہ حواشی ص ۴۸۳ پر)

ایک جست" نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ سب ایک ہی سلسلہ کی چیزیں اور ایک ہی ارتقائی زنجیر کی کڑیاں ہیں، اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کے اثر سے جو نئی شش جہت قائم ہوئی یا نیا نقطۂ نظر پیدا ہوا، اس کی تعمیر میں ان اخباروں کا بڑا حصہ ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا سکتا،

(بقیہ حواشی ص ۳۸۳) بارہ میں جو تحقیقات کی تھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ۸۳ اخبار نکلتے تھے، جن میں اخبار الاخیار مظفر پور بھی تھا، بحوالہ مموائر سر جارج کیمبل۔

۳ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی ۱۸۶۲ء میں قائم ہوئی، اور ۱۸۶۶ء میں اس کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شائع ہوا،

سلیمان نمبر

معارف کا سلیمان نمبر جس کا شائقین و قدر دان معارف کو مدت سے انتظار تھا ابھی میں شائع ہو گیا، اس میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور ان کے علمی و دینی، قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا پورا مرقع آگیا ہے، پہلے سیرت و سوانح کا حصہ ہے، پھر عمومی حیثیت کے مضامین اور مقالات ہیں، اس کے بعد مرحوم کے سلوک و تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں متعدد منظومات اور قطعات تاریخ ہیں، یہ نمبر معارف کے مستقل خریداروں کو ع۸ میں اور عام خریداروں کو علاوہ محصول ڈاک کے چار روپے میں دیا جاتا ہے۔ صرف ۱۵ سو چھپا تھا، تھوڑے نسخے اور رہ گئے ہیں، جلدی کیجئے۔

(مرتبہ شاہ معین الدین ندوی)

منیجر

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

سید عبد الحکیم صاحب دسنوی

اعظم گڈھ

محترمی زاد لطفکم

السلام علیکم، آپ کے خطوط یکے بادیگرے ملے، سب سے پہلے تو میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کو جانِ نو اور قوت تازہ بخشی، اور آپ کو آپ کی اس "سرِ نو جوانی" پر مبارکباد دیتا ہوں، کتنی دفعہ ارادہ کیا کہ آپ کی عیادت اور ملاقات کے لیے آپ تک پہنچوں، مگر ذاتی حالات اور دوسرے مشاغل نے فرصت نہ دی، وطن کی مہجوری کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا، اور اب اس کی زیارت کے لیے اولین فرصت کا جویاں ہوں، اور عید اضحیٰ کے بعد آخر مئی میں اس کے دیدار کی مسرت حاصل کرنا چاہتا ہوں،

کتنا عزم صمیم تھا کہ قومی ہنگاموں میں شرکت نہ کروں، امروہہ کے اجلاس جمعیت العلماء سے خطوط اور تار آئے، مگر ٹالتا رہا، کہ صحت کا قوام اتنا بگڑ گیا ہے کہ ذرا بے احتیاطی، روزانہ کے پروگرام میں ہوئی اور اس نے جواب دیا، مولوی مسعود علی صاحب کی تقریب سے واپس آ رہا تھا کہ آنکھیں جوش

کرآئیں، یہ طوفان کم ہوا، تو زبان میں چھالے پڑگئے، یہ اچھے ہوئے تو بیچش کی خلش نے ستایا، اس سے نجات ملی تو دانتوں میں درد کی نوبت آئی، زخم بننے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ رات ہی کو نشتر سے خون فاسد نکلوانا پڑا، پرسوں مولانا حمید الدین صاحب کے ہاں صرف ۱۰ میل موٹر کار پر گیا، ۱ بجے دن کو واپس آیا تو زکام کی خبر ہے، بہرحال یہ زندگی اب یوں ہی نشیب و فراز میں بسر ہوگی، اس کا کیا شکوہ الحمد للہ علیٰ کل حال۔

امروہہ نہ جانے کا قطعی ارادہ تھا، کل مولوی احمد سعید صاحب ناظم کا آخری تار آیا کہ "تمھاری ضرورت بیحد ہے، ضرور آؤ"۔ ایک ندوی برادری کے اہلکار امروہہ کا خط آیا کہ آنا لابد ہے، مشکل یہ ہے کہ ہر مجلس میں دو فریق باہم نبرد آزما ہیں، اور دونوں میں عزیز ترین احباب ہیں، اب جاکر کس کی مخالفت اور کس کی موافقت کی جائے، امروہہ میں دوسرا جلسہ "مجلس توسیع نظام علماء" نام جمعیت کے خلاف ہے جس میں مولانا محمد علی اور مولانا عبد الماجد وغیرہ ہیں، ادھر مولانا کفایت اللہ وغیرہ، مولانا کفایت اللہ صاحب کا خط آیا کہ آپ کے آئے بغیر کام نہ چلے گا، ہر جلسہ میں یہ ہوتا ہے کہ داعیوں کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کرۂ ارضی کا صرف میری ذات پر مدار ہے، مگر جب جایئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سا کوئی غیر ضروری عنصر نہیں اور مجھ سا کوئی سادہ لوح نہیں، جو یوں خطوط اور تار پر اعتبار کرکے چلا آیا،

یہ قصہ تو اپنی جگہ پر ہے، دوسرا قصہ یہ ہے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب (میرداد) نے المبین نام ایک کتاب لکھی ہے، ہمارے ایک فاضل دوست ڈاکٹر عبد الستار صدیقی پی، ایچ، ڈی، سابق پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی نے اس پر تنقیدی ریویو لکھا، اور معارف میں چھپا، میں نے یہ کتاب خود نہیں پڑھی، دوسری طرف ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد نے نئے سال کی ادبی کتابوں پر انعام کے لیے جو سب کمیٹی بنائی، اس میں سات آدمیوں میں ایک میں بھی تھا، دو صاحبوں نے ان میں سے اپنی کتابیں خود پیش کی تھیں، وہ رائے سے محروم رہے، باقی ۵ رہ گئے، رشید صدیقی، ماجد میاں، سجاد حیدر، نیاز فتحپوری

اور میں، رشید صدیقی صاحب نے تین اور صاحبوں کو ہموار کر لیا تھا، ماجد میاں کی رائے الگ تھی، میں مذبذب کہ شعر الہند نکل گئی، اس لیے کثرت رائے البین پر ہوگئی، اور انعام اس کو ملا، معارف میں لکھ چکا تھا کہ میں نے کتاب نہیں دیکھی، اور واقعہ بھی ہے کہ اکاڈیمی کے دفتر نے میرے پاس کتابیں نہیں بھیجیں، بہرحال مخالفین نے میرے اس نوٹ پر نوٹ لکھا کہ ایسی حالت میں سید سلیمان نے البین پر انعام کی رائے کیسے دی، ادھر مولانا سلیمان اشرف میرے معارف کے نوٹ پر اور تنقید سے آزردہ ہوئے، مولانا شروانی نے بھی اس تنقید کی اشاعت پر آزردگی ظاہر کی،

اب تھیٹر کا تیسرا سین ملاحظہ کیجئے، مسلم یونیورسٹی کا نظم ونسق از سرنو ہو رہا ہے، اساتذہ اور معلمین اوپر نیچے اور ہر طرف کیسے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں دینیات کے شعبہ پر بھی نظر ثانی ہو رہی ہے، اسکے لیے کورٹ نے تین آدمیوں کی سب کمیٹی بنائی ہے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب اور مولانا ابوبکر صاحب میں سے کون ریڈر رہے اور کون لکچرار ہو، اول میرے خاندانی عزیز اور دوسرے میرے مکرم دوست (مولانا ابوبکر صاحب جونپوری، مولانا سخاوت علی جونپوری استاد مولانا مصطفیٰ شیر صاحب مرحوم و مولانا یعقوب صاحب مرحوم وغیرہ اکابر دیوبند کے استاد کے پوتے ہیں) کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ، مولوی ابوبکر صاحب کے تقرر میں دوسروں کے ساتھ میری کوشش بھی شریک تھی، بہرحال اس سب کمیٹی کے صدر نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی ہیں، فخرالدین صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کا خط آیا کہ تحریری اس معاملہ میں اپنی رائے لکھیے، مگر آج مولانا شروانی کا تار آیا کہ ۶ مئی کو سب کمیٹی کا جلسہ علی گڈھ میں ہے، شرکت کیجئے، اس تار نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ امروہہ کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے، جہاں ۳، ۴، ۵ مئی کو اجلاس ہے اور رستہ وہی ہے، ساتھ ہی خیال آیا کہ اگر میری ناچیز کوشش سے علماء کے ہر دو فریق میں مصالحت ہو جائے تو بڑی سعادت ہے، چنانچہ آج دوپہر کو فیصلہ ہوا کہ کل ۳ مئی کو سفر کیا جائے، اور امروہہ ہو کر علی گڈھ پہنچا جائے، جہاں سے نواب سر مزمل اللہ خاں

سے بقیہ تین ہزار بھی شاید وصول ہو جائیں، الغرض کل روانہ ہو جاؤں گا، اور آج سر شام وقت نکال کر آپ کو اپنی رام کہانی سنانے بیٹھا ہوں، ۵ تک شاید واپسی ہو،

بیچ میں حیدرآباد کی سرکار سے اردو ٹائپ کانفرنس کے لیے بلاوا اور تین فرسٹ کلاس کرایہ کی پیشکش تھی، تیار ہوا مگر عین وقت پر کچھ اضطراب قلب، کچھ مولوی عبدالباری کے ایک خط، کچھ خوف صحت ان سب نے مل ملا کر ایسا گھبرایا کہ سفر ملتوی کر دیا تھا، اب سفر کے نام سے جی گھبراتا ہے، مگر سفر مجھکو نہیں چھوڑتا،

ملکی سیاست کا جو حال ہے، وہ داستان تو الگ رکھیے اور جگ بیتی چھوڑ کر اب آپ بیتی سنیے، آپ کے مدرسہ کا تقاضا ہے، میرے ٹال مٹول سے آپ کو یا آپ لوگوں کو یہ شبہہ ہوگا کہ میں "بخل" سے کام لیتا ہوں، میرا کچا چٹھا سنیے، میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ میرے ماہانہ آمدنی (دو سو) کے اندر اخراجات ہوں، سو حال یہ ہے کہ عہ ماہوار میرے باورچی خانہ کا مع مصارف خانہ داری خرچ ہے، عہ ماہوار بیوی کی نذر ہیں، پندرہ ماہوار ملازم، دائی، حجام، دھوبی وغیرہ کی تنخواہیں ہیں، سو ہو گئے، دوسرا سو لیجئے، پچیس ماہوار سہیل، پندرہ اور کبھی بیس ماہوار سیدہ، پچیس ماہوار جوتے، کپڑے وغیرہ کی دوکانوں کیلئے میرے اور تمام اہل و عیال کے مصارف سالانہ کے متعلق جو ادھار ہوتے ہیں، اور ماہانہ ادا ہوتے ہیں، ستر ہوئے، باقی ۳۰ عہ، متفرقات میں خرچ ہوتے ہیں، جیسے بیماری و علاج، سفر، اتفاقی خریداری اشیاء، غرض یہ میرے حصہ کی رقم ہے، جو بہت کم پس انداز ہوتی ہے، پس انداز اگر ہوتی ہے تو ؟ یونیورسٹی کے پرچوں وغیرہ کی اجرت، میں حق المقدور اس کو ہاتھ نہیں لگاتا، اب میرے سالانہ چندوں کی فہرست سنیے، جو دوران سال میں ادا ہوتے ہیں، اور امسال ہو چکے ہیں، اور ہوں گے، بمد وظائف سالانہ ندوہ ۱۰۰ سالانہ، مدرسہ اصلاحیہ سرائمیر عہ، مدرسہ اسلامیہ اعظم گڈھ عہ ۱۲ سالانہ، انجمن امداد غربا، اعظم گڈھ عہ ۱۲ سالانہ، ندوہ چندۂ رکنیت عہ سالانہ،

ایجوکیشنل کانفرنس چندہ رکنیت ۵ سالانہ، امارت شرعیہ عـہ سالانہ، انجمن تبلیغ الاسلام انبالہ عـہ سالانہ
انجمن تبلیغ صوبہ متحدہ ۲ سالانہ (بابت ۳ سال)

ان میں سے ایجوکیشنل کانفرنس کے چندے کے سوا بحمد اللہ تعالیٰ سب ادا ہوتے ہیں، اور امسال بھی ادا ہوئے، اب آپ کی رقم عـہ سالانہ ہے، بات یہ ہے کہ جس کا تقاضا سخت ہوتا ہے اسکو اداکرنا پڑتا ہے، اب آپ کا تقاضا سخت ہوا تو عـہ سال گذشتہ کے اداکر دیے، انشاء اللہ امسال کے بھی اداکر دوں گا، شاید اسی مہینہ میں یا آیندہ مہینہ میں۔

تاریخ اکابر دسنہ کا حال بہت کچھ مرتب ہوگیا، ایک مہینہ بھی دسنہ میں رہنا ہوا تو پورا ہو جائے گا، دو چیزیں میرے پاس نہیں ہیں، حافظ محمد جان صاحب کے خاندان کا پروانہ نامہ نہیں ملا، یہ ملنا چاہیے، اور سجھا دان کا نسب نامہ چاہیے، معلوم نہیں کس کے پاس ہے، مولوی مناظر حسن صاحب والد سے گیلانی سے نقل اس کی مل سکے تو حاصل کیجئے،

دادا مرحوم کی ایک مختصر کتاب احوال سلاسل سہروردیہ شیخ احمد چرم پوش اور شجرۂ قادریہ میں تھی، اس کو چھپوا رہا ہوں، ساٹھ ستر اس میں خرچ ہوں گے، یہ روپئے خاندان میں عظمت علی صاحب سے بحساب ۵ سیکڑہ وصول کرنا چاہتا ہوں، اگر یہ اسکیم کامیاب ہوئی، تو کل کتاب مدرسہ کو نذر شاید ۸ کی کتاب قیمت ہو، آخر میں اکابر دسنہ کی تاریخ وفات کے قطعات مؤلفہ حکیم صاحب مرحوم دیدینا چاہتا ہوں،

آپ بیتی کیفیت کا ایک زیر پردہ نظارہ باقی رہ گیا ہے، روز بروز طبیعت کا رخ دوسری طرف ہو رہا ہے، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے خط وکتابت جاری ہے، خدا جانے توفیق ملتی ہے یا نہیں، معیار اتنا بلند ہے کہ نظر کہیں کم جمتی ہے، بہرحال کچھ نہ کچھ "راز ونیاز" کا سلسلہ جاری ہے، (یہ تمام تر راز ہے)

مالی سلسلہ کی ایک تازہ کڑی اور ملاحظہ طلب ہے، یونیورسٹی کے سلسلۂ امتحان میں گورنمنٹ سو پچاس جو دیتی ہے، اس کی تقریب میں اس کو اس میں سے کچھ واپس لینے کا خیال آیا، اور انکم ٹیکس کے صیغہ کو لکھا گیا، اطلاعیں آئی ہیں، رجسٹرڈ نوٹسیں آئیں، دو ہزار سال سے زائد آمدنی پر ٹیکس ہے، اس زد میں میں آتا ہوں، پھر دارالمصنفین پر بھی بحیثیت ایک کاروباری کارخانہ کے یہی مطالبہ ہے، حالانکہ میں نوکر نہیں ہوں، ریاست بھوپال سے ایک مذہبی کام کے لیے عارضی وغیر مستقل الاؤنس پاتا ہوں، اور دارالمصنفین بھی ایک مذہبی ورفاہ عام کا ادارہ ہے، اور یہ سرکاری انکم ٹیکس سے خارج ہیں، بہرحال اس اصول پر لڑائی ہوگی، نتیجہ حوالۂ خدا،

آج میں نے قلت فرصت کے باوجود خلافِ عادت کہ رات کو آنکھوں سے کام نہیں لیتا، بعد مغرب لالٹین میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں کیونکہ کل صبح ۹ بجے روانگی ہے، غالباً یہ مطول ومفصل خط "نصف ملاقات" سے کچھ زیادہ ہی ثابت ہوگا، والسلام

سید سلیمان

۲؍مئی ۱۹۳۰ء

اعظم گڈھ

محترمی اطال اللہ بقاءکم

السلام علیکم۔ کارڈ بحالت انتظار پہنچا، جب آپ کا خط کچھ دنوں نہیں آتا تو میں اس کے معنی آپ کی علالت سمجھتا ہوں، اس لیے الجھتا ہوں، ادھر میرے خط آپ کے پاس باقاعدہ نہیں گئے، وجہ یہ ہے کہ ادھر مجھے دو تین مجلسوں میں مضمون پڑھنے ہیں، ان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھا، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ۱۱ مارچ کو "ہندوستان میں ہندوستانی" یعنی اردو پر مضمون پڑھنا ہے، اس لیے کل یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔ واپس آکر شاید اہل وعیال کو وطن سے پٹنہ تک

پہنچانے آؤں۔

پھر اپریل کے شروع میں جامعہ ملیہ دہلی میں "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" پر ایک لکچر دینا ہے، اور ۱۵۔۱۶ کو لاہور کے ادارۂ معارف اسلامیہ میں "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" ایک مقالہ سنانا ہے، اسی لیے ۱۵ اپریل کو دیسنہ کی شادیوں کی تقریب میں شریک نہ ہوسکوں گا۔

جو آپکے قلب کا حال ہے وہی میرے قلب کی کیفیت ہے، خدا جانے یہ کارخانہ کب تک چلے، سب کچھ کرتا ہوں، مگر دل کی امنگ ساتھ نہیں، خدا رحم فرمائے۔

"سلمان ہندی" ۲۶ مارچ کو شاید دیسنہ پہنچیں، بغداد کی ایک انجمن ہدایت اسلام ربیع الاول میں کوئی مجموعۂ مضامین سیرت تقسیم کرے گی، اس کے لیے مجھ سے بھی تقاضا ہے، مگر مضمون مقرر کردیا ہے، رحمۃ للعٰلمین اس سال بھی رہ گئی۔

خیریت ہے۔ والسلام

سید سلیمان۔ ۱۵ مارچ ۱۹۳۳ء

اعظم گڈھ

محترم دام کرمہٗ

السلام علیکم۔ رمضان کے بعد خاموشی صرف روزوں کا خمار تھا، چند روز مولانا حسین احمد صاحب کی صحبت میں گذرے، اپنے کسی عزیز کی تقریب میں آئے تھے، ایک روز شبلی منزل بھی ٹھہرے، تقریب میں ساتھ شریک رہے، مولانا حمید الدین صاحب کے بعد نمازوں میں انکے ساتھ لطف آیا، سرکار حیدرآباد نے چار ہزار کی بقیہ رقم یکشت ادا کردی، دار المصنفین کو اگر یہ رقم نہ مل جاتی تو مالی مشکلات میں مبتلا ہو جاتا، بھوپال نے امسال سو روپیہ کم کردیے اور صرف ایک سو جاری رکھا، ارادہ ہے کہ ایک شاگرد کے ذریعہ محرم سے ایک تبلیغی رسالہ اردو میں نکلواؤں، مگر کوئی فتنہ

نہیں، الا یہ کہ لوگ خریداری کریں، انشاء اللہ یہ مفید ہوگا۔

والدہ شمیمہ نے آپ کی تحریک پر حافظ صاحب کی مد میں عمر ماہوار منظور کیا ہے، میں تو آجکل غریب و نادار ہوں، مکان و باغ نے تہی دست کر دیا ہے، مسجد کی مرمت کا کام آپ نے شروع کر دیا، جزاک اللہ۔ اگر اشد ضرورت پڑے تو مجھے بھی "تکلیف" دیجیے۔

الحمد للہ خیریت ہے۔ ننھا بچہ جس کا نام سلمان پڑا ہے، اور تاریخی نام ابوالمظفر ہے، اچھا ہے، باغ کی خیریت لکھیے۔

سید سلیمان، ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء

اعظم گڈھ

عم محترم دام لطفہٗ

السلام علیکم۔ والا نامہ بہت انتظار کے بعد ملا، یاد آوری کا شکریہ، میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ رحمۃ للعالمین کے حکم کی نصف تعمیل کر دی ہے، یعنی سیرت کمیٹی لاہور کی فرمائش پر اس کا ایک حصہ امسال کی تقریر سیرت کے طور پر "رسولِ وحدت" کے عنوان سے لکھکر بھیجدیا ہے، شاید وہ دو جزوں میں آئے، دیسنہ میں چیچک کی وبا کا حال سنکر تعلق و تردد ہے، اب گرمی ہیں تو اس کی اور ترقی کا موسم ہے، کاش کہ اہل دیسنہ نماز باجماعت کا اہتمام کرتے، اور نماز کے بعد اس بلا کی دوری کی دعا، مغرب میں تو یہ اہتمام ہو سکتا ہے،

غلوں کی نسبت جو سوال ہے اس کا جواب یہ عرض ہے کہ آؤں تو وہ غلہ کام آئے، فروخت میں تو کوئی قیمت ہاتھ نہیں آئے گی۔

برادرم عبدالقیوم سلمہٗ سے کہدیجئے کہ مزید روپیہ کی آپ نے حد نہیں بتائی کہ کتنا چاہیے، میں سو پچاس بھیج سکتا ہوں۔

آجکل سیرت میں دوزخ کی سیر ختم کرکے بہشت کی سیر میں مشغول ہوں، خدا مبارک کرے،

والسّلام

سید سلیمان، ۲۷ اپریل ۱۹۳۲ء

اعظم گڈھ

محترم دام لطفہٗ

السلام علیکم۔ آج پانچویں رمضان کی صبح ہے، بحمد اللہ خیریت ہے۔ دسمبر کی اکثر تاریخیں سفر میں گذریں، کچھ سیاسی اور کچھ قومی، آپ کی اور مولوی قاسم صاحب کی دعوت سفر وطن کی تھی، مگر حالات سے مجبوری ہے، ورنہ میں تو دینہ کے رمضان کا اب بھی عاشق ہوں، وطن کے دوسرے جبری مسافروں کی طرح یہ بھی امید نہیں کہ قوم کی نوکری سے پنشن ملے گی، اور گھر بیٹھنا نصیب ہوگا،

میں نے آپ کے لکھنے کے مطابق قاضی احمد حسین صاحب کو لکھا تھا، انھوں نے دسمبر کے جلسہ میں شرکت کے ساتھ تحریک کا وعدہ کیا تھا، معلوم نہیں یہ وعدہ کہاں تک وفا ہوا، اور کیا اثر ہوا،

سیرت کی چوتھی جلد آپ ختم کر چکے ہونگے، آپ پر کیا اثر پڑا، آپنے جس شبہہ کا ذکر کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ نبی قلوب وارواح کی اصلاح کے لیے آتے ہیں، مگر قلوب و ارواح اللہ تعالےٰ نے یکساں نہیں بنائے ہیں، خود انسان کے ذاتی ارادوں اور کوششوں کو بھی اس قبول اصلاح میں دخل ہوتا ہے، آپ دینہ میں مریضوں کی اصلاح کے لیے ہیں، مگر جو آپ کیطرف متوجہ نہیں، اور آپکی حذاقت پر جنکو شبہہ ہے، اور آپ تک آتا بھی نہیں، آپ اس کا علاج کیونکر کر سکتے ہیں، ان ہی کے لیے خدا کا یہ قول ہے "وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ" ۔ رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا، اور الست کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلانا فرض ہے، منوانا فرض نہیں،

والسلام

سید سلیمان

۵ رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ

۲ جنوری ۱۹۳۳ء

ندوہ۔ لکھنؤ

محترم السلام علیکم

میں ۱۱ جنوری کو اعظم گڈھ سے نکل کر لاہور، لدھیانہ، سہارنپور، تھانہ بھون، دیوبند، دہلی ہو کر کل لکھنؤ پہنچا، دہلی میں آٹھ روز لگ گئے، خالدہ خانم کے عزیز کمال عاطف بے جو کابل میں مشیر قانونی تھے، خالدہ خانم سے ملنے کے لیے دہلی آئے تھے، اور پہنچنے کے دوسرے دن رات کو ہوٹل میں دفعۃً ان کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے چند روز کے لیے جامعہ کا جلسہ بند کرنا پڑا، اور مجھے چند روز کے لیے مزید رکنا پڑا۔

خالدہ خانم سے متعدد ملاقاتوں میں ٹرکی کی مذہبی حالت پر بحث رہی، وہ کہتی رہیں کہ آپ اپنے خیالات ٹرکی کے اخبارات میں چھپواتے رہیے، بہت سنجیدہ، فہیم، متین اور عفت مآب خاتون معلوم ہوتی ہیں، لباس بھی ساتر ہے،

عزیزی عبدالعلیم کے لیے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا خط لیکر بھجوا دیا تھا، کیا ہوا، عبدالعلی کا وظیفہ منظور ہو گیا، آپ جلد از جلد ان کو لکھنؤ بھیجد یجئے، پتہ: بادشاہ باغ، ندوہ بتا دیجئے، یہاں آکر دفتر میں ان کو ہدایت مل جائے گی،

یہاں تو سخت پالا پڑا ہے، جس سے آم کے چھوٹے درخت جل گئے، اب آپ اپنے باغ کا حال لکھیے کہ اس پر کیا گذری،

میں اس وقت اعظم گڈھ جا رہا ہوں، ۸ بجے صبح کو چل کر ۴ بجے شام کو پہنچوں گا۔

والسلام

سید سلیمان

یکم فروری ۱۹۳۶ء

ادبیات

عرضِ شوق

از زائرِ حرم جناب حمید صدیقی

اشکِ غم یوں ڈبڈبا کر رہ گئے
جیسے تارے جھلملا کر رہ گئے

جانے والے تو مدینہ چل دیے
ایک ہم آنسو بہا کر رہ گئے

اضطرابِ شوق میں بے ربط سے
چند فقرے لب تک آ کر رہ گئے

دل بھر آیا، آنکھ پُر نم ہو گئی
اُف نہ کی، لب تھرتھرا کر رہ گئے

دل پہ رکھا ہاتھ، ٹھنڈی سانس لی
کچھ نگاہوں سے بتا کر رہ گئے

گنبدِ خضرا کا جب آیا خیال
دل کے گوشے جگمگا کر رہ گئے

سنتے ہی ذکرِ گلستانِ قبا
زخمِ دل سب مسکرا کر رہ گئے

آ گئی جب یاد محرابِ نبیؐ
ہم ادب سے سر جھکا کر رہ گئے

ہائے وہ جلوے جو اٹھتے ہی نظر
دیدہ و دل میں سما کر رہ گئے

اللہ اللہ ان کی قسمت کا فروغ
جو درِ اقدس پہ جا کر رہ گئے

خیر تو ہے بات کیا ہے اے حمیدؔ
ایک ہی مصرع سنا کر رہ گئے

شب معراج

از

جناب اثر رام پوری

ہے شب وصل شہِ ہر دو سرا آج کی رات
بقعۂ نور ہے کل ارض و سما آج کی رات

کتنی پر نور و حسیں ہے بخدا آج کی رات
ذرے ذرے کی نرالی ہے ادا آج کی رات

حرم کعبہ سے جب شہ نے کیا عزم فلک
وجد میں آگیا خود غارِ حرا آج کی رات

جگمگاتے ہوئے تاروں نے چمک نذر زمیں دی
جب گیا سوئے فلک بدرِ دجیٰ آج کی رات

وہ عبائے عربی اور وہ عمامۂ سبز
جس کا ہر پیچ بنا عقدہ کشا آج کی رات

جس طرح شمع پہ پروانوں کا ہوتا ہے ہجوم
تھا یونہی گرد فرشتوں کا پرا آج کی رات

راز کی باتوں کے لائق نہ تھی قاصد کی زباں
اس لیے خود ہی کہا جو بھی کہا آج کی رات

لاکھ پردوں میں ازل سے جو نہاں تھا جلوہ
شوق نے اس کو بھی بے پردہ کیا آج کی رات

ہمکلامی میں نہ تھا گوش و دہن کو کوئی دخل
عقل حیراں تھی کہ کیا کس نے کہا آج کی رات

کفر و ایماں کی کسوٹی تھی یقیناً معراج
کوئی کاذب کوئی صدیق بنا آج کی رات

سائل رحم و کرم ہے اثرؔ خستہ جگر
در سے محروم نہ جائے یہ مہمان آج کی رات

مطبوعات جدیدہ

مشاہدات وواردات

از جناب ایم عبدالرحمن خاں صاحب، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۵۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ستے، پتہ: ایم ثناء اللہ خاں، ریلوے روڈ، لاہور۔

مصنف روشناس صاحب قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، اب انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور بعض افکار وخیالات کو مشاہدات وواردات کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے، ان میں ابتدا سے تلاش حق اور حرکت وعمل کا مادہ تھا، اس لیے انھوں نے مختلف اوقات میں مختلف راہیں اختیار کیں، اور ان کا تعلق اسٹوڈنٹس فڈریشن، کانگریس، مجلس احرار اور مسلم لیگ وغیرہ مختلف جماعتوں سے رہا، اور مذہبی تعلیمات سے بھی پوری آگاہی حاصل کی، آخر میں سلوک ومعرفت کے کوچہ میں قدم رکھا، اور اس کے احوال ومقامات کی سیر کی، کسب معاش کے سلسلہ میں کچہری سے تعلق رہا، جو بجائے خود ایک بڑی تجربہ گاہ ہے، ان تمام مراحل میں ان کو جو دینی ودنیاوی واخلاقی ومادی تجربات حاصل ہوئے اور اس سے جو خیالات پیدا ہوئے ان کو انھوں نے سبق آموز اخلاقی واصلاحی رنگ میں پیش کیا ہے، یہ کتاب ۲۱-۲۲ مضامین پر مشتمل ہے، مثلاً کچھ اپنے متعلق، اولیا، اللہ کی معرفت، سکون قلب کی تلاش، روحانیت کی فتح، عذاب قبر کی ابتدا، اقبال اپنی نظر میں، قائد اعظم کی نماز، قائد اعظم کا مقام، فرودگاہ محمد بن قاسم، علمائے حق اور ارباب مسلم لیگ، انگریزی نظام حکومت بدعنوانیاں اور ارباب اقتدار کا اخلاق، پرویز کا اسلام وغیرہ، اس فہرست سے مضامین کی نوعیت کا اندازہ ہوگا، ان سب میں کوئی نہ کوئی دینی یا دنیاوی سبق پیش کیا گیا ہے، اس لیے یہ کتاب دونوں حیثیتوں سے

مفید ہے، اس سے اخلاقی سبق بھی حاصل ہوتا ہے، اور دنیاوی امور میں بھی بصیرت حاصل ہوتی ہے لیکن قائد اعظم کے دینی و روحانی درجہ اور مولانا اشرف علیؒ سے ان کے روحانی تعلق کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ہم ظاہر بینوں کی فہم سے باہر ہے۔

حیات ولی۔ مولانا رحیم بخش مرحوم دہلوی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۶۵۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۳۵ پتہ: مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور،

یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی، ان کے اسلاف کرام اور انکی اولاد و امجاد کا تذکرہ ہے، جو آج سے نصف صدی پیشتر لکھا اس سے بھی پہلے لکھا گیا تھا، اور اب نایاب تھا، اس لیے مکتبہ سلفیہ نے اس کو دوبارہ شائع کیا ہے، اس زمانہ میں تاریخ اور سوانح نگاری کا موجودہ علمی طرز عام طور سے رائج نہ ہوا تھا، اور اس کے مصنف پرانے مذاق کے بزرگ تھے، اس لیے یہ تذکرہ بھی پرانے طرز کا ہے، اور اس میں کشف و کرامات اور مبالغہ کا عنصر زیادہ ہے، خصوصاً شاہ صاحب کے اسلاف کا تذکرہ تو بالکل تذکرۃ الاولیا معلوم ہوتا ہے، البتہ شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب اور ان کی اولاد کے حالات تاریخی ہیں، ان کے علمی کمالات کا بھی ذکر ہے، مگر شاہ صاحب کے علمی و دینی کارناموں پر جیسی تفصیلی اور جس نوعیت کی بحث کی ضرورت تھی وہ نہیں ہے، حضرت شاہ صاحب کی ذات جامع العلوم بلکہ منبع العلوم تھی، اور اس سے علوم پھوٹتے تھے، وہ اپنے دور میں دینی علوم کے مجدد تھے، انھوں نے اس میں نئی روح پھونکی، خصوصاً اسرار دین پر ان کی نگاہ جیسی حکیمانہ اور نکتہ رس تھی، اس کی مثالیں گذشتہ ائمہ میں بھی کم ہی ملیں گی، ان علوم کے علاوہ قوموں اور حکومتوں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور سیاسی، اقتصادی اور تمدنی مسائل پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی جس کے اشارے جابجا ان کی تصانیف میں ملتے ہیں، اس کتاب میں ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس کتاب سے اس نامور خاندان خصوصاً شاہ صاحب کی علمی جلالت اور ان کے علمی و دینی کارناموں کا اجمالی اندازہ ہوجاتا ہے،

بعض اور خامیاں بھی ہیں، مگر اس سے اس کتاب کی اہمیت میں فرق نہیں آتا، اردو میں ایسی بھی کوئی کتاب نہیں ہے جس میں خاندان ولی اللّٰہی کے اتنے حالات بھی مل سکیں، اس لئے حشو و زوائد کے باوجود اس کتاب میں بہت سی کار آمد اور مفید باتیں مل جاتی ہیں، اور ان کی مدد سے ایک اچھی کتاب لکھی جا سکتی ہے، اس لیے اس کمیاب کتاب کی اشاعت ضروری تھی۔

کتاب نورس

مرتبہ جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۸۰ صفحات،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ: دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ،

دکن کے عادل شاہی سلاطین میں ابراہیم عادل شاہ اپنی علم دوستی اور علماء نوازی میں بہت ممتاز تھا، اور اس کا عہد دکن کی علمی تاریخ کا زریں دور تھا، تاریخ فرشتہ جیسی کتاب اسی کی علم نوازی کی یادگار ہے، وہ خود بھی صاحب کمال تھا، شاعری اور موسیقی سے خاص ذوق رکھتا تھا، فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا، موسیقی میں خود بھی مہارت رکھتا تھا، کتاب نورس اسکا نمونہ ہے، یہ فن موسیقی کی کتاب نہیں ہے، بلکہ مختلف راگ راگنیوں میں اس کے اشعار کا مجموعہ ہے، اس میں مختلف راگ راگنیوں کے عنوانات کے ماتحت اس کے اشعار درج ہیں، یہ اشعار اگرچہ دکھنی زبان میں ہیں لیکن ان میں ہندی الفاظ، ہندوانہ خیالات اور ہندو دیومالا کا اثر غالب ہے، اور پورا کلام محاسن شعری سے آراستہ ہے، یہ کتاب ابتک طبع نہیں ہوئی تھی، لائق مرتب نے اس کے مختلف قلمی نسخے فراہم کرکے ان کی مدد سے یہ نسخہ مرتب کیا ہے، کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں ابراہیم عادل شاہ کے مختصر حالات ہیں، اور نورس کی ادبی و شعری حیثیت کا تجزیہ کرکے اس کے خصوصیات اور محاسن دکھائے گئے ہیں، اور اس کے مختلف نسخوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب ہے، کتاب کے آخر میں اس کا اردو ترجمہ، اس کی تلمیحات کی تشریح اور اس کے لغات کا فرہنگ ہے، مقدمہ اور آخر کے ضمیمے فاضل مرتب کے مضامین کی طرح ان کی محنت، دیدہ ریزی اور دقت نظر کا نمونہ ہیں، اس کتاب کی

اشاعت سے ایک قدیم ادبی و لسانی یادگار محفوظ ہوگئی، اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں کی زبان اور ان کے علوم سے کتنی دلچسپی تھی،

الحسین - مرتبہ جناب شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی تقطیع اوسط، ضخامت ۲۱۲ صفحات، عمدہ کاغذ پر خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت مجلد عہ، مکتبہ جدید انارکلی لاہور،

حضرت امام حسین علیہ السلام اور حادثۂ کربلا کے حالات میں اب اردو میں متعدد مستند کتابیں ہوگئی ہیں، دارالمصنفین کے سلسلۂ سیر الصحابہ میں بھی مفصل حالات ہیں، مذکورۂ بالا کتاب مصر کے ایک صاحب قلم عمر ابو النصر کی کتاب الحسین کا ترجمہ ہے، کربلا کا حادثہ ایسا درد انگیز ہے کہ اس کا حال لکھنے میں جذبات پر قابو اور خیالات میں اعتدال قائم رکھنا بہت مشکل ہوجاتا ہے، اس لیے اس موضوع پر اردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بہت کم افراط و تفریط سے خالی ہیں، مگر الحسین بڑی حد تک اس سے پاک اور صحیح نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور مستند تاریخی روایات پر مشتمل ہے، گر خشک تاریخ بھی نہیں ہے، بلکہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی عظمت و جلالت اور واقعہ کربلا کی اہمیت اور اس کی دینی و اخلاقی حیثیت پوری طرح نمایاں کی گئی ہے، کتاب کے شروع میں منصب خلافت کی حیثیت اور اس سے پیدا شدہ اختلافات اور اس کے نتائج پر صحیح تبصرہ کیا گیا ہے، ترجمہ بھی صاف اور سلیس ہے۔

ثنائے حبیب - از جناب بہزاد لکھنوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، کاغذ، کتابت اور طباعت بہتر، قیمت: مجلد عہ، پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ۔

جناب بہزاد اس دور کے ممتاز نعت گویوں میں ہیں، ان کی نعتوں کا ایک مجموعہ اس سے پہلے شائع ہوچکا ہے، ثنائے حبیب نیا مجموعہ ہے، اس کی تمام نعتیں زبان کی سادگی و سلاست کا نمونہ، کیف و اثر سے معمور اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

"م"

مکتبۂ دارالمصنفین

سنہ ۱۹۵۰ء کی نئی مطبوعات

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزمِ تیموریہ کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے، اب اس سے پہلے کے مسلمان حکمران خاندانوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و مذہبی کارناموں اور اُن کے درباروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے، انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی نبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے، لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی، اور علماء و شعراء کی جو قدردانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی ملتانی، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہرہ، عمید سنامی، شمس دبیر، امیر خسرو، امیر حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے، خصوصاً اس دور کے قابلِ قدر نادرِ روزگار شعراء ریزہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی مرتبہ منظرِ عام پر لایا گیا ہے، اُن کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے قیمت عہ

مآل و مشیئت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی نقطوں مآل و مشیئت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انہی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحوں میں پوری بحث پر تبصرہ ہے، (از صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالاتِ روسو)

قیمت عہ

(طابع و ناشر صدیق احمد)

رجسٹرڈ نمبر ا ۵۲۰ے [illegible] سنہ ۱۹۵۵ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

اسلام اور عربی تمدن

یعنی شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی، اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور قرون وسطی کی پر فریب سیاست کا پردہ چاک کیا گیا ہے،

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

قیمت: سے

حکمائے اسلام جلد اول

دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ، یہ جلد پانچویں صدی ہجری تک کے حکما کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں یونانی اور اسلامی فلسفہ کی مختصر سرگذشت تحریر ہے، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ سے مذہب کی تخریب و بیخ کنی کے بجائے زیادہ تر مذہب کی تائید و حمایت کا کام لیا ہے،

(مؤلفہ عبدالسلام ندوی)

قیمت: عہ

جلد ۷۶ ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات

اپنی صحیح خارجہ پالیسی کی بدولت ہندوستان نے چند برسوں کے اندر بیرونی دنیا میں اتنی اہمیت اور اتنا وقار حاصل کرلیا ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں اس کی دوستی کی خواہشمند اور پیچیدہ بین الاقوامی معاملات میں اسکی امداد اور رہنمائی کی طلبگار رہتی ہیں، اور اس مقصد کے لیے مختلف حکومتوں کے نمایندے برابر آتے رہتے ہیں، چنانچہ گذشتہ مہینہ میں دو بڑی حکومتوں کے سربراہ اور حکمراں ہندوستان آئے، ایک کمیونسٹ دنیا کے لیڈر، اور روس کے وزیر اعظم بلگانن اور ان کے رفیق خرد شیف، دوسرے سعودی حکومت کے فرمانروا سلطان سعود بن عبد العزیز، اگرچہ سعودی حکومت کوئی بڑی طاقت نہیں ہے لیکن دنیائے اسلام کے مذہبی مرکز کی خدمت، پٹرول کی دولت اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کی بنا پر اسکی بڑی اہمیت ہے، عرب حکومتوں میں مصر کے بعد سب سے بڑی اور بیرونی اثرات سے آزاد یہی حکومت ہے، اور عرب اور ہندوستان کے تعلقات نہایت قدیم ہیں، ظہور اسلام کے بہت پہلے سے ان دونوں میں تجارتی تعلقات قائم تھے، پھر اسلام کے بعد علمی، مذہبی، تہذیبی اور سیاسی مختلف قسم کے تعلقات پیدا ہوگئے، اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے پیشتر جنوبی ہند کے ساحلی علاقہ میں عرب تاجروں کی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، مالابار کے موپلا انہی عربوں کی یادگار ہیں،

ہندوستان میں اگرچہ عربوں کی حکومت کل ڈیڑھ دو صدی رہی اور سندھ اور ملتان سے آگے نہیں بڑھی، مگر اس نے یہاں بڑے پایدار نقش چھوڑے جو ابتک باقی ہیں، اس کے بعد غزنویوں سے لیکر لودیوں تک ہندوستان میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں وہ سب عباسی خلافت کی مذہبی سیادت کو مانتی تھیں، اور عباسی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھتی تھیں، اور ان کے اکثر فرمانروا اپنے سکوں پر بھی ان کا نام نقش کرتے تھے، اس طرح

عرب و ہندوستان کے درمیان صدیوں سیاسی تعلق بھی رہا، اور جب خلافت کا منصب ترکوں کی جانب منتقل ہوگیا، اس وقت بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی تعلق بدستور عرب سے قائم رہا، اور وہ حرمین کی خدمت اپنے لیے باعثِ فخر و سعادت سمجھتے تھے، یہاں کے سلاطین و امراء کی جانب سے حرمین کے لیے بڑے بڑے اوقاف تھے، اور ان کے خدام کے لیے سالانہ نذرانے اور تحائف جاتے تھے، جس کا سلسلہ حیدرآباد، بھوپال اور ٹونک وغیرہ کی ریاستوں کے خاتمہ تک برابر قائم تھا، آج بھی ہندوستان میں چار کروڑ مسلمان آباد ہیں، ان کی اتنی بڑی تعداد پاکستان اور انڈونیشیا کے علاوہ کسی اسلامی ملک میں بھی نہیں ہے، ہر سال ہزاروں ہندوستانی حج و زیارت کے لیے جاتے ہیں، اس مذہبی تعلق کے علاوہ دونوں ملکوں کے درمیان تہذیبی رشتہ بھی بڑا قوی ہے، اسلام نے ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، کسی غیر اسلامی ملک میں اسکے اتنے اثرات نہیں ہیں جتنے ہندوستان میں ہیں، اور ہندوستانی تہذیب کا کوئی پہلو بھی اسکے اثر سے خالی نہیں ہے۔

خود عربوں کو ابتدا سے ہندوستان کے ساتھ بڑا لگاؤ رہا ہے، عرب مصنفین نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کو اسلامی ملکوں کے پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، اور ہندوستان کی قدیم تاریخ، اس کے مذاہب، علوم و فنون، تہذیب و معاشرت وغیرہ کے حالات بھی لکھے ہیں، بلکہ بعض مصنفین نے اس پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں اور یہ کتابیں ہندوستان کے اسلامی عہد کی فارسی تاریخوں سے زیادہ قدیم اور ہند قدیم کے حالات کا بڑا مستند ماخذ ہیں، اس حیثیت سے عربوں نے ہندوستان کی بہت بڑی علمی خدمت انجام دی ہے، اسلیے عرب و ہندوستان کے تعلقات کی بڑی بڑی گہری ہیں۔

موجودہ بین الاقوامی حالات نے ان تعلقات کی اہمیت اور زیادہ بڑھا دی ہے، عرب اور ہندوستان دونوں پڑوسی ملک ہیں، ایک کے سیاسی حالات کا دوسرے پر اثر پڑنا ناگزیر ہے، عرب حکومتوں کا سلسلہ عراق سے لیکر شام و مصر تک چلا گیا ہے، اور یہ پورا علاقہ امریکن اور کمیونسٹ بلاک کی شاطرانہ چالوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے، عرب حکومتوں میں مصر کے بعد سب سے بڑی اور بیرونی اثرات سے آزاد سعودی حکومت ہے، اور بین الاقوامی سیاست میں ہندوستان کی ہم خیال ہے، ان اسباب کی بنا پر دونوں کے تعلقات کی تجدید ضروری تھی، یہ مسرت کا مقام ہے کہ اس ضرورت کو

محسوس کرکے دونوں حکومتوں نے ایک دوسرے کیجانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے، اور اس مبارک مقصد کیلئے خود سلطان نے ہندوستان آنے کی زحمت گوارا کی، اسلیے یقین ہے کہ اس سے دونوں کے تعلقات میں اور زیادہ استواری ہوگی، اور مشرق وسطیٰ کی سیاست پر اس کا بڑا اثر پڑیگا، سلطان سعود کی حیثیت محض ایک مسلمان حکمراں کی نہیں ہے بلکہ وہ خادم الحرمین بھی ہیں، اسلیے مسلمانوں کا ان سے اخوت کے علاوہ عقیدت کا بھی تعلق ہے، اس لیے ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں، اور انکی آمد کو ہندوستانی مسلمانوں کی خوش بختی اور انکے لیے فال نیک سمجھتے ہیں،

دوسرے دونوں مہمان کمیونسٹ دنیا کے رہنما اور ایک بڑی حکومت کے وزیر اعظم ہیں، ہمارے نقطۂ نظر سے کمیونزم اور امپیریلزم دونوں کی بنیاد خالص مادیت اور خود غرضی پر ہے، اسلیے دونوں دنیا کے لیے فتنہ ہیں، مگر اس وقت امپیریلزم کی فتنہ انگیزی زیادہ بڑھ گئی ہے، اور یہ لوگ دنیا کے لیے امن و آزادی کا پیام لیکر آئے ہیں، اور روس اور ہندوستان کے اتحاد کا اثر دنیا کے امن و امان پر بہت گہرا پڑیگا، اسلیے ایک معزز مہمان اور امن کے پیامی کی حیثیت سے ہم ان دونوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں، مگر انھوں نے دلی اور آگرہ کی تاریخی عمارتوں اور ان کے بانیوں کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ نہایت لغو اور مہمل ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو انکی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے، پھر ہر چیز کو کمیونزم کے محدود پیمانہ سے ناپنا صحیح نہیں ہے، ورنہ انسانی عقل و دماغ کے سارے کارنامے اور انسانی ترقی کی پوری تاریخ پر پانی پھر جائیگا، خود کمیونزم کا یہ حال ہے کہ دنیا کا بڑا حصہ اسکو بدترین قسم کا استبدادی نظام سمجھتا ہے جس میں انسانی آزادی اتنی سلب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ اور جذبات و خیالات کا بھی مالک نہیں رہجاتا، اور جس میں ذرا سی اختلاف رائے کی سزا قتل اور پھانسی ہے جسپر روس کے واقعات شاہد ہیں، ایسی حالت میں اسکے معیار کی کیا قیمت ہوسکتی ہے، پھر انھوں نے جو بیانات دیے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے بھی سر سر غلط ہیں، اور اس سے انھوں نے اپنی تہذیب و شائستگی اور دانشمندی کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، مگر وہ اسمیں ایک حد تک معذور بھی ہیں، اسلیے کہ ابھی وہ اس منزل کے بالکل نووارد ہیں، اور اسکے آداب و رسوم سے واقفیت حاصل کرنے میں انکو عرصہ لگےگا۔ مدراس کے گورنر سری پرکاش صاحب نے بھی اپنی دعوت میں جو انھوں نے ان لیڈروں کے اعزاز میں دی تھی، بڑی خوبصورتی سے ان غلط خیالات کی تردید کی ہے،

مقالات

سلوکِ سلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب اشرف خانصاحب ایم، اے لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور

(۴)

تلاوت قرآن | جس طرح ہر عمل میں جان اخلاق و احسان سے پڑتی ہے، اسی طرح قرآن کریم کے برکات و انوار بھی اسی وقت حاصل ہوتے ہیں، جب اخلاص و احسان کی کیفیت کیساتھ تلاوت کی جائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے قرب و حضور کا دھیان اس طرح چھایا ہو کہ ان کا کلام ان ہی کو سنایا جا رہا ہے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ

"قرآن شریف کی تلاوت اس سکون اور استحضار سے کیجائے کہ، اللہ تعالیٰ سن رہے ہیں اور آپ ان کو سنا رہے ہیں"

ایک صاحب کو تحریر فرماتے ہیں :-

"قرآن پاک اس تصور سے پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری تلاوت کو سن رہے ہیں، پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو سماعت فرما رہے ہیں، تو ہم کو کس ذوق و شوق سے پڑھنا چاہیے، اگر یہ تصور ہو کہ ہمارا محبوب ہماری فریاد کو پاس کھڑا اپنے کانوں سے سن رہا ہے تو اس فریاد کی لے کیسی پر لذت ہوگی،

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لیے انعام ہو آپ خود سنتے ہیں آکر جو مرا پیغام ہے"

حب الٰہی و خشیت ربانی

سلوک عشق و محبت کا راستہ ہے۔ اس کی ہر منزل محبت کی شعلہ سامانیوں سے ہی طے ہوتی ہے، محبت کا جو بیج یوم الست میں بویا گیا تھا، سلوک کے مجاہدات سے اس کی آبیاری ہوتی ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت ہی وہ سرمایہ ہے جو سالک کے مردہ قلب میں جان ڈالتا ہے، آتش محبت ماسوا کے تصورات کو مٹا کر "جلوۂ جانانہ" سے ہم کنار کرتی ہے، اور داغ محبت وہ چراغ طور ہے جس کی تجلیاں عارف کے دل کو تابان و درخشاں کرتی ہیں، اگر محبت نہ ہو تو دل اور پتھر میں کوئی فرق نہیں، اس لیے حضرت رحمۃ اللہ محبت و خشیت الٰہی کی بڑی تلقین فرماتے تھے، ایک خط میں مولانا مسعود عالم ندویؒ کو لکھتے ہیں:

"آپ کے اس دوسرے خط نے مجھے بہت بامید بنا دیا ہے۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ وہابیوں کی خشکی آپ پر ایسی غالب آگئی ہے کہ عشق و محبت کی گنجایش آپ کے دل میں نہیں رہی ہے، الحمد للہ کہ میری یہ غلطی آپ کی نسبت آج جاتی رہی، میرا ایک پرانا شعر ہے:

اظہار کرکے عشق و محبت کے راز کو پھر سے بنا دیا مجھے امیدوار آج"

(مکاتیب ص ۱۴۸)

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"محبت الٰہی اور خشیت تو دین کی بنیادی چیزیں ہیں، محبت اللہ تبارک و تعالیٰ کے احسانات میں غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر کسی جابر و قاہر سے خوف کھانے کی طرح نہیں، بلکہ اپنے اعمال کے بدلے ملنے کا اندیشہ ہے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ لا لی و لا علیّ حالانکہ تمام امت ان کے کارناموں پر رطب اللسان ہے"۔

ایک مرتبہ فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ کا خوف سانپ بچھو کے خوف کی طرح نہیں بلکہ محبوب کی ناراضگی کے خیال کی طرح ہے"۔

ایک طالب نے عرض کی۔ "حضرت درد دل کس طرح حاصل ہو" فرمایا:

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے ۔۔۔ وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے ۔۔۔ اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

پھر ارشاد فرمایا: محبت نہ ہونے کی حسرت بھی بڑی نعمت ہے۔

محبت تو اے دل بڑی بات ہے ۔۔۔ یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے

یہی زندگی جاودانی بنے ۔۔۔ جو آبِ حیاتِ محبت ملے

ترے عشق کے غم کی دولت ملے ۔۔۔ تو سارے غموں سے فراغت ملے

اس کے بعد فرمایا: "اس کی خواہش ہو تو اہل اللہ کی صحبت اختیار کرے، محبت خاصان خدا کے قلوب کا خاص نور ہے ۔۔۔۔" جس طرح آتشی شیشے کی سوزش کے اثر سے کاغذ جل اٹھتا ہے یا چقماق کی رگڑ سے آگ پیدا ہو جاتی ہے، ان ربانی آئینوں (اہل دل کے قلوب) کے مقابل جو دل بھی شوق و طلب لیکر آتے ہیں، وہ محبت کے نور سے جگمگا اٹھتے ہیں، اہل اللہ کے قلوب بھی خدا جانے کیسی قوت رکھتے ہیں، جن کی ایک ہی نظر زندگی کو پلٹ دیتی ہے۔

اک نظر میں کچھ سے کچھ ہے میری دنیائے حواس ۔۔۔ ہوش جو تھا بیہشی ہے بیہشی اب ہوش ہے

ایک مرتبہ تسبیحاتِ فاطمہؓ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "سبحان اللہ" کا مطلب ہے کہ وہ تمام کمیوں سے بری اور پاک ہے، "الحمدللہ" کا مطلب ہے کہ تمام محبوبیتیں اور خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں، جب یہ کہا جاتا ہے تو محبت سے جی چاہتا ہے کہ چمٹ جائے۔ لیکن آگے 'اللہ اکبر' کہہ کر یہ بتایا گیا کہ وہ اتنی بڑی ذات ہے کہ وہاں یہ بات ممکن نہیں،

پاؤں تو حدِ ادب سے عشق سے باہر رکھ ۔۔۔ وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے"

اگرچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ باکمال اپنی دلستانیوں کی بنا پر سالک کے لیے سراپا جمال و

محبت ہے، مگر جلالِ الٰہی کا تصور عشق کو ان حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جو فانی اور مجازی محبتوں کا خاصہ ہے، بلکہ محبت الٰہی خشیت الٰہی و تقویٰ کے ساتھ مقرون ہوتی ہے کہ سب سے بڑے عاشقِ ربانی محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

اما واللہ انی لاتقاکم للہ واخشاکم لہ — خدا کی قسم میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا لحاظ[1] کرنے والا اور اس سے ڈرنے والا ہوں۔

اس لیے معرفت الٰہی حضرت حق کی بارگاہ قدس میں جرأت و دلیری نہیں سکھاتی، بلکہ خشیت و عبدیت کی تعلیم دیتی ہے، حضرت شیخ قدس سرہٗ فرماتے تھے، "محبت و خشیت کی دوگونہ کیفیت (کا مقصد ہونا) اس آیت سے بھی مفہوم ہے" قابل التوب شدید العقاب" اللہ تعالیٰ سے رجا عمل کے ساتھ جمع ہوتی ہے۔ بغیر عمل رجا نفس کا فریب، شیطان کا دھوکا اور کید ہے، عمل کرتے ہوئے لرزاں و ترساں رہے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ قبول ہو، والدین کی نافرمانی کرتے ہوئے ان کی مہربانی اور محبت کی امید رکھنا حماقت ہے"، کیونکہ مطلوب عقلی و شرعی محبت ہے جس کا خاصہ پابندی احکام ہے، اور اس کی ترقی بھی اعمال صالحہ اور اوامر الٰہیہ کے ظاہری و باطنی امتثال پر منحصر ہے، طبعی محبت گو ایک نعمت ضرور ہے، لیکن اس کی بقا اور مقبولیت کا انحصار بھی کتاب و سنت کے اتباع و فرمانبرداری پر ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"۔

اسی طرح محبت کا استغراق بھی مقصود نہیں، بلکہ غلبۂ محبت کے باوجود ہوش و حواس کی بقا اور احکام الٰہی کی کامل فرمانبرداری مطلوب ہے، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں ؛

"باقی جو آپ کی تمنا ہے کہ آپ کو عشق الٰہی اور عشق رسول ملے اور اس میں استغراق ہو جائے تو جہاں تک تمنا کا تعلق ہے، مناسب ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ آپ کو عشق الٰہی اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تقویٰ کا ترجمہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے "لحاظ" کیا تھا، جو اس موقع پر خوب جچتا ہے۔ (اشرف)

حاصل نہیں، صحیح نہیں، ہر مومن کو اس کا مرتبہ کچھ نہ کچھ حاصل ہے، اور آپ کی یہ صورتِ تمنا اس کی دلیل ہے، البتہ اس میں ترقی اعمال خیر میں ترقی ہی سے ممکن ہے، جس قدر اعمال میں ترقی ہوگی اور محبوب حقیقی کے احکام کی تعمیل میں ترقی ہوگی، اسی قدر اس مرتبہ میں ترقی ہوگی۔ انشاء اللہ تعالے۔

باقی استغراق اور انہماک کی طلب تو یہ ناسمجھی سے ہے، استغراق و انہماک کمال نہیں بلکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے پاک تھے، آپ غور کریں کہ کسی محبوب کے احکام کی تعمیل میں دیوانہ پن اور بے خبری دلیل کمال ہے۔ یا ہشیاری اور بیداری کمال کی دلیل ہے، سنا ہے کہ انگریز سپاہی شراب میں مست ہو کر لڑتا ہے، اور پٹھان پوری ہشیاری اور بیداری سے۔ بتایئے، ان دونوں میں شجاعت اور بہادری کا اعلیٰ نمونہ کس میں ہے"۔

اسی خط میں اسی طالب کو اس شکایت کے جواب میں کہ طبعی کمزوری کی بنا پر بعض اوقات دوسروں کے اصرار کی وجہ سے لغزش ہو جاتی ہے"۔ ارقام فرمایا:۔

"کسی شخص کے کہنے یا اصرار سے کام کرنا اگر امر مباح ہو، یعنی شرع سے اس کی اجازت ہو، تو خیر کسی مسلمان کی خوشی کے ثواب کی نیت سے کر سکتے ہیں، لیکن وہ امر اگر غیر مباح اور ناجائز ہے تو کسی حال میں اس کا کرنا درست نہیں، لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق"۔ دوسرے جس شخص کے اصرار سے آپ کرتے ہیں، اس کی رضا آپ کو مقصود ہوتی ہے، تو آیا رضائے الٰہی مقصود ہونا چاہیے یا کسی غیر کی رضا، پھر دعوائے عشق یا تمنائے عشق کے کیا معنی"۔

ایک خط میں ان ہی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ سے استفادہ کے متعلق تحریر فرمایا:

"حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات ہر وقت جاری ہیں، انہی سے استفادہ کا مادہ ہونا چاہیے، اور اسکی صورت حضور علیہ السلام کی محبت عقلی ہے، جس کا مظہر اتباع و احکام و سنت ہے"۔

گویا محبت الٰہی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بقا اوامر الٰہی کے ظاہری و باطنی اتباع

کا صلہ اور نتیجہ ہے، اس لیے عشق الٰہی جو تصوف کی روح ہے، بغیر احکام شرعیہ کی کامل پابندی کے حاصل نہیں ہوتا" جس کے دل میں یہ چراغ طور روشن ہو جاتا ہے، اس کا دل سرمدی کیف و یقین کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے، شکوک و شبہات کے اوہام، بے یقینی و تذبذب نور ایمان کی روشنی سے کافور ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ خود بھی بڑا رؤف و رحیم ہے، اس کے در پہ جو بھی درد دل کی سوغات لے کر حاضر ہوتا ہے، نامراد نہیں لوٹتا، اس کا دریائے فیض تو ہر وقت جاری ہے، نگاہ لطف تو بہانہ تلاش کرتی ہے

دو چشم محبت تو جو پائے محبت ہو ۔۔۔ دیکھے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ

حضرت والا ایک دل شکستہ طالب کو تحریر فرماتے ہیں۔

"مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالیٰ سراسر امید ہیں، وہ رؤف و رحیم ہیں۔"

ایک طالب کو جس نے اپنے حالات میں کوتاہی اور کمی کا تذکرہ کیا تھا تحریر فرماتے ہیں:

"آپ نے اپنے موجودہ حالات جو لکھے ہیں، وہ بے شبہ گذشتہ سے فروتر ہیں، مگر کوئی مایوسی کی بات نہیں، بحمد اللہ تعالیٰ جب تک قلب میں اپنی کمی اور پستی کا احساس اور بہتر حالت و کیفیت کی طلب موجود ہے روح کی زندگی کی نشانی باقی ہے، اور جب تک یہ کیفیت باقی ہے، علاج بھی ممکن ہے اور حالات امید افزا ہیں،

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ۔۔۔ . . . .

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست ۔۔۔ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو بھی اپنا بندہ کہتا ہے اور ان کو مایوسی سے روکتا ہے،

یا عبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم ۔۔۔ اے میرے وہ گنہگار بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ۔۔۔ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اللہ اکبر! یہ کیسی نوید جانفزا ہے، بس اتنی دیر ہے کہ بندہ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ پڑھ کر پھر اپنا کام شروع کر دے، پھر وہی بخششیں ہوں گی اور وہی نوازشیں ہوں گی،

غور کیجئے! اگر بادشاہ سے ملاقات نہ ہو، تو ایک درجہ کی محرومی ہے، لیکن دربار میں بار پانے کے بعد پھر وہاں سے فرار، اور کسی دوست سے دوستی بڑھا کر پھر انقطاع نہ صرف اپنی محرومی بلکہ اس بادشاہ کی ناراضی اور اس دوست کے ملال کا باعث ہے۔"

اس طویل اقتباس سے معلوم ہوا کہ محبوب ازلی تو خود سراپا رافت و رحمت، اور سراپا محبت ہے، اگر انسان کی طرف سے معمولی کوشش بھی ہو تو توفیق خداوندی دستگیری فرما کر عطا سے مالا مال کر دیتی ہے،

ان کے کرم کے ہم نثار، انکی عطا کا کیا شمار
دیدیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں"

حضرت شیخ قدس سرہ فرمایا کرتے تھے "وصول تو ہر ایک کا جذبہ ہی سے ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی راہ سلوک کو پہلے طے کرتا ہے، کوئی بعد میں،

انھیں کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے

حضرت سیدی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ "بندہ اگر ذرا سی کوشش کرے، تو وہ ہدایت کے لئے اسے خود قبول فرما لیتے ہیں، جیسے بچہ اگر قدم اٹھائے اور دو چار قدم چل کر گر جائے، تو ماں باپ پیار سے خود اٹھا لیتے ہیں، اسی طرح اللہ میاں بھی گود پھیلائے ہوئے ہیں، کہ میرا کوئی بندہ میری طرف آتا ہے کہ اسے میں اپنی رحمت سے قبول کر لوں۔"

ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں: "کام میں لگے رہیے، منزل مقصود تک رسائی ان شاء اللہ تعالیٰ ایک دن ہو ہی جائیگی۔"

آ ہی جائیگا کبھی اس تک بھی ساقی دور جام
منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے

اجتہاد کا راستہ انکی خصوصی رحمت و عنایت کا راستہ ہے، انابت کا راستہ عام سنت الٰہی ہے، اسلئے بندہ کو چاہئے کہ نا را

یعنی انابت والے راستے کو اختیار کریں تو ان شاء اللہ ہدایت تو نصیب ایک دن ہو جائیگی، اپنا کام کوشش وسعی ہی نوازنا انکا کام ہے۔"

اس سلسلے میں حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ یہ چیز خاص طور پر فرمایا کرتے تھے کہ "ہم طلب و کوشش کے مکلف ہیں، وصول کے نہیں، اس لیے سالک کے لیے ہمت کرکے کوشش کرلینا ہی کافی ہے، اس راستہ میں ہر قدم راہ بھی ہے اور منزل بھی، ذریعہ بھی اور مقصد بھی، یعنی اپنی ہمت و کوشش سے رضائے الٰہی کی جستجو میں لگا رہے اور اس راستہ میں جتنی گھاٹیاں آئیں گی، وہ وصول کا ہی حکم رکھیں گی، کیونکہ سالک کا کام صرف محنت اور جستجو ہے۔ حضرت والاؒ فرماتے ہیں:

جد و جہد دہر میں ہے ذوق و شوق لطف دید	حاصلِ ہر سعی میری سعی لا حاصل میں ہے
منزلِ مقصود ہے راہ طلب کا ہر قدم	وہ سر منزل ہے جو اب تک رہ منزل میں ہے
ہر ضرب تیشہ ساغرِ کیفِ وصالِ دوست	فرہاد کی جو بات ہے مزدور کی نہیں

بعض سالکین وصول کی فکر میں ذریعۂ وصول سے ہی غافل ہو جاتے ہیں، حالانکہ وصول اختیاری نہیں اور انسان غیر اختیاری امور کا مکلف نہیں، اس لیے کوشش کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کامل رکھنی چاہیے، وہ کسی کی طلب اور محبت کو ضائع نہیں کرتی اور نجات کی کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتی ہے۔ ایک طالب نے لکھا " ان کی رحمت ہی کا محتاج ہوں، ان ہی سے امید ہے کہ اس نااہل سے کرم والا معاملہ فرمائیں گے" اس کے جواب میں سیدی حضرۃ الشیخ مدظلہ نے تحریر فرمایا "ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ حسن ظن ہی رکھنا چاہیے' انا عند ظن عبدی بی کا منشاء یہی ہے۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مقصد یہ تھا کہ حب الٰہی اور خشیت الٰہی کے جذبات کے ساتھ انسان ایمان کی زیادتی اور اعمال صالحہ کی بجا آوری میں لگا رہے، تو ان شاء اللہ تعالیٰ منزل مقصود تک رسائی ہو ہی جائے گی، مگر راستہ میں منزل تک پہنچنے کی بیتابی نہیں چاہیے اور نہ وصول کو مقصد

سمجھنا چاہیے، ذرائع وصول یعنی ایمان باللہ اور اعمال صالحہ کی بجا آوری میں لگا رہے، وہ خود ہی کبھی نہ کبھی شرف قبول سے نوازیں گے، صدیقین و مخلصین تو اس کی رضا و طلب میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے ہی کو وصول و فوز سمجھتے تھے،

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

ذکر و تہجد و نوافل | طریق محبت کے راہی چونکہ مجلہ نشین ازل کے شیدائی ہوتے ہیں، اس لیے ان سوختہ سامانوں کا زاد راہ یاد حبیب اور توشہ درد و سوز ہوتا ہے، محبوب کی یاد میں ہر دم مگن، اس کے نام سے ان کی زبانیں تر، اور اس کے دھیان سے ان کے قلوب اور جبیں پر نور ہوتی ہیں، منشائے حبیب پر وہ جانیں قربان کرتے ہیں، اور اس کے اشاروں پر ان کی ہر حرکت موقوف ہوتی ہے، ان کی زندگی میں اس کے اوامر سے ہی جان آتی ہے، اور اس کے مشاہدہ سے ہی وہ قرار پاتے ہیں، اس لیے ان محبین صادق کی راہ پر جو گامزن ہونا چاہے، اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کا طریق اختیار کرے، یاد الٰہی سے اپنا ہر سانس اور قیام و سجود سے اپنی ہر رات زندہ رکھے، عبدیت کاملہ اس کا مشغلہ ہو، اور فنائے تام اس کا حال کہ الٰہی رنگ بندگی کے کمال سے ہی حاصل ہوتا ہے، صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عٰبدون میں اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے،

بہرحال بندگی و عبدیت، اطاعت و فرمانبرداری کے کمال کے ساتھ ذکر دائم و قیام لیل طریق کا ضروری جزو ہیں، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک والانامے میں ارقام فرماتے ہیں:

"تہجد اور ذکر یہ دونوں اس طریق کی ضروری چیزیں ہیں، ان پر مداومت رکھیے"

دوسرے گرامی نامے میں تاکید فرماتے ہیں:

"آپ تہجد اور نوافل اوابین ۶ رکعات بعد سنت مغرب اور ۴ رکعات اشراق جب

آفتاب نکل کر بلند ہو جائے۔ تہجد میں ۶ رکعات سے ۱۲ رکعات تک نصف شب کے بعد (پڑھا کریں)

ایک دوسرے طالب کو تحریر فرمایا "تہجد کا اہتمام جاری رکھیں۔"

ایک اور صاحب کو تہجد وغیرہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"معمولات کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہیے، وقت کی پابندی کے بغیر معمولات ناغہ ہوتے ہیں، اس سبب وقت کی پابندی کی ضرورت ہے۔ رات کو نہ ہو سکے تو [illegible] بعد سہی، تہجد میں اٹھنا نہ ہو سکے تو اس کی دو تدبیریں ہیں، ایک یہ ہے کہ عشا کی نماز و سنت پڑھنے کے بعد لیکن وتر سے پہلے دو دو رکعت معمولاً تہجد کی نیت سے پڑھ لیں، دوسری یہ کہ اشراق و چاشت کے وقت تہجد کی قضا پڑھ لیں"

ان ہی کو دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"معمولات کی ادائی اور تہجد کی پابندی برقرار ہے تو بڑی بات ہے۔"

ان ہی کے ایک اور خط میں یہ تحریر ہے کہ

"خوشی کی بات ہے کہ آپ تہجد پڑھتے ہیں، پہلے جب کبھی آپ کو تہجد کا موقع ملتا تھا، اس وقت [illegible] حضور ہوتا اور گریہ ہوتا تھا، وہ کبھی کبھی پڑھنے کی وجہ سے تھا، اب مداومت سے تہجد پڑھ رہے [illegible] نہیں ہوتی تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جس کو کبھی کبھی پلاؤ کھانے کو ملتا ہے تو اس میں اس کو بہت مزہ ملتا ہے، لیکن جب [illegible] اس کو روزانہ ملنے لگے تو وہ مزہ نہیں ملتا، [illegible] عادت ہو جاتی ہے، پھر گریہ سے تہجد کی [illegible] ہزار درجہ بہتر اور شکر کے قابل ہے۔"

[illegible] تو لازم و ملزوم ہیں، اس لیے مسترشدین کو اس کی تاکید بکثرت فرمائی گئی ہے

چنانچہ [illegible] ملاحظہ ہوں، ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ [illegible] مراقبہ کے لیے وقت نکالتے ہیں، اگر کچھ وقت اور ملے، جیسے صبح کی نماز

کے وقت یا تہجد میں یا کسی اور وقت تو ایک ہزار دفعہ اَللّٰہُ اَللّٰہ ذرا ہلکے نغمہ سے آہستہ آہستہ اس حد تک کہیں کہ آپ کے کان میں آواز آئے، تسبیح پر گن کر ذکر کر لیا کیجئے، آنکھیں بند ہوں، اور یہ تصور ہو کہ اللہ کا کلمہ نورانی حروف میں آپ کے سینہ پر لکھا ہے۔ اگر آپ تعلیم یا کسی اور کام میں مصروف ہوں تو اس میں نقصان نہ ہو، ہر کام میں خدا کی رضا کی نیت رہے، انشاء اللہ تعالیٰ آپ کے لیے دین کا راستہ کھلے گا۔"

دوسرے والا نامے میں ان ہی کو تحریر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عنایت فرمائیں، اسی طرح وقت اور فرصت کے ساتھ ساتھ اس ذکر کی تعداد کو بڑھاتے جائیے، البتہ خیال رہے کہ کسی دوسرے ضروری کام میں حرج نہ ہو۔"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:-

"ہر وقت ذکر کی مصروفیت یعنی دوام ذکر قلب بڑی نعمت ہے جو آپ کو مل رہی ہے، اسکو جاری رکھیے۔"

دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشف والہام وغیرہ محض محمود ہیں مقصود نہیں، ان باتوں کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں ——— قرب الٰہی صرف ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ ہیں، اس لیے دوام ذکر اور کثرت اعمال صالحہ کی فکر میں رہنا چاہیے۔"

ان ہی کو تاکید کرتے ہیں: "کیفیات واحوال کی طرف توجہ نہ کیجیے، صرف حسن عمل اور ذکر کی طرف توجہ رکھیے۔"

ایک اور گرامی نامے میں تسلی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تعلیم کے مشغلہ کی نسبت یہ خیال کریں کہ یہ مشغلہ روزی کی کوشش ہے، اس لیے یہ مشغلۂ تعلیم بھی عبادت ہی میں شمار ہوگی، بایں ہمہ اوقات نماز و نوافل و ذکر قائم رکھیں، انشاء اللہ تعالیٰ یہ نعمت (یعنی دوام ذکر) آپ کو حاصل رہے گی۔"

ان اقتباسات سے ذکر کی اہمیت واضح ہو گئی ہوگی۔ حضرت شیخؒ کی صحبت میں جنھیں بیٹھنے

کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان پر ذکر کا کس قدر غلبہ تھا، تھوڑی دیر کے بعد بے ساختہ زبان اقدس سے لا الٰہ الا اللہ یا اللہ اللہ کی صدا نکل جاتی تھی، خود فرماتے ہیں:

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز ہر رگ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں ہر صدا آواز الا اللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاس حیات جو کوئی دم ساز الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند قلب ذاکر ساز الا اللہ ہے
وجد میں جاں ہے تو اعضا رقص میں جام مے آواز الا اللہ ہے

ایک مرتبہ ایک طالب جس کے قلب سے بے اختیار "اللہ اللہ" کی صدا نکل جاتی تھی، ارشاد فرمایا "گو یہ کیفیت مجھے بھی پیش آتی ہے لیکن اصل ارادہ اور زبان سے ذکر کرنا ہے، تاکہ ذاکر اس خیال سے کہ ذکر قلبی جاری ہے، ذہول میں مبتلا نہ ہو جائے، اس کے علاوہ وہ نئے ارادہ کے ثواب سے محروم رہ جائے"، حضرت شیخ نے اپنی اس حالت کا ذکر ایک شعر میں فرمایا ہے۔

نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا تن سے جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے

ایک مرتبہ فقیر نے عرض کیا کہ "حضرت ذکر کس طرح کرنا چاہیے"۔ ارشاد ہوا:
"نالہ پابند نہیں ہے"
پھر فرمایا: "وہ طرز نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے۔
میرا ایک شعر ہے:

وہ اپنے کانوں سے سنتے ہیں میرے نالوں کو وہ طرز نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے

ایک مرتبہ سفر میں حضرت قدس سرہٗ اور فقیر کا ایک ہی کمرہ میں قیام تھا، پچھلی رات میں نطق سلیمانی نے جب داؤدی لے میں "الا اللہ، الا اللہ" کا نغمہ ملکوتی ساز میں چھیڑا تو در و دیوار پر وجد کی کیفیت تھی

اور سننے والا اپنی ہستی کو نغماتِ قدس میں گم کر چکا تھا ؎

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے   جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے

حضرت والا ذکر میں اصل توجہ مذکور کی طرف قرار دیتے تھے، اور اگر مذکور کی طرف نہ ہو سکے تو ذکر کی طرف۔ ایک طالب نے لکھا "قلب کو سکون صرف توجہ الی اللہ سے ملتا ہے، اور اس وقت الفاظ ذکر بھی منقطع کر دینے پڑتے ہیں، صرف توجہ سے دل کی سیاہی مٹتی محسوس ہوتی ہے"۔ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے جواب میں ارقام فرمایا:

"ذات کی طرف توجہ اصل ہے، اگر اس حالت میں معانی والفاظ کا استحضار نہ رہے تو کوئی حرج نہیں، اصل توجہ مذکور کی طرف ہونی چاہیے، یہ نہ ہو تو ذکر کی طرف"

ایک طالب نے لکھا کہ "پچھلے کچھ دنوں سے قلب میں سوز کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ مستی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اور عشقیہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے، اور اس سے تسکین ہوتی ہے، ذکر بھی چونکہ ہمیشہ خفی کرتا ہوں (الا ماشاء اللہ) جہری کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ جواب میں ارقام فرمایا:

"یہ کیفیت مستحسن ومحمود ہے، ذکر جہری کرنے یا عشقیہ اشعار پڑھنے کو جی چاہے تو پڑھ لیں، خواجہ مجذوبؔ کے اشعار اس کے لیے مفید ہیں"

وساوس ولاطائل خیالات عموماً سالکین کو ذکر ونماز وتلاوت وغیرہ کی حالت میں تنگ کرتے ہیں اور سالک کو اپنے میں پھنسا کر اللہ تعالیٰ کے دھیان اور اس کی یاد ومناجات سے غافل کر دیتے ہیں ہمارے حضرت قدس سرہٗ کے نزدیک وساوس کا علاج ان کی جانب عدم التفات ہے، انکی طرف جتنا دھیان کیا جائے گا، اتنے ہی بڑھیں گے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ وساوس وخیالات سے توجہ ہٹا کر ذات باری تعالیٰ کی طرف یا الفاظ ومعانی کی طرف کر لیجائے۔ وساوس کا آنا برا نہیں کیونکہ غیر اختیاری امر ہے، البتہ اس کا لانا برا ہے، سالک کو چاہیے کہ ان تمام خیالات سے یکسو ہو کر ذات

کی طرف توجہ ہو جائے، اور کسی کی طرف التفات نہ ہو، پھر ہزار وسوسے آئیں تو بھی مضر نہیں، کہ اپنا کام صرف ان کی طرف عدم التفات ہے۔

دور باش افکارِ باطل دور باش اغیارِ دل سج رہا ہے شاہ خوباں کیلیے دربارِ دل

ایک مرتبہ راقم سے فرمایا کہ "مجھے حضرت والا (یعنی مولانا تھانوی) رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائی خط میں یہ جملہ لکھا تھا کہ 'وساوس کا لانا منع ہے، آنا منع نہیں'۔"

حضرت شیخ فرماتے تھے کہ "وسوسہ تو شیطان ڈالتا ہے، اور اس لیے ڈالتا ہے کہ سالک کو تکلیف ہو، حضرت مولانا تھانوی نے لکھا ہے کہ اعلیٰ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ ان وساوس کو مراۃ جمالِ حق بنایا جائے کہ یہ بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان ہے، کہ اس نے قلب کو ایسا بنایا کہ اس میں طرح طرح کی چیزیں اور خیالات آتے جاتے ہیں، جب ان وساوس کو ذاتِ حق کے دھیان اور قرب کا ذریعہ بنا لیا جائے گا تو شیطان وسوسہ ڈالنا چھوڑ دے گا"، کہ اس کا مقصود تو ذاتِ حق سے ہٹانا تھا اور جب وساوس خود ذات کی طرف توجہ کا ذریعہ بن گئے تو اسکا مقصد کہاں پورا ہوا، اور قلب پر جب حضرت حق کا دھیان چھا جاتا ہے تو تمام وساوس خود بخود دور ہو جاتے ہیں، اسی کے متعلق کہا گیا ہے:

"نشانِ زنگارِ زنگ چھوٹ تو ہر آئینے مقیم اس گھر میں ہو جائے اگر مہمانِ دل

حضرت قدس سرہٗ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"وساوس کا واقع ہونا مضر نہیں، یہ وہیں آتے ہیں، جہاں دولت ہوتی ہے، شیطانی وساوس کے آنے کو بھی ایسا ہی سمجھا جائے، اور ان کی طرف سے ذہن کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کر لیا جائے، عدمِ التفات ہی اس کا علاج ہے۔"

بعض اوقات سالک اپنے خیالات واوہام کی بوقلمونیوں اور حجاباتِ نورانی کی دلفریبیوں

میں الجھ کر ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، اس کے متعلق حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ

"اصل یہ ہے کہ ان سب کو قلب سے خارج کر کے یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہوں، وہ سن رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جواب دے رہے ہیں، جیسا کہ خود ارشاد ہے ادعونی استجب لکم۔ اذکرونی اذکرکم، اس لیے انسان یقین کے کانوں سے کیوں نہیں سنتا کہ جب وہ اللہ اللہ کہتا ہے، تو اس کا جواب 'عبدی عبدی' دیا جاتا ہے، حضرت اُبی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر کیا، کہ تمہارا نام اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، تو فرط شوق و محبت میں رو پڑے کہ میرا نام اللہ تبارک و تعالیٰ نے لیا ہے، اور ہمیں اللہ تبارک و تعالیٰ خود کہتے ہیں کہ تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا، پھر ہمیں کیوں یقین نہیں آتا کہ جب ہم 'اللہ اللہ' کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ 'عبدی، عبدی' کہکر ہمارا جواب دیتے ہیں"

اگر سالک رویت الٰہی، سماعت الٰہی، قربت الٰہی کے یقین (اذکانک تراہ) کا حق سمجھکر ذکر کرے تو اس کے اثرات و برکات سے صدر و سینہ و دل سراپا نور ہو جائے گا، اور تمام خیالات و اوہام خود کافور ہو جائیں گے، ایسے ہی ذکر کے متعلق حضرت شیخ قدس سرہٗ فرماتے ہیں،

نام لیتے ہی نشہ سا چھا گیا ذکر میں تاثیر دورِ جام ہے
دیکھنا ہو تو نگاہِ شوق میں اس کی ہر سو بارگاہِ عام ہے
بزم میں تنہا نظر آتا ہوں میں ایک میں ہوں اور خدا کا نام ہے

اور بھی مٹ جائیگی تاریکیٔ افکارِ دل خانۂ دل میں جو پھیلینگے کبھی انوارِ دل
جمع وہ سامان ہو جس کی خریداری بھی ہو سوچ کر اور دل لگانا چاہیے بازارِ دل

ذکرِ حق سے صیقلِ کامل ہوا محو دل سے نقشِ ہر باطل ہوا
چار جانب بارشِ انوار ہے جلوہ فرما وہ مہِ کامل ہوا

لذت کو قرب میں کوئی دخل نہیں | سالکین کو اس راہ میں ایک اور سخت گھاٹی یہ پیش آتی ہے کہ وہ مختلف اذکار و احوال کی لذت کی طلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس کے حاصل نہ ہونے پر ناکامی کا گمان کر بیٹھتے ہیں، حضرت سیدی و مولائی اس لذت طلبی کو سالکین کے حق میں انتہائی خطرناک سمجھتے تھے، ایک طالب سے جو اذکار و نماز وغیرہ میں لذت نہ ملنے پر رنجیدہ تھے، احقر کی موجودگی میں فرمایا: لذت کو قرب میں کوئی دخل نہیں، یہ دو دھاری تلوار ہے اور بڑے خطرے کی چیز ہے"۔ طالب نے عرض کیا "بغیر لطف و لذت کے عمل مشکل ہو جاتا ہے"، فرمایا "یہ تو ازالۂ مشکل لذت کے لیے ہو گیا، اللہ تعالیٰ کیلیے نہیں ہوا، ممکن ہے ایسا شخص لذت کے لیے نماز پڑھ رہا ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے نہ پڑھ رہا ہو" پھر فرمایا "یہ عامیانہ تصوف کہاں سے سیکھ لیا، یہ تو گڑ کے لیے نماز پڑھنا ہو گیا"، پھر اپنے چند اشعار پڑھے۔

ترے نام ہی میں حلاوت ملے — جو ذوقِ محبت کی لذت ملے
جو تیری رضا کی بشارت ملے — تو دونوں جہانوں کی راحت ملے
محبت تو اے دل بڑی بات ہے — یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
بہرحال بندے پہ ہے بندگی — کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے
ترے عشق کے غم کی دولت ملے — تو سارے غموں سے فراغت ملے

اور فرمایا "بس طالب مولیٰ بنیئے، طالب لذت نہ بنیئے، دوا سے صحت مقصود ہو، دوا کی لذت مقصود نہ ہو، حکیم کو منتخب کیا جائے تو اس سے یہ نہ کہا جائے کہ خمیرہ گاؤزباں لکھ دے، اگر وہ چرائتہ لکھ دے تو آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ اس سے منع کریں،

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش — کہ ہرچہ ساقی ما ریخت عین الطاف است

ایک دوسرے صاحب نے ایک موقع پر فقیر کی موجودگی میں عرض کیا "حضرت بعض اوقات ذکر ذوق و شوق سے ہوتا ہے اور بعض اوقات پھیکا سا دل معلوم ہوتا ہے، کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا" فرمایا:

"یہ احوال ہیں جو بدلتے رہتے ہیں، ان کی فکر کی ضرورت نہیں، اصل چیز تو مقامات ہیں، معلوم ہوتا ہے ابھی تک آپ ان کیفیات و لذات وغیرہ کے چکر سے نہیں نکلے، ان ہی میں پڑے ہوئے ہیں، کشف، لذت، کچھ نظر آنا یہ چیزیں التفات کے قابل نہیں، مقامات کو حاصل کرنے کی کوشش کیجئے، صبر و شکر رضا وغیرہ، توجہ و کوشش کے قابل تو یہ چیزیں ہیں، غیر اختیاری امور کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے، جب تک ان چیزوں سے نہ نکلا جائے، مقصود کا پتہ نہیں چلتا، غیر مقصود کو مقصود سمجھ لینا سب سے بڑی غلطی ہے۔"

ایک گرامی نامہ میں ارقام فرمایا:۔

"ذکر میں لذت کی تلاش اور اس کے نہ ملنے پر مردودیت کا شبہہ اس راہ کا سخت پتھر ہے، اگر اس ذوق کا جاتا رہنا گناہ کے سبب سے نہ ہو تو مضر نہیں، اور یوں بھی کل جدید لذیذ کے اصول سے ایک مدت کے بعد اس کا مزہ باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ اغذیۂ مادی کا حال ہے، لیکن ظاہر ہے کہ لذت ملنے پر تولید خون موقوف نہیں، وہ صرف ہضم ہونے والی غذاؤں سے بنتا ہے، آپ اپنی طرف سے کوشش کرکے غذا کھائے جائیں، اور نتیجہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔"

ایک دوسرے مکتوب میں ہے:

"لذت گو ایک نعمت ضرور ہے، لیکن اس کو قرب الٰہی میں کوئی دخل نہیں۔"

اس سے ظاہر ہوا کہ ذکر و عبادت، لطف و لذت وغیرہ کے جذبات سے خالی ہو کر صرف رضائے الٰہی کے لیے کرنا چاہیے، کہ خلوت خانۂ دل میں سوا اس کی یاد کے کچھ بھی نہ ہونا چاہیے، لذت تو صرف اس میں ہے کہ صرف اس کے لیے اس میں شاغل ہو کر اسی کے جلووں سے لطف اندوز ہو، لذت ملی تو کیا نہ ملی تو کیا۔

نماز | نماز مومن کی معراج اور بقول حضرت مجدد سرہندیؒ اس عالم میں قرب الٰہی کا انتہائی مقام ہے، مومن کی زندگی جس قدر نماز سے متاثر ہوتی ہے کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتی، بلکہ بعض عارفین کے

قول کے مطابق نماز مومن کی زندگی کا آئینہ ہے، جس قدر نماز کامل ہوگی، اسی قدر زندگی عبدیت کاملہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوگی، نماز کا ظاہر و باطن پوری زندگی کے ظاہر و باطن کی عکاسی کرتا ہے، نماز میں جن پر خشوع طاری ہوتا ہے، وہ ہر عمل میں خاشع ہوتے ہیں، نماز کی جھکی ہوئی نگاہیں محارم کو بھی دیکھ کر جھک جائیں گی، لغو باتوں سے بے توجہی ان ہی کانوں کو نصیب ہوگی جو عالم کے ہنگامے سے کان بند کرکے مناجات میں سراپا گوش ہوتے ہیں، جن کے دل ذاتِ حق میں نماز کی حالت میں مشغول ہوتے ہیں، وہ مجمع میں بھی اس کی جانب متوجہ رہ کر باہمہ و بے ہمہ کا منظر پیش کرتے ہیں، غرض نماز ایک ایسا عظیم عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، ہم نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صفت صلوٰۃ پر گذرتی ہے، اور اس میں اسی عبدیت و عبودیت، اسی امتثال اوامر و احکام، اسی اجتماع اور اتباع میں، اسی خشوع و خضوع، اسی تعلق مع اللہ اور قربت حق اور اسی احسان و حضور کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو نماز میں ہوتی ہے، اس لیے تکمیل صلوٰۃ تکمیل مومن کا سب سے بڑا زینہ ہے، اس لیے نماز کو نماز بنانے کی جتنی سعی کی جائے گی، اتنی ہی زندگی ایمان و تقویٰ کے نور سے جگمگا اٹھے گی،

قرب بے غیبت نمازِ عاشقاں   فی صلوٰۃ دائمون آرزو ست

اس لیے حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ نماز کی تکمیل و تحسین کی طرف طالبین کو بڑی توجہ دلاتے تھے، ایک طالب کو لکھتے ہیں:-

"نماز کا کیا حال ہے، اس میں یکسوئی اور خضوع و خشوع، جماعت اور اوقاتِ مسنونہ کی پابندی اور اتباع سنت کا شوق کہاں تک ہے"؟

ایک گرامی نامہ میں تنبیہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:-

"نماز کشفِ اسرار اور وارداتِ قلبیہ کا محل نہیں، یہ صرف عبودیت و عبدیت، تواضع اور حضور کی کیفیت کا محل ہے، آپ ان شعبدوں کی طرف التفات نہ کریں، یہ امور قرب الٰہی میں کچھ

دخل نہیں رکھتے، اور نہ اس سے حصول ثواب ہوتا ہے، کیا ریل میں راستہ کے مناظر منزل مقصود کو قریب کردیتے ہیں، کیا یہ خیال حماقت نہیں۔"

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ان وساوس کی طرف سے ذہن کو پھیر کر اللہ تعالیٰ کی طرف کرلیا جائے۔"

"ذات کی طرف توجہ اصل ہے، اگر اس حالت میں معانی والفاظ کا استحضار نہ رہے تو کوئی حرج نہیں۔"

ایک مبتدی طالب کو لکھتے ہیں:-

"نماز میں وسوسے دور کرنے کے لیے یہ کیجئے کہ نماز کے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر ارادہ کیساتھ پڑھیے۔"

ایک گرامی نامے میں ہے:-

"نماز کی ترکیب خضوع و خشوع پر عمل کیجئے۔"

ایک طالب کو لکھتے ہیں:-

"جماعت کی پابندی ضروری ہے کہ اس کا اہتمام رہے۔"

حضرت شیخ قدس سرۂ نماز کے ظاہری و باطنی آداب کی پوری پابندی اور اسکو سنت کے مطابق ادا کرنے کی بڑی تلقین فرماتے تھے، راقم نے وضو کی دعائیں احیاء العلوم سے یاد کی تھیں، حضرت والا نے ایک دن پوچھا، وضو کس طرح کرتے ہو؟ میں نے بتلایا اور یہ دعائیں بھی سنائیں، حضرت کے نزدیک ان میں اکثر سنت سے ثابت نہیں تھیں، اسلیے مسنونہ دعا "اللھم اغفرلی ذنبی ووسع لی داری وبارک لی فی رزقی" تلقین فرمائی، اور تہجد کی نماز میں رکوع و سجود اور اٹھنے بیٹھنے کی مسنونہ دعائیں راقم سے سنکر خوشی کا اظہار فرمایا، نماز کے آخر میں وہ دعا پڑھنے کو بتائی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تلقین فرمائی تھی، اسی طرح نوافل وغیرہ میں ان ہی سورتوں کو پڑھنا بہتر سمجھتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تھیں، غرض نماز کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مشابہ بنانے کی سعی کی تلقین ہمیشہ فرماتے تھے۔

(باقی)

اسلامی علوم اور فلسفہ کا اثر یورپ کے علوم اور فلسفہ پر

جناب ڈاکٹر محمد احمد حسب صاحب صدیقی لکچرار عربی الہ آباد یونیورسٹی

یہ مضمون ڈاکٹر عمر فروخ کی کتاب "اثر الفلسفۃ الاسلامیۃ فی الفلسفۃ الاوربیۃ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے،

فاضل مترجم خود ڈاکٹر ہیں، مگر ان پر عربیت کا اثر اتنا غالب ہے کہ انھوں نے یورپین فضلا کے نام بجنسہ عربی لہجے میں رہنے دیئے ہیں، اور انکو صحیح تلفظ میں لکھنے کی زحمت نہیں گوارا کی ہے جس سے یہ نام نامانوس ہو گئے ہیں، مگر مضمون مفید ہے اسلیے اسکو شائع کیا جاتا ہے۔

اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ علوم اور فلسفہ پر عربوں کا احسان عظیم ہے، ان کی کوشش علمی چھان بین اور تفحص و تحقیق نے علوم میں چار چاند لگا دیے، لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ انسانی غور و فکر کی تاریخ میں اس احسان کا کیا مرتبہ ہے، ہم جب اس زمانہ پر نظر غائر کرتے ہیں جس میں اسلامی فلسفہ اپنی رونق اور ضیا باری سے دنیا کو روشن کر رہا تھا، تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ عربوں نے ثقافت کا حق پورے طور پر ادا کر دیا، انھوں نے صرف انسانی فکر کے نتیجوں کو حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے زمانہ ترقی میں ان نتائج میں اپنے مساعی سے وہ ترقیاں اور اضافے کیے جن سے دوسری قوموں کو استفادہ کا بہترین موقع مل گیا، اور عربوں نے ان معلومات کے وسیع کرنے میں ان ساری مشقتوں اور موانع کا جو انھیں پیش آئے، جرأت کے ساتھ مقابلہ کرکے کامیابی حاصل کی،

ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی ثقافت چھٹی اور ساتویں صدی ہجری یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ مشرق میں صلیبی لڑائیوں کی آگ مشتعل تھی، اور طرح طرح کے فسادات رونما ہو رہے تھے، ثقافت اسلامیہ یورپ میں اپنا اثر پھیلا رہی تھی جس سے علوم و فنون کے چشمے جاری ہوتے جاتے تھے، اور

حضارت و مدنیت کا اثر یورپ میں پھیلتا جاتا تھا، اس زمانے تک یورپ جہالت کی تاریکی میں پڑا ہوا تھا، یونان و روم کے قدیم علوم کا درجہ تیسری صدی عیسوی سے متعدد وجوہ سے گھٹ رہا تھا، ان میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسیحی کلیسا بہت سے ایسے علوم و آداب کا مخالف تھا جن کو وہ مسیحیت کے خلاف اور دہریوں اور بت پرستوں کی پیداوار سمجھتا تھا، اس کے علاوہ بربریوں وغیرہ کے حملوں کی وجہ سے جو چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں ہوئے، حضارت قدیمہ کا زوال ہو گیا، اور لوگ علوم کو بھول گئے، ہاں بعض راہب اپنے عبادت خانوں میں اور بعض علما، اپنے گوشوں میں کسی پرانی نحو یا تاریخ کی کتاب کا درس دیتے تھے، اور اس کی تشریح صرف لغوی طریقہ پر کر دیتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ فکری عمل ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا، اس کا اثر قوموں کی علمی زندگی اور ان کی سواد اعظم پر کیا ہو سکتا تھا،

شارلیمان نے جس کی وفات ۱۹۹ھ (۸۱۳ء) میں ہوئی ہے، امیرزادوں کے لیے اپنے محل میں ایک مدرسہ قائم کیا جس میں وہ ابتدائی تعلیم پاتے تھے، شارلیمان کی وفات کے بعد نوییں اور دسویں صدی مسیحی میں ایسے سیاسی جھگڑے امرا اور کلیسا کے درمیان بلکہ خود باہم امراء میں پیدا ہو گئے، جنھوں نے پرانی آبادیوں کے نشانات مٹا دیے، اور جو علوم حاصل کیے گئے تھے، انھیں معدوم کر دیا، اس وقت یورپ کی ثقافت چار اسباب کی وجہ سے کمزور پڑ گئی،

(۱) لاطینی زبان کی سیادت۔ یہ زبان مذہبی اور پڑھنے پڑھانے کی زبان تھی، جس کو صرف علماے دین جانتے تھے، یا کچھ ایسے لوگ واقف تھے جو ان علوم پر قناعت کرتے تھے، جو دین کے احاطہ سے تجاوز نہ کرتے تھے،

(۲) جب لاطینی زبان سے قوم ناواقف ہو گئی تو اس سے علم بھی جاتا رہا، اس وقت یورپ کے باشندے علمی تاریکی میں گھرے تھے، مثلاً تاریخ کے نام سے صرف چند خیالی افسانے اور فضول اعمال

جو اسکندر مقدونی اور جولیس قیصر یا بعض بہادروں کی طرف منسوب کیے جاتے تھے، خود یورپ کی تاریخ کی یہ حالت تھی کہ اس کے واقعات دھندلے پڑے تھے، ایک واقعہ کی نسبت دو مقاموں بلکہ زیادہ کی طرف کیجاتی تھی، اور اوہام فاسدہ سے اس میں کام لیا جاتا تھا، صحیح اور حقیقی علم بالکل مفقود تھا، صرف بعض قدیم علوم جو اس زمانہ میں غلط قرار دیے جاچکے ہیں، ان میں باقی تھے، مثلاً عناصر اربعہ یا زمین کے مسطح ہونے کا عقیدہ،

(۳) خرافات کی اشاعت۔ جہل کی وجہ طرح طرح کے خرافات اور لغو اعتقادات رائج ہوگئے تھے، مثلاً نجوم اور سحر کا عقیدہ، یا یہ اعتقاد کہ انسان کے بدن میں امراض شیطان کے داخل ہونے سے پیدا ہوتے ہیں، یا ایسے حیوانات موجود ہیں جن کے چہرے کتے کے ہیں اور باقی جسم انسان کا۔ یا ایسے حیوانات جن کے سینے انسان کے ہیں اور پاؤں بکریوں کے، یا یہ کہ بعض مخلوقات کے ایک آنکھ پیشانی کے بیچ میں ہوتی ہے، یا دو آنکھیں دونوں مونڈھوں میں ہوتی ہیں، یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ زمین ایسی سطح ہے جس کی ایک جانب کی انتہا آفتاب نکلنے کی جگہ اور دوسری جانب کی انتہا آفتاب کے غروب کی جگہ ہے، یا مثلاً اگر کوئی شخص سمندر پر چلتا رہے تو وہ زمین کے کنارے پر پہنچ جائے گا، اور اس سے آگے بڑھے گا تو زمین کے نیچے جہنم میں گر جائے گا، جس کے شعلے افق پر غروب شمس کے وقت ظاہر ہوتے ہیں،

(۴) کلیسا کی سیادت۔ حکومت دو حصوں میں منقسم تھی، حکومت دینی اور حکومت دنیاوی، حکومت دینی بالکل کلیسا کے قبضہ میں تھی، اور دنیاوی حکومت امرا اور پوپوں کے درمیان محل نزاع بنی ہوئی تھی، کبھی پوپوں کے قبضہ میں ہو جاتی تھی اور کبھی بادشاہوں کے قبضہ میں، اس میں کلام نہیں کہ کلیسا نے علم و تعلیم و ادب، دینی علوم اور قیود اجتماعی کے محفوظ رکھنے میں بڑا کام کیا، لیکن اس میں بھی شبہہ نہیں ہے کہ کلیسا تفکر و تحقیق کے لیے آہنی دیوار بن گیا، کوئی مفکر اگر اپنے غور و فکر سے

کوئی ایسی بات ظاہر کرتا جو کلیسا کے تعلیم کے خلاف ہوتی، یا ارباب کلیسا کے نزدیک نئی اور انوکھی ہوتی تو جھٹ اس کے کفر و بدعت ہونے کا فتویٰ کلیسا کے دارالافتاء سے صادر ہو جاتا اور وہ مفکر قتل یا سخت سزا کا مستحق قرار پاتا، چنانچہ ازمنہ وسطیٰ میں بہت سے مفکرین اور علماء اظہار خیال میں جرأت کی وجہ سے قتل کر دیے گئے۔

وہ میدان جن میں مشرق و مغرب کا مقابلہ ہوا

پانچ میدانوں میں ثقافت کے متعلق مشرق کی ٹڈبھیڑ مغرب سے ہوئی، ان میں سے تین کا تعلق حکومت سے ہے، اس ٹڈبھیڑ میں مشرق بڑے بڑے عمرانی و سیاسی و نفسیاتی نتائج لیکر نکلا اور مغرب نے اس سے حضارت اور ثقافت میں بہترین نتائج حاصل کیے، ان میدانوں کے نتائج حسب ذیل ہیں:-

اندلس جہاں عربوں کی حکومت آٹھ سو سال رہی، اور انھوں نے اس کو جیسا آباد، آراستہ اور علوم سے معمور کیا وہ اہل خبر سے مخفی نہیں ہے، صقلیہ جہاں صدیوں عربی حکومت و ثقافت رہی، مصری اور شامی سواحل جہاں دو صدی صلیبی لڑائیاں رہیں، شمالی افریقہ میں بھی ثقافت کا مقابلہ رہا، اور قسطنطنیہ کے اطراف میں پندرھویں صدی مسیحی سے پہلے کچھ تھوڑا بہت مقابلہ ہوا،

(۱) اندلسی میدان۔ عربوں نے اندلس کو ۹۲ھ (۷۱۱ء) میں فتح کیا، اور وہاں ایک بڑی سلطنت قائم کی، اور ایک بڑے تمدن کی بنیاد ڈالی، اور جب اندلس میں بنی امیہ کی حکومت کمزور ہو گئی، اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو کر طوائف الملوکی پھیل گئی، اس زمانہ میں بھی علوم عقلیہ کی روشنی اس تاریک سیاسی افق پر پھیل رہی تھی، اندلس نے مشرق کے علوم کے ماہر علماء اور ان کی کتابیں جمع کیں، اور ان کی راہوں میں موازنہ کیا، تھوڑے ہی زمانہ میں اندلس کے بڑے بڑے شہر مثلاً قرطبہ، اشبیلیہ، ملقا، اور غرناطہ وغیرہ یونیورسٹیوں سے آراستہ ہو گئے، جن میں علوم دینی، ریاضی اور فنون عقلی کا درس دیا جانے لگا، ان یونیورسٹیوں میں صرف اندلسی مسلمان ہی تعلیم نہیں پاتے تھے، بلکہ یورپ کے

مسیحی طلبہ بھی آکر علوم کی روشنی حاصل کرتے تھے، ان میں سے ایک فرانسیسی شخص کا نام گربرٹ تھا، جو بعد میں پوپ سیلفسٹر دوم ثانی کے نام سے مشہور ہوا (۹۹۹-۱۰۰۳ء) یہ اندلس سے ارقام عربیہ اور علوم عددیہ (ارتھمیٹک) کا علم حاصل کرکے اپنے وطن واپس گیا، ان ہی میں روبرٹ آف تشستر انگلستانی تھا، وہ (۱۱۴۱-۱۱۴۷ء) اندلس میں مقیم رہا، اور سنہ ۵۴۰ھ (۱۱۴۵ء) میں خوارزمی کی کتاب الجبر، اور کیمیا اور علم ہیئت کی چند کتابوں کو یورپ لے گیا، اور ہرمانوس دالماتا کی شرکت میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ سوئزرلینڈ میں ۱۵۴۳ء میں شائع ہوا۔ ان ہی لوگوں میں سے ایک ہرمانوس مذکور ہے، وہ اندلس میں (۱۱۳۳ء - ۱۱۴۲ء) مقیم رہا، اور فلکیات کی بعض کتابیں بھی نقل کیں، اس کی تالیفات ایسی ہیں جن میں عربی اثر پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے، ان میں دانیال مورلی انگلستانی بھی ہے (بارہویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں) وہ اندلس میں مقیم رہا، وہاں اس نے بطلیموس کی کتاب مجسطی حاصل کی اور کتاب الفلسفہ یا کتاب الطبیعۃ الدنیا والعلیا لکھی جس میں عربی اثر نمایاں ہے خصوصاً ان فصول میں جو فلک سے متعلق ہیں۔

عربی سے لاطینی میں ترجمہ کرنے والوں میں جیرارد قرمونی زیادہ مشہور ہے، وہ طلیطلہ میں (۱۱۱۴ء ۱۱۸۷ء تک) مقیم رہا، اس نے مجسطی فن کیمیا میں رازی کی کتاب، قانون ابن سینا، خوارزمی کی کتاب حساب الجبر والمقابلہ، مرغانی کی کتاب المدخل الی علم حیاۃ الافلاک اور کندی کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا، مشہور مترجمین میں ادیلارد اوف باث بھی ہے، جو انگریز علماء میں بڑا درجہ رکھتا ہے، یہ ان لوگوں میں ہے جنھوں نے اسلامی علوم اور اس کے فلسفہ کو انگلینڈ لیجانے کی داغ بیل ڈالی ہے، اس نے عربی سے مندرجۂ ذیل کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا، ابومعشر فلکی کی چار کتابیں بشرکت یوحنا اشبیلی، خوارزمی کی زیج اور کتاب الارقام الہندیہ اور ہیئت وحساب کی دوسری کتابوں کا بھی ترجمہ کیا، مشاہیر ناقلین میں سے میشال سکوت، افلاطون تیفولی، دومینیقوس غندیسالفی اور ہورغ سانیتالا وغیرہ بھی ہیں۔

(ب) صقلی کا میدان۔ زیادۃ اللہ بن ابراہیم بن اغلب امیر تونس نے ۲۰۲ھ - ۲۲۴ھ (۸۱۷ء - ۸۳۸ء) میں جزیرہ صقلیہ اور اس کے بعد ایطالیہ کے بعض علاقوں پر قبضہ کیا، یہانتک کہ پوپ یوحنا ہشتم (۸۷۲ء - ۸۸۲ء) متواتر دو سال جزیہ ادا کرنے پر مجبور ہوا، اور اس زمانہ میں بھی جبکہ نارمنون نے ایطالیہ کے جنوبی حصہ اور صقلیہ پر (۱۰۶۰ء - ۱۰۹۰ء) غلبہ حاصل کر لیا تھا عربی ثقافت اس کے بعد بھی عرصۂ دراز تک وہاں باقی رہی اور روجر ثانی شاہ صقلیہ اور اسکے بیٹے غلیام کا کابینہ عربی اسلامی طرز کا رہا، حتی کہ لوگوں کو روجر کے مسلمان ہونے کا گمان پیدا ہو گیا، کیونکہ اس کی معاشرت مسلمانوں کی سی تھی اور وہ باوجود پوپ کے اصرار کے صلیبی جنگ میں شرکت سے محترز رہا، اس کے ارکین دربار میں مسلمان، عیسائی، یہودی اور یونان و انگلستان کے اہل علم سب شامل تھے، صقلیہ میں دوبارہ مجسطی اور حکیم بطلیموس کی کتاب المناظر (البصریات) کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا، یہ ترجمہ اوجین پلرمی نے کیا تھا، اگر یہ نہ ہوتا تو یہ کتاب بالکل معدوم ہو جاتی، اسی طرح کتاب کلیلہ دمنہ کا عربی سے یونانی میں ترجمہ کیا گیا، اسی اثنا میں سالرنو (جنوبی ایطالیہ) میں ایک درسگاہ طب عربی کی تعلیم کے لیے قائم کی گئی،

(ج) حروب صلیبیہ۔ صلیبی لڑائیوں کے اثنا میں بعض علماے مغرب نے حصول علم کے لیے اور بعض اہل مغرب نے جنگ کے لیے مشرق کا قصد کیا، لیکن یہ جنگ سے الگ ہو کر مختلف اطراف میں چلے گئے، ان میں ایک اسطفان انطاکی ہے، وہ اصل میں اٹلی کا باشندہ تھا، انطاکیہ میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس نے تقریباً ۱۱۲۷ء میں فن طب میں علی بن عباس مجوسی کی کتاب الملکی کا ترجمہ کیا، یہ کتاب لاطینی میں طبع ہو گئی ہے، ڈاکٹر فلپ کی رائے میں یہ کتاب فن طب میں بینظیر ہے، اس کو صلیبیوں نے لاطینی میں اس وقت نقل کیا جبکہ وہ سوریہ میں تھے، ان کے علاوہ برنارڈ سلیفر اور فیلیپ طرابلسی نے بھی اس زمانہ میں عربی سے لاطینی میں ترجمہ کا کام کیا ہے، لیکن ان کے ترجمہ کا ہیں

یقین نہیں ہے،

(د) شمالی افریقہ۔ جس زمانہ میں شمالی افریقہ، اندلس اور صقلیہ کے درمیان فلسفیوں اور علماء کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اس زمانہ میں شمالی افریقہ نقل و ترجمہ کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا، ان ناقلین میں ایک لیونارڈو البیزانی تھا جو تقریباً ۱۱۷۰ء میں بمقام بیزا (ایطالیہ) پیدا ہوا، اوائل عمر میں ایک زمانہ دراز تک بجایہ (الجزائر) میں مقیم رہا، اور وہیں اس نے علوم حاصل کیے، پھر جب وہ اپنے وطن واپس گیا تو بہت سی کتابیں علم حساب میں تالیف کیں، مثلاً کتاب جبر اول: الاعداد، کتاب الہندسۃ العملیہ، کتاب طریقہ حل الاعمال۔

(ھ) قسطنطنیہ مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال تھا، اس کو ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں فتح کر لیا تھا، یہاں کے ایک عالم لیو توسکوس نے محمد بن سیرین کی کتاب تعبیر الرویا کا ترجمہ یونانی سے لاطینی میں کیا، اس کتاب کا ترجمہ عربی سے یونانی میں پہلے ہو چکا تھا۔

یورپ کے مسلمانوں اور فلسفیوں کا اثر یورپ کے فلسفیوں اور ان کے فلسفہ خصوصاً ریاضیات، فلکیات اور طب پر مسلمان علماء کا اثر بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں علوم کی تاریخ بھی مختصر بیان کر دی جائے، علمائے مغرب نے اس موضوع پر بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اگر ہم مختصر طور پر مشہور ترین علماء ان فلسفیوں کے اثر کو بیان کرنے پر قناعت کریں گے۔

۱۔ معتزلہ۔ جب معتزلہ نے دینی عقائد کی بنیاد عقل پر قائم کی اور اصول دین میں بحث و تحلیل کرنے لگے اور ان کے بہت سے خیالات عام مسلمانوں کے عقائد کے خلاف نظر آئے تو اس سے مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہو گیا، اس کا اثر غیر مسلموں پر بھی پڑا، چنانچہ مشرق کے یہودی اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ معتزلی اثرات نے فلسفۂ یہودیہ کی صورت اختیار کر لی، ان یہودیوں میں جو معتزلہ سے زیادہ متاثر ہوئے، سعد یا بن یوسف یا سعید الفیومی (ت ۹۴۲ء) ہے، یہ الٰہیات

خاص طور پر متاثر ہوا، اور عربی میں کتاب الامانات والاعتقادات تالیف کی جس میں معتزلی اثرات نمایاں ہیں،

۲۔ اخوان الصفا۔ اخوان الصفا میں اس زمانہ کے علوم و معارف جمع کیے گئے تھے، ان رسائل کا مشرق میں بڑا اثر ہوا، جب ابوالحکم عمرو بن عبدالرحمن کرمانی اندلسی (م ۴۵۹ھ) ۱۰۶۶ء میں مشرق آیا تو یہ رسائل ساتھ لے گیا، ان رسائل کا اثر کیمیا پر خاص طور سے ہوا، یہ رسائل عبرانی میں ترجمہ کیے گئے، اس لیے یہود کے فلسفہ پر بھی ان کا اثر ہوا، خصوصاً سلیمان بن یحییٰ بن جبرول (متوفی ۱۰۵۸ء) ملقب با فلاطون الیہود اور اس کے معاصر بہیا بن باکودا کے فلسفہ پر۔

۳۔ الکندی۔ یعقوب بن اسحاق کندی (متوفی تقریباً ۲۶۰ھ - ۸۷۳ء) عرب کا بڑا حکیم اور اسلام کے مشہور فلاسفہ میں سے ہے، اس کی اکثر کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ ہوا، اور زمانہ طباعت کے آغاز ہی ۱۵۳۱ء سے اس کی کتابیں طبع ہونے لگیں، اس کا اثر طبعیات اور بصریات پر کافی پڑا خصوصاً راجر بیکون (م ۱۲۹۴ء) جو تجربی علوم میں انگلستان کے اکابر میں تھے، اور یورپ میں باوجود کہ اس ایجاد اسی کی جانب منسوب ہے، اس سے بہت متاثر ہوا، فیتلو (تقریباً ۱۲۷۰ء) نے بھی اس کا اثر قبول کیا، فیتلو جو جرمن پولش ہے وہ ریاضیات، طبعیات اور بصریات کا عالم تھا، کندی نے موسیقی کے ایقاع کے متعلق کتاب تالیف کی، حالانکہ یورپ اس کے صدیوں بعد ایقاع سے واقف ہوا،

۴۔ رازی اول۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی (م ۳۱۱ھ - ۹۲۳ء) عرب کا جالینوس، مسلمان اطبا کا سردار، ازمنۂ وسطیٰ کا بہت بڑا مفکر اور نامور طبیب، طبیعات اور کیمیا کا عالم اور مشہور فلسفی تھا، کیمیا میں اس کی تالیف کتاب الاسرار ازمنۂ وسطیٰ میں، بلکہ اس کے بعد بھی علم کیمیا کی بنیاد رہی تحقیقات بابل کی ابتدا اس کا ترجمہ جیرارد قرمونی نے کیا، رازی نے طب میں کتاب الحاوی تالیف کی، پھر کتاب المنصوری

مگر اس میں فلسفیانہ خیالات خصوصیت کے ساتھ نہیں ہیں، اس کا اصل فلسفہ اس کے "رسالۃ الغفران" میں ہے، جس میں اس نے اپنا جنت اور دوزخ کا ایک خیالی سفر بیان کیا ہے، وہ ان دونوں مقاموں میں بعض ادیبوں اور شاعروں اور عالموں کو دیکھتا ہے، ان سے ناقدانہ اور ظریفانہ گفتگو کرتا ہے، اس رسالہ نے دانتے (ت ۱۳۲۱ء) کے ذہن میں "ڈی وائن کامیڈی" کا خیال پیدا کیا۔

۹۔ الغزالی۔ غزالیؒ (ت ۵۰۵ھ، ۱۱۱۱ء) نے عامۃ الناس کے عقائد خراب ہو جانے کے خوف سے ان میں فلسفہ کی اشاعت کو ناپسند کیا، اور اس کے ابطال کے درپے ہوئے، اسی لیے حجۃ الاسلام ان کا لقب ہوا، انکی کتابیں خصوصاً احیاء العلوم (۱۱۰۰ء) سے پہلے یعنی انکی وفات کے کل چالیس سال بعد ترجمہ کی گئیں، احیاء العلوم کو یہودی اور عیسائی فلسفیوں نے بہت پسند کیا، ابو الفرج بن العبری (ت ۱۲۸۶ء) نے علم اخلاق میں اپنی تالیف الحمامہ میں احیاء سے اقتباس کیا ہے، اس کا اثر بہیا بن یوسف بن باکوداکی عربی کتاب کتاب الہدایہ الی فرائض القلوب میں بھی ظاہر ہے، امام غزالی پر البرت الکبیر، مقدس ٹوما اور ازمنہ وسطیٰ کے بعض متاخرین فلاسفہ نے اعتماد کیا ہے، غزالی کا اثر تین صورتوں میں ظاہر ہوا،

(۱) نفی سببیت غزالی کا عقیدہ ہے کہ تمام امور اللہ کے ارادہ سے پورے ہوتے ہیں، نہ کہ ان اسباب سے جو ہمارے سامنے ہیں، اس مسئلہ میں اہل کلیسا کا ان کا معتقد ہو جانا کوئی عجیب چیز نہیں ہے، اسی کے مشابہ انگریز ہیوم (ت ۱۷۷۶ء) کا یہ قول ہے کہ سبب اور مسبب کے درمیان صرف تذکر کا علاقہ ہے، کوئی حقیقی تعلق نہیں ہے، دو امور کا یکے بعد دیگرے پایا جانا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ ایک امر دوسرے امر کا سبب ہو۔ غزالی علت حقیقی اللہ تعالیٰ کو قرار دیتے ہیں اور ہیوم اس میں نفسیاتی بحث کرتا ہے کہ ہم جب کوئی آواز سنتے ہیں تو حکم لگاتے ہیں کہ اس کا بولنے والا کوئی انسان ہے، کیونکہ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ہم نے کسی انسان سے ایسی ہی آواز سنی ہے، ورنہ آواز اور اس کے بولنے والے میں کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جس کا ادراک عقل کرتی ہو۔

(ب) الشک۔ نظریۂ معرفت میں شک کا قول غزالی کا کوئی اچھوتا قول نہیں ہے، غزالی سے پہلے

سینٹ آگسٹس (ت ۴۳۰ء) اس کا قائل تھا، اس کی رائے میں انسان کے اندر ظاہری حواس ہیں، پھر ان سے اوپر باطنی حواس، پھر ان سب سے بلند عقل کا درجہ ہے، جو ان کے محسوسات میں حکم لگاتی ہے، لیکن عقل انسانی ایک شے کو اپنے سے بھی اعلیٰ پاتی ہے، کیونکہ عقل میں تغیر ہوتا رہتا ہے، کبھی وہ مدرک بنتی ہے اور کبھی نہیں، اور کبھی معرفت کی طرف دوڑتی ہے، حالانکہ خود حقیقت غیر متبدل ہے، اس لیے جب تم اپنی طبیعت کو متغیر دیکھو تو اپنے نفس کو نور عقل کے باقی رکھنے والے مصدر کی طرف ترقی دو، کیونکہ کل حقائق کا مصدر وہی غیر متبدل حقیقت ہے جو اللہ ہے، مگر امام غزالی اس مسئلہ میں آگسٹس پر فائق ہیں، کیونکہ آگسٹس عقل میں شک کرتا ہے، پھر بھی عقل ہی سے معرفت چاہتا ہے، اور غزالیؒ عقل میں شک کرتے ہیں، اور یقین کرتے ہیں کہ معرفت اس نور سے حاصل ہوتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ قلب میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ ڈیکارٹ (ت ۱۶۵۰ء) اس دقیق فرق سے بے خبر رہا، جسے غزالی نے نظریہ شک میں ملحوظ رکھا ہے۔

(ج) عقل و فلسفہ کو دین و شریعت کا تابع بنانا، یہ ان اسلامی افکار میں ہے جن کا اثر یورپی افکار میں ظاہر ہوا، سب سے زیادہ روشن ہے، غزالی نے یہ نہیں کیا کہ دین اور فلسفہ میں ہم آہنگی اور توافق پیدا کریں بلکہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ علم، فلسفہ اور عقل، وحی، دین اور شریعت کے خادم ہیں، جس کا اثر ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفہ میں پوری طرح ظاہر ہے، بالخصوص البرٹ کبیر اور ٹوما کے یہاں، اور ان دونوں نے فلسفہ اسلامیہ اور ابن رشد اور غزالی کا اثر بہت قبول کیا، اور کچھ زمانہ سے اسقف کنٹربری اور ازمنۂ وسطیٰ کے فقہا بھی اس کے قائل ہو گئے تھے، فلسفہ کا تعلق دین سے ایسا ہی ہے جیسا خادمہ کا تعلق سیدہ سے ہوتا ہے۔

۱۰۔ ابن باجہ۔ ابن باجہ نے تقریباً ۳۵ سال کی عمر پائی (ت ۵۳۳ھ۔ ۱۱۳۸ء) اس نے فلسفہ میں ایک نئی روح ڈالی، اور فلسفی فکر کی بنیاد ریاضیات اور طبعیات پر قائم کی، دین اور عقل کے درمیان بحث سے علاحدگی اختیار کر کے صرف عقل سے کام لیا، موسیٰ اندلسی جس نے تدبیر المتوحد

کا ترجمہ عبرانی زبان میں کیا،اس کے واسطہ سے ابن باجہ کا اثر یورپی فکر پر ظاہر ہوا، چنانچہ البرٹ اعظم اور ٹوماس داسیا اس سے متاثر ہوئے جو اس کے قائل ہیں کہ انسان حقائق علمیہ تک پہنچنے ہی سے سعادت حاصل کرتا ہے،

۱۱- ابن طفیل۔ ابن طفیل (ت ۵۸۱ھ، ۱۱۸۵ء) ازمنۂ وسطی کا زبردست مفکر ہے، اس کی تالیف رسالۂ حی بن یقظان میں ایک فلسفیانہ افسانہ ہے، جس میں انسان کی فطری خلقت لے کر عقل انسانی کے طبعی ترقیوں کے ذریعہ معرفت کے سب سے بڑے مرتبہ پر پہنچ جانے پر بحث کی گئی ہے۔ اس رسالہ کا ترجمہ عبرانی میں کیا گیا، اور پیکوک نے لاطینی میں اس کا ترجمہ کرکے نص عربی اصل کے ۱۶۷۱ء میں طبع کرایا، اس رسالہ کا اثر بلتاسار غراتیان کے "اندرنیو" (۱۶۵۱ء) اور روسو کی کتاب "امیل" میں نمایاں ہے، اسپینوزا بھی اس سے اثر پذیر ہوا، اور لیبنیز نے اسے پسند کیا، روبنسن کروزو کے قصہ مولفہ ۱۷۱۹ء میں بھی اس کا اثر ظاہر ہوا، اور اسی کے اثر سے موسیٰ بن میمون نے فلسفہ اور دینیات اور ازمنۂ وسطی کے فلسفیوں نے فلسفہ اور کیتھولک عقائد کے درمیان میں تطبیق کی کوشش کی، اور ابن طفیل کی نشو طبعی اور نظریہ معرفۃ اور تجربی علم کا اثر یورپ کی جدید فکر میں ہوا،

۱۲- ابن رشد۔ ابن رشد (ت ۵۹۵ھ، ۱۱۹۸ء) کا علمی تاریخ میں بڑا درجہ ہے، وہ ازمنۂ وسطی میں بڑے درجہ کا مفکر ہوا ہے، اس کا فلسفہ قیمتی معلومات کا ذخیرہ ہے، اور اس کے فلسفہ نے فکر انسانی میں ایک جوش پیدا کر دیا، وہ ارسطو کی کتابوں کا محض شارح نہیں تھا، اس کی شرحیں حقیقت میں اس کی ذاتی رایوں کا آئینہ یا قدیم رایوں کی صحیح تفسیریں ہیں، اور ارسطو کا فلسفہ سمجھنے کے لیے واحد وسیلہ ہیں، اسی لیے یہ شرحیں ارسطو کی کتابوں کے ساتھ چھاپی جاتی تھیں، اور اسی لیے ولیم اوکرز (۱۲۳۱ء) نے جو پیرس کا مقنن اور اس مجلس کا رکن تھا جسے پوپ گریگوری نہم نے ارسطو کی کتابوں کی تصحیح کے لیے قائم کیا تھا، ارسطو کی کتاب ما وراء الطبیعۃ اور اس کی ارسطو کی شرح پر

اعتماد کیا تھا، ابن رشد کی کتابوں کا ترجمہ عبرانی اور لاطینی میں کیا گیا، اس کی کتابیں صرف وینس میں پچاس بار سے زیادہ چھاپی گئیں، اور یورپ نے فلسفہ ابن رشد سے پورا فائدہ اٹھایا،

ابن رشد کے تبعین اور اس کے مخالفین

ابن رشد کے فلسفہ نے یورپ کی قوتِ فکر میں آزادی پیدا کر دی، اور ازمنۂ وسطیٰ کے مفکرین نے ابن رشد کی شروح کو بہت پسند اور اس کی رایوں سے اتفاق کیا، اور یورپ میں ایک مستقل مسلک رشدیہ پیدا ہو گیا، اس کے ماننے والے بحث و نظر میں عقل سے کام لینے لگے، وہ محض دینی روایات پر اعتماد نہیں کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے مقابلہ میں ایک جماعت مسلک رشدیہ کے مخالفین کی پیدا ہو گئی، جس کا مقصد دین کی حمایت اور ابن رشد اور ارسطو کی مخالفت تھا، مسلک رشدی کا سربرآوردہ شخص سیغر البرابسونی تھا، جو پیرس یونیورسٹی میں بڑے درجہ پر فائز تھا، کلیسا نے اسے کالج سے نکال دینے کا حکم صادر کیا، مگر اس سے نہ اس کی رائے میں تبدیلی ہوئی اور نہ امنگ میں کوئی کمی ہوئی، ۱۲۷۱ء اور ۱۲۸۴ء کے درمیان میں اس کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا،

سیغر کا خیال ہے کہ البرٹ الکبیر اور قدیس ٹوما نے ارسطو کے فلسفہ کو صورت بگاڑ کر پیش کیا ہے، سیغر قدم عالم کا قائل تھا کہ اللہ سوا موجود واحد کے اور کسی چیز کے خلق پر قادر نہیں ہے، اور بہت سی غیر فانی اور ناگزیر عقول کا وجود ہے، اور عقل انسانی صرف ایک ہے، اور جوہر وجود سے مختلف نہیں ہے اور لغۃ عقل لغۃ شرع سے مختلف ہے، ابن رشد کے موافقین میں بوتیوس واسیا بھی ہے جو پیرس کالج میں تھا، اور سیغر کا ہم خیال تھا، بہنیہ دی نیفل بھی رشدی تھا، یہ ان دونوں کا ہم عصر تھا،

ابن رشد کے پیرووں میں جان جاندون الفرنسی (ت ۱۳۲۸ء) سب سے بڑھا ہوا ہے، اس نے بہت سے مسائل میں ابن رشد کی پیروی کی ہے، چنانچہ وہ قدم عالم اور قدم حرکت کا قائل تھا، اور اس کا عقیدہ تھا کہ ہر ممکن الوجود موجود بالضرورت ہے، اور اس کا منکر تھا کہ اللہ تعالیٰ کل موجودات کا خالق ہے

اور عقل بشری کی وحدت اور اس کے خلود کا عقیدہ رکھتا تھا، اس کے فلسفہ کے بنیادی مسائل حسب ذیل ہیں:

(ا) "وجود کی طبیعی اور مادی تفسیر"، جو خلق عالم کے دینی تصور اور مفردات وجود کے ساتھ عنایت الہیہ کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

(ب) "ازلیۃ مادہ اور قدم عالم کا عقیدہ" جس سے خلق عالم میں اللہ تعالیٰ کے ارادہ بلکہ خلق عالم کا انکار لازم آتا ہے۔

(ج) "عقل بشری کی وحدت اور عقول جزئیہ کے عدم خلود کا عقیدہ" یعنی پوری بشریت میں ایک ہی عقل کارفرما ہے، اور بشر کے جملہ افراد صرف اسی عقل کے مظاہر ہیں، جیسے ایک سیب کی متعدد شکلیں کئی آئینوں میں پائی جاتی ہیں، جب کوئی فرد بشر مرجاتا ہے تو اس میں مظہر عقل معدوم ہو جاتا ہے۔ جس طرح جب کوئی آئینہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس سے سیب کی شکل غائب ہو جاتی ہے، کلیسا نے اس رائے کی سختی سے مخالفت کی کیونکہ اس سے موت کے بعد جزا و سزا کا انکار لازم آتا ہے اور مرنے کے بعد ایک آدمی کے دوسرے سے افضل ہونے اور سعادت کے مراتب کی نفی لازم آتی ہے، جو مذہبی عقیدہ کے خلاف ہے۔

(د) "انسان مختلف مقتضیات کی بنا پر اعمال کے صدور پر مجبور ہے"، نہ اس کا کرنا اسکے اختیار میں ہے اور نہ کرنا اس کی قدرت میں ہے۔ اس عقیدہ سے انسان کے اپنے ارادہ میں آزاد ہونے کی نفی لازم آتی ہے، حالانکہ اختیار اور ارادہ کی آزادی ہی پر انسان کے اعمال کی جزا و سزا مبنی ہے، اس لیے یہ عقیدہ بھی دینی تصور کے خلاف ہے۔

(ہ) "نظریہ حقیقتین" یعنی دین اور فلسفہ کے درمیان اتکمال کا علاقہ ہے، ضرورت کا علاقہ نہیں نہیں ہے، کبھی ایک بات جو فلسفہ کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوتی ہے، دین کے نقطۂ نظر سے غلط ہوتی ہے، اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے، اس عقیدہ کی رو سے دینی اوامر و نواہی کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی، اور وہ صرف نسبتی رہ جاتے ہیں۔

رشدیت پیرس سے پاڈوا (اٹلی) منتقل ہوئی، وہاں سولھویں صدی مسیحی کے نصف تک اسکی گرم بازاری رہی، رشدیت کے پیرووں میں کاتیانوس تینانوس (ت ۱۴۶۵ء) تھا، جس نے فلسفہ ابن رشد اور کلیسا کی تعلیمات کے درمیان میں تطبیق کی کوشش کی، لیکن تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یورپ میں ابن رشد اور ارسطو کے فلسفہ کی سخت مخالفت شروع ہوئی، اس کا بڑا سبب وہ خطرہ تھا جس کا نشانہ دین بن رہا تھا، چنانچہ کلیسا نے ان دونوں کے فلسفوں کو پڑھانے کی ممانعت کردی، اور رشدیین پر بھی طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، کلیسا کے علماء نے رشدیین کی رد میں کتابیں لکھیں، جس میں البرٹ الکبیر اور قدیس توما زیادہ مشہور ہیں، ان دونوں کے بعد کچھ اور لوگ اس کام کے لیے اٹھے، ان میں اغیدوس رومی (چودھویں صدی کے اوائل میں) اور ریامون اول (ت ۱۳۱۵ء) قابل ذکر ہیں۔ مگر ان کی کتابیں محض دینی مناظرانہ تھیں، علمی نہ تھیں۔

۱۲۔ ابن خلدون۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ عبد الرحمن بن خلدون (ت ۸۰۸ھ ۱۴۰۶ء) نے یورپ میں علم اور فلسفہ میں اثر پیدا کیا، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم الاجتماع اور فلسفہ تاریخ کے علماء میں اس نے سب سے پہلے فلسفہ تاریخ کے قوانین وضع کیے، جس کو اس نے اپنے مقدمہ میں اجمالی یا تفصیلی طور پر ثابت کیا ہے، اور جس سے اہل یورپ صدیوں بعد واقف ہوئے۔

علم اور فلسفہ پر یورپ کا اثر

۱۔ مسلمانوں نے قدیم فلسفہ خصوصاً یونانی فلسفہ کو ضائع ہونے سے بچا لیا، جب پہلی مرتبہ نصرانیت یونان میں داخل ہوئی تو فلسفہ سے اس کو دین میں ضرر کا خوف پیدا ہوا اور اس نے اس کی تعلیم کی ممانعت کردی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسفہ کی کتابیں تہ خانوں میں رکھدی گئیں، یا زمین میں دفن کردی گئیں، جب مامون نے ۲۲۳ھ میں فتح حاصل کی تو اس وقت ان کتابوں میں سے بہت سی ضائع ہو چکی تھیں، اگر مسلمان نہ ہوتے تو قدیم فلسفہ بالکل ضائع ہو جاتا۔

۲۔ مسلمانوں نے یونانی فلسفہ عربی زبان میں ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کا درس دیا،

اس کی شرح لکھی اور اس کے مشکل مسائل کی تفسیر و توضیح کی، پھر اس میں فکر و نظر کے نئے طریقوں اور جدید تحقیقات اور نئے قوانین کا اضافہ کیا،

۳۔ مسلمانوں نے فلسفہ کو ازمنۂ قدیمہ سے نئے زمانہ کی طرف پہنچایا، اور اس کو ازمنۂ قدیمہ کے معلومات و تحقیقات کا ماخذ بنا دیا، اور علوم کو نقل کر کے محفوظ کر دینا اس کی ایجاد و اختراع سے کم اہم نہیں ہے، مسلمانوں نے اس کی پوری کوشش کی کہ علم دنیا میں ہمیشہ باقی رہے، اس لیے وہ زمانہ جس میں وہ علم کے سردار تھے، علم سے کس طرح خالی رہ سکتا تھا،

(۱) حساب۔ مسلمانوں نے ارقام کو درست کیا، مرکب و بسیط حسابی عملیات کو آسان بنایا، اور سب سے پہلے انہی نے علاماتِ جذر کو وضع کیا، اور کسر عشری کے لیے فاصلہ کی علامت ایجاد کی اس کی قدر وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو علم حساب اور الجبرا میں علمائے یونان کے تقصیر محل سے واقف ہیں، اور یہ جانتے ہیں کہ ہندسہ کے مقابلہ میں ان دونوں علوم میں ان کو پوری دستگاہ نہ تھی،

(ب) الجبرا۔ عرب ہی جبر کے بنیادی قواعد اور اس کے ابتدائی اصولوں کے موجد ہیں، انھوں نے جبر کے علامات و اشارات کو منضبط قوانین کی صورت میں مرتب کیا، اور ایسے قوانین و ضوابط سے عدد کو مستنبط کیا، جس سے لوگ پہلے ناواقف تھے، خوارزمی نے معادلہ کو درجۂ ثانیہ سے حل کیا، جیسا کہ ہم لوگ اب کرتے ہیں، عمر خیام نے معادلہ کو درجۂ ثالثہ و رابعہ سے قطع مخروط کے واسطے سے حل کیا جو معادلات کے حل میں علمائے ریاضیات کی رسائی اور تحقیق کا انتہائی درجہ ہے، اس نے جبر اور ہندسہ کے درمیان میں ایک مضبوط علاقہ معلوم کیا، اور ہندسی عملیات کے حل میں جبر کے طریقوں سے اور جبری اعمال کے حل میں ہندسی طریقوں سے کام لیا اور اس کو یہ کامیابی ہندسی تحلیل کے اصول کے موجد دیکارٹ سے بہت پہلے ہوئی،

(ج) ہندسہ۔ اگرچہ یونان نے ہندسہ میں کوئی ایسی بات نہیں چھوڑی کہ آیندہ آنے والا اس میں

کچھ اضافہ کر سکے، اسکے باوجود ابو علی محمد بن حسن بن ہیثم نے کتاب اقلیدس کی طرح کی ایک کتاب تالیف کی، جس کے ہندسی مسائل نئے ہیں اور جو قدماء کے علم میں نہیں تھے، عربوں نے ہندسہ کو صحیح طریقہ پر سمجھا،

(د) المثلثات، علم مثلثات و اسکے اکثر مسائل و قوانین عربوں ہی نے معلوم کیے، اور مثلث کروی میں اضلاع کے جیوب کے تناسب کو ان زاویاکے جیوب سے جو ان کے مقابل ہوں ثابت کیا، اور اوتار کی جگہ جیوب کو استعمال کیا، اور مثلثات کرویہ کی مساحت کو سمجھا، اور ان ہی نے پہلے اپل زاویہ قائمہ والے مثلثات کے حل میں قانون خاص کو نکالا، اور سب سے پہلے جیب، راس اور قاطع وغیرہ کے درمیان تعلق ظاہر کیا اور کرہ کی سطح کے نقوش کے اصول کو سمجھا۔

(ہ) علم ہیئت (علم افلاک) سب سے پہلے مسلمان عربوں نے علم نجوم (جوتش) کے اوہام پر مبنی ہونے کی وجہ سے اسکے غلط ہونے کا دعویٰ کیا، البتہ اس میں جہاں تک ستاروں اور سیاروں کے ان مسائل کا تعلق ہے جو مشاہدہ، رصد اور تفتیش پر مبنی ہیں، تحقیقات کی پوری کوشش کی، بلکہ اس میں وہ یونان سے بھی سبقت لے گئے، انھوں نے سیاروں کی حرکات کو انکے افلاک میں معلوم کیا اور سب سے پہلے خط نصف النہار کے درجہ کے طول کی علمی اور قانونی تحقیقات کی اور زمین کی کرویت اور اسکے محور کے گرد اس کی گردش معلوم کی اور رصد کے نہایت عمدہ اور نئے آلات ایجاد کیے، اور گھنٹے بجانے والی گھڑی بنائی، اور طبیعیات خصوصاً کیمیا میں تجربہ کا اہتمام کیا جس نے جدید ترقیوں کا راستہ کھول دیا،

(و) علم طب، ازمنہ وسطیٰ میں یورپ میں طب کے نام سے کوئی چیز نہیں تھی، بلکہ دفع مرض کے لیے وہمی خیالات پر عمل تھا مثلاً وہ لوگ بخار کے مریض کو خوب مارتے تھے تاکہ اس کا شیطان جس کے اثر سے بخار آیا ہے، بھاگ جائے، اور اگر ان کے وہم میں یہ شیطان اتنا سرکش ہوتا کہ مریض کے بدن سے اس کے نکلنے کی کوئی امید نہ ہوتی تو شیطان کو مارنے کے لیے مریض کو بھی مار ڈالتے تھے، اسی زمانہ میں رازی، ابن سینا، ابن ہیثم اور ابن طفیل نے دنیا میں تشریح کی روشنی پھیلائی، زندہ اور مردہ جسموں کی تشریح کی اور جراحی کے عملیات اور بیہوش کرنے کے طریقے استعمال کیے،

۵۔ عربوں نے علمی اصطلاحات ایجاد کیں جن میں سے بعض اصطلاحوں کا یورپ والوں نے ترجمہ کیا اور بعض کو بجنسہ لے لیا،

۶۔ انھوں نے اہل یورپ کو افلاطونیت جدیدہ سے پھیر کر ارسطاطالیسیت کی راہ پر لگا کر فکر صحیح اور نتیجہ خیز علم کا دروازہ کھول دیا،

۷۔ پہلے اہل یورپ احوال عالم کے متعلق دوسرے اہل فکر کے خیالات کو تقلیدی طریقہ پر بے چون وچرا مان لیتے تھے، عربوں نے انکو ان امور میں بحث ونظر کا طریقہ سکھایا اور ان میں عقلی جوش اور فکر ونظر کی نئی دنیا پیدا کر دی،

۸۔ دنیا میں رواداری پھیلانا بھی عربوں کا کارنامہ ہے، یورپ میں سسلی کے عیسائی فرمانروا اس بات میں ضرب المثل تھے، کہ انھوں نے اپنے دربار میں یہودی نصرانی اور مسلمان تمام مذاہب کے علما مفکرین کو جمع کیا تھا، مگر اس سے بہت پہلے اموی اور عباسی خلفا اس کا نمونہ پیش کر چکے تھے انھوں نے اپنے یہاں یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابی وغیرہ بہت سے مذاہب کے علما کو جمع کیا تھا،

۹۔ انھوں نے فلسفہ کا خاص شوق اور ولولہ پیدا کیا، اور حقائق کو جاننے کی کوشش صرف علم و حقائق کے حصول کے لیے کی جس میں کوئی اور غرض شامل نہ تھی، ان کے برخلاف جن لوگوں نے یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا وہ باوجودیکہ اس کی اجرت میں کتاب کے ہم وزن سونا پاتے تھے، پھر بھی ترجمہ میں اتنی غلطیاں کرتے تھے کہ ترجمہ کا کام عیب اور مترجم ہونا معیوب سمجھا جانے لگا۔ یہ واضح رہے کہ یونانی سے ترجمہ کرنے والے عموماً غیر مسلم تھے لیکن عرب مسلمان تحصیل علم میں مخلص تھے، اسلیے انھوں نے صحیح وغلط اور کھرے کھوٹے میں پورا امتیاز قائم رکھا،

مبادی فلسفہ حصہ اوّل

اصحابُ الاعْراف

از جناب مولوی ضیاءالدین صاحب اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار کے ساتھ ساتھ اصحاب الاعراف کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، قرآن مجید کا ایک طالب علم جب اس مقام سے گذرتا ہے تو اس کے ذہن میں کم وبیش اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں :۔

(ا) اعراف کیا چیز ہے؟

(ب) اصحاب اعراف کون ہیں؟ اور کس لیے وہاں پر ہوں گے؟

(س) اور اس سے متعلق بعض آیتوں اور فقروں کا کیا مفہوم ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ان تمام آیتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں اصحاب اعراف کا ذکر ہے،

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ	اور دونوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور
رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ	اعراف (پردہ) پر کچھ لوگ ہوں گے جو ہر ایک کو
وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ	انکی خصوصیات سے پہچانیں گے، اور جنتیوں کو
عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ	پکارینگے کہ تم پر سلامتی ہو (ابھی) وہ جنت میں
وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ	داخل نہیں ہوئے ہیں لیکن اسکی خواہش کررہے
أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا	ہونگے، اور جب انکی نگاہیں جہنمیوں کی طرف
مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ	پھیری جائیں گی تو (ہولناک منظر سے گھبرا کر)

الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَ	بول اٹھیں گے خداوندا! ہمیں ظالموں کے ساتھ
بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنكُمْ	دیکھیو، اور اعراف والے (جہنم کے) کچھ مردوں کو جنھیں
جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ	انکی خصوصیات سے پہچان رہے ہونگے پکار کر کہیں گے کہ
أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا	تمھیں تمھارا جمع کرنا اور استکبار کرنا کچھ فائدہ نہ دے سکا
يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ادْخُلُوا	(اور اللہ تعالیٰ جہنم کے رؤسا، اور کبراء سے کہے گا کہ)
الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا	کیا یہی اصحابِ اعراف ہیں جنکے بارہ میں تم لوگ (دنیا میں)
أَنتُمْ تَحْزَنُونَ[1]	قسم کھاتے تھے کہ اللہ انھیں اپنی رحمت سے نہیں نوازیگا
. . . .	تو آج تمھارے مزعومات کے خلاف میں انھیں اجازت
. . . .	دے رہا ہوں کہ) تم (اصحاب اعراف) جنت میں داخل
. . . .	ہوجاؤ تم پر (آئندہ کا) کوئی خوف اور اندیشہ نہ ہوگا،
. . . .	اور نہ تم (گذشتہ پر) غمگین ہوگے۔

اعراف کیا ہے؟ عربی زبان میں اعراف کا لفظ عرف کی جمع ہے، جس کا اشتقاق معرفت سے ہے اور عرف اسی وجہ سے ہر بلند و بالا چیز کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ معروف، ممتاز اور نمایاں ہوتی ہے، اسی لیے "عرف الدیک" مرغ کی کلغی کو بھی کہتے ہیں، کیونکہ وہ جسم کے تمام حصوں سے اوپر ہوتی ہے،[2] اسی طرح ٹیلہ یا اونچی جگہ کو بھی عرف کہتے ہیں، شماخ بن ضرار نے ایک شعر میں اس لفظ کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے،

وَظَلَّتْ باعرافٍ تعالی کانّها ۔۔۔ رماحٌ نحاها وجهة الریح راکز

رہا یہ سوال کہ مذکورۂ بالا آیت میں اعراف سے کیا مراد ہے؟ تو اس باب میں ہمارے علماء،

---

[1] اس آیت کا مفہوم ہمارے نزدیک عام مفسرین سے مختلف ہے، جیسا کہ ترجمہ ہی سے واضح ہوگیا اور بعد میں اسکی مزید توضیح کیجائیگی،

[2] لسان العرب ج ۱۰

کے متعدد اقوال ہیں۔

(۱) اعراف سے نفس حجاب مراد ہے، جو جنت اور دوزخ کے درمیان حائل ہوگا اور اسی کو سورۂ حدید میں سُور (فصیل) سے تعبیر کیا گیا ہے، فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ

(۲) سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان پہاڑ ہوں گے جن کی چوٹیوں پر اصحاب اعراف ہوں گے،

(۳) بعضوں کا خیال ہے کہ اعراف سے ٹیلے مراد ہیں،

(۴) بعضوں کے نزدیک اعراف اور پل صراط ایک ہی چیز ہے،

(۵) بعض کہتے ہیں کہ قیامت میں جبل احد جنت و دوزخ کے درمیان حائل ہوگا[1]

لیکن ہمارے خیال میں وہی قول راجح ہے یعنی جنت و دوزخ کے درمیان حجاب یا سُور (فصیل) ہوگی جس کے اوپر یہ لوگ روک دیے جائیں گے،

اس حجاب یا اعراف کا سبب قاضی بیضاوی کے نزدیک یہ ہے:

لمنع وصول اثر احدھما الی الاخری[2] تاکہ ایک کا اثر دوسرے تک نہ پہنچے

لیکن حضرت شاہ عبد القادر صاحب فرماتے ہیں:-

"اور درمیان بہشتیوں اور دوزخیوں کے پردہ حائل ہوگا یا دیوار ہوگی تاکہ باہر نکل سکیں، اور اسی کو اعراف کہتے ہیں"[3]

یہ صرف تعبیر بیان کا فرق ہے ورنہ بات دونوں حضرات کی یکساں ہی ہے،

اعراف کے لفظ سے تعبیر کی علت اوپر واضح کیجا چکی ہے، مگر بعض علماء کا خیال ہے کہ اعراف اس مقام کا نام اس لیے ہوگا کہ وہاں کے لوگ جنتیوں اور دوزخیوں کو پہچانتے ہوں گے، جیسا کہ ابن جریر

---

[1] تفصیل کے لیے تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر دیکھنا چاہیے [2] بیضاوی شریف [3] موضح القرآن

نے سدی سے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب بھی فرماتے ہیں:

"اور اس مقام کا نام اعراف اس واسطے ہے کہ مرد وہاں کے پہچانیں گے۔"

اصحاب اعراف کون ہیں رہی اس امر کی تعیین کہ اصحاب اعراف کون لوگ ہوں گے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اساطین تفاسیر کے اقوال اور آراء بیان کر دینا مناسب ہوگا، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس بارہ میں علماء کے تیرہ اقوال ہیں لیکن تمام اقوال کا ذکر باعث طوالت ہوگا، اور بعض اقوال نہایت رکیک معلوم ہوتے ہیں، اس لیے صرف مشہور اقوال کے ذکر پر ہم اکتفا کرتے ہیں،

(۱) سب سے زیادہ عام اور مشہور قول تو یہ ہے کہ اعراف پر وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی یعنی نہ تو نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا کہ جنت میں چلے جائیں اور نہ برائیوں کا ترازو وزنی ہوگا کہ دوزخ میں ڈالے جائیں، جیسا کہ خود کلام مجید میں فرمایا گیا ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ	جن کی میزان بھاری ہوگی وہی کامیاب ہونگے
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ	لیکن جن کی نیکی ہلکی ہوگی تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے
فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ کو گھاٹا دیا۔

اس لیے ان لوگوں کو اعراف پر روک دیا جائے گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے انھیں جنت میں داخل کر دے، یہ رائے سلف میں عبداللہ بن مسعود، حذیفہ، ابن عباس، شعبی، ضحاک اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کی ہے۔

(۲) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اعراف پر وہ لوگ روکے جائیں گے جو اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جہاد میں شریک ہوئے تھے لیکن شہید ہوگئے۔

(۳) مشہور تابعی مفسر مجاہد کے نزدیک اصحاب اعراف نیکوکار علماء اور فقہاء ہوں گے،

(۴) شرجیل اور قشیری فرماتے ہیں کہ یہ شہداء ہوں گے،

(۵) عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ انبیاء ہونگے، زجاج سے بھی یہی منقول ہے،

(۶) ابو مجلز کے نزدیک یہ ملائکہ ہیں[1]،

علامہ ابن جریرؒ نے ان اقوال میں سے کسی ایک کی تائید نہیں فرمائی ہے، بلکہ سب کی صحت کا فیصلہ فرمایا ہو، البتہ ابو مجلز کے قول کی تردید کی ہے،

علامہ ابن کثیر کا فیصلہ | حافظ ابن کثیر ان مختلف اقوال کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

وفی ھذہ الاقوال یدل علی ان اصحاب	ان اقوال میں بعض سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ
الاعراف دون اھل الجنۃ فی	اصحاب اعراف اہل جنت سے کمتر درجہ کے ہونگے،
الدرجات وان کانوا یدخلون	اگرچہ وہ بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں چلے جائیں گے،
الجنۃ برحمۃ اللہ تعالیٰ وفیھا	اور بعض سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اہل جنت سے اعلیٰ درجہ
مایدل انھم افضل من اھل	کے ہوں گے اور اس بارہ میں کوئی واضح نص
الجنۃ واعلیٰ منھم منزلۃ	اور روشن دلیل نہیں ہو جس کی بنا پر قطعی
ولیس فی الباب مایقطع بہ من	فیصلہ کیا جائے، . . . .
نص جلی وبرھان منیر	. . . .

حافظ صاحب کی رائے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں کوئی ایسی قابل اعتماد نص اور اساسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر سلف کے کسی قول کو اختیار کرنا ہر شخص کے لیے ضروری ہو، تمام کتب تفاسیر کو دیکھنے سے کم وبیش اسی طرح کے اقوال ملتے ہیں، مگر اس کو تسلیم کرنے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع اور صحیح حدیث اس بارہ میں مروی نہیں ہے۔ مفسرین کسی نہ کسی قول کو اختیار کر لیتے ہیں[2]، حالانکہ اس پر ضعیف حدیثوں کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں،

---

[1] یہ تمام اقوال ابن جریر، ابن کثیر اور امام رازی کی تفاسیر سے نقل کیے گئے ہیں [2] اور با عموم متاخرین نے تو یہی مشہور قول کو اختیار کیا ہے،

اس لیے اس کی تاویل کی دو ہی صورتیں ہیں، یا ان ہی اقوال میں سے کسی قول کو اختیار کر لیا جائے خواہ اس پر پورا اطمینان نہ ہو یا فکر و نظر سے کام لیکر کوئی اور انسب راہ اختیار کیجائے، اس جدید راہ کو اختیار کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پوری فکر و کاوش کے ساتھ قرآن مجید، احادیث نبوی اور اصول شریعت کو پورے طور سے ملحوظ رکھکر قدم اٹھایا جائے، اور اس کا مقصود محض نکتہ آفرینی نہ ہو بلکہ تحقیق حق ہو،

ہماری رائے | اعراف کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر اوپر گذر چکا ہے، یہاں اصحاب اعراف کی تعیین کرنی ہے، مگر اس سلسلہ میں ہمارا نقطۂ نظر جدید و قدیم تمام مفسرین سے کسی قدر مختلف ہے،

ہمارے خیال میں اصحاب اعراف بڑے کامل الایمان لوگ ہوں گے، ان کا ایمان پختہ اور ان کے عقائد غیر متزلزل تھے، بڑے خستہ حال لوگ تھے، غربت، افلاس، بیچارگی، مظلومی، تنگی اور عسرت کے دور سے گذر رہے تھے، معاشی اور اقتصادی حیثیت سے نہایت پست اور خاندانی اعتبار سے بھی اونچے طبقے کے لوگ نہ تھے، اسی لیے جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو اس راہ میں ان کو طرح طرح کی مشقتیں اور زحمتیں برداشت کرنا پڑیں، وہ کفار و مشرکین کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے، کفار و مشرکین ان کی حالتِ زار دیکھکر کہا کرتے تھے کہ ہم خوشحالوں کے بجائے کیا اللہ تعالیٰ ان ہی بدحالوں کو حیات سرمدی اور جنت سے سرفراز کرے گا، قرآن مجید نے مشرکین کے اس استحالہ کا متعدد مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے، یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت حق قبول کرنے سے صرف اس لیے گریز کرتے تھے کہ اس دعوت کے ماننے والے کمزور اور پست طبقہ کے لوگ تھے، چنانچہ فرمایا:

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَا نَرَاكَ	(حضرت نوحؑ کے پیامِ حق کے جواب میں انکی قوم)
اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ	کا فر سرداروں نے کہا ہم تو تمھیں اپنے ہی جیسا
اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ	آدمی سمجھتے ہیں، اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمھاری پیروی

وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِيْنَ
(ھود)

ہمارے اندر سے صرف رذیل اور سطحی نظر کے لوگوں نے کیا ہے، اور ہم اپنے اوپر تمھاری کوئی برتری بھی نہیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ تمھیں جھوٹا سمجھ رہے ہیں،

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا:

انؤمن لك واتبعك الارذلون
(شعراء)

کیا ہم تمھاری تصدیق کرلیں درانحالیکہ تمھاری اتباع پست لوگوں نے کی ہے

اور یہ واقعہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر سب سے پہلے ضعفاء اور مفلوک الحال لوگوں نے لبیک کہا ہے، اور بڑے بڑے اور صاحب وجاہت لوگ ہمیشہ مال و دولت کے گھمنڈ میں مبتلا رہے ہیں، اس کی ایک مثال ہرقل اور ابوسفیان کی اس گفتگو میں ملتی ہے جو ہرقل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی تحقیقات کے سلسلہ میں کی تھی، اور اس سلسلہ میں ہرقل نے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ آپ کے پیرو کون لوگ ہیں، شرفاء اور اصحاب وجاہت ہیں یا غریب اور نیچے طبقہ کے لوگ، ابوسفیان نے جواب دیا تھا، غریب اور نیچے لوگ، یہ سنکر ہرقل نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ انبیاء کی پیروی غریب اور کمزور ہی لوگ کرتے ہیں[1]،

اتنا ہی نہیں بلکہ رؤسا اور کبرا، یہ بھی کہتے تھے کہ کیا سوسائٹی کے کمزور اور پست طبقہ کے لوگوں کو جنت مل جائے گی، ہم تو سمجھتے ہیں کہ جنت کا وعدہ پروپیگنڈہ ہے، اولاً تو جنت و دوزخ کا معاملہ ہی نہیں پیش آئیگا، اور بفرض محال اگر پیش بھی آیا تو ہمیں (رؤسا اور کبرا) وہاں بھی بلند و برتر رہینگے،

وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا

اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت ہوگی اور اگر مجھے میرے رب کے پاس لوٹنا ہوگا تو

---

[1] بخاری شریف جلد اول باب الوحی

مِنْهَا مُنْقَلَبًا	تو وہاں بھی اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔

اس لیے ہماری رائے یہ ہے کہ یہی کمزور اور پست لوگ جو نہایت کامل الایمان تھے، اعراف پر کھڑے کیے جائیں گے تاکہ مال و جاہ کے متوالے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ ان کا خیال کتنا خام تھا، اور انھوں نے ان مظلومین کے بارہ میں جو تصور قائم کیا تھا، اور اپنے متعلق جس فریب میں مبتلا تھے، وہ کتنا غلط تھا، اسی لیے بعد میں فرمایا گیا:

اَهٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ	کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم قسم کھاتے تھے
لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ	کہ اللہ انھیں اپنی رحمت سے نہ سرفراز کرے گا،
اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ	سو اب تم لوگ جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر
عَلَيْكُمْ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ	کوئی خوف و حزن نہ ہوگا،

ہمارے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، اور "هٰؤُلَاءِ" کا اشارہ اصحاب اعراف کی جانب ہے اور یہ خطاب اصحاب نار میں سے خصوصیت کے ساتھ ان کبرا اور ساوات سے ہے جو دنیا میں ضعیف اور کمزور طبقہ کے اہل ایمان کے متعلق قسم کھایا کرتے تھے، کہ بھلا یہ لوگ بھی کیا جنت میں جاسکیں گے۔

بعض علمائے تفسیر کی رائے بھی یہی ہے، چنانچہ صاحب درمنثور لکھتے ہیں:

قَالَ اللّٰهُ لِاَهْلِ التَّكَبُّرِ اَهٰؤُلَاءِ	اللہ متکبرین سے کہے گا کہ کیا ان ہی لوگوں کے
الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ	متعلق تم قسم کھاتے تھے کہ اللہ ان پر اپنی رحمت نہ
بِرَحْمَتِهٖ	کرے گا۔

بیضاوی نے "قیل" کہکر ایک اور قول نقل کیا ہے، جس سے اگرچہ ہماری تائید نہیں ہوتی، مگر اس کی تردید بھی نہیں ہوتی:

وقيل لما عيروا اصحاب النار	اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اصحاب اعراف اصحاب نار کو

اقسموا ان اصحاب الاعراف لا	عار دلائیں گے تو وہ قسم کھائیں گے کہ اصحاب اعراف
یدخلون الجنۃ فقال اللہ	جنت میں داخل نہ ہونگے، پس اللہ تعالیٰ یا
او بعض الملٰئکۃ اھٰؤلاءِ الّذین	کوئی فرشتہ کہے گا کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کے
اَقْسَمْتُمْ الخ	بارے میں تم قسم کھاتے تھے۔

ایک حد تک ہمارے مسلک کی تائید مفسرین کے عام خیال سے بھی ہوتی ہے کہ اَھٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ الخ اصحاب اعراف کا اصحاب نار سے خطاب ہوگا اور ھٰؤلاء کا اشارہ ضعفاء جنت کی طرف ہے، کیونکہ جہنم میں جانے والے اربابِ ثروت کفار دنیا میں ضعفاء مومنین کے متعلق قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ جنت میں نہ جائیں گے، چنانچہ اردو تفسیروں میں حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ نے اس خیال کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

"اور پکاریں گے اعراف والے مردوں کو دوزخ والوں سے کہ پہچانیں گے ان کو ساتھ نشانیوں ان کے کہ منہ کالے ہوں گے اور نیلی آنکھیں، اور وہ مرد سردار کافروں کے ہونگے جیسے ولید بن مغیرہ، ابوجہل، عاص بن وائل اور مانند ان کے مشرکوں سے کہ دنیا میں کہتے تھے کہ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ خدا بلال، عمار اور صہیب کو بہشت میں لیجاوے اور ہم کو دوزخ میں اور قسم کھاتے تھے کہ غلاموں اور چرواہوں کو اوپر ہمارے بزرگی نہ ہوگی"

یہ صرف شاہ صاحبؒ کا خیال نہیں بلکہ جمہور مفسرین کی انھوں نے ترجمانی فرمائی ہے لیکن اس تاویل پر متعدد شکوک و شبہات وارد ہوتے ہیں اور ہم نے جو تاویل اختیار کی ہے اور جس کی تائید بعض اور مفسرین کے قول سے بھی ہوتی ہے وہ زیادہ دلنشین ہے۔

اس تاویل کو اختیار کرنے کے وجوہ | اگرچہ یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ تاویل کیوں اختیار کی گئی، اس لیے کہ خود علماء سلف کے اس سلسلہ میں بکثرت اقوال موجود ہیں، اور ان کا ان میں سے کسی ایک تاویل پر

اجماع نہیں ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں خود کسی رائے پر پورا اطمینان نہیں ہے، حافظ ابن جریر اور ابن کثیر کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع حدیث بھی اس بارہ میں وارد نہیں ہے، مگر ان باتوں سے قطع نظر کر کے بھی ہم اپنے دعویٰ کے ثبوت میں چند دلائل پیش کرتے ہیں،

(۱) امام رازی صاحب نے تمام اقوال سلف کو دو قولوں کے اندر محدود کر دیا ہے (۱) اہل طاعت و ثواب میں سے اشراف لوگ اعراف پر ہوں گے، (۲) اہل ثواب میں سے کمتر درجہ کے لوگ جن کے اعمال حسنہ اور سیئہ برابر برابر ہوں گے،

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہاں انھیں دو باتوں کا دوقعی احتمال بھی پیدا ہوتا ہے، مگر پہلا احتمال چند وجوہ سے قابل قبول نہیں ہے،

(۱) حدیثوں سے نہایت صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف لوگ اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے جنت میں جائیں گے تو دوسری طرف برے اعمال کا ارتکاب کرنے والے بھی اپنی سزا بھگت کر جنت میں داخل کیے جائیں گے، اور بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے جنت میں چلے جائیں گے، بعض لوگ جن کی ساری زندگی معصیت میں بسر ہوئی ہے لیکن ان کا ایک عمل خیر ساری برائیوں پر بھاری ہوگا، ایسی حالت میں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہیں ہو سکتی جن کے اچھے اور برے اعمال برابر ہیں، جہاں وہ بڑے بڑے گنہگاروں کو بچائے گا وہاں ان لوگوں کو بھی بچا سکتا ہے، اور یہ محض قیاس نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے نزدیک یہ مسلم ہے اللہ کی رحمت اس کے عذاب اور نقمت پر غالب ہے، اس لیے جب ان کے اچھے اور برے اعمال کا معاملہ برابر ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انھیں جنت میں داخل کر دے،

(۲) اعراف پر روکنے کی خاص حکمت کیا ہو سکتی ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اعراف یا بلند مقام پر

عزت و برتری کی علامت ہے، اور یہ معلوم ہے کہ اصحابِ اعراف اللہ کی نظر میں معزز اور مکرم نہیں ہیں کیونکہ ان کے اچھے اور برے اعمال یکساں ہیں،

(۳) قرآن مجید نیز کسی صحیح روایت سے بھی اس خیال کی تائید نہیں ہوتی،

رہا دوسرا احتمال وہ بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر اس سلسلہ میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں وہ کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتے، پورے غور و فکر کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اس سے وہ خستہ حال مومنین مراد ہیں جنھوں نے ایمان و اسلام قبول کرکے کفار و مشرکین کے ہاتھوں طرح طرح کی زحمت اور مشقت برداشت کی تھی، اور جن کے بارہ میں مشرکین بطور استہزاء کہا کرتے تھے کہ یہ ارذال اور اجلاف کیا جنت میں جائیں گے، اس لیے انھیں مقامِ اعراف پر روک دیا جائے گا، تاکہ مال و دولت پر گھمنڈ کرنے والوں کو یہ اچھی طرح یقین ہوجائے کہ ان کا معیارِ عزت و ذلت کتنا غلط تھا ؎

خاکساران جہاں را بنظر حقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اس سے اگر ایک طرف اشراف و صاحب وجاہت لوگوں کی انتہائی رسوائی ہوگی تو دوسری طرف مظلومین، اور ضعفاء کی دلدہی بھی ہوگی، ایک کے مزعومات کی تردید ہوگی، اور دوسرے کی تمنا بر روے کار آئے گی،

(۴) اسی سلسلہ بیان کے اس ٹکڑے سے "ما اغنی عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون" تو ہماری تاویل کے علاوہ کسی دوسری تاویل کی گنجایش ہی نہیں رہتی، یہ کتنا لطیف اور زبردست طنز ہے کہ ایک دن یہ لوگ، مال و دولت کے نشہ میں چور ہوکر ان غریب اور فاقہ مست لوگوں پر پھبتیاں کسا کرتے تھے، اور اب ان ہی غریبوں کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ تم جو مال و دولت کی کثرت پر پھولے نہیں سماتے تھے تو کیا اب تمھارا مال و دولت تمھارے کچھ بھی کام آیا اور ہماری غریبی اب جاکر رنگ لائی،

یہ تو مسلّم ہے کہ اصحابِ اعراف کا اصحاب نار سے خطاب ہے، اور جو لوگ کلام کی بلاغتوں اور خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، وہ ہماری تاویل کی پوری تائید کریں گے،

(۳) اھٰؤلاء الذین اقسمتم الخ سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے، اور اس آیت کا مفہوم پورے حسن و خوبی کے ساتھ اسی وقت بے نقاب ہوتا ہے جب ہماری تاویل کو اختیار کیا جائے۔

(۴) اور مطلقاً جو کہا جاتا ہے کہ اصحاب اعراف اصحاب نار کو عار دلائیں گے تو ابھی انھیں یہ کہنے کا موقع کہاں ہے، ابھی تک ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم نہیں ہوا ہے اور ان کی بےچینی اور پریشانی دور نہیں ہوئی ہے، یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جو کبھی خود اصحاب نار کا طنز و طعنہ سن چکا ہو، یا اللہ تعالیٰ کہے،

(۵) سورۂ اعراف کے موقعۂ نزول اور انداز بیان سے بھی ہماری تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہ مکی سورہ ہے، جب کفار و مشرکین دعوت نبوی کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت کر رہے تھے، اور غریب اور مفلوک الحال مسلمانوں کو اسی قسم کا طعنہ دے رہے تھے، جس قسم کے طعن و طنز کا اوپر ذکر ہو چکا ہے،

لم یدخلوھم یطمعون کی تاویل اس پورے سلسلۂ بیان میں جو وقت طلب آیتیں تھیں، ان کا مفہوم واضح ہو چکا ہے، لیکن یہ فقرہ تشریح اور توضیح کا طالب ہے، کیونکہ اس سے بعض لوگوں نے اپنے خیال کی تائید اور دوسرے گروہ کی تردید کی ہے کہ اگر اصحاب اعراف سے اشراف اور معزز لوگوں کو مراد لیا جائے تو یہ وصف یعنی طمع ان کے شایان شان نہیں ہے، اسی لیے لوگوں کو بڑی دقتیں پیش آئی ہیں، اور بعضوں کو یہ ثابت کرنا پڑا ہے کہ طمع کے معنی یقین کرنا ہے[1]، حالانکہ کسی لفظ کو اس کے معروف اور مشہور معنی سے ہٹا کر غریب اور نادر معنی میں استعمال کرنا کسی طرح درست نہیں ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ اصحابِ اعراف بھی جنت کی خواہش و طمع کریں گے تو ہمارے نزدیک

---

[1] دیکھو تفسیر کبیر للرازی،

اس میں کوئی دشواری نہیں، اس لیے کہ جنت کی طمع تو ہر مومن کے اندر اس وقت تک رہے گی جبتک وہ جنت میں داخل نہ ہو جائے گا، اور پھر یہ لوگ جن کے سامنے عیش وعشرت کے تمام سامان موجود ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مصلحتاً روک رکھا ہے، اور انھیں قطعی طور پر یہ معلوم بھی ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے، بھلا کس طرح اپنے بے پایان جذبۂ شوق کو قابو میں رکھ سکیں گے، یہ تو مسلّمہ اصول ہے،

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد

اس لیے اگر خدا کی راہ میں ہر طرح کے ظلم وستم انگیز کرنے والے اس کے حکم سے اگر تھوڑی دیر کے لیے اعراف پر روک کے جارہے ہیں اور جنت کا دلکش منظر دیکھکر جنت میں جانے کے لیے بے چین اور مضطرب ہوں تو اس میں کونسا اشکال ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں فطرت کی صحیح تصویر کشی کی گئی ہے، اور قرآن مجید نے جو انتہائی حقیقت افروز بات فرمائی ہے، اسی میں لوگوں کو برائی نظر آرہی ہے، اور ایسی ایسی توجیہات کی ہیں، جس سے آیت کا سارا حسن وجمال غارت ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری لطافت اور خوبی پر پانی پھر جاتا ہے،

اس لیے اس آیت کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ اصحاب اعراف ابھی جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے، لیکن ان میں جنت کے داخلہ کا بے پایاں جذبۂ شوق ..... موجزن ہوگا، اور اس مفہوم میں ہم کو کوئی زحمت نہیں نظر آتی ہے۔

محمد علی

ذاتی ڈائری کے چند ورق

(حصہ اول)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح وحالات، وقائع زندگی جو صاحب تفسیر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق کے ذاتی مشاہدہ وتجربہ میں آئے، اس میں انکی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت بسط وتفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے: قیمت ۔ ۲ر "مینجر"

مثنوی برہان رازالٰہیؒ

از جناب شیخ فرید ایم اے، لکچرار رابرٹسن کالج جبلپور

شیخ برہان الدین رازالٰہیؒ[1] المتوفی ۱۰۸۳ھ سلسلۂ شطاریہ کے جیّد عالم اور صوفی بزرگ تھے، انھوں نے یگانۂ عصر، محدثِ کامل حضرت شیخ علم اللہ کمال کی خدمت میں فقہ، حدیث اور سلوک کی تحصیل کی، علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد علوم باطنی کے شوق میں ایک عرصہ تک حسن بنانی کی خدمت میں رہے اور آخر میں حضرت عین العرفا مسیح الاولیا شاہ عیسیٰ جند اللہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت رازالٰہیؒ عابد مرتاض تھے، شب و روز عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ ایک عرصہ کی ریاضتِ شاقہ کے بعد حضرت شاہ مسیح الاولیا نے ان کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اورنگ زیب عالمگیر، فاضل خاں رازی اور امیر شایستہ خاں کو حضرت مسیح الاولیا سے بڑی عقیدت تھی، چنانچہ جانشینی کی جنگ میں آتے وقت شہزادہ اورنگ زیب نے شیخ نظام برہانپوری کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر باطنی توجہ کی درخواست کی تھی[2]۔

ایک عرصہ تک زمانہ ان کے باطنی فیوض سے مستفیض ہوتا رہا، ۱۰۸۳ھ میں ان کا وصال ہوا۔

حضرت رازالٰہی کو علوم متداولہ خصوصاً حدیث و فقہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی، نثر میں "شرح آمنت باللہ"، "وصیت نامہ" اور "شرح بیم کہاسے" ان کی یادگاریں ہیں[3]۔

---

[1] تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجئے معارف نمبر ۵-۶ جلد ۶۰ [2] بزم تیموریہ ص ۲۵۳ [3] کتب خانۂ خانقاہ رازالٰہی میں ان کتابوں کے قلمی نسخے محفوظ ہیں، موجودہ سجادہ نشین حضرت سید حبیب الدین صاحب نے ازراہ بندہ نوازی اور علم دوستی مذکورہ بالا مخطوطات مرحمت فرمائے تھے۔

اور الذکر آمنتُ باللہ کی عام فہم تشریح ہے، وصیت نامہ اذکار و اشغال پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے جس میں طالبانِ حق کیلیے مختلف وصیتیں کیگئی ہیں، اس میں "ھو الاوّل ھو الآخر ھو الظاہر ھو الباطن" کی تشریح بھی ہے،

"شرح ہیم کہاے" ہندی دوہروں کی فارسی شرح ہے،

حضرت برہان الدین راز الٰہی کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا لیکن زیرِ نظر مثنوی و مناجات اور چند متفرق اشعار کے علاوہ آپ کا زیادہ کلام نہیں مل سکا،

وصیت نامہ کے آخر میں حسبِ ذیل مناجات مرقوم ہے، جس کے صرف تین شعر (پہلا، دوسرا اور گیارھواں) شرح آمنت باللہ کے آخر میں مندرج ہیں۔

یارب مرا گرداں چناں، از راہِ لطف و مرحمت ؎ بے شک شمارم اغنیا، شاہاں بیارم درنظر

باشم توانگر دل چناں، از کس نخواہم حاجتے ؎ فارغ نشینم شاد و خوش، بیروں نیایم پیش در

راضی بہ فقر و فاقہ ہم باشم بہ کنجِ اندروں ؎ ممنون زمنتِ سفلگاں مارا مگرداں تا حشر

از بہرِ روزی رزق ہم وقتے پریشاں دل مکن ؎ یارب بدہ صبرم چناں، جز تو نخواہم کس دگر

یارب بحقِ مصطفٰے، ہم انبیاء، ہم اولیاء ؎ گرداں چناں ایں تحفہ را مقبول گرد و بحر و بر

عاشق بود جملہ جہاں، اندر درونِ جانِ خود ؎ سازند پاکاں جائے او، دارند بالا چشم و سر

الغرض چناں دہ خلق را جز ایں نخواہد ہیچ کس ؎ ہر جا کہ بیند عالمے، مردی تعویذ (؟) او ایں مختصر

اصحابِ علم و معرفت ہر کہ ببیند سوئے آں ؎ عیبم نگیرد بہر حق، ہم راست سازد زود تر

چوں عیب دارم جاہلگی جز عیب در من ہیچ نہ ؎ صد عیب یابی بے شکے، ہرگز نہ بینی ایک ہنر

کردم ہوس چوں (؟)[۱] رفتار کبکا زاکمز ؎ بربادشد رفتار من، گشتم خجل چوں منکسر

گرکیک سخن زیں جاہلگی، یا بہ قبولے نزد حق ؎ نازم چو حسّان در عجم، گردم چو سحباں مفتخر

۱؎ کرم خوردہ

دارم امیدے از خدا خواہند چون صاحب دلاں بکنند بہر من دعا یا بم نجاتے در قبر

سرِّ نازکتر بگویم بشنو! اے جانِ پدر در خود نگر آں وجہِ مطلق تا نگردی در بدر

مذکورۂ بالا مناجات میں کوئی ایسی صراحت نہیں ہے، جس کی بنا پر ہم اسے حضرت رازِ الٰہی کی جانب منسوب کرسکیں، مگر آخری شعر سے ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مناجات حضرت موصوف کی ہی فکر کا نتیجہ ہے،

اس شعر کی شانِ نزول بیان کرتے ہوئے ملفوظات حضرت رازِ الٰہی کے مرتب عاقل خاں رازی[1] نے لکھا ہے کہ حضرت موصوف کو علم عروض و قافیہ میں مہارت نہ تھی، ان کے پیر و مرشد حضرت مسیح الاولیا نے اس فن میں استفادہ کی اجازت بھی عطا کی، مگر انھوں نے اس کے بجائے عارفانہ حقائق و معارف سے مستفید ہونے کی تمنا ظاہر کی، مگر پھر خیال ہوا کہ مرشد کے حکم پر عمل ضروری ہے،

چوں گزیدی پیرہاں، تسلیم شو ہم چو موسیٰ زیر حکم خضر رو

اور حالتِ وجد میں مذکورۂ بالا شعر ان کی زبان سے صادر ہوا۔

بیتے موزون کہ از حضرتِ ایشان در حالتِ وجد ان شرف صدور و عز ظہور یافتہ این ست"[2]

شعر سرِّ نازک تر ...... الخ

"شرح بیم کہاتے"[3] کے آخر میں ایک طویل مناجات ہے، اس شرح کا ایک مکمل نسخہ حضرت سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد (برہانپوری) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اور ۱۲ رجب ۱۲۰۶ھ

---

[1] عاقل خاں رازی کے حالات و تصانیف کے لیے ملاحظہ کیجئے "بزم تیموریہ" ص ۲۹۷ [2] ثمرات الحیات قلمی ورق ص ۵۳

[3] شرح بیم کہاتے کا ایک مکمل نسخہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں اور ایک ناقص نسخہ کتب خانہ درگاہ پیر محمد شاہ احمد آباد میں بھی ہے،

کا نقل شدہ ہے، ذیل کی مناجات اسی سے نقل کی گئی ہے۔

اے جمالِ تو کانِ محبوباں عکسِ حسنِ تو جملۂ خوباں

جلوۂ حسنِ تست در ہمہ جا از تو دارند جملہ نشو و نما

چشم آنکس کہ کردۂ تو وا بنظرش کے فتد بغیر سوا

تا کہ حسنِ تو گشتہ است عیاں جذبۂ عشق تست در ہمہ جاں

ہمہ ذرات مست و بے خبر اند از خودی ہائے خویش بگذشتند

حسن لیلےٰ کہ زد رہِ مجنوں برد از کوئے عقل سوئے جنوں

ہوش و امق کہ زلف عذرا برد دل و جانش بہ بیخودی بسپرد

لب شیریں کہ بود شور انگیز رنج فرہاد و راحت پرویز

زاں ہمہ پرتو جمال تو بود کہ دلِ ہر یکے ازان بربود

گرچہ جز یک جمال بیش نبود در ہر آئینہ روے خویش نمود

گشت کثرت نما در آئینہ ہا مختلف گشت در معائینہ ہا

گاہ در گل گہے در خار روئے در ہر لباس و در اطوار

ہر طرف جلوہ گر بہ شکل دگر تو بہر شکل روئے او بنگر

گاہ در مومناں نماید روئے گاہ در کافراں کشاید موئے

گر بہ کعبہ گہے بہ مسجد ہا پرتو روے تست ... صنما

گاہ در بتگر و گہے بہ بتاں جلوۂ خود نمودی اے جاناں

بت پرست و برہمن و ختار از تو دانند ہو بہو اسرار

گہ ز روئے مضل گہے ہادی ہمہ را پرورش تو خود دادی

چونکه در اصل شان همی نگرم — همه جا روی تست جلوه گرم
بردی از صورتِ دل مجنون — کردی او را بحسنِ خود مفتون
دلِ وامق به هستی بردی — زلف عذرا بهانه آوردی
روی شیرین که بود راحت خیز — شهدِ فرهاد و شکر پرویز
این همه جز بهانه بیش نبود — کیست جز تو که روی خویش نمود
دام پرپیچ و دانهٔ فرهاد — حسن تو بود داوست این فریاد
زد بهر جلوه سعادت بند — ساخت از زلف خویش جانش بند
بکمند دو زلف بست و نهاد — کرد از جمله بندها آزاد
من هم ای شه یکی گدای توام — از دل و جان خود فدای توام
تا که جانم جدا شد از اعیان — جمله دارند بر من آه و فغان
گه بری در سرای خود بینان — گه فرستی به پیش بی دینان
چند سرگشته داریم چون باد — گه بری بر خرابه گه آباد
چه شود گر ازین خلاصم دهی — گر ز اخلاص جام خاص دهی
باده شاها مرا ز خویش رهان — تا که باشم بچشم خویش نهان
روز و شب کوکبِ دولت تو زنم — گه نیاید بخاطرم که منم
چند داری مرا ز خود مهجور — تو به نزد من است و من ز تو دور
گر به تیرم کشی گهی به تفنگ — صلح کردم بر این ندارم جنگ
پردهٔ ما و من ز پیش ربای — بر رخِ خویش چشم من بگشای
چونکه بر خویش چشم بگشایم — تو درآئی بچشمِ من نائم

درتہ بینی نہ مرد این ہوسم طلبِ شیر و کم تر از گسم
بدلِ اہلِ درد راہم دہ بصفِ بیدلاں پناہم دہ
سرمن ساز خاکِ درِ ایشاں تا بیایند و گذرند ایشان
حرز جانم نگاہِ ایشاں کن دل و جانم براہ ایشاں کن
خاطرم را ہم کن ز صحبت شاں وقت من ساز خوش ز قسمت شاں

ثمرات الحیات میں حضرت برہان راز الٰہی کا ذیل کا ہندی دوہرہ بھی ملتا ہے:

جہتہ جہتہ کھیلیں سچ پچ ہوئے سچ مچ کھیلے برلا کوئے

مرتب ثمرات الحیات[1] نے اس دوہرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ دورانِ سماع میں اہل طریقت پر وجد طاری ہو جاتا ہے، اور وہ رقص کرنے لگتے ہیں۔ اس حالت میں وہ قید لبقات رہا اور حدود زمان و مکان سے پرے ہو جاتے ہیں۔ وجد سے فراغ کے بعد ان کے لیے وضو لازمی نہیں اور اسی طہارت سے نماز جائز ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں کہ سماع کا نتیجہ بے خودی ہے، جس سے نقض طہارت ہوتا ہے حضرت موصوف نے فرمایا کہ "ظہور جذبات سے شعور کا سقوط ایسا ہے، جیسے آفتاب کے سامنے چراغ کی روشنی کا مدہم ہونا، پھر حدیث شریف "اذا رأیتم اھل البلاء فابکوا و ان لم تبکوا فتباکوا" کا حوالہ دیکر فرمایا کہ" اہل درد کو دیکھ کر گریہ و زاری کرو" ایک روایت میں حضرت رسالت مآبؐ نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ "قرآن کی تلاوت کے وقت گریہ کرو" اس ارشاد کے بعد مذکورۂ بالا دوہرہ پڑھا،

اگرچہ حضرت کو خود شعر و سخن سے ذوق تھا، اور شاعری بھی فرماتے تھے، مگر عاقل خاں رازی

---

[1] ثمرات الحیات (قلمی) ورق ۵۵ (ب)

کے استفسار شعر گوئی پر انھوں نے پہلے یہ آیت پڑھی "وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ" اور یہ ہدایت فرمائی کہ اس کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پھر "وان من الشعر لحکمۃ" کا مقولہ نقل کرکے موصوف کو واردات نظم کرنے اور خرافات سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔[1]

مندرجۂ بالا منظوم کلام کے علاوہ ان کی ایک مثنوی کتب خانہ پیر محمد شاہ (احمد آباد) میں ایک بیاض میں مرقوم ہے۔ جس کے سرورق پر لکھا ہے "مثنوی شیخ برہانؒ، برہان پوری"۔ اس مثنوی میں کہیں بھی آپ کا تخلص نہیں ہے، صرف ایک شعر میں (عیسوی) کی طرف اشارہ ہے،

عیسوی را عشق او بے خود نمود　　　عشق را بے سود ان اے اہل خود

عیسوی سے مراد یہاں حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہ نہیں ہیں، جیسا کہ بشیر محمد خاں صاحب نے اپنے مضمون "حضرت شاہ برہان الدین راز الٰہی" میں بتلایا ہے۔[2] بلکہ ان کے صاجزادے "بابا فتح محمد محدث" ہیں، جو اپنے دور کے جید عالم، فاضل اجل، حافظ، قاری، محدث، مفسر اور فقیہ تھے، ان علوم کے علاوہ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور عیسوی تخلص کرتے تھے۔

محدثِ موصوف کی ایک تصنیف مفتاح الصلوٰۃ میں تعین اوقاتِ نماز کے ذیل میں جا ان سایہ کا ذکر ہے، ان کا ایک قطعہ ملتا ہے جس کے آخری شعر میں عیسوی تخلص ہے۔

باز از حل دو نیم ہست، گر عاقلی عاقل بشو　　　بہر خدا گفتم بر تو اے عیسوی! ایں نظم را

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زیر نظر مثنوی میں عیسوی اگر شاعر کا تخلص قرار دیدیا جائے تو اس مثنوی کو حضرت محدث کی فکر کا نتیجہ تسلیم کرنا ہوگا، اس صورت میں مثنوی کا غلط انتساب سہو کاتب پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

راقم السطور کی ناقص رائے میں حضرت راز الٰہی نے مذکورۂ بالا شعر میں اپنے مرشد زادہ

---

[1] ثمرات الحیات (قلمی)، ورق ۱۸ [2] معارف نمبر ۶ جلد ۱۰، ص ۴۰۳

کی طرف اشارہ کیا ہے، جو عشق الٰہی میں سرشار تھے۔

زیرِ نظر مثنوی دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ۱۹۲ اور دوسرے میں ۱۶۲ اشعار ہیں، بعض اشعار نقل درنقل کے تغیرات سے وزن سے خارج ہو گئے ہیں، بعض اشعار میں ایسے الفاظ لکھ دیے گئے ہیں یا ایسی تحریف ہو گئی ہے جس کا نفس مضمون متحمل نہیں ہو سکتا،

زیرِ بحث مثنوی ایک ایسے بزرگ کی تصنیف ہے جو وحدت الوجودی مشرب رکھتے تھے، چنانچہ مثنوی میں جابجا اسی کے غوامض و رموز کی تشریح کی ہے، یہ مثنوی خاصی طویل ہے، کل نقل کرنے کی گنجایش نہیں ہے، اس لیے صرف اول و آخر کے کچھ اشعار نقل کیے جاتے ہیں

ذاتِ حق چوں بود اول بے نشاں   نے تعین داشت وبے نام ونشاں
او وجود صرف بود و ذاتِ بحت   زاں[1] معرا از حقیقت بود و نعت
از ظہور و از بطون و از صفات   او مبرا بود از جملہ جہات
نیست از نعت و نسبت آں ذات را   تا کہ او را بے نشاں گفتن خطاست
انبعاثے شد از اں دریاے جود   تا کہ ظاہر گشت از وے ایں نمود
بے نشاں اندر نشاں زاں آمدہ   لاتعین در تعین حاشدہ
آمدش در عالم ذاتِ بحت خویش   انچہ قابل بود کاں آمد نہ پیش[2]
ہر نشانِ بے نشاں ہم خود بدید   لاتعین در تعین شد پدید
گشت حاضر در کمال خویشتن   انچہ اول بود آخر ذو المنن
عاشق آمد مرکمال خویش را   خواست تا جوید وصال خویش را
فیض بخشد خستۂ دل ریش را   تا بدست آرد دلِ درویش را

[1] زاں کے بجائے "ہا" چاہیے۔ "نشاں ہا" [2] نہ پیش کے بجائے 'بہ پیش' چاہیے۔

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں:

او من را پردۂ خود ساختہ	تا بخود بر خود نظر انداختہ
خود شدہ عاشق برو سے خویشتن	کس نباشد در میان زو الفتن
نیست کشتہ خود شدہ اسرار جو	در درون شہر اندر چارسو
از انا الحق دم زند منصور دار	در شریعت خود شدہ بالائے دار
عاشق و معشوق خود بودہ است پس	در میاں ناید بجز او ہیچ کس
ایں سخن آخر ندارد ختم کن	عشق وے از مشرب خود دم مزن
اعتقاد صوفیہ گفتم تمام	در عمل آرید یاراں والسلام
من نگویم ستر اسرار ازل	خود بگوید پیش خود آں بے بدل

اوست اول اوست آخر در جہاں
اوست ظاہر اوست باطن بے گماں

دار المصنفین کی نئی کتاب

تاریخ دعوت و عزیمت

(حصہ اول)

یعنی عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی و عملی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ۔

اس جلد میں پہلی صدی یعنی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے لیکر مولانا جلال الدین رومی تک کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مؤلفہ مولانا ابو الحسن علی ندوی۔ قیمت: ۷ؔ

"مینجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

علاء الدین خلجی کے بارہ میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک ظالم، سفاک، متعصب اور مذہبی حیثیت سے بدعقیدہ فرمانروا تھا، لیکن ۱۹۵۰ء میں پروفیسر کے. ایس. لال ایم. اے. ڈی فل نے انگریزی میں خلجیوں کی تاریخ کے نام سے جو کتاب لکھکر شائع کی ہے، اس کے حسب ذیل اقتباسات سے ہندوستان کے اس فرمانروا کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں:

ڈاکٹر کے. ایس. لال رقمطراز ہیں:-

ضیاء الدین برنی کی تاریخ کے سرسری مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین اگر مذہب کا منکر نہ تھا تو کم از کم اس سے بدعقیدگی ضرور رکھتا تھا، لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا، وہ رمضان کے روزے اور نماز کا بھی پابند نہ تھا، اور شاید وہی ایک ایسا سلطان تھا جو جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جامع مسجد نہیں جاتا تھا، وہ سلطنت کے نظم و نسق میں مذہب کی مداخلت بھی گوارا نہ کرتا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ ایک سچا مسلمان تھا، اس کو اپنے مذہب سے بڑی عقیدت تھی، اور وہ

کوئی ایسی بات سننا پسند نہ کرتا جس سے مذہبی بدعقیدگی کا اظہار ہوتا ہو،

وہ اپنے معاصر صوفیہ کا بڑا احترام کرتا تھا حضرت نظام الدین اولیاء سے تو خود کبھی نہیں ملا لیکن ان کے روحانی تصرفات کا بڑا معتقد تھا، اور اپنے امراء کے توسط سے ان کی دعاؤں کا ہمیشہ طلبگار رہتا تھا، آخری زندگی میں ان کا اور بھی گرویدہ ہوگیا تھا، اور اس کے خاندان کے تقریباً تمام افراد ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوگئے تھے، جب مولانا شمس الدین ترک مصر سے ہندستان آئے اور علاء الدین سے ملے بغیر واپس چلے گئے تو اس کو بڑا قلق ہوا، الغ خاں مرا تو اس کے ایصال ثواب کے لیے اس نے کثیر رقم خیرات کی، ممکن ہے کہ اس کو سیاسی چال پر محمول کیا جائے لیکن اس کی اور دوسری باتوں سے یہ پوری طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنی نجی زندگی ایک اچھے مسلمان کی طرح بسر کی، امیر خسرو، عصامی، شمس الدین ترک اور وصاف کی نظروں میں علاء الدین ایک سچا مسلمان تھا، عصامی کا تو یہ بھی بیان ہے کہ سلطان نے شریعت کے اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور اپنے عمل میں اسلامیت کا اظہار کیا، اور اس کے عدل و انصاف کی وجہ سے سلطنت مستحکم ہوئی، لوگ اطاعت گذار رہے، اور عام خوش حالی رہی،

اس پر تعصب کا بھی الزام ہے لیکن اگر اس کے کردار کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے کسی مذہبی بنیاد پر ہندوؤں کو نہیں دبایا، البتہ اس کے سخت نظام حکومت کی وجہ سے سازش کرنے والے امیروں، بے جا فائدہ اٹھانے والے تاجروں، اور سرکش زمینداروں کو بڑا نقصان پہنچا، اور اس سلسلے میں جو مذہبی قوانین نافذ ہوئے ان سے متوسط درجہ کے تاجروں اور غریب کسانوں کو بھی کچھ سختیاں جھیلنی پڑیں، لیکن ملک کی آبادی اور اس کے زمینداروں اور کاشتکاروں کی اکثریت ہندوؤں ہی کی تھی، اس لیے جو بھی تجارتی یا مالی قانون نافذ ہوتا اس سے ان کا قدرۃً ہندوؤں پر زیادہ اثر پڑتا، اگر علاء الدین کسی ہندو راجہ کے علاقہ پر حملہ کرتا

اور اس عہد میں ہندوؤں کو زیادہ نقصان پہنچتا، یا ہندو راجاؤں سے جنگی ٹیکس جس کا سرکاری نام جزیہ تھا لیا جاتا تو یہ اس لیے نہیں کہ علاء الدین متعصب مسلمان تھا. کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی جا سکتی، جس سے یہ ثابت ہو کہ علاء الدین نے ہندوؤں کو محض ان کے ہندو ہونے کی وجہ سے ستایا، یا مسلمانوں کے ساتھ اس لیے لطف و کرم کا برتاؤ کیا کہ وہ مسلمان تھے، اگر تاجروں کو نقصان ہوتا تھا تو صرف ہندو تاجر نقصان نہیں اٹھاتے تھے. اگر محکمۂ مال کی طرف سے کوئی ظالمانہ قانون نافذ ہوتا تو اس کا نفاذ صرف ہندوؤں پر نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر امراء کو دبا کر رکھا جاتا تو صرف ہندو امراء ہی اس کے شکار نہیں ہوتے تھے، علاء الدین نے اپنے امرا کے خلاف سخت ترین رویہ اختیار کیا تھا. حالانکہ اس کے زمانہ میں ہندو امراء نہ ہونے کے برابر تھے، اس کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مسلمانوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمان سلاطین کو اپنا اقتدار ایک ایسی جگہ قائم کرنا پڑا جہاں کے لوگ مذہب، معاشرت اور کلچر میں ان سے بالکل ہی مختلف تھے، ایسی حالت میں وہ ایسے لوگوں کو اونچے عہدے دیکر ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے، ہندو راجاؤں سے ان کی لڑائیاں برابر جاری رہیں، اور ترکوں کے حکمراں طبقہ اور یہاں کی مفتوح رعایا میں غیر شعوری طور پر کشمکش قائم تھی، ایسی حالت میں ان سلاطین سے یہ امید کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ وہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کرتے، اور ان کے لیے بڑے عہدوں کے دروازے کھلے رکھتے. اس لیے اگر علاء الدین کے عہد میں ہندو عہدیدار نظر نہیں آتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں،

علاء الدین ضرورت سے زیادہ بلند حوصلہ تھا، اسے اپنے نام کو دوام بخشنے کی بڑی آرزو تھی، اس لیے کبھی وہ سکندر اعظم کی طرح فتوحات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا، اور کبھی کوئی نیا مذہب بنا کر انسانی تاریخ میں زندہ جاوید بننے کے لیے سوچتا. اس کی ان تمناؤں کو اس کی شراب نوشی، اس کے ہمجلیسوں کی خوشامدانہ باتیں اور بڑے سے بڑے عزائم میں اس کی

کامیابی نہ دیا کرتی تھی، لیکن جب کوئی اس کو بہی خواہانہ مشورہ دیتا تو اس کو خاموشی سے سنتا تھا، ملک علاء الملک نے اس کو جو مفید نصیحتیں کی تھیں، اس کے اثر سے وہ اپنے بہت سے ارادوں سے باز آگیا، اور اس کی توجہ مغلوں کو شکست دے کر ہندوستان کی ریاستوں کو تسخیر کرنے کی جانب منتقل ہوگئی، فتوحات ہوں یا عظیم الشان تعمیرات یا اقتصادی اصلاحات ہر ایک چیز میں سلطان کی یہی خواہش رہتی تھی کہ وہ کوئی ایسا غیر معمولی کارنامہ انجام دے جس سے اس کے نام کو بقائے دوام حاصل ہو،

اس کے بلند حوصلوں نے اس کو ایک ہوشمند مدبر بنا دیا تھا، اس کو جب کوئی بڑا کام انجام دینے کا خیال پیدا ہوتا تو پہلے اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچ لیتا، چنانچہ جب وہ دیوگیری پر حملہ کرنے کے لیے جارہا تھا تو اس کی پوری احتیاط کی کہ اس کی خبر جلال الدین خلجی کو نہ پہنچنے پائے جو ایک قابل تعریف بات ہے، جب وہ کسی راجہ سے لڑتا یا مغل حملہ آوروں کا مقابلہ کرتا تو ہر حال میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیتا، اس نے ایک بڑی سلطنت وراثت میں نہیں پائی تھی، بلکہ خود بنائی تھی، اس لیے وہ زندگی کی تلخی اور شیرینی دونوں سے واقف تھا، اور اس کو ہر کام کو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرکے انجام دینے کا پورا تجربہ تھا، وہ کسی خوف کی بنا پر احتیاط نہیں کرتا تھا، جب وہ کسی کام کا ارادہ کر لیتا، تو اس کو پورے عزم اور قوت کے ساتھ تکمیل تک پہنچاتا، جس کی اس میں پوری صلاحیتیں موجود تھیں، اس نے اپنے چچا کو قتل کرکے تخت و تاج حاصل کیا تھا، لیکن واقعات نے ثابت کیا کہ وہ ایک بڑا جنرل تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ خود کوئی بڑا جنرل نہ تھا، بلکہ تمام فتوحات اسکے الغ خان اور نائب کافور کی بدولت حاصل ہوئیں، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں، جب اس کی شخصیت بالکل گمنام تھی، اس وقت بھی اس نے ملک چھجو (۱۲۹۲ء) اور بھیلسا (۱۲۹۲ء) کی مہموں میں اپنی سپہگری کا ثبوت دیا تھا، اور دیوگیری کی غیر معمولی تسخیر میں تو اس نے ایک فوجی رہنما کی حیثیت سے اپنا سکہ پوری طرح جما لیا، تخت سلطنت پر بیٹھنے کے بعد وہ دارالسلطنت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے

الغ خاں اور نصرت خاں کو ملتان اور گجرات کی مہم پر بھیجا تھا، لیکن ۱۲۹۹ء میں اس نے خود قتلغ خواجہ کو شکست دی، پھر ۱۳۰۳ء میں ترغی نے منگولوں کا جو زبردست حملہ ہندوستان پر کیا، اس کو بھی اس نے بڑی بہادری سے روکا، منگولوں کے مقابلہ کے لیے جب وہ روانہ ہو رہا تھا، اس وقت اس نے علاء الملک سے جو گفتگو کی تھی، اس سے اس کی شجاعت اور بہادری کے جوہر کا پورا اندازہ ہوتا ہے، اس نے دہلی کے چاروں طرف خندق کھدوا کر منگولوں کو جس طرح روکا ہے اس سے اس کی غیر معمولی جنگی قابلیت ظاہر ہوتی ہے، منگولوں اور راجپوتوں کیساتھ اس کے بڑے بڑے معرکے ہوئے، جن میں اس نے اپنی فوجی تنظیم، جنگی بصیرت اور بہادرانہ جوہر کا پورا ثبوت دیا، جب الغ خاں رنتھنبور کے محاصرہ سے تھک کر واپس ہوگیا تو علاء الدین خود اس کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا، اور مسلسل مشقت اور سپاہیانہ کمال دکھا کر اس کو فتح کر لیا، ۱۳۰۳ء میں علاء الدین نے چتوڑ کی تسخیر کی، جس کو اب تک دہلی کا کوئی سلطان نہ لے سکا تھا، اور اکبر جیسا طاقتور حکمراں بھی آسانی سے اس پر قبضہ نہ کر سکا، چتوڑ کی تسخیر کے بعد منگولوں نے اتنا زبردست حملہ کیا کہ ہندوستان کی سلطنت کے لیے موت و زیست کا سوال پیدا ہوگیا، لیکن علاء الدین نے اس پر بھی قابو پا لیا، ۱۳۰۳ء کے بعد علاء الدین سلطنت کے نظم و نسق کی اصلاح میں مشغول رہا، اس لیے پایۂ تخت سے باہر نہ جا سکا، لیکن اس کی فتوحات عین الملک اور نائب کافور جیسے فوجی سرداروں کے ذریعہ سے برابر جاری رہیں، اس کے سپاہیانہ تدبر کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے فوجی سردار اس زمانہ میں بھی جبکہ ہر فوجی سردار کی یہ خواہش رہتی تھی کہ وہ کسی طرح تخت و تاج کا مالک بن جائے، اس کے اطاعت گذار رہے، الغ خاں، نصرت خاں، ملک کافور اور غازی ملک جیسے بڑے بڑے فوجی سرداروں کا اس کا فرمانبردار رہنا اس کی ہوش مندی کی دلیل ہے، درحقیقت وہ تمام فوجی افسروں کا سردار تھا، اور خود بھی سپہگری اور جنگی فنون کا بڑا ماہر تھا، اپنے

دشمنوں کو آسانی سے منا سٹے میں لا کر اور انکو تھکا کر آزمائش میں ڈال دیتا تھا۔

ملکی نظم و نسق میں اس کے کارنامے اور بھی نمایاں ہیں، بلکہ اس کی فوجی قابلیت اسکی انتظامی ہوشمندی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ اس نے ملک کے لیے عجیب و غریب قسم کی اصلاحات جاری کیں، اور اپنی خواہش کے مطابق حکمرانی کی، سپاہیوں کی بھرتی براہ راست اپنی نگرانی میں کیا کرتا، گھوڑوں پر داغ لگوانا شروع کیا، فوجیوں کی نقدی تنخواہ کا رواج جاری کیا، بازاروں کے نرخ کو قابو میں کیا، راشن بندی کرائی، پرمٹ (حصول اجازت) کی روایت قائم کی، اسی طرح کی اور بھی نئی نئی باتیں ایجاد کیں جو پہلے سلاطین کے ذہن میں نہیں آسکی تھیں۔ اس کے لائق مشیر مثلاً ظفر خاں، نصرت خاں، الغ خاں اور علاء الملک وغیرہ ۱۳۰۲ء سے پہلے ہی مر چکے تھے، اسلیے اس نے جو کچھ کیا وہ سب اسکے غیر معمولی ذہن کا کرشمہ تھا۔ اس نے زمین کی پیمایش شروع کرائی، لوکل گورنمنٹ قائم کرنے کی کوشش کی، اور مالگذاری کی تحصیل کے لیے قوانین بنائے، ان سب باتوں میں اسی کو اولیت حاصل ہے۔ وہ جو نظام یا قانون نافذ کرتا اس پر عمل درآمد کی پوری کوشش کرتا تھا، چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس غرض سے چپکے سے بازار بھیجا کرتا تھا کہ دوکاندار مقررہ نرخ کے مطابق چیزیں فروخت کرتے ہیں کہ نہیں۔

علاء الدین شہنشاہیت کا علمبردار اور اپنی سلطنت کے حدود کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کا بڑا دلدادہ تھا، لیکن فتح حاصل کرلے کے بعد نامناسب اور ناخوشگوار رویہ اختیار کرنا ملکی مصالح کے خلاف سمجھتا تھا، دکن کے راجاؤں کو شکست دے کر ان سے زیادہ سے زیادہ خراج وصول کیا، لیکن انکو ان کے علاقوں میں برقرار رکھا، اس طرح اسکے بڑے سے بڑے دشمن اسکے دوست بن گئے، دیوگیری اور دوار سمندر کے راجاؤں کا استقبال جس فراخ حوصلگی سے اس نے کیا اور انکو خلعت، خطابات اور اپنے علاقے میں حکمراں بنا کر جس طرح انکی عزت افزائی کی اس سے اس بات کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات پر بڑی اچھی نظر رکھتا تھا، اس نے اپنی سیاسی بصیرت سے ان کو خوب سمجھ لیا تھا کہ ایسے علاقے کو فتح کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جہاں

اس کا قدم اچھی طرح جم نہ سکے، اس لیے دکن میں اسکی پالیسی کی وجہ سے بہت سے راجہ اسکے حلیف بن گئے جو نہ صرف اسکے اطاعت گذار اور فرمانبردار رہے بلکہ بہت سے فوجی معرکوں میں اسکو مدد بھی دی، یہ عجیب بات ہے کہ علاء الدین کے فوجی سرداروں نے جن علاقوں میں خونریزی اور آتشبازی کی وہاں کے راجہ علاء الدین کے بہت زیادہ فرمانبردار ہوگئے، علاء الدین ہی پہلا مسلمان فرمانروا ہے جو ہندو راجاؤں کو انکے علاقوں میں حکمراں بنائے رکھتا تھا، بشرطیکہ وہ خراج دیتے رہتے۔

علاء الدین میں بڑی جدت پسندی تھی، اسکی بعض جنگی اور مالی اصلاحات کو بعد کے فرمانرواؤں نے جاری رکھا، شیر شاہ نے علاء الدین کے بہت سے فوجی اصلاحات کو اپنی حکومت میں رائج کیا، علاء الدین نے زراعت، زمین اور مالگذاری کے سلسلہ میں جو قوانین بنائے تھے انکو شیر شاہ اور اکبر دونوں نے قبول کیا،

اس میں شک نہیں کہ علاء الدین کے نظم و نسق میں کچھ نقص ضرور تھا، اس کی حکومت شخصی تھی، جس کا دارومدار رائے عامہ کے بجائے فوجی قوت پر تھا، اور لوگ ڈر کر اسکی اطاعت کرتے تھے، اور نہ اس سے محبت کرتے اور نہ اسکا احترام کرتے تھے، وہ بھی اپنی فوجی طاقت برقرار رکھنے کے لیے اقتصادی خوشحالی کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا، بلکہ تجارت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا، تاجروں کو پوری آزادی حاصل نہ تھی، کاشتکاروں کو بھی بڑی مشقت اٹھانی پڑتی تھی، اس کے جاسوس اس طرح پھیلے رہتے تھے کہ لوگوں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی، امراکو اس نے بہت دبا رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے مرنے کے بعد حکومت پر بڑا نازک وقت آگیا، لیکن جب علاء الدین کی کارگذاریوں کا ناقدانہ اور گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے تو سارے الزامات دور ہو جاتے ہیں، اس کے روشن کارنامے زیادہ ہیں، اس نے ایک چھوٹی سلطنت کو امپائر بنا دیا، جس سے ہندوستان کے بیشتر علاقے ملحق ہوگئے تھے، وہ ہندوستان کا پہلا فرمانروا ہے، جس نے دکن کو اپنی حکومت میں ملاکر اس ملک کو ایک سیاسی وحدت عطا کرنے کی کوشش کی، اس نے منگولوں کو پسپا کرکے ہندوستان میں ان کی حکومت کے خواب کو بالکل ہی خواب پریشاں کر دیا، اس کی موت کے وقت بعض علاقوں نے آزادی کا

اعلان کر دیا تھا لیکن اس سے علاء الدین کے کارناموں پر کوئی حرف نہیں رکھ سکتا، اس نے جنوبی ہند کے دور دراز علاقوں میں پہنچکر وہاں کے راجاؤں کو پسپا کیا، جس کے بعد اس کے عیش پسند جانشین قطب الدین کو بھی وہاں کے راجا کو سرنگوں کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، علاء الدین کی فتوحات دیرپا نہ رہی ہوں لیکن اس کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوئے، اسی نے یہ کر دکھایا کہ وندھیا کے پار کے علاقے بھی تسخیر کیے جا سکتے ہیں۔

اس نے ایسا نظام حکومت قائم کر رکھا تھا کہ جس کی بدولت وہ کامیابی سے دو قرن تک حکومت کرتا رہا، اور اس کے بنائے ہوئے ضوابط آگے چل کر نمونے کے طور پر قابل تقلید ہوئے، ضیاء الدین برنی نے اس کے عہد حکومت کے بہت سے شاندار کارنامے گنوائے ہیں، جو کسی دوسرے حکمراں کے عہد میں نہیں پائے جاتے، مثلاً (۱) ضروریات زندگی کی چیزیں سستی ملتی تھیں، اور قحط کے زمانے میں بھی ان کے نرخ مقرر تھے (۲) اس دور میں بہت سی فتوحات ہوئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کامیابی مہم سے پہلے ہی حاصل ہو جاتی تھی (۳) منگولوں کو بری طرح پسپا کیا گیا، (۴) ایک بہت بڑی فوج کم تنخواہ پر مطمئن اور آسودہ حال رہی، (۵) سرکش زمیندار بالکل دبے رہے (۶) سڑکیں اور شاہراہیں بالکل محفوظ تھیں، رہزن ہی گذرگاہوں کے محافظ بنا دیے گئے تھے (۷) تاجروں کو ایماندار بننے پر مجبور کیا گیا، (۸) مضبوط عمارتیں بکثرت بنائی گئیں، (۹) ہندو اطاعت گذاری کرتے رہے اور مسلمانوں نے سچائی، پرہیزگاری اور عدل و انصاف کی زندگی بسر کی (۱۰) اس عہد میں ارباب ہنر اور اصحاب علم کا اتنا بڑا اجتماع ہو گیا تھا کہ کسی اور دور میں نہیں ہوا،

(ص ۔ ع)

ادبیات

آہ حضرت سہیل

از

جناب یحییٰ اعظمی

ترے غم کی اس میں باقی تھی کہاں تابِ رقم
ہو چکا تھا خستہ مدت سے مرا محزون قلم

وہ قلم جس کو بتائے تو نے اسرار ادب
وہ قلم جس کو سکھائے تو نے آدابِ رقم

تھی زباں جس کی ترے فیضِ نظر سے نغمہ سنج
آستانِ فضل پر تیرے جبیں تھی جس کی خم

آج ہے سر در گریباں تیرے ماتم کے لیے
تھا مقدر اس کی قسمت میں تری رحلت کا غم

حضرت سید کے ماتم سے نہ تھی فارغ ہنوز
دل میں تازہ تھا ابھی تک آہ یہ داغِ الم

ہو گئے رخصت وطن سے آہ اب اقبال بھی
ہو گیا صد حیف دورِ بزمِ شبلی مختتم

کون اب کھولے گا ہم پر شعر و دانش کے رموز
ذہن کس کا اب کرے گا فاش اسرار و حکم

آستانِ فیض تیرا تھا تو کچھ بھی غم نہ تھا
عقدۂ دشوار لیکر اب کہاں جائیں گے ہم

کون فیضانِ نظر سے اب نوازے گا ہمیں
آستاں پر کس کے حاضر ہونگے اب ہم صبحدم

کس کی تنقید و نظر سے ہوگا نموِ ادب
بخشدے گا گنجِ تحقیق و ہنر کس کا قلم

اٹھ چکے تھے دورِ پیشیں کے سب اربابِ کمال
اک ترے دم سے تھا قائم شعر و دانش کا بھرم

اسی کی فکر سے ٹوٹا فسونِ تیرہ شبی — بجھا اسی کے نفس سے چراغِ بولہبی
رہی متاعِ امانت جو سرسبد اسکی — تپِ جنوں سے لہکتی رہی خرد اسکی
فرشتہ صید رہا یہ بغیر ناوک و تیر — ہیں اس کے زلہ ربا جبرئیلِ پاک ضمیر
کہاں یہ اور کہاں شیوۂ زبونِ حیات — اسی نے عام کیا سوزِ اندرونِ حیات
خرد یہ رازِ دو عالم ہے آشکار اس سے — جنوں ہے جوشِ تپیدن سے ہمکنار اس سے
یقین و علم سے عقبیٰ کو روشناس کیا — ترے وجود سے دنیا کو روشناس کیا
ہر اک نظر تھی گہر سنج و کامراں اسکی — بہار چہرے پہ ملتی رہی خزاں اسکی

(انسان عہدِ حاضر میں)

سحر گزر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر — چلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر
سیاہ راتوں سے سورج ہیں مطمئن کتنے — سیاہیوں کی طرف مڑ گئے ہیں دن کتنے
خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے — ہوائے تند سی لڑ کر چراغ ٹوٹ گئے
غریقِ زہرِ ہلاہل ہے سفینۂ نوش — نشے کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش
وہ جس کا سینۂ روشن تھا مایۂ دار علوم — وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم
دلوں کے گنج میں کینے کا سانپ بستا ہے — وہ آدمی ہی ہے جو آدمی کو ڈستا ہے
بنائے عشق بہ تہذیب و کفر کے ناسور — یہ بے نگاہ کلیم اور یہ خرابۂ طور
زمین کے دوش پہ فکر و نظر کے یہ تابوت — یہ مقبرہ ہے الٰہی! کہ عالمِ ناسوت

تمام سعیِ کرم رائگاں ہوئی تیری
متاعِ سود سپردِ زیاں ہوئی تیری

مطبوعات جدیدہ

صحیفہ ہمام بن منبہ - مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ہے پتہ الہدیٰ بک ایجنسی نظام شاہی روڈ، حیدرآباد دکن۔

ہمام بن منبہ المتوفی ۱۳۱ھ مشہور اہل کتاب تابعی ہیں، وہ حضرت ابوہریرہؓ صحابی کے خاص شاگرد تھے، انھوں نے ہمام کے لیے ۱۴۰ حدیثوں کا ایک مجموعہ مرتب کر کے ان کو املا کرایا تھا، جو صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے مشہور ہے، ان کے سلسلہ تلامذہ میں معمر بن راشد، عبدالرزاق بن ہمام صاحب مصنف امام احمد بن حنبل اور ان کے بعد کے لوگوں میں برابر اس صحیفہ کے درس و سماع کا سلسلہ جاری رہا، امام احمد نے مسند میں ہمام کی حدیثوں کے تحت میں یہ پورا صحیفہ نقل کیا ہے، دوسرے محدثین نے بھی اپنی کتابوں کے مختلف ابواب میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں، اس طرح یہ صحیفہ ہر زمانہ میں نقل ہوتا رہا، مگر اس کے اصل مجموعے کا پتہ نہ چلتا تھا، چند سال ہوئے دو نسخوں کا پتہ چلا ہے، ایک برلن کے کتب خانے میں، دوسرا دمشق میں، اس کی صحت کا ثبوت یہ ہے کہ ان نسخوں اور مسند احمد بن حنبل کی نقل کردہ حدیثوں اور ان کی ترتیب میں بعض ایسے جزوی اختلاف کے علاوہ جو ایک کتاب کے مختلف نسخوں میں عموماً ہوا کرتے ہیں، کوئی بڑا فرق نہیں ہے، یہ صحیفہ حضرت ابوہریرہؓ صحابی کا مرتب کردہ ہے، جن کی وفات ۵۸ھ میں ہوئی ہے، اس اعتبار سے یہ صحیفہ حدیث نبوی کا سب سے قدیم مجموعہ اور تاریخ تدوین حدیث کی بڑی اہم کڑی ہے، اس لیے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے برلن اور دمشق کے نسخوں کی مدد سے صحیفہ کا ایک صحیح نسخہ مرتب کر کے اس کو عربی مقدمہ کے ساتھ

شائع کیا تھا، اب اس کو اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے، جس میں کتابت اور تعلیم کی اشاعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام، عہد نبویؐ اور اس کے بعد عہد صحابہؓ میں احکام و فرامین نبویؐ، آپؐ کے سیاسی معاہدوں اور احادیث نبویؐ کی کتابت اور ان کی تدوین پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ عہد نبوی ہی سے احادیث نبوی کی کتابت شروع ہوگئی تھی، اور عہد صحابہ اور تابعین میں اس کے متعدد مجموعے مرتب ہوگئے تھے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ احادیث کی تدوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صدی بعد عمل میں آئی، اس لیے یہ صحیفہ بجائے خود حدیث نبوی کے قدیم ترین مجموعے کی حیثیت سے بڑی قابل قدر یادگار ہے،

جہاں آرا بیگم - مرتبہ جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۹۰ صفحات، چھپے کاغذ اور عمدہ ٹائپ میں چھپی ہے قیمت مجلد عہ/ پتہ تعلیمی مرکز نمبر ۱۰۵ گیدول لیکھراج روڈ متصل ریڈیو پاکستان۔

تیموری شاہزادیوں میں جہاں آرا بنت شاہجہاں اپنی قابلیت، فہم و فراست، متانت و سنجیدگی، اخلاق و سیرت، دینداری اور اعمال خیر کے اعتبار سے بڑی نامور خاتون تھی، تصوف کا اس کو خاص ذوق تھا، اور خواجگان چشت سے بڑی عقیدت رکھتی تھی، ان کے حالات میں مونس الارواح اس کی مشہور تصنیف ہے، یہ چھپ بھی چکی ہے، اور اس کے قلمی نسخے بھی مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، اور وہ خاص نسخہ جو شاہزادی نے بڑے اہتمام سے اپنے لیے لکھوایا تھا، اور جو خطاطی اور آرایش کا بہترین نمونہ ہے، دار المصنفین کے کتب خانے کی زینت ہے، ضیاء الدین صاحب برنی نے آج سے تقریباً ۴۳ سال پہلے جہاں آرا کے حالات میں مذکورۂ بالا کتاب لکھی تھی، اب اس کا دوسرا اڈیشن نئے اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے، اس میں شاہزادی کے سوانح، اخلاق و سیرت، علمی قابلیت،

اور مختلف کارناموں اور اعمال حسنہ کے حالات ہیں، کتاب کے آخر میں مونس الارواح کے چند اقتباسات اور اس کے فارسی کے چند خطوط بھی دیدیے ہیں جس سے شاہزادی کے محاسن و کمالات کا اجمالی اندازہ ہوجاتا ہے، مصنف نے جو واقعات لکھے ہیں وہ اگرچہ صحیح ہیں مگر انھوں نے ان کو تیموری دور کی تاریخوں کے بجائے ثانوی درجہ کے ماخذوں یعنی اردو کی کتابوں اور مضامین سے لیا ہے، جس سے اس کتاب کا علمی وزن ہلکا ہوگیا ہے، مگر اس سے حالات و واقعات کی صحت اور کتاب کے افادہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کمار سنبھو ۔ مترجمہ جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۰۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد صہ، پتہ انجمن ترقی اردو بک ڈپو، اردو بازار، دہلی۔

سنسکرت کے ملک الشعراء کالیداس کی کئی نظموں کا اردو میں ترجمہ ہوچکا ہے، انکی ایک مشہور نظم کمار سنبھو بھی ہے جس کا تعلق ہندو دیومالا سے ہے، جناب منور لکھنوی نے جن کو منظوم ترجمہ کرنے میں خاص مہارت ہے، اور وہ متعدد نظموں کے اردو میں بڑے کامیاب ترجمے کرچکے ہیں، اب کمار سنبھو کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے، کسی زبان کی نظم کا دوسری زبان کی نظم میں اس طرح ترجمہ کرنا کہ ادبی اور شاعرانہ خوبیاں بھی قائم رہیں، بڑا دشوار کام ہے، مگر لائق مترجم اردو کے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں اور سنسکرت سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے انھوں نے ترجمہ میں بڑی حد تک ادبی اور شعری خوبیاں قائم رکھی ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ کسی طویل نظم کے پورے ترجمے میں یکسانیت نہیں ہوسکتی، اور اس میں نشیب و فراز کا ہونا ناگزیر ہے جو اس ترجمہ میں بھی موجود ہے، مگر اس کا بڑا حصہ اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، اور بعض بندوں پر تو طبعزاد کلام کا دھوکا ہوتا ہے، اس ترجمہ سے اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہوا،

حیوانات قرآنی ۔ مؤلفہ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت للعہ، پتہ: (۱) مکتبہ ندوۃ المعارف بنارس (۲) نمبر ۸ لال کوٹھی باغ گونگے نواب لکھنؤ۔

کلام مجید میں وعظ و تذکیر اور احکام و قوانین وغیرہ کے سلسلہ میں مختلف موجودات اور ان کے متعلقات کا ذکر آیا ہے، جس سے ان کے متعلق بہت سے فوائد اور معلومات حاصل ہوتے ہیں، اور قدما نے ان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی قبیل کی ایک مفید تالیف ہے، اس میں ان تمام حیوانات کو جن کا کلام مجید میں ذکر آیا ہے، بہ ترتیب حروفِ تہجی جمع کر دیا گیا ہے، اور ان کے حسب ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱) ان کے معنی لکھے گئے ہیں (۲) قرآن مجید میں جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے، بقید پارہ، سورت اور رکوع پورا حوالہ دیا گیا ہے (۳) قرآن مجید میں ان کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اس کو بتلایا گیا ہے (۴) ان جانوروں اور ان کے متعلقات کے بارہ میں فنی معلومات جمع کر دیے گئے ہیں (۵) توریت و انجیل میں ان کے متعلق جو کچھ ہے، اس کا بھی اجمالی ذکر کر دیا گیا ہے، (۶) مذاہب شرکیہ میں جو کچھ ہے اس کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے"۔ اس طرح یہ مختصر کتاب حیواناتِ قرآنی کے متعلق مفید معلومات کا ایک گنجینہ ہے۔

ذکر غالب۔ مؤلفہ جناب مالک رام صاحب ایم اے تقطیع اوسط، ضخامت ۲۴۸ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی نمبر ۶

یہ کتاب مصنف کی پرانی اور مشہور و مقبول تالیف ہے، یہ اس کا تیسرا اڈیشن ہے، ہر اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافے ہوتے رہے، یہ نیا اڈیشن سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے، غالب کے حالات اور سوانح پر اردو میں اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کتاب میں بڑے سلیقہ سے اس کی تلخیص کر دی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب غالبیات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اور اس کا مطالعہ بہت سی طویل کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے، مصنف نے اپنی تحقیق سے بعض نئے اضافے بھی کر دیے ہیں۔

"م"

مصنفین کی نئی کتابیں

بزمِ مملوکیہ

ہندوستان کے تیموری سلاطین کی علم نوازی اور معارف پروری پر ایک کتاب بزمِ تیموریہ لکھی جا چکی ہے، چونکہ ہندوستان میں پہلے کے مسلمان حکمران خانوادوں یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے علمی و ادبی کارناموں اور علم پروروں سے متوسل علماء و مشائخ اور ادباء و شعراء کے حالات میں بھی ایک سلسلہ لکھا جا رہا ہے، یہ جلد غلام سلاطین اور ان کے امراء اور شہزادوں کے حالات میں ہے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جو جوہر دکھائے، اور اپنی تبرد آزمائی و جنگ آوری کا جو ثبوت دیا، اس کی داستان تو بہت لکھی گئی ہے، لیکن انھوں نے شعر و سخن اور علم و ادب کی جو خدمت کی اور علماء و شعراء کی جو قدر دانی کی، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، اس میں بہاء الدین اوشی، فضلی [illegible]، امام صغانی، سدید الدین عوفی، نظامی نیشاپوری، مولانا منہاج سراج، فخر مدبر، ناصری، روحانی، تاج الدین ریزہ، شہاب مہمرہ بدایونی، شمس دبیر، امیر خسرو، اور حسن سجزی وغیرہ جیسے باکمال علماء و فضلاء و شعراء کے علمی و ادبی کارناموں پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا، خصوصاً اس دور کے [illegible] نامور گمنام شعراء دینہ، شہاب اور عمید کو پردۂ گمنامی سے نکال کر اردو زبان میں پہلی بار منظرِ عام پر لایا گیا ہے، اُن کے کلام سے اندازہ ہوگا کہ ان کو شعر و سخن، اور زبان و ادب پر کتنی قدرت تھی، اس میں انھوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں، اور اپنی قادر الکلامی اور کمالِ فن کا کیا ثبوت دیا، مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے قیمت [illegible]

تآل و مشیئت

اس میں حیاتِ انسانی کے دو بنیادی عقیدوں تآل و مشیئت کی فلسفیانہ تحلیل کی گئی ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے، اس کے بعد انہی دونوں موضوع پر سلسلۂ افکار دو دفتروں میں پیش کیا گیا ہے، آخر میں چند صفحوں میں پوری بحث پر تبصرہ ہے، (صاحبزادہ ظفر حسین خان صاحب مترجم مقالاتِ روسو)

قیمت [illegible]